ہر گھر کی زینت

ماہنامہ کراچی

دوشیزہ

NOVEMBER 1992

4 ایوارڈ یافتہ افسانہ نمبر

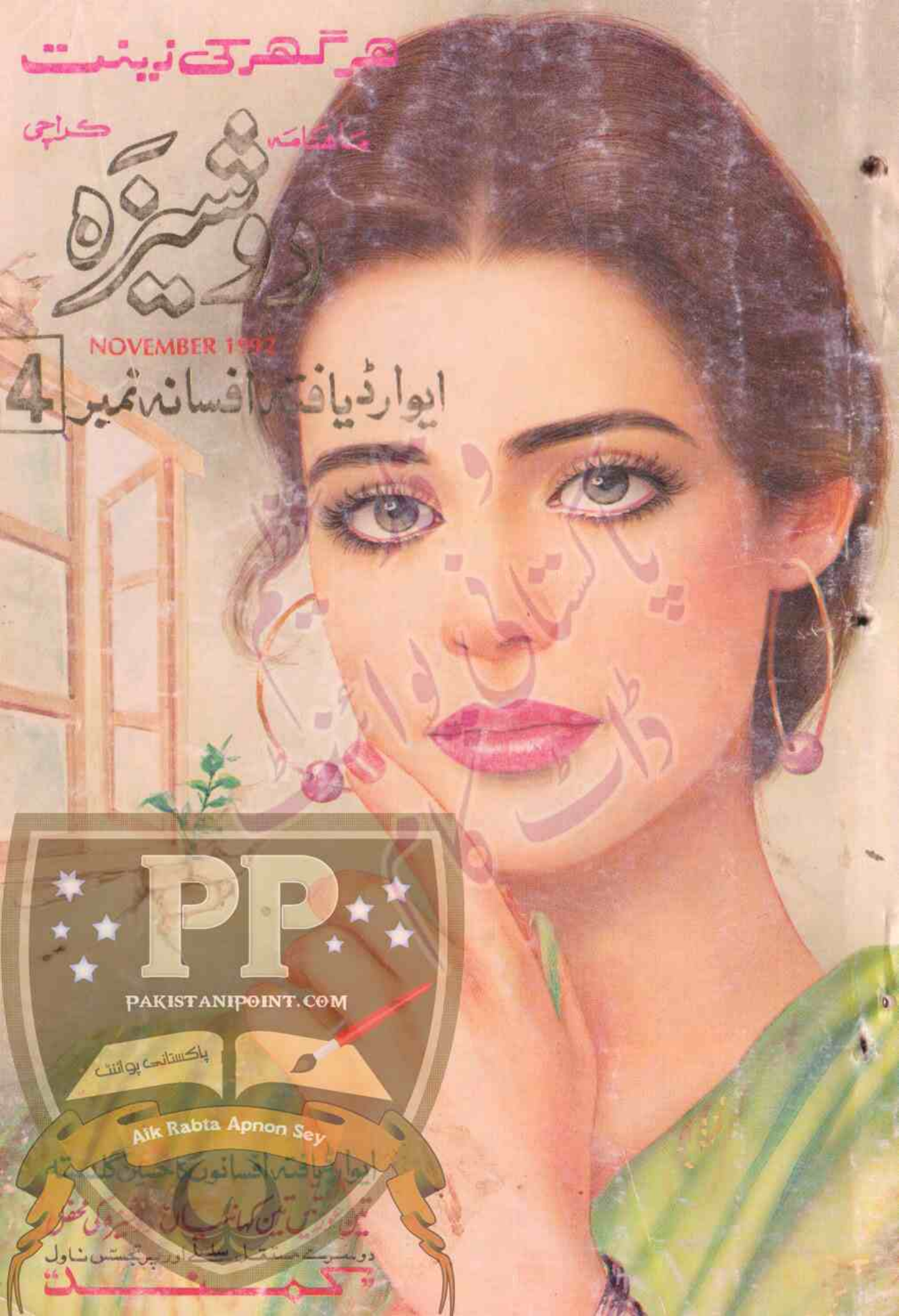

PP
PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ
Aik Rabta Apnon Sey

ایوارڈ یافتہ افسانوں کا حسین گلدستہ

تین نہیں تین کہانیاں

دوسرے ستارے سلسلہ وار جاسوسی ناول

کمند

ماہنامہ
دوشیزہ کراچی
ترجمان آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی

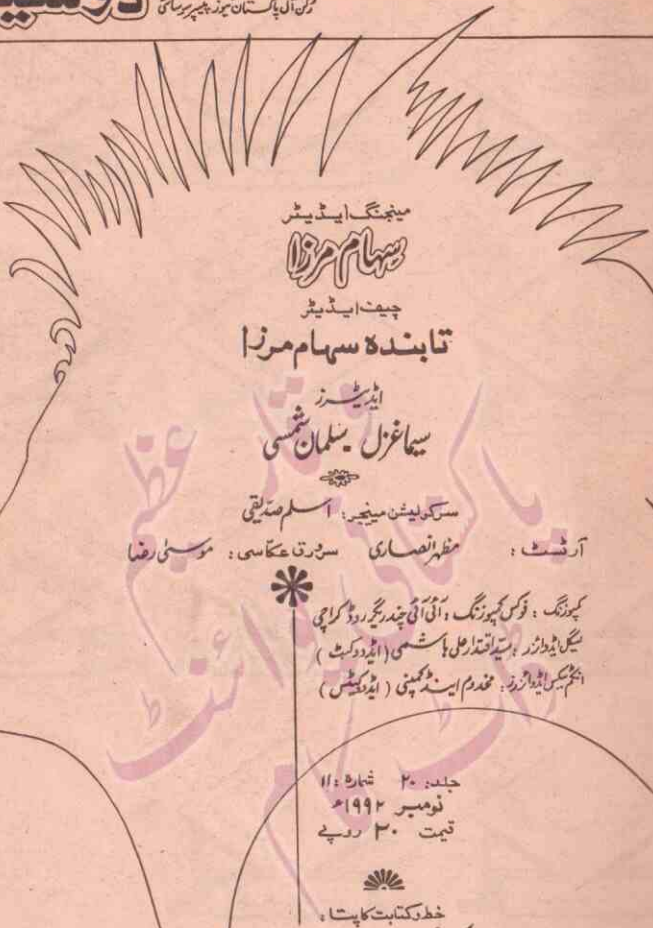

مینجنگ ایڈیٹر
سہام مرزا
چیف ایڈیٹر
تابندہ سہام مرزا
ایڈیٹرز
سیما غزل ۔ سلمان شمسی

سرکولیشن مینیجر: اسلم صدیقی
آرٹسٹ: مظہر انصاری سرورق عکاسی: موسیٰ رضا

کمپوزنگ: فوکس کمپوزنگ، آئی آئی چندریگر روڈ کراچی
لیگل ایڈوائزر: سید اقتدار علی ہاشمی (ایڈووکیٹ)
انجمن سیکس ایڈوائزر: مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

جلد: ۲۰ شمارہ: ۱۱
نومبر ۱۹۹۲ء
قیمت ۲۰ روپے

خط و کتابت کا پتا:
پوسٹ بکس نمبر ۸۰۹۵ کراچی ۷۵۴۰۰
رابطہ آفس: پرل پبلی کیشنز۔ ۱۱۰ آدم آرکیڈ،
شہید ملت روڈ / بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی
فون نمبر۔ ۴۹۳۷۰۹۱
فیکس نمبر ۴۹۳۹۶۱۱

ناشرات: پرل پبلی کیشنز: ماہنامہ دوشیزہ، ماہنامہ سچی کہانیاں،
ماہنامہ جنتی کہانیاں

K. S. Bhutti

۳ مادام نوبوکراشیک سے ملاقات — انٹرویو

۲۷ شناخت — فہیم فضل خالق

۱۰۰ ذات کے قیدی (ناولٹ) — آسیہ رزاق

۲۲۱ دھند لکے — فہیم فضل خالق

۲۸۴ خوشبو — فہیرین خاں

۳۲۳ تیز نیم کش — قارئین

۱۳ آپس کی باتیں — سہام مرزا

۳۲ نیا سورج — حمیرا راحت

۱۲۵ نذرانہ — فرحت ظفر

۲۳۵ اپوزیس — فرح تاباں

۳۰۰ چنبیلی کی ڈالی — زاہدہ پروین

۳۲۱ لذتِ کام و دہن — ادارہ

۱۴ دوشیزہ کی محفل — سہا مغزل

۵۴ منزل — نسرین خواجہ

۱۵۹ مہربان سایہ — سہا مغزل

۲۲۴ میٹھا سچ (افسانچے) — فرحت سلیم

۳۱۳ بانٹنے میں کنجوسیوں — قارئین

متفرقات — قارئین

۶۸ بھرم — خالدہ اسد

۱۴۹ کورٹ مارشل — سہا مغزل

۲۳۸ برف کے آنسو — خالدہ اسد

۳۱۷ تکلف بر طرف — شہباز مرزا

۸۰ آبگینے — آسیہ سلیم قریشی

۱۹۳ کمند (ناول) — سہا مغزل

۲۵۴ فرزند قوالہ — فہیم نوید

۳۲ حسن و آرائش — نسرین نکہاری

PAKISTANIPOINT.COM

ایک ہفتہ وار رسالے، ڈائجسٹوں، تاریخی و رومانوی اور جاسوسی ناولوں کی سرکولیشن لائبریری اینڈ جنرل اسٹور

جمال چوک سکھر

شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے

آپس کی باتیں

ایوارڈ یافتہ افسانوں کا چوتھا انتخاب حاضر ہے۔

یوں تو ہر دور میں افسانے شائع ہوتے رہے ہیں اور آج بھی ہو رہے ہیں لیکن ہم نے ہمیشہ ایسے افسانوں کی اشاعت کو ترجیح دی ہے جو معاشرے کی سچی عکاسی کرتے ہوں۔ یہ ایوارڈ یافتہ افسانے اسی حقیقت کے مظہر ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

اس ایوارڈ یافتہ افسانہ نمبر کی حیثیت بھی ایک مستقل کتاب کی سی ہے لیکن اس اعتبار سے عام افسانوی مجموعوں سے بہتر اور زیادہ دلچسپ ہے کہ یہ کسی ایک قلم کار کے افسانوں کا مجموعہ نہیں بلکہ مختلف قلم کاروں کی اچھی تخلیقات پر مشتمل ہے جنہوں نے کڑے مقابلے سے گزرنے کے بعد مقبولیت کی سند حاصل کی۔

ہمیں یقین ہے کہ ہمارے محترم قاری ادب نواز ہیں اور ہر ادب نواز قاری جانتا ہے کہ آج کل ڈیڑھ سو صفحات کا اچھا سا افسانوی مجموعہ ساٹھ روپے سے سو روپے تک دستیاب ہوتا ہے جبکہ یہ نمبر عام کتابوں کے ایک ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے مگر اس کی قیمت نسبتاً بہت ہی کم رکھی گئی ہے تاکہ یہ ہر ادب دوست کی دسترس میں رہے۔ ہمیں یقین ہے کہ "دوشیزہ" کے مستقل قارئین کے علاوہ ادب نواز دوست پہلے نمبروں کی طرح اسے بھی ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

یہ نمبر پیش کرتے ہوئے ہمیں دہری مسرت محسوس ہوتی ہے کہ "دوشیزہ" نے معیاری ادب کے فروغ کے لئے جو مشن شروع کیا تھا اس میں آپ سب بھی ہمارے شریک سفر رہے۔ جس کے لئے آپ سب کا بہت بہت شکریہ۔

دوشیزہ کی محفل

قارئین!

آداب ونیاز

پھول اتنے تھے کہ میرے ہاتھ چھوٹے پڑگئے کاروبار عشق کارگلستاں بنتا گیا

آپ کی محبتوں' عنایتوں اور خلوص آگیں لہجوں سے بھرے یہ ڈھیروں ڈھیر خطوط جنہیں دامن میں سمیٹے بیٹھے ہیں' اتنے ہیں کہ بس' لگتا ہے اس لمحے ہم دنیا جہان کی دولت سمیٹے بیٹھے ہیں۔ سچ وہ شخص کتنا غریب ہوتا ہے جس کے دوست نہ ہوں محبت کرنے والے نہ ہوں اور وہ کتنا امیر ہوتا ہے جس کے پاس آنے والے محبت نامے اتنے ہوں کہ اس کے ہاتھ انھیں سمیٹ بھی نہ سکیں۔۔۔۔۔۔

جس کا دامن محبتوں کے سمیٹنے کو چھوٹا پڑجائے۔ ہم وہی امیر ترین ہستی ہیں اور آپ سب کے بہت مشکور کہ آپ کی ہی وجہ سے ہم یہ مقام حاصل کرپائے ہیں اور پتا ہے اس بات سے کیا ہوا؟ ایک روز اچانک جلنے کی بو پھیل گئی۔ بڑے گھبرائے کہ پتا نہیں کیا جل رہا ہے۔ سفارتی تعلقات مصطفیٰ چاند سے ہی زیادہ بہتر رہتے ہیں سو انھی سے پوچھا۔ بولے تو کچھ نہیں آنکھیں نچا نچا کر سلیم فاروقی کی طرف اشارہ کرنے لگے۔ "کیا ہے بھئی؟ بتاؤ نا یہ جلنے کی بو کہاں سے آرہی ہے؟"

بیزار ہو کر بولے۔ "ایک تو آپ پوری بات کیے بغیر سمجھ کے نہیں دیتیں۔۔۔۔۔ بھئی کسی کا دل جل رہا ہے۔"

انھوں نے پھر آنکھیں نچائیں۔۔۔ ہم نے بے اختیاری سے سلیم فاروقی کی طرف دیکھا تو ان کے کانوں کے علاوہ داڑھی سے بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔

"یا اللہ! ان کا دل کیا ٹھوڑی میں ہے۔" ہم نے مصطفیٰ سے پوچھا۔

بولے۔ "نہیں داڑھی کے قریب ہی ہے' یا داڑھی دل تک پہنچ چکی ہے۔" اف۔ پھر تو وہاں بھی جنگل کا سا سماں ہوگا۔ اسی مناسبت سے اور بہت سی چیزیں بھی ہوں گی اور تبھی ہمیں دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا۔

سلیم فاروقی جو کچھ لکھنے میں مصروف تھے' چونک کر ہمیں دیکھنے لگے اور ہم نے جھٹ اپنا رخ دانش صاحب کی طرف کرلیا۔ اس وقت انتہائی سنجیدگی میں لپٹے ہوئے کام کررہے تھے اور ہمیں ڈر تھا کہ ذرا سا بھی موقع ملا تو جھٹ کام لپیٹ کر رکھ دیں گے' کچھ دیر ہم سے لڑیں گے پھر مصطفیٰ کو ڈانٹنے کی کوشش کریں گے اور پھر۔۔۔ کسی داستان گو سے قصے سننے بیٹھ جائیں گے۔ گویا آرمیشن چل پڑے گی' پھر تو ہم بھی کچھ نہ لکھ سکیں گے۔ فوراً جلدی سے رخ پھیرلیا۔ مصطفیٰ بھی نگاہیں بظاہر نیچی کرکے بیٹھ گئے۔ دانش صاحب کی نگاہیں تو ویسے ہی صرف خلاؤں میں سمجھ رہتی ہیں ان سے کسی کو خطرہ نہیں ہوتا۔ سلیم فاروقی نے بڑے غور سے سب کے چہروں کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر سوچتے رہے پھر کام کی طرف متوجہ ہوگئے۔۔۔۔ ہم نے چپکے سے خدا کا شکر ادا کیا اور آپ کے محبت ناموں کو اپنے چاروں طرف سجالیا۔

قارئین! اس بار اس شمارے میں ایک خوب صورت انٹرویو بھی شامل ہے اور ہم نے آپ سب کے بے حد اصرار پر یہ سلسلہ پھر شروع کرنے کا پروگرام بنالیا ہے۔ اب آپ ہر شمارے میں انٹرویو پڑھ سکیں گے۔ ہمارے نزدیک آپ کی تجاویز اور مشورے بہت اہم ہیں اس لیے کہ دوشیزہ آپ کا اپنا ڈائجسٹ ہے اسے ہر حال آپ کے معیار پر پورا اترنا چاہیے۔ ہماری یہ کوشش آپ کو کیسی لگی۔ یہ لگمتات بھولے نہ گئا۔

سچ قارئین! ہمارے پاس الفاظ نہیں کہ ہم آپ کی محبتوں کا شکریہ ادا کرسکیں۔ جانے کتنے خوف ناک طوفان آئے اور چلے گئے' سیاہ بادل رو رو کر برسے مگر آپ سب کی محبتوں نے احساس بھی نہ ہونے دیا کہ کبھی تکلیف بھی اٹھائی تھی۔ خدا کرے ہم آپ کی محبتوں اور عنایتوں کا حق ادا کرسکیں۔ ہم پوری کوشش کرتے ہیں کہ دوشیزہ کے معیار کو مزید بہتر اور بہتر بناتے چلے جائیں۔ اس میں وہ سب کچھ سمو دیں جس کی کمی کو آپ محسوس کرتی ہیں۔ ہم اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں' یہ تو آپ ہی لوگ بتاسکیں گے۔ آپ کے الفاظ' شعور اندیشوں میں راستہ دکھاتے وہ چراغ ہیں جنہیں آندھیاں بھی نہیں بجھاسکتیں۔ روشنی کی یہی مدہم کرن ہمیں انگلی پکڑے منزلوں کی طرف لے جاتی ہے۔ آیئے اب انھی چراغوں سے چراغ جلاتے چلیں۔

یہ ہمارے اچھے سے بھیا آصف سہارنی' لکھتے ہیں۔

افسانہ نمبر ے متاثر ہو کر خط لکھا تھا پریرائی کا شکریہ' دوشیزہ کا شمارہ بہت لیٹ ملا۔ اگست کے شمارے میں تو آپ نے کمال ہی کردیا۔ شاعری کے اتنے بڑے بڑے نام ایک ساتھ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ خطوں کے جواب جس محبت سے دیے جاتے ہیں دوسرے جرائد میں ذرا کمی ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ خدا کرے آپ کا یہ لہجہ برقرار رہے۔ آپ کی محبت بھری باتوں سے نکلتے ہی میٹھے لہجے کے شاعر فیصل شفائی کی غزل منتظر تھی۔ میں امجد اسلام امجد' ناصر زیدی' مجروح سلطان پوری کی شاعری کو دیوانگی کی حد تک چاہتا ہوں۔ روح کا زخم' مصلوب و فاتاثر کن تھے' انصاف کا انجام غیر متوقع تھا۔ گوگج اور باقی افسانے بھی لاجواب تھے۔ تبصرہ اس

لیے نہیں بھیج رہا کہ اب تو اگلا شمارہ بھی آگیا ہوگا۔ اسے پڑھنے کے بعد ہی تبصرہ بھیجوں گا۔ بہرحال آپ کی محنت اور ہمت سے دوشیزہ کا معیار دن بہ دن نکھرتا جارہا ہے دعا گو ہوں کہ دوشیزہ مزید ترقی کرے۔ چند غزلیں بھیجی تھیں نہ معلوم کیا انجام ہوا۔

اور قارئین آصف صاحب کا دوسرا خط بھی مل گیا۔ لکھتے ہیں۔ "اکتوبر کا خوب صورت شمارہ ہاتھ میں ہے۔ گویا تبصرہ کا شمارہ بھی انھوں نے پڑھ لیا۔ پھر لکھا ہے۔ "سب سے پہلے دوشیزہ کی محفل میں آپ کے محبت بھرے جوابات سے لطف اندوز ہوئے۔ "جوکی" (درداتہ توسین خان) واقعی اس قابل تھی کہ اول انعام کی حق دار ٹھہرے۔ غلط فہمی (فرح شاہانی) چنتا سحرا (سلمان غزالی) اور جمیل والی لڑکی (اقبال ہاشانی) نے کافی متاثر کیا۔ باقی افسانے بھی

اچھے تھے۔ اس دفعہ سلیم فاروقی کو بھی خط لکھ رہا ہوں تاکہ انھیں آپ کے خلاف اکسایا جاسکے کیونکہ دوشیزہ کی محفل میں انھی کے دم سے رونق ہے۔ اپنی غزل دیکھ کر خوشی ہوئی ورنہ ہم تو سمجھے تھے کہ بات آئی گئی ہوگئی۔ تو آموز شعراء کی حوصلہ افزائی کرتے رہا کریں ناکہ نئے لکھنے والے زیادہ جذبے سے لکھ سکیں۔ تمام غزلیں اچھی تھیں۔ تیز نیم کش زیادہ متاثر نہ کرسکا۔ قارئین سے التماس ہے کہ معیاری شعروں کا انتخاب کیا کریں۔ اشعار اور غزلیں بھیج رہا ہوں۔ دوشیزہ مسلسل لیٹ مل رہا ہے آخر کیوں؟"

بھیا جی! کیسے ہیں آپ؟ خدا کرے اچھے ہوں بہت اچھے، ویسے یہ بہت غلط بات ہے، پہلے خط میں لکھا کہ دوسرے خط میں تفصیل لکھوں گا مگر بھلا یہ تفصیل اتنی مختصر کب ہونے لگی۔ غزلیں آپ کو اچھی لگیں، شکریہ ہم تو کوشش کرتے ہیں کہ جو کچھ بھی چھاپیں معیاری اور اچھا ہو۔ افسانے پسند کرنے کا شکریہ، اور یہ کیا ہے؟ یعنی آپ بھائی جارہے اور اکسا رہے ہیں سلیم فاروقی کو؟ گو آپ کی صاف گوئی اچھی لگی مگر بھیا جی! خوب، یعنی

کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

بھی کہانیاں پڑھتے ہیں آپ؟ ذرا پڑھ کر دیکھیں، ہم نے کما تھا نا کہ ہم پر بھی نہ بھی دفعہ ۳۰۲ ضرور لگے گی، اور اس کا سبب یہی موصوف ہوں گے خیر اکسالیں، اکسالیں ہم بھی ایسا جواب دیں گے کہ ان کی بغلیں جھانکتے رہ جائیں گے۔ اور بھیا! دوشیزہ آپ کو ٹپ مل رہا ہو گا یا نہیں کیوں؟ ہم تو حتی الامکان وقت پر لانے کی کوشش کررہے ہیں۔ آپ ایسا کریں کہ سالانہ خریدار بن جائیں تاکہ شمارہ شائع ہوتے ہی فوراً آپ تک پہنچ جائے۔ دوشیزہ کے لیے دعاؤں کا شکریہ۔

کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے، ہی جناب یہ خط ہماری دوست ثمینہ افتخار اعوان کا ہے۔ بھئی کفر تو یوں ٹوٹا کہ صدیوں بعد ان کا افسانہ موصول ہوگیا۔ لکھتی ہیں۔ "سیما! ناولٹ ارسال ہے (جانو! آپ کے حساب سے ناولٹ مگر ہمارے حساب سے افسانہ ہے) لکھتی ہیں۔ اسے انتہائی مصروف دنوں میں مکمل کیا ہے۔ اسے پڑھوانا تو کجا جیسے ناول کا خلاصہ ہو۔ جی چاہا کہ وادی سون کی رسومات اور وہاں کے لوگوں کے رویے و مزاج پہ بھی کچھ لکھوں مگر اب تم سے شرم آرہی ہے کہ کہوں گی کہ یہ لمبا ہی پروگرام ہے۔ چاہو تو قسط بنا دو اور چاہو تو۔" دوشیزہ مل گیا ناں، اماں کے شمارے میں دو تحریریں لاجواب تھیں پہلی "قصاص" ڈاکٹر شہناز جمال اور دوسری "بساط" نسیم آمنہ کی۔ اچھا بھئی اللہ حافظ، مگر ٹھہو یاد آیا۔ دوشیزہ ملتے ہی شدید مصروفیت کے باوجود "کنکہ" کھول لیا کہ پچھلی قسط میں تجسس رہ گیا تھا لیکن پڑھا تو تجسس ختم کیا ہوا مزید سوا ہو گیا۔ شاباش! بھابی رخسانہ اور دانش دیر وی کو سلام۔۔۔"

"وعلیکم السلام۔" بھئی یہ بھرائی ہوئی آواز دانش دیر وی صاحب کی تھی۔ ثمینہ! افسانہ مل گیا۔ یہ خوبی ایک مکمل داستان ہے، اچھوتی اور خوب صورت جس تو پند آئی۔ اگلے شمارے میں چھپ رہی ہے۔ بلیز اب بریک نہیں لگانا۔ کچھ نہ کچھ اپنے قیمتی وقت میں سے چرا کر ہمیں بھی دے دیا کرو۔ اس چوری کا کانٹا ہمارے سر! تمہیں قصاص اور بساط پسند آیا یہی کہہ رہا تھا، شکریہ، کند کی پسندیدگی پر بڑی نوازش۔ تجسس ختم ہو گیا تو بھلا باقی کیا رہ جائے گا۔ جتنا مزہ افسانہ پڑھ کر آیا تھا اتنا ہی مزہ خط پڑھنے میں بھی آنا چاہیے اگر نہیں آیا۔ خیر مصروفیت کو جان کر معاف کردیتے ہیں۔ اچھا بس اب جلدی سے دوسرا افسانہ بھیج دو۔ ہری اپ۔"

اور سنو ثمینہ! انھیں جانتی ہو؟ بھئی یہ گل مینہ زوار خان ہیں کوئٹہ سے۔ ارے بڑی پرانی دوست ہیں دوشیزہ کی اور آج سے تو ہماری بھی ان سے دوستی پکی، لکھتی ہیں۔ "سیما صاحبہ! آپ کے لیے تو شاید میرا نام اجنبی ہو مگر قارئین دوشیزہ کے لیے جانی پہچانی ہوں۔ کافی عرصے تک دوشیزہ میں شرکت کرتی رہی ہوں مگر اس کے فعل کی وجہ سے اور کچھ اپنی مصروفیات کی وجہ سے غیر حاضر رہی۔ پہلے اپنے بیٹے احنف کے ساتھ ہوتی تھی اور اب بٹی خیران بھی ساتھ ہے۔ گزشتہ چند مہینوں میں آنے والے تمام شمارے پڑھتی رہی ہوں مگر خط لکھنے کا وقت نہ نکال سکی۔ جس طرح سے آپ نئے آنے والوں کا استقبال کرتی ہیں اس نے مجھے بہت متاثر کیا ہے، اس لیے میں بھی آگئی اور انشاءاللہ اب مسلسل شرکت کروں گی۔ ہمارا نرسنر پشاور سے کوئٹہ ہو گیا ہے۔ ویسے مجھے آپ سے گلہ ہے کہ آپ نے بھی لوگوں کو پکار لیا مگر میرا نام بھی نہ لیا۔ چلیں خیر میں پھر بھی آگئی۔ زوار رخسانہ بھابی کو اور سب کو سلام کہتے ہیں۔ اجازت دیں۔"

گل مینہ! بھئی یہ بھی ہمارا "اسٹائل" سمجھ لو۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ جو چیز بہت پیارا ہو اسے اگر نظر انداز کیا جائے تو وہ منہ پھلا لیتا ہے اور پھر بہت پیارا لگنا ہے۔ کسی کسی کو پیار سے اور کسی کسی کو نظر انداز کرکے بھی بلایا جاتا ہے۔ بلکہ ہمارا خیال ہے کہ وہ دوسرے بچوں سے جیلس ہو کر خود ہی سرکتا ہوا قریب آجاتا ہے اور دل بہلانے والی حرکتیں کرتا ہے کہ بے اختیار اسے ہنسنے سے لگا لینے کو جی مچل اٹھتا ہے، ہا! تو دیکھا۔ کیسے آنکھیں تم۔ خیر دل چھوٹا نہ کرو تم تو ہمارے بہت قریب ہو۔ مگر ہاں اگر نائب ہوئیں تو جرمانہ۔ سمجھیں! زوار صاحب کو سلام کہنا اور بچوں کو پیار کرنا۔ ہم اگلے خط کے بلکہ تفصیلی تبصرے کے منتظر ہیں خالی ہاتھ ہلاتی مت آنا۔

روحی بانو! ہم تم سے بہت ناراض ہیں۔ تمہاری بھیجی ہوئی دو غزلوں کا شکریہ، ویسے اس تکلف کی بھی کیا ضرورت تھی! نہ تبصرہ نہ تفصیل نہ کچھ خیر خیریت۔ بھئی "دوشیزہ" تو اس لیے بھیجتے ہیں کہ تم کچھ لکھو گی۔ کچھ تعریف کچھ تنقید وغیرہ وغیرہ۔ مگر خیر

یہ خط ابھی ساتھی طاہرہ مرزا کا ہے۔ رسالہ بھیجنے پر شکریہ ادا کرتی ہیں۔ ایوارڈیافتہ نمبر انھیں بے حد پسند آیا لکھتی ہیں۔ "واللہ از گولڈ دیے ہی تو نہیں کہا گیا مگر ملیزیہ جو ننھے ننھے ستارے چمکتے ہیں انھیں بھی چمکتے رہنے دینا آپ کا کام ہے۔ عظمت عزمی خاص طور پر یاد آتی ہیں کاش وہ بھی لوٹ آئیں۔ بے حد سندر الفاظ کے خزینے ہیں ان کے قلم میں۔ شہناز اے جمال کی اپنی کاٹ ہے۔ دوشیزہ بہتر ہو تا جا رہا ہے۔ گویا ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساتی۔ کیا خیال ہے، ارے نیا افسانہ لکھ رہی ہوں کفر فیصلہ ضرور سنا دیا کرو تاکہ آگے کچھ کی خواہش و گنجائش نہ رہے۔ مصروفیت اجازت نہیں دیتی مگر تمہاری محبت کی وجہ سے کوشش کرتی ہوں کہ قلم کو زنگ نہ لگنے پائے۔"

طاہرہ! تمہارا ایک افسانہ تو مل گیا تھا، پچھلی جواب کا انتظار اگلا شمارہ آنے تک کرلیا کرو۔ بعض مرتبہ براہ راست خط لکھنا بہت دشوار ہو جاتا ہے، ہیں تم زنگ نہ لگنے دینا۔ اور ایوارڈیافتہ نمبر کے بعد نارمل ایشو بھی تو نکلتا ہے ان جگنوؤں کو ستاروں ہی کے لیے تو۔ اور کیسی ہو؟

اور ہاں طاہرہ! تم نے دردانہ نوشین کو پوچھا تھا! اب تک تو تم ان کا افسانہ "جوگی" گزشتہ شمارے میں پڑھ چکی ہوں گی۔ تو بھئی یہ خط انھی کا ہے۔ لکھتی ہیں۔ "خیریت کی طالب ہوں۔ آپ نے ہم سیلاب زدوں سے خیریت بھی دریافت نہ کی۔ پہلے تو ایسا دستور نہ تھا۔ مظفر گڑھ کو خدا نے بال بال بچا لیا۔ سیلاب کے اس سانحے پہ امدادی سامان کی منصفانہ تقسیم از حد ضروری تھی مگر۔ مصیبت زدوں کو کھلے میدانوں میں دیکھ کر اور ایسے حالات میں بھی دکھتی اور اغوا کے واقعات افسوسناک ہیں، کیا ہم واقعی بے حسی اور بے غیرتی کے اس مقام تک پہنچ چکے ہیں کہ جہاں ملعون بندروں کی قوم" میں بدلے جانے کی سزا کے بھی مستحق ہوں؟ ان حالات میں لکھنے کی ہمت نہیں رہتی بس ذہن سوچے جاتا ہے۔"

دردانہ! خدا کرے خیریت سے ہوں۔ بی بی آپ کو براہ راست خط لکھ دیا تھا۔ مل ہی گیا ہو گا اور ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ اس سانحے میں آپ کا خیال نہ آتا؟ ہم نے دن رات دعائیں مانگی ہیں، صرف مظفر گڑھ کے لیے نہیں پورے ملک کے لیے، اور پھر گزشتہ شمارے کا اداریہ تو تم نے پڑھ ہی لیا ہو گا، خدا کا شکر ہے کہ مظفر گڑھ بال بال بچ گیا مگر جہاں سیلاب سیل بلا خیز کی طرح آیا اور گزر گیا وہاں کی تباہ کاریاں دیکھ کر آنکھوں سے لہو ٹپک پڑا تھا۔ جانے نوشین وہ کون چھپرول ہوتے ہوں گے جن کی نگاہیں عذاب دیکھنے کے بعد بھی خواب دیکھنے کی ہمت رکھتی ہوں گی۔ یہ بے حسی؟ تو ہمیں آخرت سے بھی بیگانہ کرلی جا رہی ہے ایسے میں ہمیں جو سزا بھی ملے کم ہی ہے۔ کاش ہم سوچ سکیں کہ یہ انسان کی معراج نہیں، پستی ہے اور اس پستی سے ہمیں ابھرنا ہے، انسانیت ہی وہ سیڑھی ہے جو ہمیں اوپر اور اوپر لے جاسکتی ہے ورنہ انسان، وہ انسان ایسا تو نہ تھا جسے خدا نے اشرف المخلوقات کا درجہ دیا تھا۔ کاش ہم لمحہ بھر کو اس انسان کا تصور ہی کریں تو شرمسار ہو جائیں، ایسے کہ پھر سر نہ اٹھا سکیں۔ لٹ جانے والے، برباد ہو جانے والے ان معصوموں کے لیے سوچیں جنھوں نے برسوں خواب دیکھ کر اپنی بستی بسائی ہوگی، اسے سجایا، اور سنوارا ہو گا مگر محبوں میں وہ سب کچھ طوفان بلا خیز اجاڑ کر لے گیا، ان آبزی آنکھوں میں تو اب خواب دیکھنے کی ہمت بھی نہ ہو گی۔ جن کے خوابوں کی ایسی بھیانک تعبیر ملی ہو، پھر ایسے میں انھیں گلے لگانے والے، دلاسہ دینے والے

لوٹ مار میں لگے ہوں تو بھلا سزا کے مستحق کیوں نہ ٹھہرائے جائیں' خدا کرے تم ایسے اور بھی ہوں۔

قارئین! یہ المیے ہمارے ہیں۔ یہ دکھ' یہ کرب بھی ہمارے ہیں' ہم اس سے نگاہیں نہیں چرا سکتے۔ بس پھٹول لوگوں کے لیے دعا کرسکتے ہیں' ہنستے ہنستے رو دینا' یا رلا دینا یہ حقائق ہیں کوئی مذاق نہیں' سو ہم بھی رو پڑے تھے۔

وہی محفل ہے مگر ہم گئی کیسی بے رنگ
بچ میں حرف دل آزار کے آجانے سے

یہ خط ماریہ عرفان کا ہے' ارے وہی ماریہ جو بی بی کے پنے پر ناراض ہو جاتی ہیں مگر میں بہت بیزاری اسی لیے جی چاہتا ہے کہ خوب چٹاپٹا ہے۔ خیر لکھتی ہیں۔ "سیما باجی! سنائیے کیسے مزاج! ایوارڈ نمبر ۳ کل رات ملا اور مت پوچھئے کہ کتنی مشکلوں سے۔ اب آپ کہیں گی کہ گھر پر لگوا لو تو بھئی ہم ایک جگہ نکیں تب نا! ماما نہ۔ اچھا لگا اور آپ کا پیارا بھی۔ رہی بچی کھانیاں کے شکوے والی بات تو جناب ادھر سے ہمیں روزانہ سے پذیرائی ملی۔ سو رسٹلہ اٹوٹ ہے جب کہ دوشیزہ کا مت پوچھئے' جب آپ نے ہم سے رابطہ کیا تو بسلا اور تعاون واحد خط بعد آپ جناب' ہمارے سارے طبق روشن کرگیا۔ ایسی کڑوی قسم کی عزیز داری میں بھلا مجھ جیسا بندہ کیا لکھے۔ آپ کے خط سے اندازہ ہوا تھا کہ آپ خاصی سنجیدہ قسم کی شخصیت ہیں یعنی آپ نے بالکل ڈرا ہی دیا تھا۔ آپ نے سلیم بھائی کے لیے غور و خوض کرنے کو اکتوبر کا احوال پڑھا ہے آپ نے! نہیں پڑھا تو اب پڑھیں۔ آپ کی تعریف ہی تھی لے گی۔ یعنی حیرت انگیزیات کہ اتنی بہت سی زبانیں جانتی ہیں' تو مزاج میں بھی سمی آپ کی تعریف تو تھی نا! تو کیسے آئس کریم پگھلی! وہ بھی صحیح نہ کرانے کی۔ ویسے غور و خوض پر تو مجھے آپ دونوں ہی اچھے لگے اب پتا نہیں قصور کس کا ہے۔ غازی کی آخری قسط بوجھل سی ورنہ آپ پڑھ کر دیکھ لیجئے گا کہ ہم نے سچ کہا تھا۔ اف سیما باجی! آپ بی بی کم از کم مجھ نہ کہا کریں۔ سچ ایسا لگتا ہے جیسے کسی جنرل اسپتال میں مریضوں کی طویل قطار سے مخاطب ہوا جا رہا ہو۔ کہانی کی بات یہ کہ اپنی ہر کہانی پڑھ کر مزہ نہیں آتا' پتا نہیں کیوں؟ آپ کہہ کر تو دیکھیں کہانیاں حاضر ہوں گی اور تھوڑی دیر کے لیے ہماری خاطر ہی سہی ناراضگی ختم کرکے سلیم بھائی سے کہئے گا کہ مجھے انعام مل گیا ہے۔ انھیں بھی خط لکھ رہی ہوں۔ اتنا طویل خط لکھ دیا ہے اب تو شکوہ دور ہو گیا ہوگا۔ میرے تکلف میں رہنے کی وجہ بھی آپ جان چکی ہیں۔ فی امان اللہ۔

ماریہ بی بی!... ادہ سوری' بھئی ماریہ! بی بی کہنے پر اکثر سلیم فاروقی بھی منہ پھلا چکے ہیں مگر کیا کریں سب کے ساتھ انصاف کرنے کے چکر میں غلط عادت پڑ گئی۔ خیر اب تم نے ٹوکا ہے تو خیال رکھیں گے ورنہ سلیم فاروقی کی بات پر تو ہم نے دھیان دیا ہی نہیں تھا اور ماریہ یہ تم نے کیا لکھ دیا' گویا ہم نے تمہاری پذیرائی کی ہی نہیں' ایسی دل دکھانے والی باتیں تو نہ کرو۔ تم نے ہمیں ایک ہی خط لکھا تھا سو جواب دے دیا اب پھر لکھا ہے تو جواب دے رہے ہیں۔ افسانے تمہارے دو تو لگ چکے ہیں۔ ایک باقی ہے جسے تم اگلے ماہ کے شمارے میں دیکھ لو' کون پذیرائی کے کہتے ہیں؟ رہی آپ جناب والی بات تو سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ آخر کیا لکھیں' بی بی لکھیں گے تو ناراض ہو جاؤ گی' اور ہم سنجیدہ صرف اسی وقت ہوتے ہیں جب سنجیدگی ضروری ہو۔ تم ڈرنامہ' ویسے قریب آؤ ایک بات بتانا ہے۔ "جناب یہ ساری سنجیدگی اور رعب داب سلیم فاروقی کے دکھانے کو ہے تاکہ وہ ڈرا سے رہیں۔ تمہارے لیے نہیں۔" اور سناؤ کیا حال ہے اور آئس کریم کہاں ہے بھئی' واہ کینٹ کی آئس کریم تو بڑی فوجی قسم کی ہوگی' الربا' اکڑی ہوئی۔ رہی سلیم فاروقی کی ہمارے سلسلے میں تعریف تو وہ بے چارے اور کر بھی کیا سکتے ہیں اور جو تمہیں اپنی لکھی ہوئی کوئی کہانی پڑھ کر مزہ نہیں آتا تو یہ بھی بات ہے' ارتقا کے ابتدائی مرحلہ ہے۔ اچھا چیز اچھی نہ لگے یہ بھی تو آدمی اس سے اچھا اور بہتر لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ارتقائی عمل جاری رہتا ہے اگر بہت اچھی لگے تو سمجھو سفر ختم ہو جاتا ہے اور لکھنے والا پھر یہی سمجھے بھی اس سے بہتر نہیں لکھ سکتا۔ تم سمجھ رہی ہو نا! تو ذرا اور اچھی سی تحریر بھیج دو۔ صرف تمہاری خاطر سلیم فاروقی کو اطلاع دے دی ہے کہ انعام مل گیا۔ اب سنو! خط لکھنے پر ناشکوہ نہ کرنا کہ جواب نہیں دیا اور یہ وہ' یہ وہ۔"

یہ خط روبینہ شاہین نے کراچی سے لکھا ہے۔ لکھتی ہیں۔ "آپ سب کے لیے بے شمار دعائیں' میں نے ستمبر کا ایوارڈ یافتہ افسانہ نمبر پڑھا ہے حد پسند آیا۔ خاص طور پر

افسانہ "مصلوب وفا" بہت پسند آیا۔ آسیہ سلیم قریشی کو مبارک باد۔ دو افسانے بھیج رہی ہوں۔ کچھ ہی دن میں ایم اے کے امتحانات کی تیاری میں مصروف ہو جاؤں گی' پتا نہیں آپ سے رابطہ رکھ سکوں یا نہیں' اگر چھاپیں تو میرز شمارہ ضرور بھیجئے گا۔ تبصرہ کتن کے لیے اشعار بھیج رہی ہوں۔ سب کو سلام' دانش دیوری صاحب کو بالخصوص' اجازت۔"

روبینہ! اچھی ہو نا! شمارے کی پسندیدگی کا بڑا شکریہ' آسیہ سلیم قریشی کو مبارک باد ان سطور کے ذریعے پہنچ جائے گی۔ افسانے مل گئے۔ اشعار موجود ہیں۔ فارغ ہو جاؤ تو خط ضرور لکھنا۔ پی بی خط یا افسانے پر اپنا پورا پتا ضرور لکھا کرو' تاکہ افسانہ شائع ہونے پر شمارہ بھیجا جاسکے۔

یہ خط لکھا ہے بیول سے شازیہ سجاد قریشی نے۔ لکھتی ہیں۔ "ڈیر سیما جی! قلم سے ناتا تو بہت پرانا ہے۔ ساتویں جماعت سے لکھنا شروع کیا تھا اور اب ایف اے کر چکی ہوں۔ وقت کے ساتھ یہ شوق بھی پروان چڑھتا رہا ہے لیکن ابھی تک کہیں سے مناسب پذیرائی نہیں مل سکی۔ کہیں کوئی حوصلہ شکن ہو جاتی ہے اور کبھی انتظار کے چراغ جلانے کے باوجود بھی۔ خیر یہ غالباً ۸۷ء کی بات ہے۔ ابو کے کہنے پر میں نے دوشیزہ کو اپنی تحریر بھیجی اور وہ باجی ہاں کے عنوان سے شائع کرکے دوشیزہ نے مجھے اپنا سیر کرلیا تھا۔ ان دنوں میں دبئی میں تھی۔ پاکستان آکر بہت تلاش کرنے پر بھی دوشیزہ ۱۱ء اور ایک طویل مدت بعد دوشیزہ سے ملن ہو ہی گیا۔ بہرحال رابطے کی کڑی جوڑی ہے امید ہے دوشیزہ کی محفل میں جگہ دیں گی لیکن خالی ہاتھ پہلی بار آنا اچھا نہ لگا سو ایک عدد کہانی بھی حاضر ہے۔ انعامی مقابلے کے لیے افسانہ بھیجنے کا طریقہ کار لکھئے گا۔ ایوارڈ نمبر ایک قابل ستائش کاوش ہے۔ پذیرائی کی امید اور دعاؤں کے ساتھ آپ کی شازیہ۔

خوش آمدید شازیہ! آپنے بھولے ہوئے ناے میرے نام آئے۔ لوگ جانے کیوں بھٹک گئے تھے۔ ہم پکارتے ہی رہے اور لوگ گھنے جنگلوں میں کہیں ہمیں ہی تلاش کرتے رہے۔ کوئی عجب تماشہ رہا۔ شازی! تم نوٹ آئیں بہت کمال ہوا' بھئی آخر دوشیزہ نے پہلے بھی تو پذیرائی کی تھی نا! پھر اب بھلا کیوں نہیں کرے گی۔ تمہاری تحریر مل گئی۔ دیکھیں گے تو بتائیں گے محرمل نہ ہارا کرو۔ انتظار کی لذت تو بڑی خوب صورت ہوتی ہے۔ بڑی بیتاب اور بے کل سی۔ بس لکھو اور بھیج دیا کرو۔ انعام یافتہ کے لیے بھی کوئی خاص طریقہ تو نہیں' ایسے ہی بھیج اب بھیجا ہے۔ مگر زبردست ہونا چاہیے۔ کچھ تبصرہ تو بھیجیں۔ اب تو زمانے ہو گئے دوشیزہ کو چھپتے ہوئے۔ تم اب ڈھونڈنے نکلیں! خراب تو لاقات ہوگی نا! ہم منتظر ہیں۔

یہ خط ہمارے محترم عرفان علی شاہ صاحب نے مرزا صاحب کو لکھا ہے۔ "آپ کے خط کی تعمیل میں دو افسانے "رات کا بوجھ" اور "صراط مستقیم" بھیج رہا ہوں شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری تحریر کو انعام کا حق دار ٹھہرایا۔ بہت خوشی ہوئی۔ میری نیک تمنائیں اور دعائیں آپ کے ادارے کے ساتھ ہیں۔ انشاءاللہ آپ جلد ہی اپنے خوابوں کو حقیقت کے روپ میں دیکھیں گے۔ میرا یقین ہے۔ تمام احباب کو سلام کہیے گا۔

محترم! بڑی نوازش کہ آپ مسلسل ہمیں افسانے بھیج رہے ہیں' لگتا ہے جیسے ہمارا سایہ کچھ گھٹا ہو کر لمحہ لمحہ ہمیں اپنی پناہ میں لیے ہوئے ہے۔ اپنے ہی سائے کا ہر لمحہ ساتھ بھی تو اب معجزے سے کم نہیں کہ یہاں تو سایہ بس اس وقت تک ساتھ رہتا ہے جب تک روشنی ہو' حوصلہ تو اس وقت ہوتا ہے جب اندھیرے میں کوئی ہاتھ تھامے چلتا محسوس ہو۔ آپ نے وہی حوصلہ بخشا ہے ہمیں' بڑا شکریہ۔ دونوں افسانے مل گئے اور آئندہ شمارے کی زینت ہوں گے۔ یہ ساتھ چھوڑ نہ دیجئے گا۔ امید کہ یہ خیر ہوں گے۔

"ڈیر سیما! میں تمہیں یہ تیسرا خط لکھ رہی ہوں مگر سوائے ایک خط کے مجھے کوئی دوسرا نہیں ملا۔ مجھے معلوم ہے تم بہت مصروف رہتی ہو کئی محرر پرچے کے ساتھ ایک خط بھی رکھ دیا ہوتا۔" جی قارئین! یہ بیشہ آتے ہی مجھے ڈانٹتی ہیں۔ ہاں نہیں تو۔ نہ خیریت پوچھتی ہیں نہ حال چال' بیٹھتی ہیں بس آئیں اور دھواں سا چاروں طرف سے اٹھنے لگا۔ ارے آپ نہیں جانتے انھیں! بھئی یہ عذرا فاطمی ہیں۔ نیدا رک سے آدئی ہوئی آئی ہیں' شور مچاتی ہیں اور پھر غائب۔ آگے لکھتی ہیں۔ "دوشیزہ کیونکہ یہاں مل جاتا ہے اس لیے مجھے نہ بھیجنا مگر اس ماہ کا دوشیزہ بھیجنے کا بہت شکریہ کم از کم خیال تو رکھتی ہو۔ تمہارا ناول فرسٹ کلاس جا رہا ہے۔ فرزند قوالہ تھوڑا سا پڑھا تھا' کل سی۔ بس نکھو اور بھیج دیا کرو۔ انعام یافتہ کے لیے بھی کوئی خاص طریقہ تو نہیں' ایسے ہی بھیج اب بھیجا ہے۔ مگر زبردست ہونا چاہیے۔ کچھ تبصرہ تو بھیجیں۔ اب تو زمانے ہو گئے دوشیزہ کو چھپتے ہوئے۔ تم اب ڈھونڈنے نکلیں! خراب تو لاقات ہوگی نا! ہم منتظر ہیں۔

دوہانہ نہ پڑھنے کے لیے۔ میرا خیال ہے بند کرا دیا ر۔ ردینہ اخلاق کی کوئی اچھی نعم نگر End پسند نہیں آیا۔ زاہدہ پروین کی لاحول ولا بہت پسند آئی۔ شکیلہ رفیق کی کہانی بھی اچھی تھی۔ ہاں سیما! یہ جو آخر میں حسن و آرائش کا سلسلہ ہے بہت اچھا ہے اسے جاری رکھنا' ویسے میں سب سے پہلے محفل پڑھتی ہوں۔ یہ چیزیں عام طور پر خشک ہوتی ہیں لیکن تمہارے ہاں ہوا یک 'میریکٹر' ہیں' جن سے تم اکثر چھیڑ چھاڑ رکھتی ہو انھی کے دم سے محفل میں جان ہے جناب' ہر وقت بے چارے کو نشانہ بنائے رکھتی ہو' مگر یہ بھی صحیح ہے کہ اگر تم اتنی خنچائی نہ کرو تو یہ بس کھیلتے ہی رہیں۔ ویسے تمہارے ہمیرے ہوتے مزے کے ہیں۔ دیار غیر میں یہ باتیں موذے جاتی ہیں لگتا ہے پاکستان میں کوئی اپنا اپنا سا ہے۔ ایک چھوٹا سا آنریبل مسائل کے متعلق بھیج رہی ہوں' اگر مناسب لگے تو لگا دینا۔ ایک بات اور مجھے محفل کے علاوہ بھی جواب دہ کرنا انتظار کرتی ہوں۔ خالد فاطمی کہانی چھاپنے کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ ویسے کہتے ہی کہ سیما نے قینچی چلا دی۔ کہانیاں بھیجتے رہیں گے' باقی سب کو سلام۔

ایسے ہی ڈانٹ دیا تم نے! لکھا تو ہے خط۔ اب تک تو مل بھی گیا ہو گا۔ مل گیا ہو تو ہم سے سوری کرو۔ اتنی زور سے ڈانٹنے ہو کہ بس' اتنی زور سے سلیم فاروقی ہنستے بھی ہوئے کہ ہمیں کے ہنسنے پر اچھل پڑتے ہیں پھر تمہارے ڈانٹنے پر کیا حال ہوا ہو گا؟ ہم تو کچھ نہیں ہی کہ ان کا دم ہمارے ہی دم سے ہے بھلا ہم اتنا کچھ نہ کہیں تو دمہ۔ اور بھی یہ تم سب نے انھیں بچوا رکھا کیوں لکھنا شروع کر دیا ہے۔ بچاری کی زندگی تو ہم گزار رہے ہیں۔ ان کی معیت میں گھنٹوں بیٹھنا بلکہ بیٹھ کر کام کرنا بڑے دل گردے والا کام ہے۔ تلوار کی طرح سر پر لٹکے رہتے ہیں حالانکہ تلوار کی داڑھی نہیں ہوتی اور وہ تو اسامہ ہی ہوتی ہے' مگر یہ نہیں بالکل تلوار تلوار سے لگتے ہیں۔ ہم نے یہ ذکر مصطفےٰ چاند سے چپکے سے کیا تو انھوں نے سلیم فاروقی کو دیکھا اور جھٹ ہماری آڑ میں ہو گئے۔ کہنے لگے۔ "واللہ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ پان کی وجہ سے لو رگ بھی ہو رہے ہیں۔" اور بھی خالد کی کہانی بھی نا دو نمبر میں' رسالہ بھیجنا تو فاخیر آئندہ نہیں بھیجیں گے۔ فرزند قوالہ کی آخری قسط چھپی ہے۔ کہانیاں' افسانے اور حسن و آرائش کا شکریہ۔ کمند

فرسٹ کلاس لگی۔ یہ مکمل تبصرہ تو نہ ہوا پڑھ کر اب کیسا لگا ٹھیک ٹھیک لکھنا۔ اور بھئی سلیم فاروقی کو نشانہ اس لیے بناتے ہیں کہ ہمارا نشانہ بہت خراب ہے' درست کر رہے ہیں۔ ایک مرتبہ ہمیں ایک ریایم ایم دیکھنے کو ملی تھی۔ پہلی بار دیکھی تھی۔ بی جا ہا چلا کر دیکھیں کیسا لگتا ہے۔ ہم نے سلیم سے کہا بھی کہ ذرا تھوڑی دیر کے لیے دیوار کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ بعد میں ہٹ جانا مگر وہ ناراض ہو گئے۔ ایم ایم چلانے کی حسرت ہی رہ گئی۔ خیر بالوں سے متعلق تمہارا آنریبل مل گیا ہے۔ اچھا ہے' اس بار تو لیٹ ہو گیا اگلے شمارے میں حسن و آرائش میں ضرور لگ جائے گا۔ خالدہ نے اصل میں افسانہ بھیجا تھا' ہمیں بھی کہانی چاہیے تھی اس لیے تھوڑا سا کاٹنا پڑ گیا' انتظار نہ کرنا' یہ کہانی کی ضرورت تھی۔ اگلی کہانی کب آ رہی ہے؟ اور خالدہ کو کہ اب ایسی بھی کیا کنجوسی' دو چار سطریں لکھ دیا کرو۔ ہمارے خط کے بارے میں ضرور اطلاع دو کہ ملا۔ کہ نہیں۔ تمہیں بہت سی دعائیں۔

قارئین! حیدر آباد دکن (بھارت) سے یہ خط بھیجا ہے ملک محمد علی خان صاحب نے۔ لکھتے ہیں۔ "السید کہ یہ خیر ہوں گے۔ دو شیزہ ملا۔ میرے پیغام کی اشاعت پر تہہ قبول کریں۔ ہفتہ وار آندھرا جیوتی میں دو شیزہ پر تبصرے کی اشاعت کے بعد بعض دوسرے اخبارات نے بھی تبصرے شائع کیے ہیں۔ وجہ انڈیا میں دو شیزہ کی غیر معمولی مقبولیت ہے۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ ہندوستان کے اکثر ڈائجسٹوں میں پاکستانی افسانہ نگاروں کے افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں یا پھر ان کی کہانیاں اور سلسلہ وار ناول بھی چل رہے ہیں جن میں خالدہ اسد' منورہ نوری خلیق' سیما مناف' اقبال بانو اور سیما غزل شامل ہیں ان سب کا تعلق دو شیزہ سے ہے۔ دو شیزہ سے متاثر ہو کر ہندوستان میں بھی اب کئی ادارے دو شیزہ کو بغیر حوالے کے من و عن شائع کر رہے ہیں اس سے آپ دو شیزہ کی یہاں مقبولیت کا خوب اندازہ کر سکتے ہیں۔

محترم ملک محمد علی خان! امید کہ یہ خیر! ہندوستان کے اخبارات کے وہ تراشے بھیجنے کا بہت شکریہ جس میں دو شیزہ پر تبصرے شائع ہوئے ہیں۔ یہ جان کر بھی خوشی ہوئی کہ ہمارے لکھنے والے ہندوستان میں بھی اس قدر مقبول ہیں۔ مطلوبہ شمارے ارسال کر دیے جائیں گے' ہمارے لائق

کوئی اور خدمت ہو تو فرمائیں۔

ماریہ! یہ ابھی ابھی ہمیں تمہارا دو سرا خط بھی ملا ہے۔ تم نے جو کئی میں جن اشعار کی غلطیاں نکالی ہیں وہ دراصل سرائیکی زبان سے ہماری عدم واقفیت کی وجہ ہے۔ اس ضمن میں دانش دیروی کی خدمات بھی حاصل کی گئی تھیں لگتا ہے وہ بھی سرائیکی بھول بھال گئے ہیں۔ تم نے لکھا ہے کہ ہفتے بھر پہلے ہی کمند اور فرزند قوالہ کی قسطیں ختم تھیں' ہفتے بھر بعد ہی اگلا شمارہ مل گیا قسطوں کا انتظار نہیں کرنا پڑا' یعنی دو شیزہ اس بار ہفت روزہ کی طرح مل گیا۔ ہے نا مزے کی بات' شاعری کا انتخاب تمہیں پسند آیا گا۔ ہماری دونوں تحریریں مل گئیں۔ سلیم فاروقی سے نارسٹکی کا سن کر مزہ آیا۔ تو کیا اب صلح نہ کرانے پر ہماری آنکھ کریم کی؟ ہم سے پیار کرنے پر نوازش' اور پیار نہ کرو کی تو بھلا کر دو کی بھی کیا؟ ہم جو اتنا چاہتے ہیں تمہیں' محبت کا جواب محبت سے تو دینا ہی پڑتا ہے نا!

قارئین! یہ ہماری آپ کی انجمن ہی' پیاری سی دوست میں گل۔ ان کا خط ہمیں جچے اکتوبر کو' دو سرا دس اکتوبر کو موصول ہوا۔ لکھتی ہیں۔ "آپ کا نوازش نامہ موصول ہوا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے مجھے اتنی اہمیت دی۔ مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ آپ کے رسائل میں میری صرف پانچ کہانیاں شائع ہوئی ہیں جن میں سے چار انعام کی مستحق ٹھہرائی گئیں۔ سچی کہانیوں کا ایک کہانی بھیجی تھی اب تک مل گئی ہو گی۔ میری صحت ٹھیک نہیں ہے آپ میرے لیے دعا کریں۔ اگلے خط میں لکھتی ہیں۔ "پیاری سیما غزل! اس بار حیرت انگیز طور پر دو شیزہ کا اکتوبر کو ہی مل گیا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ افسانہ خصوصی انعام پا گیا ہے۔ سارا رسالہ پڑھ چکی ہوں۔ سب کہانیاں اچھی تھیں۔ خوشی اس بات کی ہے کہ "دو شیزہ" ڈائجسٹوں کے اس دور میں اپنا ایک منفرد مقام بنا رہا ہے۔ مار دھاڑ' قتل' اغوا' اسمگلنگ اور سستی محبت کی داستانوں کی بجائے روزمرہ زندگی سے قریب تر حقائق پر مبنی زندگی کے نازک و حساس جذبات پر مبنی افسانے اور کہانیاں دو شیزہ کی زینت بن رہی ہیں جس نے اس رسالے کو ڈائجسٹوں کی صف سے نکال کر ادبی رسالوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے اور اب سنجیدہ اور اچھا ادبی ذوق رکھنے والے لوگ اسے پڑھ رہے ہیں۔ اس شمارے میں شاہدہ ناز قاضی کا "خلیے پر دہلا" کلثوم واحد کی "تعبیر" زہرہ ممتاز کے "بند دروازے" عرفان علی شاد کا "پاڑھ" غرض کس کس کے نام لوں تمام ہی افسانے اپنی جگہ خوب ہیں۔ دعا ہے کہ دو شیزہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔ ایک نئی کہانی شروع کی ہے مکمل ہوتے ہی بھیجوں گی۔

گل! اچھی ہی دوست! تمہیں براہ راست بھی خط لکھا تھا اب تک تو مل گیا ہو گا۔ ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ دو شیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ اور ہاں ـــ بہت سے انعامات پانے پر مبارک باد۔ تمہاری کہانی "جچی کہانیاں" کو موصول ہو گئی۔ ہمارا افسانہ جلد مکمل کر کے بھیجو۔

یہ خط دبئی سے محمد انیس خان نے مرزا صاحب کو بھیجا ہے۔ لکھتے ہیں۔ فون پر گفتگو رہتی ہے اس لیے خط لکھ رہا ہوں۔ بار بار جی چاہا کہ آپ کا تحریری شکریہ ادا کروں کہ آپ نے مجھے یہاں ہر صورت مل ہی جاتے ہیں۔ ہمیں دو شیزہ' ہی کہانیاں اور پھر آپ کا اداریہ پڑھنے کو مل جاتا ہے یہی کافی ہے۔

بھیا انیس خان صاحب! بہت شکریہ۔ امید کہ خیریت سے ہوں گے۔ جن صاحب کے بارے میں آپ نے پوچھا ہے ان سے فی الوقت کوئی رابطہ نہیں اس لیے یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ کہاں ہیں۔ خط پا کر خوشی ہوئی' کبھی کبھی یاد کرتے رہیے گا۔ لکھیے گا کہ دو شیزہ کی صورت میں آپ کو ہماری کوششیں کیسی لگتی ہیں۔

یہ خط مراد آباد انڈیا سے عامرہ تبسم طالب نے لکھا ہے۔ لکھتی ہیں۔ "ہائی! دو شیزہ کی پرانی قاری ہوں۔ دو شیزہ میرا عزیز ترین رسالہ ہے' خدا اسے مزید ترقی دے۔ میرا سارا خاندان پاکستان میں ہے انھی کی معرفت یہ خط بھیج رہی ہوں۔ اس سے پہلے بھی خط ڈال چکی ہوں' جواب نہیں ملا۔ ہمیں یہ رسالہ مراد آباد میں نہیں ملتا۔ ہمیں دلی سے دوگنی قیمت پر منگوانا پڑتا ہے۔ پچھلے سال کے دو تین شمارے نہیں مل سکے جس کی وجہ سے سلسلہ وار ناولوں کی دو تین قسطیں نہیں مل سکیں کیا وہ آپ کے پاس سے مل سکتے ہیں؟ اگر میں اپنے کسی پاکستانی رشتے دار کی معرفت منگواؤں تو کیا مل سکیں گے؟

بی بی عامرہ! تم سالانہ خریدار بن جاؤ تو یہ سلسلہ ہی ختم ہو جائے گا اور دو شیزہ تمہیں وقت پر ملتا رہے گا۔ تمہارا اس

سے پہلے ہمیں کوئی خط نہیں ملا ورنہ ہم جواب ضرور دیتے۔ تم ایسا کرو کہ اپنے دفتر سے حاصل کرلے۔ پاکستان آؤ تو ضرور ملنا ہمیں خوشی ہوگی۔ منورہ نوری آج کل امریکہ میں ہیں' ان سے کافی دنوں سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ رضا صاحب کا وہی ایڈریس ہے جو خود آپ نے لکھا ہے۔ دعاؤں کا شکریہ۔

قارئین! شاداب نے بجائے' پھول نچھاور کیجئے کہ ایک ایسی ہستی بھی ہنستی مسکراتی ہمارے درمیان چلی آئی جسے پکارتے پکارتے ہمارے گلے میں نوخراشیں سی پڑ چکی تھیں' آپ سب بھی یاد کرتے کرتے تھک چکے تھے بس ہمارے تو دل میں ایک کانٹا سا چبھا رہ گیا تھا کہ ہماری صداؤں کے جواب میں ایک مکمل سناٹا سا چھایا رہتا تھا۔ جانے آج کیا ہوا؟ کون سی ادا بھائی کہ چلی آئیں بلکہ سوغات بھی لے آئیں۔ بھئی شہرزاد ہا! اب ایسی بھی کیا بے مہری؟ ہمیں اسی معطر اور خوش رنگ ملاقات سے فارغ تو ہونے دیں۔ اچھا بھئی نسیں! یہ بہت محترم ہیں' بڑی خوب صورت اور پرانی دوست خالدہ اسد۔ دیکھا' ہم نے کہا تھا ناکہ آپ اچھی ہی پڑیں گے۔ آپ سمجھتے تھے کہ وہ بے وفا ہیں' اب چھوڑ کر گئی ہیں تو لوٹ کر نہ آنے کے لیے۔ جی نہیں جناب! ایسا نہیں تھا' اور پتا ہے کیا لکھتی ہیں؟ "سیما جی! خوش رہو۔ امید ہے کہ بخیریت ہوں گی۔ کچھ ایسی مصروفیات اور طبیعت کی خرابی حملہ آور ہوئی کہ باوجود کوشش کے رابطہ نہ کرسکی۔ ارے بھئی پہلے یہ بھی کمانی اور افسانہ تو لو' ورنہ گلہ کروگی کہ اتنی مدت بعد آئیں اور خالی ہاتھ۔' مرزا صاحب کی طبیعت کا بڑھ کر دکھ ہوا اللہ انھیں صحت دے اور تابندہ بیٹی کے متعلق پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی اور حیرت بھی کہ ماشاءاللہ وہ اتنی بڑی ہو گئی۔ بہرحال مبارک بادکی مستحق ہے بھئی۔ رخسانہ آج کل کیا کر رہی ہیں۔ میری طرف سے دائق دیدی' مرزا صاحب' رخسانہ اور تمہیں بہت سلام قبول ہو۔ خوش آمدید خالدہ! سچ آپ تو ہمت ہار بیٹھے تھے۔ سوچا شاید ہم اس قابل ہی نہیں کہ پلٹ کر دیکھا بھی جائے۔ بہت نوازش' شکریہ' مہربانی آپ کا ساتھ بڑا حوصلہ مند ہو گا۔ یوں جیسے سچ مچ منجدھار میں پتواروں کا سہارا میسر آجائے' اور کنارے خود ہی بڑھ کر ہاتھ پھیلادیں۔

کہانی افسانہ دونوں مل گئے۔ کمانی تو اسی شمارے میں موجود ہے' افسانہ اگلے شمارے میں آسکے گا۔ آپ کی مبارک باد تابندہ کو پہنچادی ہے' مرزا صاحب اور رخسانہ بھابی سلام کہتے ہیں اور خیریت پوچھتے ہیں۔ ہماری دعیوں دعائیں قبول کریں' مگر جناب بس اسی علیک سلیک ہی سے کام نہیں چلنے والا۔ آپ کا سہرہ بے حد ضروری ہے۔ دوشیزہ کیسا لگا؟ ہم کہاں تک کامیاب ہیں' وغیرہ وغیرہ کی بے حد ضرورت ہے۔ مزید تحریروں کے ساتھ ہی تبصرے کے منتظر رہیں گے۔ امید کہ اب کھنے جنگلوں میں تنہا چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گی۔

یہ خط جنلم سے ہمارے بھیا ریاض حسینی قمر نے بھیجا ہے۔ "سوئیٹ بچا سیما غزل! اکتوبر کے شمارے میں اپنی غزل دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ دوشیزہ زیر مطالعہ رہتا ہے' صرف عدیم الفرصتی کی وجہ سے تبصرہ نہیں بھیج پاتا۔ آئندہ کوشش کروں گا۔ دوشیزہ سے رشتہ بہت پرانا ہے۔ آپ جس طرح گفتن خلوص اور محنت سے پرچہ ترتیب دے رہی ہیں اس پر آپ لائق صد مبارک باد ہیں میری دعا ہے کہ خداوند کریم آپ کو عمر خضر عطا کرے۔

ارے ارے بھابی! غدا کے واسطے اتنی لمبی عمر کی دعا تو نہ مانگو' زندگی میں خوشیاں تو کم کم ہی ہوتی ہیں پھر اتنی لمبی عمر دکھوں میں کاٹنے کا حوصلہ نہیں۔ ہاں دکھ کم ہوجائے گی دعا ضرور مانگا کرو کہ زندگی میں سے دکھوں کے لمحے کم ہو کر زندگی مختصر مگر خوش کن رہ جائے۔ یہی بڑی دعا ہے۔ دوشیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ! اور عدیم الفرصتی کا بہانہ کب تک چلے گا۔ یہ بچپن کی عادت چھوڑتی نہیں تم نے؟ ہر بات پر وقت کی کمی کا بہانہ' اب کوئی جدید سائنیا اور انوکھا سا بہانہ تلاش کرو' بندے کے ہر کام میں جدت ہونا چاہیے۔ غزلیں بھی تمہاری ہمارے پاس موجود ہیں' اور کیسے ہو؟

یہ خط ہماری اچھی ہی دوست ثمینہ انتظار اعوان کا ہے۔ لکھتی ہیں گھر سے لوٹی تو تمہارا خط منتظر تھا۔ خوشی ہوئی۔ ناولٹ کیسا لگا۔ کچھ پہلے بھی ایوارڈ یافتہ میں دو افسانے لکھ چکی ہوں مگر اپنی ہر تحریر کے بعد یوں لگتا ہے کہ اس سے بھی عمدہ لکھی جاسکتی تھی۔ تمہیں کیسا لگا یہ ضرور لکھنا۔ میں دوشیزہ کے لیے مزید لکھوں گی یہ سوچ کر' مجھے جذبوں کے اظہار کا سلیقہ نہیں تبھی تو کبھی بتا نہیں پاتی کہ آپ لوگ مجھے کتنے عزیز ہیں۔ دوشیزہ کا معیار بہت بہتر ہو گیا ہے۔

آہستہ آہستہ اپنے روایتی منفرد انداز میں آرہا ہے۔ اس کی دلی مبارکباد ہے۔ بھئی سب سے زیادہ تو ثمینہ! ہمارا خلط ملط ہو گیا اور سنو! ہمیں جذبے کھوج لینا کا سلیقہ ہے' تم پروا مت کرو' ہم بے رنگ و بے معنی الفاظ میں بھی جذبے تلاش کرلیتے ہیں جبکہ تمہارے الفاظ تو بہت بنتے سنورتے اور چھم چھم کرتے ہوتے ہیں۔ افسانہ بہت اچھا لگا۔ اگلے شمارے میں آرہا ہے۔ میں نے متعلقہ شعبے سے کہہ دیا ہے کہ اگر وہ شمارے جو تم نے مانگے ہیں مل گئے تو ضرور بھیج دیے جائیں۔ اچھا سنو تو ابھی ابھی تم نے لکھا تھا کہ شاید تم مزید لکھ کر بھیج رہی ہو۔ کیا چ چ؟ ارے نہیں یار مذاق مت کرو۔ اچھا' چلو ٹھیک ہے دیکھے لیتے ہیں۔ زیادہ نہ ماہ سال بھر انتظار کرنا ہو گا' اب کرلیں گے۔ اتنے پیار کرنے والے ہوں تو صدیاں بھی ہنستی بجاتے گزر جاتی ہیں۔ اور منہ کیوں پھلا لیا تم نے! اچھا ٹھیک ہے بابا۔ تم سچ مچ تو۔

یہ ہیں مرزا ادیب صاحب! مرزا صاحب آداب' ہم نے تینوں افسانوں کے بارے میں آپ کو لکھ دیا ہے' اگر آپ مزید بھجوادیں تو نوازش! امید کہ خیریت ہوگی۔ شمس آغا صاحب سے کہیے گا کہ افسانے بھجوادیں۔ انھیں سلام بھی کہیئے گا۔ رخسانہ بھابی تک آپ کا سلام پہنچادیا ہے۔ ہمارے لائق کوئی اور خدمت ہو تو بتایئے۔

یہ خط ہے جناب نیر غیاثی کا۔ لکھتی ہیں۔ "سیما غزل جی! پرسوں دوشیزہ کی امرازی کاپی موصول ہوئی۔ تیرانی کے ساتھ ساتھ شرمندگی بھی ہوئی۔ تیرانی اس بات کی کہ دوشیزہ نے نہ صرف مجھے یاد رکھا بلکہ بہت یاد رکھا افسانہ بھی چھاپا۔ شرمندگی اس بات کی کہ آپ نے مجھے یاد کیا مگر میں جواب بھی نہ دے سکی۔ وجہ اس کی قطعی معمولیت تھی۔ معمولیت ختم ہوتے ہی اپونے کہا کہ دوشیزہ کو کچھ بھیجو مگر سستی نے کچھ کرنے نہ دیا۔ بہرحال آج ایک کہانی لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ دوشیزہ کے لیے ہی تحریر کررہی تھی کہ آپ نے یاد کرکے شرمندہ کردیا۔ معذرت! آئندہ کوشش کروں گی کہ کوتاہی نہ ہو۔ کہانی شائع کرنے کے بابت شکریہ۔ تابندہ نے تو واقعی کمال کردیا گویا دھماکا ہوگیا۔ اب افسانے بھی دھماکا خیزی آئیں گے۔ انٹرویو کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے' پھر کب سے شروع کررہی ہیں انٹرویو؟ منورہ نوری کی تحریریں ہر شمارے میں ہونا چاہیے۔ سچ آپ کے بغیر ادھورا بن لگتا ہے۔ امید ہے غور کریں گی' بہرہ پھر کسی "اجازت" نہیں! اتنے دنوں میں آئیں اور تبصرہ پھر ناں نکیں! بھئی بہت ہی ست ہو' تمہاری شکایت تمہارے ابو سے کرنا پڑے گی ہیں نا! اور بھئی ہم تو سب کو یاد کرتے ہیں' کوئی آئے یا نہ آئے۔ کہانی مل گئی بہت نوازش' اور ہاں بھئی تم کہو اور ہم پورا نہ کریں! لو انٹرویو حاضر ہے۔ آئندہ بھی انٹرویو جاری رہیں گے۔۔۔۔ ارے بابا تم لوگ کہہ کر تو دیکھو۔۔۔ تم ہی لوگ تو ہمارے اپنے ہو! تم لوگوں کی فرمائش نہیں کریں گے تو پھلا پھر کس کی کریں گے!

اور بی بی منورہ صاحبہ سے رابطہ نہیں' اب کیا کریں وہ کچھ بھیجیں گی تو چھاپیں گے نا! سناؤ کیسی ہو! اب آئیدہ سستی دکھائی تو بہت ڈانٹ پڑے گی' پھر شکایت نہ کرنا' آج کا کام کل پر نہ ٹالا کرو۔ ہاتھ کے ہاتھ تبصرہ بھیج دیا کرو۔ تمہارے اگلے خط کے منتظر رہیں گے۔ سمجھیں!

قارئین! یہ ہیں ہماری اچھی سی' پیاری سی دوست اب ورنی پشاور شفقدر سے لکھتی ہیں۔ "پیاری سیما غزل! ورنی تم ہم سے بہت پیار کرتی ہو' بڑی نوازش! آگے لکھا ہے۔ "اکتوبر کا شمارہ بھیجنے کا اور میرے دونوں خطوط کا جواب دینے کا شکریہ۔ خط کی ابتدا شکر گزاری سے کرتی ہوں کہ آپ کے احساسوں تلے دبی ہوں لیکن آپ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ میں شکریہ کے چند الفاظ سے ان احساسوں کے بوجھ کو اتارنے کی کوشش کررہی ہوں۔ یہ بوجھ تو نہ اتر سکتا ہے نہ اتارنا چاہتی ہوں کیونکہ یہ بوجھ جس قدر بھاری ہوتا جاتا ہے میرے دل ودماغ کی سار وجدانیاتی ہلکا پھلکا ہوتا جاتا ہے۔ آپ نے لکھنے کی فرمائش کی تو دو افسانے لکھ تو بھیجنے کی جرات نہیں ہو رہی تھی کہ کہیں آپ بھی ایسا جواب نہ دے دیں جیسا ایک ایڈیٹر نے ایک رائٹر کو دیا تھا کہ بہت خوب صورت کہانی لکھی ہے آپ نے' فریم میں لگانے کے قابل تو ہے شائع کرنے کے قابل نہیں۔" اور پھر دوشیزہ کی کہانیاں جو پڑھتی ہوں ان میں جو لفظوں کی خوب صورت لڑیاں پروئی ہوئی ہیں وہ شاید میرے افسانوں میں نہ ہوں' لیکن پھر بھی بھیج رہی ہوں۔ یہ سچا واقعہ ہے' ایسا ہی ایک واقعہ میں دوشیزہ میں پہلے بھی پڑھ چکی ہوں۔ یہ واقعہ قریبی گاؤں میں پیش آیا تھا۔ اور ہاں تابندہ سمام مرزا کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ انعام یافتہ نمبر میں سارے ہی افسانے خوب تھے۔ میری طرف سے دلی مبارک

بادوبیں۔ اکتوبر کے شمارے میں دردانہ نوشین کی ہوگی' ذہرہ ممتاز کی بندرہ ڈائے' اور گل صاحبہ کی شکست فاحش بہت ہی اچھی لگیں۔ باقی کہانیوں میں روحی یا سرکی فرق نمایاں طور پر مٹی کابت اور نصرت افشاں کی بیت بہت خوب صورت تھیں۔ اس بار بچی کہانیوں میں بھی تینوں کہانیاں اچھی تھیں البتہ جمیل والی لڑکی اور غلط فہمی اتنا متاثر نہ کر سکی۔ جتنا صحرا تو افسانہ کم اور پی وی کا ڈراما زیادہ لگا۔ دو شیزہ کے صفحات بڑھانے کا شکریہ' تکلف بر طرف میں جواب کم اور لطیفے زیادہ ہوگئے ہیں۔ تبصرہ کس میں تمام اشعار خوب صورت تھے۔ یہ حسن و آرائش میں آپ نے سوال جواب کا سلسلہ بھی خوب شروع کیا۔ کیا آپ سوچ رہی ہیں کہ میں کمند پر بھرہ بھول گئی؟ ارے یہ میں بھلا کیسے بھول سکتی ہوں۔ لیکن میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ کی عمر کتنی ہے۔ دیکھئے اس سوال سے کوئی اور مطلب نہ نکلے گا میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ کی تحریر میں یہ پختگی عمر کی بدولت ہے یا دماغ کی۔ واقعات کو الفاظ کا اتنا خوب صورت پیرہن دیتی ہیں کہ نظریں اس وقت تک نہیں ہٹتیں جب تک کہانی ختم نہ ہوجائے اور اس وقت تو جب سورن سنگھ کہانی سنا رہا تھا تو ایسا لگا جیسے میں بھی وہیں بیٹھی سب کچھ سن اور دیکھ رہی ہوں اور وہی محسوس کر رہی ہوں جو کہانی کے کردار محسوس کر رہے ہیں۔ رائٹرز تو اور بھی کئی اچھے ہیں مگر آپ سے عمروں پوچھنے کو لگتا ہے۔

میرے سر میں بھی کسی سہاگ بوڑھے کا دماغ پختگی کا بوجھ میری کم سنی پر چھا گیا

وریٰ! بہت پیار، تمہاری تحریریں مل گئی ہیں۔ اچھی ہوں گی تو ضرور چھپیں گی۔ تحریر میں خوب صورتی تو رفتہ رفتہ پیدا ہوتی ہے۔ ہمارا جواب یقیناً ایسا نہیں ہوگا جیسے اس ایڈیٹر کا تھا کیونکہ تمہاری کہانی بھی ویسی نہیں ہوگی جیسی اس رائٹر کی تھی۔ ٹھیک! اور پی وی احسان کیسا؟ پیار کرنے والوں کو پیار کرنا کوئی احسان تو نہیں' دو شیزہ کا اور افسانوں کی پسندیدگی کا شکریہ' بھئی کمند کو اسی حد تک پسند کرنے کا بہت شکریہ' بقول سلیم فاروقی کے ہم ڈیڑھ اے بخاری کے ہم عصر ہیں مگر اس شمارے میں تم بھی دیکھ لوگی اپنی عمر کا اندازہ تم خود ہی لگالینا۔ تبصرہ بڑا مفصل تھا جس کا شکریہ' خط لکھتی رہنا۔۔۔۔ اور سب اچھا تو ہے نا؟

یہ خط ہمیں اچھی شاہدہ ناز قاضی نے لکھا ہے۔ "پیاری سیما غزل! ش۔ش۔ش۔ شکریہ جناب بہت بہت۔" یہ تم ہلکا رہی ہو یا اتنا لمبا شکریہ ہے کہ ہاتھ میں ہی نہیں سما رہا۔۔۔ اچھا اچھا ہم سمجھ گئے؟ یہ خط پہ دیا کے انعام کا شکریہ ہے' چلو قبول کیا تم بھی کیا یاد کرو گی کہ کس سخی سے پالا پڑا تھا۔۔۔ اچھا کچھ کیا کہتی ہو؟ اور اس کا بھی جس نے آتے ہی نئی بندگی کی لہر پورے ادارے میں دوڑا دی' ایسے ہی تو نہیں کہا گیا نا!

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

جناب آپ کو اب تک میری آزاد اور قید نظمیں مل گئی ہوں گی۔ پڑھی بھی جاچکی ہوں گی۔ مولا جانے کیا ہوا آگے؟ اللہ جانے کیا ہوا آگے سام صاحب کا خط پر سوں ملا' بے حد خوشی ہوئی' یاد آوری کا شکریہ' مزید افسانے اور کہانیاں بھیجنے کے لیے کہا کیا ہے۔ انشاء اللہ پوری کوشش کریں گے۔ تیز دوڑے بھی تو خطرہ اور رکے رہے تو بھی خطرہ۔ سلیم فاروقی' چند ماموں' رخسانہ بنو اور نئی کونپل' نئی سوچ' نئے اجالے یعنی تابندہ کو بھی پیار دینا۔ لکھتا ہے مرزا صاحب کی تینوں بیٹیاں ذہانت میں ماں باپ کا پرتو ہیں۔ کمند ٹھیک چل رہا ہے۔ کلثوم واحد کا افسانہ شہر بہت اچھا لگا۔ جیسے کوئی آپ بیتی ہو۔ گل کی کہانی بہت پیاری لگی' دردانہ نوشین کا افسانہ موضوع کے اعتبار سے پرانا تھا مگر انداز تحریر نے اس میں جان ڈال دی تھی سلمٰی جلدی کچھ بھجوائیے گی۔

شاہدہ! بھئی کون سی نظمیں' کیسی غزلیں؟ کیا خواب دیکھا ہے تم نے؟ ہم تک پہنچیں گی تو پڑھی جائیں گی یار' مزید افسانے اور کہانیوں کے لیے ہاتھ لنے کا خوب صورت انداز تمہیں بھی آگیا ہے۔ یعنی کوشش کریں گے۔ اوہ! بات سنو اب انتظار کی عادت نہیں رہی۔ بیکار باتیں قطعی نہ کرو' زیادہ جملہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں بس جلدی سے لکھو اور پوسٹ کردو ورنہ اگلے شمارے میں سادے صفحات چھوڑ کر ان پر لکھ دیں گے کہ یہ صفحات شاہدہ ناز قاضی کے ظلم کا نشانہ بنے اور انتظار کی اذیت سے دوچار ہیں۔۔۔۔ پھر سوچ لو کہ قارئین کیسی خبریں گے۔ تمہارے مختصر تبصرے کا مفصل شکریہ۔ سب کو پیار پہنچایا ہے البتہ ہمارا دامن خالی رہا۔۔۔۔ مختصر ہیں۔

دردانہ نوشین لکھتی ہیں۔ "ڈیئر سیما غزل! آپ کا خط ملا پھر مرا صاحب کا خط موصول ہوا۔ قدر افزائی کے میری' بہت خوشی ہوئی۔"

اچھی دردانہ! خدا کرے خوش رہو۔ وقت ملتے ہی براہ راست خط لکھ دیتے ہیں اگر کبھی نہ لکھ پائیں تو درگزر کیا کرو۔ معروفیت بھی تو بہت ہوتی ہے نا! پھر لکھتی ہیں۔ "دو شیزہ خرید کر پڑھ چکی تھی۔ پتا نہیں اعزازی پرچہ کیوں نہیں ملا۔ جو کچھ پہلے انعام کا اجالا کا شکریہ' اکتوبر کے شمارے کا معیار بہت بہتر تھا۔ نئی کہانیوں کو مزید جاندار ہونا چاہیے۔ تابندہ کی آمد سے دو شیزہ کے قیام کے استحکام کا اظہار ملا۔"

انعامات بڑھانے کا اعلان حوصلہ افزا ہے۔ ناولٹ ابھی مکمل نہیں کر پائی چلئے یونہی کردوں گی کہ ناولٹ آپ کا اور افسانہ کسی اور کا۔

بھئی یہ نہیں چلے گا! ہمارا بس بھیں ہی بھیج دو باقی تم جانو اور تمہارا کام مگر ہمیں جلدی سے چاہیے۔ اب تک تو اعزازی شمارہ اور چیک مل گیا ہوگا! ضرور لکھو۔۔۔۔ دو شیزہ تمہیں بہترین شکریہ۔ کوئی اور خدمت!

ارے قارئین! بچولوں کی ضرورت پڑتی۔۔۔۔ اب تو فرش راہ کرنے کو بس پلکیں ہی بچی ہیں سو حاضر ہیں۔ جی جناب! ایک اور پیاری سی بستی جلوہ افروز ہے۔

بھئی بچولوں سے گفت سیما تشریف لائی ہیں۔ "سیما غزل صاحبہ!" بھئی یہ صاحبہ بالکل اچھا نہیں لگا۔ اتنی دور سے آئی ہو اور ایسا تکلف! بس سیما کافی تھا۔ "خط ملا' شکریہ' بہت شرمندہ ہوں کہ حسب وعدہ کوئی کہانی نہ بھیج سکی۔ دو شیزہ مل رہا ہے۔ ایوارڈ نمبر بھی اچھا لگا اور دیبا بھی۔ ہم خیریت سے ہیں تم سنا ہے۔" کیوں بھئی کیوں؟ جناب نے واقعی تنہائی مچائی۔ بچولوں میں تو خیریت ہی رہی۔ کوشش کروں گی کہ جلد ہی کچھ لکھ بھیجوں۔ اجازت' آپ کا ناول اچھا لگا۔"

شکریہ بہت اس عزت افزائی کا۔۔۔ویسے سیما! ہم دونوں کا اشارا ایک ہی ہوگا نا! تو اس طرح تو ہم تمہیں بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ کوشش کب تک جاری رہے گی اور نتیجہ کب نکلے گا؟ پلیز جلدی سے نا! ناول کی پسندیدگی کا شکریہ۔ کچھ اور تبصرہ کرتیں' ذرا تفصیلی قسم کا تو بڑا مزہ آتا۔۔۔ ویسے کھڑے کھڑے ہی آئیں مگر آئیں تو۔۔۔ نوازش۔

اب جناب یہ خط سعودی عرب سے محترم اصغر نظامی نے لکھا ہے۔ لکھتے ہیں "سیما غزل صاحبہ! مزاج بخیر! تمہارا شمارہ قارئین دو شیزہ نے نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھا' چشم بددور خوب صورت تحریروں کا ایسا مجموعہ پاک و ہند میں کہیں نظر نہیں آتا۔ جملہ تحریر کنندگان کے لیے دعا۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

اس شمارے میں سبھی بھائیوں کے ذوق مزید کے لیے آسیہ سلیم قریشی کی تحریر "مصلوب وفا" خاصے کی چیز رہی۔ اس خوب صورت اور لازوال تحریر پر آسیہ قریشی کو ڈھیروں ڈھیر مبارک باد۔ انھوں نے اپنے موضوع کے ساتھ نہ صرف انصاف کیا ہے بلکہ اسے خوب نبھایا ہے۔ کاش اس کہانی کو ٹلایا جائے اور کرسی کے موقع پر دکھایا جائے۔

امید کہ آسیہ سلیم قریشی کی تحریر مزید نکھری جائے گی اور ادبی دنیا میں ان کا حقیقی مقام دو شیزہ کے طفیل مل رہے گا۔"

آپ کی مبارک باد ان سطور کے ذریعے پہنچ جائے گی۔ اکتوبر کے شمارے میں تبصرے کا انتظار تھا مگر خیر دیے اچھے تو ہیں نا آپ؟

قارئین؟ خط تو ابھی بہت ہیں مگر وقت اور صفحات کی کمی ہمیں آپ کے قرب کی لذت سے مزید فیض یاب نہیں ہونے دیتی' ہر بار اس محفل سے اٹھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے آدھا وجود یہیں انکا رہ گیا۔ ایک سایہ سا ہم سے جدا ہو کر محفل میں بکھرا رہتا ہے پر کیا کریں! ایسا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ رونق محبتوں کو یوں چھوڑ کر چلے جانا بھلا کس کے بس کی بات ہے؟ آیندہ ملاقات کا خوب صورت اور کیف آگیں خیال ہی اتنے روز گزارنے میں مدد دیتا ہے کہ یہ محفل پھر سجے گی' پھر ہم سب روبرو ہوں گے' ہنستے مسکراتے اور کبھی کبھی اچانک رو پڑتے دکھ سکھ کہتے اور ایک دوسرے کو چھیڑتے' ناراض ہوتے' پھر سب جمع ہوں گے۔

پھر وہی رنگ جمیں گے وہی رونق ہوگی
اب اجازت دیجئے
صرف آپ سب کی
سیما غزل

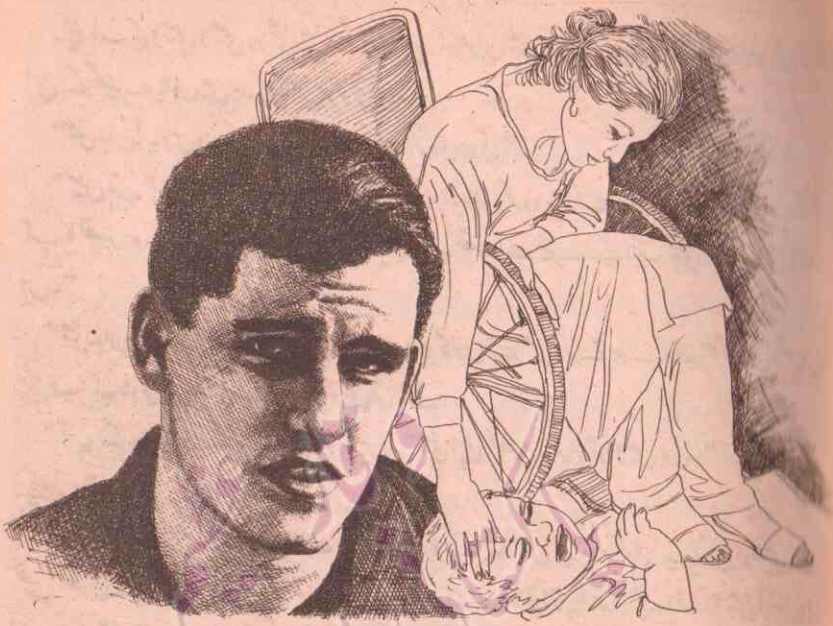

ہر اُس شخص کی داستان جو دوسری
شادی کے خواب دیکھتا ہے

وہ ایک بزدل عاشق تھا، تحفظ دینے والا شوہر نہیں
خود فریبی کے پنگوڑے میں بیٹھے، جنت کی سیر کرنے والے ایک مرد کی کہانی
ممتا آشنا دلوں کے لیے ایک تحفہ، ایک دھنک رنگ تحریر

شمیم فضلِ خالق

نیلے بلب کی دھیمی دھیمی روشنی میں سگریٹ کا پورا دھواں عینی کے چہرے پر چھوڑنے کے بعد میں نے اس کے گھنیرے بالوں میں منہ چھپا کر سرگوشی کی۔

"عینی جان! یہ دس دن کی جدائی تم پر بڑی سخت گزری ہوگی؟"

"نہیں تو..." میرے ہاتھوں پر نازک ہاتھوں کا بوجھ ڈال کر وہ پیار سے بولی۔ "آپ نہیں ہوتے تو آپ کا تصور ہوتا ہے... آپ کی یادیں ہوتی ہیں... یہ تصورات میرے لیے ایک قیمتی سرمائے کی مانند ہیں۔"

"عینی جان! میں نے اپنے ہونٹ اس کے نرم نرم گالوں سے مس کرتے ہوئے کہا۔ "اگر میں تمہیں عنقریب ایک ماہ کی لمبی جدائی سے ہمکنار کروں تو؟"...

"آپ کے دیے ہوئے دکھ بھی مجھے عزیز ہیں۔" عینی اپنی مخصوص نرم آواز میں بولی۔ "آپ آزما کر تو دیکھیے۔"

میں نے بے قرار ہو کر اسے سینے سے لگالیا۔ اس کا یہ دھیما سُر، یہ نرم آواز، یہ پیاری ادائیں ہی تھیں جنھوں نے مجھے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اگر میں اتنا دیوانہ نہ بنتا تو اتنا بڑا قدم کیسے اٹھاتا؟ یعنی اتنا بڑا نواب ہو کر عینی جیسی معمولی لڑکی سے شادی! یہ ایک بڑا رسک تھا... یہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ شادی کو چار ماہ ہو گئے تھے لیکن نواب شجاع الدولہ یعنی میرے والد صاحب کو ابھی تک میری شادی کا علم نہ تھا ورنہ قیاس ہی نہیں بلکہ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ مجھے جایداد سے عاق کر دیتے۔ بھلا وہ یہ کیسے برداشت کرتے کہ ان کا اکلوتا بیٹا ان کی مرضی کے بغیر کوئی قدم اٹھائے... میں ذرا حقیقت پسند واقع ہوا ہوں۔ شادی کو میں خالصتاً اپنی مرضی کا معاملہ سمجھتا ہوں لیکن جایداد سے محرومی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میں غریبی کو ایک لعنت سمجھتا ہوں۔

عینی سے میری ملاقات اتفاقیہ تھی... عینی اس فرم میں ملازمت کرنے آئی تھی جس کا میں باس تھا... ایسے کئی ادارے میری نگرانی میں چل رہے تھے اگرچہ میں پہلی نظر کی محبت کا قائل نہیں لیکن عینی کو دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے مجھے اگر یہ نہ ملی تو زندگی کا چارم بالکل ختم ہو کر رہ جائے گا۔ عینی سے میں نے کئی سوالات پوچھے۔ اس کے جواب دینے کا انداز دھیما، مہذب لیکن بولڈ تھا۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ کیا ملازمت کسی ضرورت کے تحت کر رہی ہو یا محض شوقیہ تو وہ بولی۔

"میں اس سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی۔"

پہلی تو اس سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھ رہی تھی لیکن میں اپنے اس سوال کا جواب ضرور چاہتا تھا لہٰذا اس کے باہر جانے کے بعد میں نے اس کا تعاقب کیا اور ایک گندے سے محلے میں اس کا چھوٹا سا مکان دیکھ کر چلا آیا۔ اس کے بعد جب عینی دوبارہ آئی تو میں نے اسے ٹکا سا جواب دے کر رخصت کر دیا اور خود شام کو ایک بے تکلف دوست کے ہمراہ اس کا رشتہ مانگنے چلا گیا۔

میری شروع سے عادت ہے کہ میں کوئی فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگاتا اور ایک بار فیصلہ کر لوں تو اس پر عمل کرنے میں بھی دیر نہیں کرتا۔ عینی اس چھوٹے سے گھر میں اپنی والدہ کے ساتھ رہتی تھی۔ باپ بچپن میں فوت ہو چکا تھا۔ ایک بڑا بھائی تھا جو چند ماہ پیشتر بس کے ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو چکا تھا۔ اب تک وہ زندہ تھا یعنی اپنی تعلیم میں مگن تھی لیکن اس کی وفات کے بعد مالی پریشانیوں نے گھیر لیا تو عینی نے مجبوراً تعلیم کو خیرباد کہا اور نوکری کی تلاش میں نکلی۔ مجھے اپنے گھر دیکھ کر عینی کو تعجب ضرور ہوا ہوگا لیکن یہ لڑکی بالکل کنویں جیسی تھی۔ اس کے جذبات اور احساسات کا کسی کو پتا نہیں چلتا تھا۔ غالباً اس کا خیال یہ ہوگا کہ شاید نوکری کے بارے میں ٹکا سا جواب دینے سے میں اپنے ضمیر پر بوجھ محسوس کر رہا ہوں گا اور یہی بوجھ اتارنے ان کے گھر آ پہنچا ہوں لیکن جب میں نے اس کی بوڑھی ماں کے سامنے اپنا مقصد بیان کیا تو وہ حیرت سے گنگ رہ گئی۔ نہایت اعلا برانڈ کی سگریٹ کا کش لگا کر میں نے کہا۔

"ماں جی! آپ بھی ہمارے ساتھ رہیں گی کوئی فکر نہ کریں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے بیٹے لیکن اگر تمہارے ساتھ تمہارے والد صاحب یا والدہ آجائیں تو اطمینان سے ساری باتیں ہو جاتیں۔"

"اوہ..." میں ہنس کر بولا۔ "ماں جی آپ یہ ساری باتیں اطمینان سے میرے ساتھ بھی کر سکتی ہیں۔ عینی کو میں اپنی پسند سے، اپنی خوشی سے بیوی بنا رہا ہوں۔ آپ کا ہر مطالبہ مجھے منظور ہوگا لیکن والدہ صاحبہ تو فوت ہو چکی ہیں اور فی الحال والد صاحب کو میں اپنی اس خوشی میں شریک نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔"

"اچھا بیٹے۔ تم ایک ہفتے بعد آنا۔ میں عینی سے پوچھ کر کوئی جواب دوں گی۔" بڑی بی نے نرمی سے کہا۔ اس ساری گفتگو میں عینی شامل نہ تھی۔ وہ باہر جائے کا انتظام کرنے میں مصروف تھی۔

=====○=====

ٹھیک ایک ہفتے کے بعد اپنی توقع کے مطابق مجھے جواب اثبات میں مل گیا اور ٹھیک دو ماہ بعد بہت خاموشی اور سادگی سے عینی میری بیوی بن گئی۔ عینی کے بارے میں میں نے جو اندازہ لگایا تھا وہ حرف بہ

حرف صحیح نکلا۔ وہ بہت سمجھدار، بے حد سلجھی ہوئی اور نہایت عقلمند لڑکی تھی۔ حسین تو وہ تھی ہی لیکن میری نظر میں حسن کی بھی اہمیت نہیں رہی، میں انسان کے اندر چھپی صلاحیتوں کا مداح رہا ہوں اور عینی کے اندر بے پناہ جوہر تھے۔ صرف ایک بار عینی نے دبے الفاظ میں خواہش ظاہر کی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ سوسائٹی میں میرے نام سے پہچانی جائے۔ لوگ جان سکیں کہ وہ میری بیوی ہے لیکن میں نے بڑے پیار سے اسے سمجھایا کہ فی الحال میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اس لیے وہ مجھے مجبور نہ کرے اور بس۔ اس کے بعد اس نے مجھے کبھی مجبور نہیں کیا۔ وہ کبھی اس ذکر کو زبان پر بھی نہ لائی۔

میں نے شادی کو بہت خفیہ رکھا تھا۔ عینی کے لیے میں نے ایک الگ تھلگ جگہ پر چھوٹی سی کوٹھی تعمیر کی تھی جس میں ضرورت کی ہر چیز تھی۔ نوکر اس کی خدمت کے لیے موجود تھے۔ اس کوٹھی میں وہ اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ میں کبھی دو دن بعد کبھی چار دن، کبھی آٹھ دن بعد عینی کے پاس آجاتا تھا، جب سے ابا حضور کی ٹانگوں پر فالج کا حملہ ہوا تھا میں بلا شرکت غیرے تمام سیاہ، سفید کا مالک بن گیا تھا لیکن میں ابا حضور کے حکم سے سرتابی کی جرات کبھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میں لاکھ سیاہ سفید کا مالک ہوتا مگر اصلی مالک میرے ابا حضور ہی تھے۔ جاید ادان کے نام تھی۔ ہر چیز پر ان کا قبضہ تھا اور رہا شادی کا معاملہ، تو وہ اس معاملے میں حد سے زیادہ جذباتی تھے اور خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتے تھے کہ میری شادی کسی غریب لڑکی سے ہو سکتی ہے۔ اب تک تو خیر میری مرضی کے مطابق تمام حالات جا رہے تھے لیکن اب مسئلہ پیش آگیا تھا، تبھی تو لمبے چوڑے ڈبل بیڈ پر عینی کے پاس لیٹے لیٹے میں نے اپنے جلتے ہوئے ہونٹ اس کے نرم نرم گالوں سے مس کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر میں اسے عنقریب ایک ماہ کی لمبی جدائی سے ہمکنار کروں تو؟ اور عینی کے جواب پر میں نے اس لپٹا کر پیار کیا تو اس کا پیارا پیارا چہرہ نیلے بلب کی روشنی میں دمکنے لگا۔ اپنا چہرہ میرے سینے میں چھپا کر اس نے سرگوشی کی۔

"لیکن جیدی..... اتنی لمبی جدائی کا کوئی جواز بھی تو ہوگا نا؟"

وہ لمحہ آپہنچا تھا جس سے میں ڈر رہا تھا۔ میرا ہاتھ اس کے گھنیرے بالوں میں الجھ کر رہ گیا..... دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ میری خاموشی پر کچھ الجھ کر اس نے چہرہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"آپ چپ کیوں ہو گئے؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

"اوہ نہیں۔" میں گڑبڑا گیا۔ "بات دراصل یہ ہے عینی جان۔" میں رک رک کر بولا۔ "میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں اپنی بات کی ابتدا کیسے کروں۔" میں پریشانی سے بولا۔

"بات کیا ہے جیدی... آپ کھل کر کیوں نہیں کہتے؟" عینی میرے ہاتھوں پر اپنے نازک ہاتھوں کی

گرفت مضبوط کرتے ہوئے حیرانی سے بولی۔

"عینی جان! کیا تمہارے اعصاب اتنی بڑی بات سہہ لیں گے؟"

"میرے اعصاب بہت مضبوط ہیں جیدی! آپ بے فکر ہو کر جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہہ دیں میں سہہ لوں گی۔" عینی سنجیدگی سے بولی۔

"تو سنو عینی۔"..... میں دل کڑا کر کے بولا۔ "ابا حضور میری شادی کرنا چاہتے ہیں..... انھوں نے تاریخ تک مقرر کر دی ہے۔ تمہیں علم ہے کہ ابا حضور کے سامنے میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

❁

عینی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں کانپ کر رہ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی شاید وہ میرا چہرہ پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ کیا میں وہی جاوید بول رہا ہوں۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سردی میں بھی پسینے کے قطرے میرے ماتھے پر نمودار ہو گئے تھے۔ میں عینی سے محبت کرتا تھا، شدید محبت اور اس سے جدائی کسی حال میں قبول نہیں کر سکتا تھا۔ جان لیوا خاموشی دونوں طرف چھائی تھی۔ عینی کا سرد اور بے جان ہاتھ میرے ہاتھوں میں تھا۔ ایک ایک لمحہ مجھ پر صدیاں بن کر گزر رہا تھا۔ خدا جانے عینی کا کیا فیصلہ ہوگا؟ اس کا اگلا قدم کیا ہوگا؟ میرا دل انجانے وسوسوں اور اندیشوں سے سما جا رہا تھا۔

"عینی۔ عینی خدا کے لیے کچھ تو کہو۔ کچھ تو بولو۔" میں نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"جیدی! کچھ کہنے کو اب رہ کیا گیا ہے۔" وہ مردہ آواز میں بولی۔

"نہیں عینی۔ خدا کے لیے مجھے کوسو، لعنتیں دو مجھے، میں تمہارا مجرم ہوں۔"

"مجرم تو میں ہوں۔" وہ بڑے رسان سے بولی۔ "میں آپ کی الجھنوں کا باعث بنی ہوں۔ جائیے آرام سے شادی رچائیے۔"

"عینی!... عینی چاند! خدا کے لیے۔" میں نے اس کا وجود ہاتھوں میں تھام کر، سینے سے لگا کر وہانسی آواز میں کہا۔ "تم میری مجبوری کو سمجھ رہی ہو نا؟ بولو عینی... جواب دو۔" میں نے اسے جھنجوڑا۔

"میں آپ کی مجبوری جانتی ہوں۔" وہ پرسکون آواز میں بولی۔ "مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں، پلیز کوئی اور بات کیجیے۔" وہ آہستہ اور نرم آواز میں بولی۔

"عینی چاند... عینی جان... عینی میری زندگی..." میں بے اختیار ہو گیا۔ غضب کا حوصلہ تھا اس نازک لڑکی میں۔ میں نے اسے سینے سے لگایا، اپنی مجبوریوں کی ایک لمبی فہرست سنائی لیکن وہاں وہی جامد خاموشی تھی، سپردگی کا وہی پرانا انداز تھا۔ وہی ادائیں۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا لیکن میرے دل میں پشیمانی کی آگ

سگ رہی تھی، ضمیر کی چبھن مجھے ایک پل چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ صبح جب میں رخصت ہو رہا تھا تو عینی نے ہمیشہ کی طرح مسکراتے چہرے سے مجھے الوداع کہا۔ اس کے انداز سے بالکل ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ کوئی انہونی بات ہوئی ہے۔ میں بجھے دل سے چلا آیا۔

میری شادی ابا حضور کی شدید خواہش تھی اس کے لیے انہوں نے وسیع پیمانے پر انتظامات کیے تھے۔ بڑی تعداد میں شادی کے کارڈز چھپوائے گئے تھے۔ ہر خاص و عام کو کھانا دیا گیا اور جی بھر کر خوشیاں منائی گئیں۔ مجھے اس بات سے کوئی مطلب نہ تھا کہ میری بیوی کون ہے! کس خاندان کی ہے۔ ظاہر ہے وہ ابا حضور کی پسند تھی کسی اونچے گھر کی چشم و چراغ ہوگی۔ وہ رات جو میری سہاگ رات تھی مجھ پر بہت بھاری تھی عینی کا معصوم چہرہ بار بار میرے تصور میں آ رہا تھا۔ کیا قصور تھا اس کا؟ کس گناہ کی سزا دی میں نے اسے؟ میں عینی کا تصور دل میں لیے نئی بیوی کے پاس گیا۔

شبینہ میری نئی بیوی تھی۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اتنا بے پناہ حسن، مکمل حسن میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لانبی لانبی پلکوں تلے جھیل جیسی گہری آنکھیں، سفید رنگت میں گلابی آمیزش، بھیگے بھیگے نرم و نازک ہونٹ اور سانچے میں ڈھلا جسم، سب سے زیادہ اس کی ذہانت اور دھیمی مسکراہٹ جس میں وہ بالکل عینی کی ہم پلہ تھی۔ ساری رات باتوں میں کٹ گئی۔ میری آدھی کوفت ختم ہوگئی۔ صبح ہونے کو تھی جب میں اسے بانہوں میں سمیٹ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

صبح میں ہشاش بشاش تھا۔ میری آدھی پریشانی ختم ہوگئی تھی۔ میں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ میں نے خود کو سمجھا لیا تھا کہ اسلام نے چار شادیوں کی اجازت دے رکھی ہے اگر مجبوری کے تحت میں نے دوسری شادی بھی کر لی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں عینی کی حق تلفی کروں گا یا دوسری بیوی کا حق ماروں گا جبکہ بفضل خدا میں دو چھوڑ چار بیویوں کی اعانت بھی کر سکتا تھا۔ مالی طور پر میرے قدم مضبوط بلکہ بہت مضبوط تھے۔ یہ سب کچھ سوچ کر میں نے اپنے دل کو تسلی دی دیسے بھی یہ دن بہت مصروف ترین تھے۔ دعوتوں کا سلسلہ ختم ہونے میں نہ آ رہا تھا۔ سوچ بچار کا موقع کم ہی ملتا تھا۔ جب دعوتوں سے ذرا فراغت نصیب ہوئی تو میں شبینہ کو ہنی مون کے لیے یورپ لے گیا۔ مجھے افسوس بھی ہوا کہ عینی کے ساتھ میں کسی تفریح میں شریک نہیں ہو تا تھا۔ اس کے ساتھ ہنی مون میں نے اسی کوٹھی میں منایا تھا جس میں وہ رہ رہی تھی لیکن وہ بہرحال خفیہ شادی تھی جسے میں ہر ممکن طریقے سے خفیہ رکھنا چاہتا تھا جبکہ شبینہ سے میری شادی ڈنکے کی چوٹ پر ہوئی تھی۔ ہر کوئی اسے میری بیوی کی حیثیت سے جانتا تھا۔ یورپ سے واپسی پر ایک دن ضائع کیے بغیر میں عینی کے پاس گیا۔ میں اس کے لیے پاگل ہو رہا

تھا۔ اتنے ہی وہ میرے سامنے آئی میں بے قرار ہو گیا۔ بے تابی سے اسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ بار بار اسے اپنے سے لگایا۔

"عینی... عینی جان... کیسی ہو تم؟... کیسے گزرے یہ دن تم پر؟" میں نے اس کے بالوں میں منہ چھپا کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"میں تو ٹھیک ہوں لیکن آپ کا کیا حال ہے؟" عینی نے پیار سے میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں عینی جان لیکن خدا کے لیے مجھ سے ایک پل کے لیے بھی دور نہ ہونا۔ میں تمہارے لیے تڑپ گیا ہوں۔" میں نے اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔ وہ اصرار کرتی رہی کہ اپنے ہاتھ سے میری پسندیدہ ڈشز بنا کر مجھے کھلائے گی لیکن میں نے ایک منٹ کے لیے بھی اسے اپنے پاس سے اٹھنے نہ دیا۔ دن تو سارا خوش گپیوں میں گزر گیا۔ نہ اس نے میری شادی کے متعلق بات کی نہ میں نے یہ ذکر چھیڑا لیکن رات کو سوتے وقت وہ آہستگی سے بولی۔

"یہ بی بی! کیسی ہے وہ؟"

میرا دل تھوڑا سا دھڑکا پھر میں نے اس کا ہاتھ تھام کر رازداری سے پوچھا۔

"اس بات کا جواب سچ میں دوں یا جھوٹ میں عینی جان؟"

"سچ میں دیجیے کہ مجھے سچ کی کڑواہٹ جھوٹ کی مٹھاس سے زیادہ عزیز ہے۔" وہ بڑی آواز میں بولی۔

"تو سنو چاند! وہ بہت حسین لڑکی ہے۔ تمہاری طرح ذہین ہے، عادتیں اس کی بہت میٹھی ہیں، دیکھنے میں تو صبح کے نور کی مانند ہے لیکن نام اس کا شبینہ ہے۔" میں نے چند جملوں میں اس کی صفات سچے دل سے بیان کر دیں۔

"شکر ہے خدا کا، آپ کی بیوی کو ایسی ہی صفات کا حامل ہونا چاہیے تھا۔" وہ صاف دلی سے بولی اور اس کے بعد ہمارے درمیان ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ چار دن میں نے عینی کے ساتھ ایسے گزارے کہ ایک پل کے لیے بھی اس سے دور نہ ہوا لیکن چار دن بعد بادل ناخواستہ مجھے شبینہ کے پاس آنا پڑا اور اس طرح زندگی کا معمول بن گیا۔ چھے دن عینی کے پاس تو چار دن شبینہ کے پاس۔ میں سمجھتا تھا کہ زندگی اس ہر طرف رنگ ہی رنگ ہیں۔ نور ہی نور ہے عینی تو خیر تھی ہی ہر لحاظ سے ایک مکمل عورت لیکن شبینہ بھی اس سے کم نہ تھی۔ بعض اوقات میں اپنی قسمت پر ناز کرنے لگتا۔ قدرت مجھ پر مہربان تھی۔ میرے کاروبار میں بھی روز بروز ترقی ہونے لگی۔

ایک دن صبح صبح تیار ہونے کے بعد جب میں گھر سے روانہ ہونے لگا تو شبینہ کو پیار کرنے کے بعد میں ابا حضور کے کمرے کی طرف گیا۔ مجھے دیر ہو رہی تھی اور میں خاصی جلدی میں تھا لیکن ابا حضور نے پر رعب آواز میں مجھ سے کہا۔

"آج جلدی آجانا جاوید بیٹے اور شبینہ کو کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جانا۔"

"کیوں خیریت تو ہے ابا حضور... میں تو ابھی شبینہ کے پاس سے آرہا ہوں وہ بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے تعجب سے کہا۔

"تمہاری شادی کو چھے ماہ ہوگئے ہیں جاوید بیٹے اور ابھی تک مجھے دادا ہونے کی خوشخبری نہیں مل سکی۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"اوہ" میں کچھ گڑبڑا سا گیا۔ "جی سمجھ گیا۔ میں جلدی آجاؤں گا ابا حضور۔" اور عجلت میں سلام کر کے باہر آگیا۔ چونکہ یہ ابا حضور کا حکم تھا لہٰذا لاکھ مصروفیات کے باوجود میں اسے ٹال نہ سکا اور شام میں شبینہ کو ایک اچھی لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے شبینہ کا مکمل معاینہ کیا۔ اس کے چند ایک ٹیسٹ تجویز کیے اور کہا کہ اس کے بعد ہی میں کچھ بتا سکوں گی۔ اس کے بعد شبینہ کے مختلف ٹیسٹ لیے گئے۔ آخر ٹیسٹ کے بعد جب میں نے زردی شبینہ کو سہارا دے کر کار میں بٹھایا اور خود ٹیسٹ کا رزلٹ لینے چلا گیا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اتنی بری خبر سنوں گا۔ لیڈی ڈاکٹر نے ٹیسٹ کا رزلٹ دیتے ہوئے کہا۔

"جاوید صاحب! آپ ڈاکٹر تو ہیں نہیں کہ ڈاکٹر کی زبان سمجھ سکیں۔ آسان الفاظ میں، میں آپ کو بتائے دیتی ہوں کہ آپ کی بیگم اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ بہرحال آپ دوسرے ڈاکٹروں سے بھی معاینہ کروالیں۔" میں نے ڈوبتے دل اور سنسناتے ذہن سے رزلٹ والا کاغذ لیا اور کار میں آبیٹھا۔ شبینہ سے چھپانا بے کار تھا۔ میں نے اسے بتادیا۔ صدمے سے اس کی حالت غیر ہوگئی... وہ بے یقینی سے میرا چہرہ دیکھنے لگی میں نے اسے تسلی دی کہ میں امریکہ میں اس کا علاج کرواؤں گا۔ روپے پیسے کی میرے پاس کمی نہیں تھی لیکن فی الحال میں اس خبر کو ابا حضور سے چھپانا چاہتا تھا۔

اس کے بعد میں اسے چوٹی کے ڈاکٹروں کے پاس لے گیا لیکن ہر جگہ یہی جواب تھا کہ شبینہ ماں نہیں بن سکتی۔ تمام ڈاکٹروں نے یہی مشورہ دیا کہ امریکہ جانا بے کار ہے کیونکہ جیسے کینسر کا علاج ناممکن ہے ویسے ہی شبینہ کا علاج ناممکن ہے۔ شبینہ دن رات روتے گزارتی۔ وہ رو رو کر پاگل ہوئی جارہی تھی... اس کا کھانا پینا چھوٹ گیا تھا... سوچ سوچ کر میری کنپٹیاں سلگنے لگتیں۔ کوئی تسلی، کوئی دلاسہ شبینہ کا

غم کم نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ہر طرح کوشش کی کہ شبینہ کا دکھ کم کر سکوں لیکن ناکام رہا۔ جب غم واندوہ کے بادل کچھ زیادہ گہرے ہونے لگے تو گھبرا کر، پریشان ہو کر میں یعنی کے پاس چلا آیا۔

آج میں نے یعنی کو کچھ زیادہ ہی خوش پایا۔ یعنی کو خوش دیکھ کر میں کچھ جل سا گیا کیونکہ میرا دل پژمردہ اور ذہن پریشان تھا۔ شبینہ کے آنسو میرے دل پر بارش کے قطروں کی مانند برس رہے تھے لیکن بہرحال میں نے یعنی کو کچھ محسوس نہیں ہونے دیا۔ یعنی جب میرے لیے چائے بنا کر لائی تو پیالی میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے سر جھکا کر بولی۔

"میں آپ کو ایک میٹھی سی بات سنانا چاہ رہی تھی۔ سنیں گے آپ؟"

"بالکل سنوں گا۔" میں زبردستی مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے بولا۔ "تم سناؤ میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"جیدی... آپ... آپ۔"

"یا بات ہے چاند۔ تم جھجک کیوں رہی ہو؟" میں متعجب سا ہو کر بولا۔

"بات ہی کچھ ایسی ہے۔" اس کے چہرے پر قوس قزح کے ساتوں رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ "میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ عنقریب آپ باپ بننے والے ہیں۔" وہ رک رک کر دوپٹے کے آنچل سے کھیلتے ہوئے بولی۔

"کیا!" پیالی میرے ہاتھوں میں کانپ کر رہ گئی۔ میں پھٹی پھٹی نظروں سے اس کے صبیح چہرے کو دیکھنے لگا۔ اے خدایا کیا یہ ستم ظریفی نہیں کہ بیک وقت مجھے غم اور خوشی دونوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ میں کیا کروں میرے رب! یعنی کی خوشی پر قہقہے لگاؤں کہ شبینہ کے غم پر چیخ چیخ کر رو دوں؟ میں کس جذبے کا اظہار کروں؟ میں کیا کروں؟ خوشی اور غم دونوں میرے اپنے ہیں۔ میں نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر میں نے چائے کی پیالی تپائی پر رکھ دی۔ یعنی جس کا چہرہ کچھ دیر پہلے خوشی سے گلگوں ہو رہا تھا اب تشویش سے سفید پڑ رہا تھا۔ میرے قریب بیٹھ کر وہ نہایت تشویش سے بولی۔

"جیدی جان! کیا بات ہے؟ اس خبر سے آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟"

میں نے آنکھیں کھول کر تھکے تھکے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور اس کا ہاتھ تھام کر دھیرے سے جواب دیا۔

"تم کیا سمجھتی ہو یعنی جان کہ میں اس خبر سے خوش نہیں ہوں گا۔ نہیں چاند! میں بہت خوش ہوں لیکن دراصل میں شبینہ کی وجہ سے پریشان ہوں۔"

"کیا ہوا شبینہ کو؟ وہ خیریت سے تو ہے نا؟" وہ پریشانی سے بولی۔

"اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔" میں نے بہت آہستگی سے' دھیرے دھیرے اسے ساری بات سنائی۔ وہ دم بخود رہ گئی۔ اسے سکتہ سا ہو گیا' میری بات ختم ہونے کے بعد بھی وہ کافی دیر چپ بیٹھی رہی پھر یکایک چونک کر بولی۔

"چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے میں دوسرا کپ بنا کر لاتی ہوں۔" پھر سارا دن اس نے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ شام کو جب وہ میرے ساتھ صوفے میں دھنسی بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی تو آہستگی سے بولی۔

"جیدی! کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہوتا جس کا حل موجود نہ ہو۔"

"کیسا مسئلہ جان؟ کونسا حل؟" میں نے حیرانی سے پوچھا

"وہی شبینہ والا۔" وہ ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ میں پھنسا کر بولی۔ "کیا ابا حضور کو اس ٹریجڈی کا علم ہے۔"

"نہیں' میری ہمت نہیں پڑتی کہ انھیں حقیقت بتا دوں۔" میں نے بے بسی سے جواب دیا۔

"ان کو بتانے کی ضرورت بھی نہیں۔" وہ اطمینان سے بولی۔ "آپ ایسا کریں کہ شبینہ کو ابھی سے حاملہ ظاہر کر دیں۔"

"کیا.... کیا مطلب ہے تمہارا۔" میں بوکھلا کر بولا۔

"جب میرا بچہ پیدا ہونے کو چار ماہ رہ جائیں گے تو آپ شبینہ کو ادھر لے آئیں.... کسی بھی بہانے سے' اس طرح جب میرا بچہ ہو گا تو میں اسے شبینہ کو دے دوں گی۔" وہ سکون سے بولی لیکن میں شدت حیرت سے اچھل پڑا۔

"کیا کہہ رہی ہو عینی.... تم اپنے ہوش میں تو ہو نا؟"

"بالکل ہوش میں ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اپنا بچہ شبینہ کو دوں گی۔" وہ اٹل اور مضبوط لہجے میں بولی۔

"عینی چاند' یہ تم کیسی انہونی باتیں کر رہی ہو۔ اپنے حصے کی خوشی دوسروں کو نہ دو۔ ہر انسان کی اپنی قسمت ہوتی ہے اگر شبینہ کی قسمت میں محرومی اور نامرادی ہے تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اس کی محرومی تمہاری خوشی سے پوری کی جائے۔ یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔" میں نے افسردہ ہو کر کہا۔

"نصیب ہمت اور حوصلے سے بدلا کرتے ہیں۔ شبینہ کو خوشی میں دوں گی۔" وہ نڈر آواز میں بولی۔ اس کے چہرے پر سچائی کا نور بکھرا ہوا تھا۔ اس کی خوبصورت آنکھیں ہیروں کی مانند چمک رہی تھیں۔

ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا اگر خدا شبینہ کو خوشی عینی کی وساطت سے دینا ہی چاہتا ہے تو میں بیچ میں روڑے اٹکانے والا کون ہوتا ہوں۔ مجھے عینی پر شدت سے پیار آگیا۔ اس کے وجود کو میں نے بڑے احترام سے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا اور اسے شدت سے چومنے لگا۔

"عینی! تم احسانوں کے بوجھ تلے مار ڈالو گی۔ تم.... تم جیسا دنیا میں کوئی نہیں چاند۔ مجھ جیسا گناہگار تمہارے قابل نہ تھا۔ جانے خدا کو میری کون سی نیکی بھا گئی تھی جس کے بدلے میں اس نے مجھے تم سے نوازا۔ تم میرے لیے تحفہ ہو عینی۔ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا خوبصورت اور انمول تحفہ۔" میں بولتا رہا اور وہ چپ چاپ میرے سینے پر سر رکھے آنکھیں موند کر سکون سے لیٹی رہی۔ دفعتاً مجھے یاد آیا.... شبینہ کو تو علم ہی نہیں کہ میری پہلی شادی ہو چکی ہے۔ اس بات کے لیے تو اس حقیقت کو بھی بے نقاب کرنا ہو گا۔ کچھ جھجک کر میں نے عینی سے بات کی تو وہ جلدی سے بولی۔

"آپ حقیقت کو بے نقاب کر دیجیے.... شبینہ ذہنی طور پر اس قدر اپ سیٹ ہو چکی ہے کہ وہ اس خبر کو زیادہ محسوس نہیں کرے گی۔"

عینی کا کہنا درست ثابت ہوا جب میں نے مضمحل اور بکھری بکھری شبینہ کے سامنے ساری حقیقت بیان کر دی تو وہ خواب کی سی کیفیت سے میرا منہ دیکھنے لگی۔ وہ اسے سچ سمجھنے کو تیار نہ تھی۔

"آپ کی شادی کی بات سچ ہو سکتی ہے لیکن ایک عورت اتنی بڑی قربانی دے سکتی ہے اور وہ بھی دوسروں کے لیے میں اسے سچ سمجھنے کو تیار نہیں۔" وہ بے یقینی سے بولی۔

"تمہیں علم نہیں شبینہ کہ عینی کیسی عورت ہے' تم تصور بھی نہیں کر سکتیں کہ اس کا دل کتنا وسیع ہے' وہ کتنی اعلیٰ ظرف ہے۔ وہ سمندر کی طرح گہری اور دریا کی مانند پرسکون ہے۔ وہ عام عورتوں کی مانند نہیں۔ میری بات کا یقین کر دو شبینہ۔ عینی تمہارا دامن خوشیوں سے بھرنا چاہتی ہے۔" میں شبینہ کو یقین دلاتا رہا پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا لیکن جب اسے یقین آیا تو وہ مارے خوشی کے بے اختیار رو پڑی۔ اس کی پژمردگی اچانک غائب ہو گئی' مایوس چہرہ امیدوں کی خوشی سے دمکنے لگا۔ وہ دیوانوں کی مانند بار بار مجھ سے پوچھتی۔

"آپ کو پورا یقین ہے نا.... کہ عینی اپنا بچہ مجھے دے دے گی۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا میں اتنی خوش نصیب ہو سکتی ہوں؟ کیا میری ماں بننے کی خواہش پوری ہو سکتی ہے؟ بتائیں جاوید؟" وہ روہانسی آواز میں پوچھتی رہی۔

کچھ عرصے سے اس کا گلاب سا چہرہ مرجھا کر رہ گیا تھا' اس کی ذہنی حالت بکھر گئی تھی کیونکہ غم نے اس

کے اعصاب پر برا اثر ڈالا تھا لیکن خوشی میں اتنی طاقت ہے کہ وہ انسان کو نئی زندگی بخش سکتی ہے۔ آہستہ آہستہ شبینہ نارمل ہونے لگی۔ میں نے ابا حضور کو بتایا کہ وہ عنقریب دادا بننے والے ہیں۔ ابا حضور کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ انھوں نے اپنی دولت کے خزانوں کا منہ کھول دیا۔ مزاروں پر چڑھاوے چڑھائے گئے۔ غریبوں کو کھانا کھلایا گیا اور ڈری سہمی شبینہ کی ناز برداری میں کئی گناہ اضافہ کردیا گیا۔ میں نے شبینہ کو بتایا کہ وہ نوکروں سے رازداری روا رکھے۔ شبینہ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے گھبرانے لگی تھی ہر وقت خرابیٔ طبیعت کا بہانہ کرکے کمرے میں گھسی رہتی' وقت آہستہ ہو یا تیز گزرتی جاتا ہے۔ امتحان کے یہ کٹھن مرحلے بھی گزر گئے۔

جب عینی نے مجھے بتایا اب شبینہ کو ادھر لے آئیں تو میں واقعی گھبرا سا گیا کیونکہ جھوٹ نبھانا ذرا مشکل ہو رہا تھا کہ اس لیے بھی کہ شبینہ کا پیٹ کمرے لگا تھا جبکہ اس حالت میں پیٹ غیر معمولی طور پر بڑھ جاتا ہے۔ بہرحال میں نے ابا حضور سے کہہ دیا کہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق میں شبینہ کو پہاڑ پر لے جا رہا ہوں' ڈیلیوری کیس بھی وہیں ہوگا۔ ظاہر ہے ابا حضور کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا جب میں شبینہ کو عینی کے پاس لا رہا تھا تو شبینہ بھی سہمی سہمی تھی اور خود میں بھی نروس ہو رہا تھا لیکن عینی کا سلوک ویسے ہی فراخدلانہ تھا۔ وہ بڑے تپاک سے شبینہ سے ملی۔ جی بھر کر مہمانداریاں کیں۔ جب میں نہا کر باتھ روم سے نکلا تو دونوں ایک صوفے پر بیٹھ کر یوں گھل مل کر باتیں کر رہی تھیں جیسے ایک عرصے سے ان کی جان پہچان ہو۔ اس کے بعد حالات کچھ اور دلچسپ ہو گئے دونوں مل کر آنے والے بچے کی تیاریوں میں مصروف رہتیں۔ ننھے ننھے فراک شبینہ بناتی تو چھوٹا سا سوئیٹر بننے میں عینی مصروف رہتی۔ شبینہ عینی کا زحد خیال رکھتی۔ اپنے ہاتھ سے پھل کاٹ کاٹ کر اسے کھلاتی اور کوئی کام کاج نہ کرنے دیتی۔

امتحان کا وہ کڑا لمحہ بھی آگیا جب عینی اسپتال میں داخل ہوئی تو ساری رات اسپتال کے ڈیلیوری روم کے باہر میں اور شبینہ دعائیں مانگتے رہے۔ جب نرس نے باہر آکر بیٹا ہونے کی خوشخبری سنائی تو شبینہ مجھے چھوڑ کر دیوانہ وار اندر بھاگی اور نرس کی ہدایت کے مطابق جب میں تھوڑی دیر بعد اندر گیا تو شبینہ بچے کو گود میں اٹھائے بے اختیار چوم رہی تھی اور کنوری سی عینی مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی۔

"عینی چاند' عینی جان' کیسی ہو تم؟.... کیا حال ہے تمہارا؟" میں نے اس کا ہاتھ تھام کر بے تابی سے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ نے ساری رات بے آرامی میں گزاری' اب آپ گھر جاکر آرام کیجیے۔" اس نے نرمی سے میرا ہاتھ دبا کر بولی۔

ہمارے کتنے جیالے' کتنے بہادر' کتنے جانباز' پاکستان پر قربان ہو گئے کہ پاکستان سلامت رہے۔ آج ہر شخص قسم قسم کے نعرے لگا رہا ہے۔

مجھے یاد ہے جب ہم علی گڑھ میں پڑھتے تھے' تو وہاں سندھی' پنجابی' پٹھان' بنگالی اور یوپی کے طالب علم ایک ساتھ رہتے تھے۔ خدا گواہ ہے مجھے یا کسی بھی طالب علم ساتھی کو یہ کبھی گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ یہ کہاں کے ہیں۔ صرف یہ معلوم تھا مسلمان ہیں اور طالب علم ہیں۔ اگر قومیتوں کی چھاپ ہمارے ذہنوں پر ہوتی' تو آپ یقین کریں اے۔ ٹی۔ ایم مصطفیٰ مرحوم کبھی بھی علی گڑھ یونین کے نائب صدر نہ ہوتے اور نہ مولانا محمد علی مرحوم اپنے طالب علمی کے زمانے کی مشہور نظم کہتے' جو ایک نائب صدارت کے امیدوار کی تائید میں لکھی گئی تھی اور اس کا تعلق سرحد سے تھا۔ اس کا ایک شعر ہے۔

کچی بارک کی جان ہے پیارے
سرحدی اک پٹھان ہے پیارے

اور اس نظم نے اس پٹھان کو علی گڑھ یونین کا نائب صدر بنوا دیا۔ آج ہمارے بہت سے مشہور لیڈر علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ہیں۔

(خادم' لیفٹیننٹ کرنل الطمر)

"آرام بھی کرلیں گے۔ پہلے اپنے چاند کو تو دیکھیے۔" شبینہ مسرت سے چمک کر بچہ میرے قریب لے آئی۔ میں نے بچے کو سینے سے لگایا تو مجھے یوں لگا جیسے میرے رگ و پے میں مسرت کی میٹھی میٹھی ٹھنڈک اتر آئی ہو۔

اگلے دن جب فون پر میں نے ابا حضور کو یہ پرمسرت خبر سنائی تو فون پر ہی مارے خوشی کے ان کی آواز رندھ گئی۔ وہ بے قراری سے پوچھنے لگے کہ میں ان کے پوتے کو کب ان کی خدمت میں پیش کرنے والا ہوں۔ میں نے ان کی بے قراری پر مسکرا کر کہا کہ فی الحال شبینہ کی طبیعت اس قابل نہیں کہ وہ سفر کرسکے۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ وہ فی الوقت اس بات کو زیادہ عام نہ کریں جب ہم آنے کی اطلاع دیں تبھی رشتے داروں اور ملنے جلنے والوں کو بتائیں تاکہ لوگ یہاں آکر شبینہ کو تنگ نہ کرسکیں۔ اس پر ابا حضور نے ہنس کر کہا۔

"تم اپنی جائے رہائش تو بتاتے نہیں بیٹا' بھلا کون آئے گا تمہارے پاس؟ بہرحال میں احتیاط کروں گا۔ اس تم شبینہ اور بچے کا خیال رکھنا.... اور میری بے تابی کا خیال کرتے ہوئے جلد آنے کی کوشش کرنا۔"

فرمانبرداری سے "جی اچھا" کہہ کر میں نے فون بند کردیا۔

عینی کے صحت مند ہونے تک ہم اس کے پاس ٹھیرے رہے لیکن وہ ہمارے جلد چلے جانے پر بضد تھی۔ اس کے اصرار پر مجبوراً ہم نے اپنا جانے کا پروگرام جلد بنالیا۔ عینی سے رخصتی تکلیف دہ تھی کیونکہ اس بار ہم اس سے عزیز از جان شے لے کر جارہے تھے لیکن عینی سچ مچ کا کنواں ثابت ہوئی۔ غضب کا کنٹرول تھا اسے اپنے جذبات اور احساسات پر۔ شبینہ نے اس کے ہاتھ چوم چوم کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ احسان مندی کے جذبے سے اس کے سامنے بچھی جارہی تھی لیکن عینی کے چہرے پر اس کے اندر کی سوچوں کا کوئی عکس نہ تھا۔ شبینہ کو گلے لگاتے ہوئے اس کی گود میں پڑے بچے کو عام بچوں جیسا پیار کیا اور بس! اس نے بچے کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی کچھ بھی نہ کہا۔ سارا وقت وہ بچے سے تعلق رہی۔ میں اور شبینہ دونوں اس کا ظرف اور حوصلہ دیکھ کر حیران تھے۔ راستے میں بار بار شبینہ مجھ سے پوچھتی رہی۔ "کیا عینی سچ مچ اس دنیا کی عورت ہے۔ مجھے تو لگتا ہے وہ کوئی دیوی ہے نیکی کا فرشتہ ہے۔ میرے لیے تو وہ خوشیوں کا پیغامبر ہے۔" میں اس کی تعریف سن سن کر مسرور ہورہا تھا۔ بچہ شبینہ کی گود میں مچل رہا تھا اور وہ اسے بار بار چوم رہی تھی۔

اباحضور کو پوتا کیا ملا گویا دنیا بھر کی خوشیاں انھیں مل گئیں۔ کئی دنوں تک انھوں نے خوشیاں منائیں (دست احباب اور رشتے داروں کے گھر مٹھائیوں کے ٹوکرے تقسیم کیے گئے۔ نوکروں کو بے پناہ انعامات سے نوازا گیا۔ ہر روز مختلف لوگوں کی دعوتیں ہوتیں۔ کوٹھی میں ان دنوں جشن کا سماں تھا۔ سب کچھ تھا لیکن جو یہ خوشی دینے کا سبب بنی تھی وہی ان خوشیوں سے دور تھی۔ عینی کے لیے میں اس کے دل میں درد محسوس کررہا تھا۔ اب تو شبینہ سے بھی کوئی رازداری نہ تھی۔ شبینہ سے کہہ کر اور اباحضور سے کاروبار کا بہانہ کرکے میں عینی کے پاس آگیا۔

شام کے سائے گہرے ہورہے تھے جب کار لاک کرکے میں گنگناتا ہوا کوٹھی کا مین گیٹ کھول کر اندر چلا آیا۔ اندر خاموشی اور سناٹا تھا لیکن یہ کیا؟.... کسی کی سسکیاں اس سناٹے کو توڑ رہی تھیں۔ یہ رونے والا کون ہوسکتا ہے؟ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ میرے قدم رک گئے۔ شادی سے لے کر اب تک میں نے کبھی بھی کسی قسم کے سخت حالات میں بھی عینی کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے تھے کجا کہ بلند آواز میں رونا۔ سسکیاں بھرنا..... پھر یہ کون ہوسکتی ہے؟ کیا کوئی ملازمہ؟ میں اندھیرے میں خاموشی سے اندر چلا آیا اور بے آواز قدموں سے اندر گھستا چلا گیا۔ کیا میں یہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا مدھم سی روشنی میں وہ عینی ہی تھی جو اپنی ماں کے سامنے بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ میں سانس روکے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا۔

"اب بس بھی کرو عینی بیٹا۔" اس کی والدہ کی کمزور آواز سنائی دی۔ "رونے دھونے سے کچھ نہیں بنتا تمہارے خاوند نے تمہیں بچہ شبینہ کو دینے کے لیے مجبور نہیں کیا تھا اگر تم نے اپنی مرضی سے سب کچھ کیا ہے تو پھر واویلا کیوں؟"

"ماں جی... میں نے شبینہ کی ہمدردی میں کچھ نہیں کیا۔ میں نے اپنا بچہ جاوید کی الجھنیں دور کرنے کے لیے اس کے حوالے نہیں کیا۔"

"پھر... پھر... تم نے اپنا بچہ کیوں دیا؟" ماں جی کی متعجب آواز سنائی دی۔

"ماں جی۔" عینی کے لہجے میں بلا کی تڑپ تھی۔ "کیا آپ بھی نہیں جانتیں کہ میں نے اپنا بچہ شبینہ کو کیوں دیا؟ آپ تو ماں ہیں۔ کیا آپ بھی ممتا کی مجبوری سے آشنا نہیں ہیں۔ میں نے جب جیدی سے شادی کے لیے انکار کردیا تھا تو آپ نے کہا تھا کہ بیٹی تو ساری عمر راج کرے گی۔ اپنی اولاد کو راج کرانے کا ہر ماں کو ارمان ہوتا ہے۔ یہ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے ماں جی کہ میں دنیا کے سامنے شوہر کو اپنا نہیں کہہ سکتی اور اب یہی دکھ میری اولاد کو بھی ملے گا کہ معاشرے میں منہ چھپا کے جیئے۔ آپ نے اپنی اولاد کے لیے سکھ ڈھونڈا۔ مجھے اپنی اولاد کے لیے جائے پناہ ڈھونڈنا تھی۔ جاوید کی بیوی بن کر تو میری شناخت بھی کھو گئی۔ اب یہی گمنامی کا طوق میری اولاد کو پہنا دیا جاتا۔ میں نے بھی اپنی اولاد کے لیے بھلائی چاہی ہے ماں جی... جاوید بزدل آدمی ہے۔ وہ عمر بھر میرے بچے کو اس کا جائز مقام نہیں دلا سکتا تھا۔ وہ صرف ایک بزدل عاشق ہے' تحفظ دینے والا شوہر نہیں۔ وہ اس بچے کو بھی زندگی بھر دنیا کے سامنے اپنا بچہ کہنے سے ہچکچاتا رہتا اور وہ بچہ بھی میری طرح ساری عمر گمنامی کی زندگی گزارتا۔ اسے سماج میں اس کا جائز مقام دلانے کے لیے' اسے اس کے باپ کے نام سے پکارے جانے کے لیے مجھے اپنی ممتا کا گلا گھونٹنا پڑا ہے ماں جی۔ میرا سسر جو معمولی لڑکی کو بہو بنانے پر کبھی راضی نہ ہوتا اور اب اسی معمولی عورت کا بچہ اس کا پوتا اور وارث کہلائے گا۔ مجھے شبینہ کا مقام نہ مل سکا مگر شبینہ میری اولاد کو اس کا مقام دینے پر مجبور ہوگئی ہے۔ کیا ہوا جو میری گود ہمیشہ کے لیے وہ سونی کرگیا' اس کا مستقبل تو تابناک ہوگیا نا! مائیں تو اولاد کے لیے قربانی دیتی چلی آئی ہیں پھر میں نے کوئی انوکھا کام نہیں کیا ماں جی...." یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور میرا سر چکرانے لگا۔ اگر قریب کی دیوار کا سہارا نہ لیتا تو یقیناً پورے قد سے گر پڑتا۔ عینی کی سسکیاں میرے اعصاب پر ہتھوڑے کی مانند برس رہی تھیں۔

کہانی ایک بار پھر دُہرائی جانے والی تھی، وہی ماحول اور وہی واقعات پھر نگاہوں کے سامنے تھے
عظمت کسی کی میراث نہیں، نیچے سمجھا جانے والا کوئی شخص بھی اس سے مالا مال ہو سکتا ہے
باذوق دوستوں کے لیے نفیس اور بھیگتی تحریر

حمیرا راحت

نیا سورج

چندو کے لیے اس کی ماں کی ہستی ایک خواب تھی اور باپ کا وجود ایک گالی اور جب یہ گالی برکت حلوائی کے موٹے موٹے بدنما ہونٹوں پر ابھرتی تو اس کا سارا خون کھنچ کر چہرے پر سمٹ آتا۔ نفرت کا احساس پورے وجود میں پھیل جاتا اور کڑھاؤ دھوتے ہوئے ہاتھ لمحے بھر کو کانپ جاتے۔ اس کا دل چاہتا کہ سامنے سڑک پر سے کوئی بڑا سا پتھر اٹھا کر برکت حلوائی کے سر پہ دے مارے اور اس وقت تک مارتا رہے جب تک اس کا دم نہ نکل جائے لیکن اس پل رابعہ کی آنسو بھری آنکھیں اس کی خواہش سے زنجیریں کر لپٹ جاتیں۔ وہ ایک گہری سانس لے کر بے بسی سے سر جھکا لیتا اور ہاتھ پھر پہلے کی طرح دودھ کا کڑھاؤ صاف کرنے لگتے۔

برکت حلوائی کو ابھی تک وہ شام اچھی طرح یاد تھی جب وہ اپنے ایک کام سے شہر گیا تھا اور وہاں یونہی گھومتے ہوئے ایک سنسان سی سڑک پر اس نے سرخ کپڑے میں لپٹے چندو کو پہلی بار دیکھا تھا۔

ایک اچھے خاصے صحتمند اور خوبصورت بچے کا یوں سڑک کے کنارے پڑا ہونا برکت کے لیے اتنا حیرت ناک تھا کہ وہ اپنی جگہ مجسمہ سا کھڑا رہ گیا۔

بچے کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ وہ خوابوں کی جنت میں بھٹک رہا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ فرشتوں نے اسے انسانوں کے جس دوزخ میں پھینک دیا ہے۔ وہ کتنا سفاک اور بے رحم ہے۔ برکت رحم

دل تو ہرگز نہیں تھا لیکن اس لمحے بچے کی معصوم صورت دیکھ کر آپ ہی آپ اس کا دل رحم اور ہمدردی کے احساس سے بھر گیا۔ اس نے ایک نظر اپنے اردگرد ڈالی، پیڑ سر اٹھائے خاموش کھڑے تھے۔ یہاں دور دور تک کوئی آواز، کوئی آہٹ نہیں تھی۔

برکت کے تصور میں اپنی بیوی رابعہ کا چہرہ اتر آیا۔ شادی ہوئے پانچ سال بیت گئے تھے لیکن اس کی گود ابھی تک خالی تھی۔ رابعہ ایک بچے کے لیے ترس رہی تھی۔

"کمال ہے یہ شہر والے اپنی اس انمول دولت کو کس بے رحمی سے سڑکوں پر پھینک دیتے ہیں۔" برکت نے سوچا اور آگے بڑھ کر بچے کو اٹھا لیا۔ اسے سینے سے لگا کر ایک بالکل انوکھا سا احساس ٹھنڈک بن کر برکت کے سینے میں اتر آیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا بسوں کے اڈے کی طرف جانے لگا جو وہاں سے ایک میل کے فاصلے پر تھا۔

بچے کو سینے سے لگائے برکت جب گھر میں داخل ہوا تو رابعہ دھلے ہوئے کپڑے الگنی پر پھیلا رہی تھی۔ برکت کی گود میں ایک گول مٹول بچہ دیکھ کر اس کے ہاتھوں سے دھلی دھلائی چادر چھوٹ کر آنگن کے

کپے فرش پر گر پڑی لیکن اسے اٹھائے بنا وہ تیزی سے لپکتی ہوئی برکت کے قریب آگئی۔

"یہ... یہ کس کا بچہ ہے؟" اس نے پر تجسس انداز میں آنکھیں پھیلا کر سوال کیا تو برکت کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"کمرے میں آجا سب کچھ وہیں بتاؤں گا۔"

رابعہ کو ساری روداد سنا کر اس نے بچہ اس کی گود میں ڈال دیا۔

"لے! بڑا ارمان تھا ناں تجھے بچے کا۔ اب پال اسے۔" رابعہ نے بڑی محبت سے بچے کی طرف دیکھا۔ وہ طویل نیند کے بعد آہستہ آہستہ کسمسا رہا تھا۔ نازک سے گلابی گلابی لب بسورنے کے انداز میں پھیل گئے تھے اور غلافی پپوٹے دھیرے دھیرے لرز رہے تھے۔ رابعہ کے چہرے پر ممتا کے رنگ دھنک بن کر چھا گئے۔ وہ آہستہ آہستہ جھکی اور بچے کے رخسار پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ اس کے ہونٹوں کا لمس پا کر بچے نے آنکھیں کھول دیں اور پھر کمرے میں اس کے رونے کی آواز گونج اٹھی۔ یہ آواز رابعہ کے جلتے ہوئے دل پر بارش کی ٹھنڈی پھوار کی طرح گری۔ وہ تیزی سے اٹھی اور باورچی خانے سے دودھ کا کٹورا لے آئی پھر وہ صاف ستھری روئی کی بتی بنا کر دودھ میں بھگو بھگو کر بچے کے منہ میں ڈالتی رہی۔ برکت بڑی دلچسپی سے اپنی بیوی کی حرکتوں اور اس کے پر ناچتی خوشیاں دیکھ رہا تھا۔

اسی وقت ماسی بشیراں اور رحمت بی بی گھر میں داخل ہوئیں تو جس کو بچے کی خبر ملی اس کا رخ برکت کے گھر کی طرف ہو گیا۔ گاؤں والوں کے لیے یہ بات بہت تعجب انگیز تھی کہ برکت اپنی بیوی کے لیے شہر سے ایک جیتے جاگتے بچے کا تحفہ لے کر آیا تھا۔

❁

برکت بڑا خوش اور مطمئن سا بیٹھا تھا کہ اچانک مولوی دین محمد کی آواز پر چونک پڑا' وہ فکر مند لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"اس بچے کو بستی میں لا کر تو نے اچھا نہیں کیا برکت۔"

"کیوں مولوی صاحب۔" برکت نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس لیے... اس لیے کہ تو نہیں جانتا شہر میں کیسی حرام کاری ہوتی ہے۔ اپنے جگر کے ٹکڑے کو کوئی یونہی تو نہیں پھینک دیتا۔ ضرور یہ بچہ کسی کے گناہ کا نتیجہ ہے اور اگر یہ اس گاؤں میں پلا بڑھا تو ہمارے گاؤں میں بھی گندگی پھیل جائے گی کیونکہ خون اپنا رنگ ضرور دکھاتا ہے۔ میری مان تو اس بچے کو وہیں چھوڑ آ' جہاں سے لایا ہے۔"

برکت سر جھکا کر سوچنے لگا۔ "اس رخ سے تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ مولوی صاحب ٹھیک ہی تو کہتے ہیں کہ کون اپنی اولاد کو لاوارثوں کی طرح سڑکوں پر ڈال دیتا ہے۔ ضرور یہ بچہ کسی بے غیرت انسان کا خون ہے۔ نہیں... نہیں میں اسے... نہیں پال سکتا... میں..." وہ فیصلے کی دہلیز پر کھڑا تھا کہ مولوی صاحب کی آواز پہ چونک پڑا۔

"اچھا برکت پتر۔ میں چلتا ہوں اب۔ تو اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔" مولوی دین محمد اٹھتے ہوئے بولے۔

برکت انھیں دروازے تک چھوڑ کے اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔ عورتیں جا چکی تھیں۔ وہ رابعہ کے قریب بیٹھ گیا جو بڑی محبت سے بچے کو آہستہ آہستہ تھپک رہی تھی۔

"میں نے اس کا نام بھی سوچ لیا ہے۔ چاند۔" وہ خوشی سے سرشار لہجے میں بولی۔

برکت اسے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے ہچکچانے لگا۔ رابعہ اسے بے حد عزیز تھی اور یہ بچہ کتنے مختصر لمحوں میں رابعہ کی اولیں خوشی بن گیا تھا۔ برکت بہت سوچ سوچ کر مدھم لہجے میں بولا۔

"رو... میرا خیال ہے کہ میں اس بچے کو واپس شہر چھوڑ آؤں۔" رابعہ کو جھٹکا سا لگا۔ وہ گنگ سی برکت کا منہ تکنے لگی۔ وہ جلدی سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"دیکھ نا۔ یہ کوئی اپنا خون تو ہے نہیں۔ ہمیں اس کا آگا پیچھا بھی نہیں معلوم۔ کس کی اولاد ہے؟ جائز ہے ناجائز ہے؟ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ..." برکت کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ رابعہ چھم چھم آنسو بہانے لگی پھر آنسوؤں بھری آواز میں بولی۔

"نہیں برکت... یہ بچہ جو ہمارے سونے آنگن میں اجالا بن کے آیا ہے۔ میں اسے واپس نہیں کروں گی۔ اس کے ماں باپ نے کچھ بھی کیا ہو۔ بچہ تو بے گناہ ہے۔ ابھی تو یہ نیکی' بدی' گناہ' ثواب کچھ بھی نہیں جانتا۔ ہم اسے جو کچھ سکھائیں گے یہ وہی سیکھے گا۔ یہ میری تمنائی کا سہارا بنے گا اور جوان ہو کر تیرے بڑھاپے کا۔ اپنا فیصلہ بدل دے برکت میں... میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" رابعہ نے روتے ہوئے سچ مچ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تو برکت کا دل پسیج گیا۔ وہ رابعہ کے دونوں ہاتھ تھام کر نرمی سے بولا۔

"اچھا ٹھیک ہے لیکن ایک وعدہ کر... کہ جب ہماری اپنی اولاد ہو گی تو میں اسے شہر کے کسی یتیم خانے میں چھوڑ آؤں گا۔"

"ہاں... یہ ٹھیک ہے۔" رابعہ نے لمحے بھر سوچ کر سر ہلا دیا۔

یوں چاند محبتوں کے سایے میں پروان چڑھنے لگا۔ رابعہ اسے دیوانگی کی حد تک چاہتی تھی۔ البتہ

برکت دن بھر دکان پر اس بچے کے بارے میں گاؤں والوں کی طرح طرح کی قیاس آرائیاں' مولوی دین محمد کی نصیحتیں سنتا رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے چاند سے کوئی خاص انسیت نہ تھی لیکن ایک بات اور رابعہ برملا کہتی تھی اور برکت دل ہی دل میں تسلیم کرتا تھا۔ وہ یہ تھی کہ چاند اس کے گھر کے لیے بہت بھاگوان ثابت ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی چھوٹی سی دکان بازار کی سب سے بڑی مٹھائی کی دکان بن گئی تھی پھر اس نے برابر والی دکان بھی خرید لی اور دیوار توڑ کر اپنی دکان میں شامل کرلی اور وہاں دودھ کی دکان کھول لی۔ آمدنی بڑھی تو برکت نے دو نوکر بھی رکھ لیے اور رابعہ کے لیے سونے کے کنگن بھی بنوا ڈالے۔

چاند نے پانچویں سال میں قدم رکھا تو برکت کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی سننے کو ملی۔ پورے دس سال کے صبر آزما انتظار کے بعد اس کے گھر میں بہار آنے والی تھی۔ رابعہ امید سے تھی۔ برکت کو دیر تک اپنے کانوں پر یقین نہ آیا پھر وہ حیران حیران سے چاند کو گود میں اٹھا کے بے تحاشا چومنے لگا۔ آج اسے چاند کی خوش بختی پر مکمل یقین آگیا تھا۔

ایک شام جب آسمان پر بادلوں کی فوج برسنے کو تیار کھڑی تھی تب رابعہ نے ایک پیاری سی بچی کو جنم دیا لیکن اس کی حالت بہت خراب تھی۔ برکت جب کمرے میں داخل ہوا تو باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی تھی۔

رابعہ کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔

"برکت نے اس کا سرد ہوتا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ تب اس کی کمزور سی لڑکھڑاتی ہوئی آواز برکت کی سماعت سے ٹکرائی۔

"بب... کت... میرے... چاند ... کو کبھی... اس ... گھر سے ... نہ... نکالنا... ورنہ... قبر میں بھی... مجھے... چین نہیں... آئے... گا۔"

"نہیں رابو... چاند کو میں اپنی جان سے عزیز رکھوں گا۔ پر... تیرے بغیر میں زندہ کیسے رہوں گا؟" وہ بچوں کی طرح رو پڑا لیکن برکت کی صدائیں اور چاند کے آنسو رابعہ کو زندگی کی طرف واپس نہ لاسکے۔ اپنی پہلی اور آخری نشانی برکت کے سپرد کرکے وہ موت کی اندھیری وادیوں میں گم ہوگئی۔

وقت ہر زخم کے لیے مرہم بن جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے رابعہ کی جدائی کا زخم بھی بھرتا گیا اور جیسے جیسے رابعہ کی یاد برکت کے دل سے نکلتی گئی ویسے ویسے چاند کی قدر و قیمت بھی گھٹتی گئی یوں بھی اب برکت کی چاہتوں کا مرکز بھی ننھی ریشم کا وجود تھا۔ اس کا اپنا خون' اس کی اکلوتی بیٹی جس کی پرورش کے لیے وہ اپنی بیوہ خالہ کو مستقل طور پر اپنے گھر لے آیا تھا۔

چاند کے لیے رابعہ کا ہر خواب اس کے ساتھ ہی دفن ہوگیا۔ وہ اس کے اسکول میں پڑھنے کا خواب دیکھا کرتی تھی لیکن برکت نے اپنے ساتھ دکان پر لے جانا شروع کردیا جہاں وہ مختلف قسم کے چھوٹے موٹے کاموں میں جتا رہتا۔

آمدنی میں اضافے کے ساتھ ساتھ برکت بے حد سخت خو اور مغرور ہوتا گیا۔

وقت موسم کی طرح رنگ بدلتا رہا۔ پورے بیس سال بیت گئے۔ چاند کے لیے اپنا اصلی نام ایک بھولا ہوا خواب بن گیا۔ اب وہ صرف چندو تھا۔ پچیس سال کا نوجوان چندو' برکت کے طعنے تشنے اور جھڑکیاں اس کا نصیب تھیں۔

گاؤں والوں کا رویہ تو شروع ہی سے اس کے ساتھ سرد مہری کی دھند میں لپٹا ہوا تھا لیکن چندو کو ان سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ اسے تو برکت سے بھی کوئی شکایت نہیں تھی جو اسے ہر لمحے اپنے لفظوں سے زخم لگاتا رہتا تھا۔ چندو کو اپنی کہانی معلوم ہو چکی تھی اور اپنا مقام بھی وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ برکت کا یہی احسان کیا کم تھا کہ اس نے چندو کو سر چھپانے کو ایک پناہ گاہ دے رکھی تھی۔ اپنے گھر میں ایک چھوٹا سا کمرا جو باہر گلی کی طرف کھلتا تھا' برکت نے چندو کو دیا ہوا تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ دکانوں کا آدھے سے زیادہ کام چندو نے بغیر کسی تنخواہ کے سنبھال رکھا تھا۔ برسوں پہلے کی نیکی آج ثواب بن کر برکت کے کام آرہی تھی۔

کبھی کبھی چندو کا جی چاہتا کہ اس بستی کو چھوڑ کر کسی دوسری آبادی میں چلا جائے جہاں کوئی اس کے باپ کا نام نہ پوچھے اسے اس کی ذات' اس کے نام کے حوالے سے پہچانا جائے جہاں پر وہ گندگی کا ڈھیر نہ کہلائے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ گناہ ماں باپ کرتے ہیں اور سنگسار اولاد ہوتی ہے لیکن چندو جب بھی کہیں جانے کا ارادہ کرتا رابعہ کی محبتیں دیوار بن کر سامنے آجاتیں اور وہ مجبور ہوجاتا۔ ساتھ ہی ساتھ ایک اور وجود بھی تھا جو اس کے ارادے کو ڈانوں ڈول کردیتا تھا۔ ہنستی آنکھوں' دہکتے رخساروں والی گڑیوں جیسے حسن کی مالک ریشم' جو اپنے نام کی طرح ریشمی سی لڑکی تھی۔ چندو کے خوابوں میں چاند بن کے چمک رہی تھی۔ کبھی کبھی تو چندو کو اپنی سوچوں کی اڑان پر ہنسی آجاتی کہ میں بھی کتنا پاگل ہوں۔ وہ جس کا باپ مجھ سے شدید بیزار ہے اور خود اس نے بھی آج تک مجھے نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ اسے میں اپنے تصورات میں کیوں سجائے ہوئے ہوں! کیوں آسمان پر چمکتے ستارے بھی کسی کے دامن میں ٹوٹ کر گرتے ہیں لیکن دل اور خوابوں پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ باوجود کوشش کے چندو اس کا عکس اپنے دل سے نہ مٹا سکا بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ یہ عکس اور گہرا ہوتا گیا۔ اس کی آرزوؤں میں اور شدت آتی گئی۔

خواب اپنی تعبیریں پانے کی ضد کرتے رہے۔

لیکن ایک رات ریشم کی پاکیزگی کا وہ بت جو چندو نے اپنے دل کی سب سے اونچی مسند پر سجا رکھا تھا۔ ایک چھناکے سے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگیا۔ اس اندھیری رات میں جب معمول کے مطابق دکان کا کام ختم کرکے چندو گھر آرہا تھا۔ اپنے کمرے کے قریب پہنچ کر اس نے دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ برابر والے دروازے سے سیاہ چادر میں لپٹا ہوا ایک نسوانی وجود اندھیرے میں ایک طرف جانے لگا۔ رات اندھیری ضرور تھی لیکن پھر بھی چندو نے چادر میں لپٹی ہوئی ریشم کو پہچان لیا۔

غیر ارادی طور پر چندو کے قدم اس کے تعاقب میں اٹھ گئے۔ مکانوں کی قطار ختم ہونے کے بعد وہ پگڈنڈی پر چلنے لگی جس کے ایک طرف نشیب میں کھیتوں کا طویل سلسلہ تھا اور دوسری طرف چھوٹی سی نہر بہتی تھی۔

چاند بادلوں میں چھپا ہوا تھا اور اندھیرے میں نہر کا پانی، دور تک پھیلے کھیت اور ریشم کا سیاہ چادر میں لپٹا ہوا وجود بہت پراسرار لگ رہا تھا۔ کچھ دور چل کر پنگھٹ آگیا۔ پنگھٹ کے قریب پانی کے برتن وغیرہ رکھنے کے لیے ایک چبوترہ بنا دیا گیا تھا جس پر کوئی شخص بیٹھا ہوا تھا۔ ریشم پر نظر پڑتے ہی اس نے بازو پھیلا دیے اور ریشم دوڑ کر ان کھلے ہوئے بازوؤں میں سما گئی۔ چاند نے حیران ہو کر بادلوں سے جھانکا پھر مکمل طور پر باہر آگیا اور چاندنی میں چندو نے زمیندار کے چھوٹے بیٹے دلاور کو صاف پہچان لیا۔

وہ کسی پتھر کے مجسمے کی طرح اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ اب ریشم اور دلاور مل کر باتیں کر رہے تھے اور کبھی کبھی ریشم کی مترنم ہنسی فضاؤں میں جل ترنگ بن کر بکھر جاتی۔ چندو نے کرب سے آنکھیں بند کرلیں۔ ذہن پر گرنے والی ہر بجلی نے اس کی سوچوں کو مفلوج کر ڈالا تھا۔ دل میں اٹھنے ورونے اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اپنے ریزہ ریزہ ہوتے حواس سمیٹ کر وہ واپسی کے لیے پلٹ گیا۔ کچھ دیر پہلے جو راستہ پلک جھپکتے طے ہوگیا تھا۔ واپسی میں وہی راستہ چندو کے لیے پل صراط بن گیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ لالٹین جلائے بنا بستر پر ڈھیر ہوگیا۔ اس نے آنکھیں بند کرکے روٹھی ہوئی نیند کو منانے کی کوشش کی لیکن پلکوں تلے کانٹے سے اگ آئے تھے۔ نظروں میں ابھی تک ریشم اور دلاور کے ملن کا منظر گھوم رہا تھا اور دل میں درد کی لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔ اس رات کا ایک ایک لمحہ چندو کے لیے عذاب بن گیا۔ اس نے بے چینی سے کروٹیں بدلتے ہوئے سوچا۔

"کیا میں اس لیے بے چین ہوں کہ ریشم کسی اور سے پیار کرتی ہے؟ نہیں..... نہیں... یہ تو میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ میرا اور اس کا ملن آسمان پر نہیں لکھا گیا۔ وہ کسی اور کی تقدیر کا ستارہ ہے لیکن دلاور...

دلاور تو ایک ایسا سانپ ہے جو ریشم کے خوابوں کو ڈس لے گا۔ خوبصورت لڑکیوں کو بے وقوف بنانا تو اس کا مشغلہ ہے اور..... اور ریشم اس کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتی ہے۔ وہ اس کی خوبصورت باتوں اور دلفریب وعدوں میں الجھ کر اپنا سب کچھ ہار دے گی اور ایک وقت ایسا آئے گا جب اس کے دامن میں پچھتاوے کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا۔ میں کل صبح خود ریشم سے بات کروں گا اور اسے سمجھاؤں گا کہ دلاور کتنا جھوٹا اور ہرجائی ہے۔" اس فیصلے نے چندو کو کچھ سکون پہنچایا لیکن نیند اسے پھر بھی نہ آئی۔ طویل رات آنکھوں آنکھوں میں کاٹ کر دوسرے دن وہ برکت کے دکان پر جانے کے بعد گھر میں داخل ہوگیا۔ ماسی خیراں سامنے چوکی پر بیٹھی دال چن رہی تھی۔

"کون اے توں؟" اس نے آنکھوں پر ہاتھوں کا چھجہ سا بنا کر چندو کو پہچاننے کی کوشش کی۔

"میں چندو ہوں ماسی۔ ریشم سے کہنے آیا ہوں کہ آج دوپہر کا کھانا دکان پر نہ بھیجے۔" چندو نے بہانہ بنایا۔

"اچھا... اچھا... تو بول دے اسے۔ اپنے کمرے میں ہے وہ۔" وہ پھر اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

اب چندو کمرے میں داخل ہوا تو ریشم اپنے لمبے سیاہ گھناؤں جیسے بال سلجھا رہی تھی۔ چندو کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

"کیا بات ہے چندو؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے چندو کی طرف دیکھا۔ چندو کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کس طرح شروع کرے۔ اس نے اپنے بکھرے ہوئے حواس سمیٹے اور اپنے سارے حوصلوں کو یکجا کرکے آہستہ سے بولا۔

"ریشم بی بی..... آپ... آپ دلاور سے نہ ملا کریں۔ ریشم کے ہاتھ سے کنگھا چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ چندو نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر نظریں جھکا کر بولا۔

"آپ اسے نہیں جانتیں۔ وہ بہت آوارہ شخص ہے۔ لڑکیوں کو بیوقوف بنانا اس کی عادت ہے۔ وہ آپ کو بھی۔"

"چندو۔" ریشم کی غصے سے لرزتی ہوئی آواز ابھری تو چندو نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ نفرت بھرے لہجے میں بولی۔

"دوسروں کو کچھ کہنے سے پہلے تو اپنی اوقات تو پہچان۔ تیرے ماں باپ تو خود آوارہ تھے جو تجھے سڑک پر پھینک گئے تھے۔ بستی والے تجھے گندگی کا ڈھیر کہتے ہیں۔ کیا میرے بابا کے احسانوں کا یہی صلہ ہے کہ آج تو اپنی حیثیت بھول کر مجھے نصیحتیں کرنے چلا ہے۔"

چندو گم صم سا کھڑا تھا اور ریشم کے لفظ نشتر بن کے اس کے دل میں اترتے جا رہے تھے۔ ریشم کی آنکھوں میں اس کے لیے بے پناہ نفرت تھی۔ چندو نے ڈوبتے ہوئے دل کو سنبھالا اور کچھ کہے بنا سر جھکا باہر آگیا۔ کہنے کو رہ بھی کیا گیا تھا۔ وہ بے جان قدموں سے برکت کے گھر سے اور پھر اس گلی سے باہر نکل گیا۔

اس دن کے بعد چندو نے اس گلی میں کبھی قدم نہیں رکھا۔ اس نے برکت سے ہر تعلق ختم کر کے کپڑے کے نشاط میں نوکری کر لی تھی۔ شیدا پوری بستی میں اس کا واحد ہمدرد تھا۔ نوکری دلانے میں وہی اس کا مددگار ثابت ہوا تھا۔ چندو کی ڈیوٹی صبح سات بجے سے دوپہر تین بجے تک کی تھی۔ اس نے ایک کھولی بھی کرایہ پر لے لی تھی۔

برکت کو اس کے یوں اچانک چلے جانے پر کافی حیرت اور صدمہ ہوا تھا۔ صدمہ یوں کہ دکانوں کی آدھی سے زیادہ ذمے داری چندو نے بغیر کسی تنخواہ کے سنبھال رکھی تھی۔ شروع شروع میں وہ ہر ایک کے سامنے چندو کی دھوکے بازی کی داستان سنانے بیٹھ جاتا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے صبر آتا گیا۔

لمحوں کے پھول کھل کھل کر مرجھاتے رہے اور ڈھیر سارے دن گزر گئے۔

ایک صبح، بستی والوں کے لیے بے شمار حیرتیں لے کر طلوع ہوئی جب بستی والوں نے دیکھا کہ چودھری کی اونچی حویلی کے بڑے گیٹ کے سامنے کپڑے میں اچھی طرح لپٹا ہوا ایک نومولود بچہ پڑا ہے۔

بڑی بوڑھیاں دنگ رہ گئیں۔

بزرگوں کی نگاہیں جھک گئیں۔ نوجوانوں کے چہرے فرط غیرت سے سرخ ہو گئے۔ ہر ذہن سوال بن گیا تھا۔ ہر آنکھ شرمساری کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھی۔ بچے کے اردگرد بستی کے بہت سے لوگ گھیرا بنائے کھڑے تھے۔ ایک آدمی چودھری کو خبر کرنے حویلی کے اندر گیا ہوا تھا۔ سارے مجمعے میں صرف ایک شخص ایسا تھا جس کے ذہن میں اس بچے کے لیے کوئی سوال نہیں جاگا تھا۔ وہ تو بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس بچے کو تک رہا تھا اور اس کے ذہن میں پچیس سال پہلے کا وہ بچہ گھوم رہا تھا جو برکت کو سڑک پر پڑا ملا تھا۔

"تو کیا میری کہانی ایک بار پھر دہرائی جائے گی۔" چندو کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ کیا یہ بچہ بھی میری طرح ساری زندگی نفرتوں کا عذاب سہے گا؟ کیا یہ بھی محبت کی ایک نظر، ہمدردی کے ایک بول کے لیے ترستا رہے گا۔ کیا اس کے لیے بھی باپ کا نام ایک گالی بن جائے گا؟"

ایک خاتون نے آواز دے کر انار والے کو بلایا اور دو پیک بھاؤ تاؤ کے بعد مقررہ نرخ پر انار خریدنے کر راضی ہو گئیں۔ انار والا انار تولنے لگا اور ساتھ خاتون بولیں۔ "مہینے دو میں انار خریدنا نہیں سیکھ گی۔ میں بھول ہی گئی کہ یہ سیر پاس پیسے نہیں ہیں۔"

"کوئی بات نہیں اس وقت پیسے نہیں تو پھر دے دیجیے گا۔" یہ کہہ کر اس نے خاتون کی طرف ایک انار بڑھایا۔ "ذرا چکھ کر دیکھیں کیسا میٹھا ہے۔"

"میں روز دے سے ہوں، انار نہیں چکھ سکتی۔" خاتون بولیں۔

"لیکن آج کل تو رمضان نہیں ہیں۔" انار والے نے خاتون کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

خاتون نے جواب دیا۔ "کئی سال پہلے میرا ایک روزہ قضا ہو گیا تھا۔ اب اس کا قرض چکا رہی ہوں۔"

یہ سنتے ہی انار والے نے گردن سر پر رکھا اور جانے لگا۔

خاتون نے حیرت سے کہا۔ "یہ کہاں چلے؟ کیا انار نہیں دو گے؟"

انار والا جواباً کہنے لگا۔ "معزز خاتون آپ نے خدا کے قرض کی ادائیگی میں اتنی تاخیر اور سستی سے کام لیا ہے تو میں اپنے قرض کی واپسی کی آپ سے کیا امید رکھ سکتا ہوں!"

شبانہ

کوئی اُمید نہیں

لوگوں میں اچانک بے چینی پھیل گئی۔ چودھری رحمت علی باہر آرہا تھا اور اس کے پیچھے اس کا چہیتا بیٹا دلاور تھا۔ چندو کی آنکھیں جلنے لگیں۔ اس کی نگاہ دلاور کے زرد ہوتے چہرے پر جم گئی۔ وہ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا۔ چندو کے ذہن میں دھماکا سا ہوا۔ اس کے تصور میں وہ منظر در آیا جب اس نے ریشم کو دلاور سے ملتے دیکھا تھا۔

"تو... تو کیا... ریشم... ریشم نے...." چندو اس سے آگے نہ سوچ سکا۔ چودھری رحمت علی کی پاٹ دار آواز سب کی آوازوں پر چھا گئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"میرے بھائیو! بڑے افسوس کا مقام ہے کہ شہر کی طرح ہمارے گاؤں میں بھی اب ایسے شرمناک کام ہونے لگے ہیں۔ اس وقت پوری بستی کے لوگ یہاں جمع ہیں اور بچہ یقیناً ان ہی میں سے کسی کا ہے۔ میں اپنے گاؤں کی کسی بہن یا بیٹی کو بدنام نہیں کرنا چاہتا بلکہ اب میں صرف یہ چاہوں گا کہ میرے بیٹے سمیت اس وقت یہاں جتنے بھی نوجوان کھڑے ہیں، ان میں سے جس کا بھی یہ گناہ ہے وہ آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگالے۔ میں وعدہ کرتا ہوں اسے سخت سزا نہیں دی جائے گی۔ اس کی سزا صرف اتنی ہو گی کہ اسے ہم اس گاؤں سے نکال دیں گے۔ آگے خدا جو سزا دے۔"

چودھری کی تقریر ختم ہو گئی۔ پورے مجمع پر سکوت طاری تھا۔ یہاں سے وہاں تک کوئی سرگوشی کوئی آواز نہیں تھی۔

کافی دیر گزر گئی۔ دلاور اپنی جگہ جما ہوا تھا۔ چندو پر مایوسی طاری ہونے لگی۔ اس نے بے چینی سے مجمے پر ایک نگاہ ڈالی۔ سب گم صم کھڑے تھے۔ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا تھا۔ چندو کی نظریں سب سے ہوتی ہوئی بچے پر جم گئیں۔ اس کا دل جیسے کوئی مٹھی میں لے کر ہولے ہولے مسلنے لگا۔ وہ غیر ارادی طور پر ایک قدم آگے بڑھ گیا۔

"آوارہ ماں باپ کی اولاد۔ گندگی کے ڈھیر۔" اس کے کانوں میں جیسے کسی نے پگھلا ہوا سیسہ بھر دیا۔ کیا یہ الفاظ اب اس معصوم وجود کا نصیب بنیں گے۔ وہ ایک قدم اور آگے بڑھ گیا۔ "اس کانٹوں بھری راہ پر اس کے پاؤں بھی زخمی ہوں گے۔"

"نہیں... نہیں... ایسا نہیں... ہونا چاہیے۔" چندو نے کرب سے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کا سارا وجود ان دیکھے طوفانوں کی زد میں تھا۔ وہ فیصلے کی صلیب پر لٹک رہا تھا اور جب وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا چودھری رحمت علی کے سامنے پہنچا تو سب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"چودھری... یہ... یہ بچہ... میرا ہے۔" چندو نے ڈوبتے ہوئے لہجے میں کہا۔ چودھری چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

"میری بتائی ہوئی سزا تو سن ہی لی ہوگی۔ جا اسے اٹھا کر بستی بیشہ کے لیے چھوڑ دے۔" چندو بچے کی طرف جانے لگا لیکن اسی لمحے چند جوشیلے نوجوانوں نے اسے پکڑ لیا پھر ایک نوجوان چیخ کر بولا۔

"چودھری یہ اتنی آسانی سے ہماری عزت پامال کرکے نہیں جاسکتا۔" پھر وہ سب چندو پر ٹوٹ پڑے۔ لاتیں، گھونسے، تھپڑ، وہ ہر طرف سے دل کی بھڑاس نکال رہے تھے۔ چودھری رحمت علی نے آگے بڑھنا چاہا لیکن دلاور نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"رہنے دیں ابا۔ وہ سب حق بجانب ہیں۔"

چودھری نے لمحے بھر اس کی طرف غور سے دیکھا اور پھر ہاتھ چھڑا کر تیزی سے چندو کے قریب پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر کچھ اور بڑے بوڑھے بھی قریب آکر بیچ بچاؤ کرانے لگے۔ چودھری چندو کے سامنے جا کھڑا ہوا اور نوجوانوں کو سمجھانے لگا کہ اس کے لیے اتنی ہی سزا کافی ہے کہ اسے گاؤں سے نکال دیا جائے اور ویسے بھی اس نے اپنے گناہ کا اعتراف کرکے بڑی جرات کا ثبوت دیا ہے پھر وہ چندو کی طرف مڑا جو زمین پر گرا ہوا تھا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے اور سر سے گاڑھا گاڑھا خون بہہ رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھنے لگا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے دائرے سے ناچ رہے تھے۔

چودھری نے بچے کو اٹھا کر چندو کی گود میں دے دیا۔ بچے کا نرم گرم وجود سینے سے لگاتے ہی چندو کو

اپنے اندر ایک نئی توانائی، ایک نیا حوصلہ جاگتا محسوس ہوا۔ وہ ڈگمگاتا ہوا ان سب سے دور ہونے لگا۔

باقی شریر بچوں نے تالیاں بجاتے ہوئے اور کنکریاں مارتے ہوئے کچھ دور تک چندو کا ساتھ دیا پھر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ چندو آہستہ آہستہ گاؤں سے باہر جانے والی سڑک پر پیڑوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ماتھے سے بہنے والا خون بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے جالا سا بن دیتا۔ سر میں اٹھتی درد کی لہریں ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھیں۔ چندو دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ وہ کسی طرح بس اسٹینڈ تک پہنچ جائے۔ وہ اپنے ٹوٹے ہوئے حوصلے سنبھال کے اور اپنی بکھری ہوئی ہمت جمع کرکے لڑکھڑاتا ہوا مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ اتنے میں پیڑوں کے پیچھے سے سر تا پا چادر میں لپٹی ہوئی ایک لڑکی چندو کے سامنے آگئی۔ چندو نے اپنی پھٹی ہوئی آستین سے چہرے پر بہتا خون صاف کیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس لڑکی کو پہچاننے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اس نے اپنا چہرہ چادر میں چھپا رکھا تھا۔

اچانک وہ آگے بڑھی اور چندو کے پیروں پہ گر کر بری طرح سسکنے لگی۔ اس کی سسکیاں چندو کی سماعت پر تھپڑ سا گئیں۔

"ریشم بی بی۔" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور ڈگمگاتا ہوا ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"چندو... مجھے معاف کردے۔ جو کچھ میں نے تجھ سے کہا تھا وہ خدا نے پلٹ کر میرے منہ پہ مار دیا۔" ریشم آنسوؤں سے لبریز آواز میں بولی۔ "میں نے تجھے کبھی انسان نہیں سمجھا اور تو... تو فرشتہ نکلا۔ تو نے اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے یہ... یہ میرا گناہ ہے۔ جو تو نے اپنے سر لے لیا۔ تو نے ایسا کیوں کیا چندو؟" ریشم نے تڑپ کر پوچھا۔

چندو نے ایک نظر بے خبر سوئے ہوئے بچے پر ڈالی پھر ریشم کے زرد چہرے کی طرف دیکھا اور بہت آہستہ سے بولا۔

"میں اگر ایسا نہ کرتا تو یہ بچہ جس کا کوئی گناہ نہیں، زندگی بھر کے لیے گندگی کا ڈھیر بن جاتا۔ اب لوگ اسے میرے نام سے پہچانیں گے۔ میں اسے اپنا نام دوں گا ریشم۔"

چندو میں اس بچے کی ماں ہوں۔ اب اس کے ساتھ باپ کا ہی نہیں۔ ماں کا نام بھی آئے گا۔" چندو نے ایک نظر ریشم کی طرف دیکھا اور پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے آج کا سورج صرف اسی کے لیے طلوع ہوا ہے۔

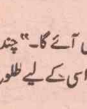

مَیں نے بھی بُرے پریشاں کی طرح پیار کیا
تم نے بھی زخم دیے مجھ کو گلابوں کی طرح

• ایک خود غرض اور ہوس پرست عورت کی داستان
نحواب اور حقیقت کے درمیان اُس کا وجود دو لخت ہو گیا تھا

نسرین خواجہ

منزل

حمید چند روز سے سخت الجھن میں تھا اور یہ الجھن تھی بھی عجیب، جس کا سرتھانہ پیر، وہ گھر سے دفتر جس راستے سے جاتا تھا وہ راستہ اس کی الجھن کا سبب تھا۔ یہ وہ راستہ تھا جس سے گزرتے ہوئے زاہدان کرام بھی کتراتے تھے۔ حمید کے مضبوط ایمان کو کوئی بھی پریشانی لاحق نہ تھی۔ گھر سے دفتر جو راستہ جاتا تھا اس کے بیچ میں ایک چھوٹا سا پر رونق بازار آتا تھا۔ دونوں طرف بھی سجائی دکانیں تھیں۔ خاص کر مٹھائی کی دکانیں، ہار پھولوں کی دکانیں اور پھر کالے پان والے کی دکان.... جس کے پان میں ایک نشہ سا تھا جو کھانے والے کے جسم کی ساری تھکن اور ذہنی پریشانی دور کر دیتا تھا۔ کالے کی دکان کے بالکل سامنے اوپر فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ پرانے زمانے کی یادیں چہرے پہ سجائے لوہے کی نیلی ہری کالی گیلری والے فلیٹ.... گندگی سے بھرے اس بازار میں بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ حمید کی پریشانی یہ تھی کہ وہ شریف زادہ تھا اور اس کا گزر اس بدنام علاقے سے ہوتا تھا۔ لیکن اس کا خیال تھا کہ اگر انسان کے اندر کا آدمی مضبوط ہو تو باہر کا ماحول اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ وہ پورا مہینا اس راستے سے گزرتا رہا مگر اس کے دل میں کبھی کوئی غلط خیال نہیں آیا۔ کیونکہ اس کی پرورش ایک نیک اور پاکیزہ ماحول میں ہوئی

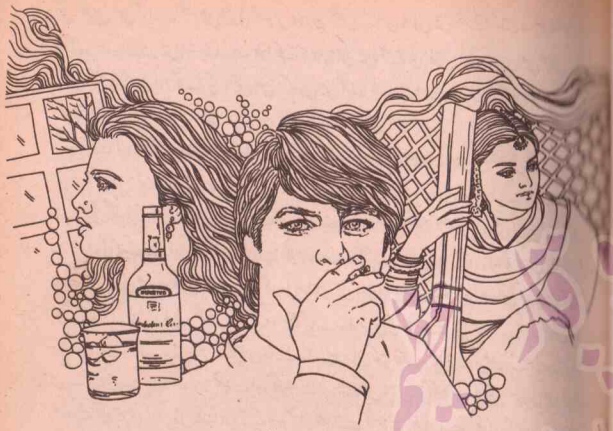

تھی۔ اس دن جب وہ تیزی سے اپنی سائیکل پہ اسی راستے سے واپس گھر آ رہا تھا کہ کالے پان والے نے آواز دی۔

"اے بابو.... سنو تو سہی۔" اور وہ یہ آواز سن کر بری طرح چونکا اور مڑ کر کالے کو دیکھنے لگا جو اپنی پان والی بتیسی نکالے، آنکھیں چمکائے پرامید نظروں سے سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ حمید نے جب یہ آواز سنی تو پل بھر لمحے وہ تذبذب میں سائیکل روکے کھڑا رہا اور پھر کچھ سوچ کر وہ اس کی دکان کی طرف چلا آیا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا....

"ایسی بے رخی بھی کیا ہے۔ کبھی تو ہمارا پان بھی کھا کر دیکھو ہر قسم کے اسپیشل خاص و عام پان بناتا ہوں۔" کالے نے پراسرار انداز میں اس پہ اپنی قابلیت بگھاری۔ "بناؤں ایک بیڑا؟"

"ہاں.... بناؤ۔" .... وہ کچھ الجھ کر بول پڑا.... اور کالے نے فوراً پان لگانا شروع کر دیا ساتھ ہی ساتھ اس کی زبان قینچی کی طرح چلنا شروع ہو گئی۔ "بابو آپ جانتے ہیں۔ یہ بیلا بائی کا فلیٹ ہے سامنے نیلی گیلری والا، بڑی خوبصورت عورت ہے۔" وہ آنکھ مار کر بدمعاشی سے بولا.... اور حمید کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا.... اسے اس بازار میں کھڑے ہو کر سخت الجھن ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے اردگرد نظر ڈالی تو کئی

ننگی نظریں اس کو اپنے جسم میں اترتی محسوس ہو رہی تھیں.... اس ماحول میں آکر تو انسان نہ سوچنا چاہے تو بھی بہت کچھ ذہن میں اتر جاتا ہے۔ طوائف کا نام ذہن میں آتے ہی انسان اپنی سوچوں میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے اور کالے کی باتیں اس کے دل میں ایک عجیب انداز سے اتر رہی تھیں۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔

پان لے کر وہ بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اپنے گھر کے پاکیزہ ماحول اور خوبصورت بیوی کی آغوش میں اور اپنی بیٹی کی ہنسی میں گم ہو جانے کے لیے.... اس نے پان منہ میں رکھ کر غیر ارادی طور پر ایک سرسری نظر سامنے نیلی گیری پہ ڈالی.... تو ہڑبڑا کر رہ گیا۔ اس نے جلدی سے نظریں جھکا کر لاحول پڑھی اور پیسے جلدی سے پینٹ کی جیب سے نکال کر کالے کو دینے لگا جو دوسرے گاہک سے پان بناتے ہوئے باتیں کر رہا تھا۔ سامنے نیلی گیری میں وہ کھڑی تھی۔ پیلے رنگ کی ساڑی میں وہ اداس چہرہ لیے اسے مخصوص انداز میں گھور رہی تھی۔ اس کو اپنی طرف نگراں دیکھ کر وہ سٹپٹا گیا..... بے حیائی کی بھی حد ہو گئی۔ ہونہہ.... پتہ نہیں کیا سوچ رہی ہو گی۔ شاید کہ میں اس کے پاس جانے کے لیے یہاں کھڑا تھا.... یا پھر اسے دیکھنے کے لیے.... تو بہ اس نے جلدی سے پیسے کالے کو تھمائے اور گھبراہٹ اور غصے میں اپنی پرانی کھٹارا سائیکل سنبھالی اور ادھر ادھر دیکھے بغیر تیزی سے پیڈل مارتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ کالا اسے تمسخرانہ نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔

وہ سائیکل پر تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا لیکن اس کا دماغ کہیں اور تھا۔ بار بار اس کے ذہن میں پیلی ساڑی والی بیلا بائی در آتی کبھی مسکراتی ہوئی کبھی حسرت و یاس کی تصویر بنی ہوئی۔ تصورات کے کینوس پر اس کی مختلف تصویریں ابھر رہی تھیں۔ یکایک وہ چونکا اس کی سائیکل کے سامنے ایک بڑا پتھر آگیا تھا۔

اب اس کے سامنے اس کا چھوٹا سا گھر اس کی پیاری بیوی اور بچے تھے اسے اپنی اس ذہنی حالت پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے نفرت سے منہ میں بھری پان کی پیک زمین پر تھوکی۔ اس نے پیک اس انداز میں تھوکی جیسے یہ زمین نہ ہو بلکہ بیلا بائی کا چہرہ ہو۔

جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے وہ اس عورت کی نظروں کے جال میں الجھتا جا رہا تھا۔ اس کو چڑ سی ہو گئی تھی اس نیلی گیری سے اس کا بس چلتا تو اس نیلی گیری والی کو گیری سمیت پھکوا دیتا گندگی کے گہرے گڑھے میں۔ بڑی بڑی گہری آنکھیں اب پر جم کر رہ گئی تھیں.... ٹھیک ساڑھے چھ بجے وہ دفتر سے نکلتا اور جب وہ اس گیری کے قریب پہنچتا تو محسوس کرتا کہ شبنم سے دھلے ہوئے چہرے پر دو خوبصورت اور مدھ بھری آنکھیں اسے تک رہی ہیں اس خیال کو جھٹک کر وہ آگے بڑھ جاتا اور کافی دیر تک وہ ان آنکھوں کے سحر میں مبتلا رہتا۔

ہر شام جب وہ لوٹتا تو وہ آنکھیں مجسم انتظار گیری میں کھڑی ملتیں اس نے سوچا۔ ارے میرا کیا یہ تو روز کا ہی نکلنے کے لیے ہوتی ہیں۔ یہ ہر کسی کو یونہی تکتی ہوں گی۔ میں نے ان پر توجہ نہیں دی۔ شاید اسی لیے مجھے یہ زیادہ قابل توجہ سمجھتی ہیں۔ اس نے ہر طرح اپنے دل کو تسلی دینے اور سمجھانے کی کوشش کی مگر ان دو گھورتی ستم گر آنکھوں نے اس کی زندگی میں ہلچل مچا دی.... اسے ان نظروں سے نفرت تھی سخت نفرت..... لیکن پھر بھی وہ گزرتے ہوئے غیر محسوس طور پر اس گیری کی طرف ضرور دیکھتا اور سوچتا۔ کیسی عجیب عورت ہے چھپکلی کی طرح.... شکار کو پھانسنے کے لیے بے حس و حرکت کھڑی رہتی ہے اور جب شکار قریب آئے تو بڑی پھرتی اور تیزی سے اسے چٹ کر جاتی ہے

مگر آتا تو ذرا سکون ہو جاتا۔ رقیہ کی خوبصورت مسکراہٹ... اور اس کی اکلوتی بیٹی گڈو کی شرارتیں اس کے الجھے ذہن کو سکون بخشتیں..... رقیہ اب اس کے دو سرے بچے کی ماں بننے والی تھی گھر کے کام میں حمید بھی اس کا ہاتھ بٹاتا۔ رقیہ اس کی پہلی اور آخری محبت اس کے گھر کی رونق... ایسی چاہنے والی بیوی کی موجودگی میں بھلا وہ کسی اور کے بارے میں سوچ سکتا ہے؟ "لاحول ولا....." وہ بھی ایسی گندی اور بازاری عورت کے بارے میں....

اس دن وہ دفتر سے واپسی پر بوجھل بوجھل قدموں سے سائیکل پر چلا آرہا تھا اور جب بازار حسن قریب آیا تو اس نے ایک دم سائیکل آگے بڑھا دی۔ وہ جلد سے جلد ان نگاہوں کے جال سے نکل جانا چاہتا تھا، باہر آزاد فضا میں۔ وہ جو اوپر ایک گمراہ عورت کے چہرے پر لگی تھیں۔ بے حس و بے حرکت عورت کے چہرے پہ۔ بے تحاشہ نفرت اور غصے کے جذبات نے تھکن کے ساتھ مل کر اسے بے چین اور بے قابو کر دیا..... اس نے تیزی سے سائیکل گھسیٹی تو سامنے ٹھیک اس فلیٹ کی سیڑھیوں کے قریب پڑے ہوئے پتھر سے ٹکرا گیا..... کھٹارا سائیکل ان بیلنس ہو گئی۔ اس کی بد نصیبی تھی کہ سامنے سے آتی ایک سوزوکی نے بھی تیزی سے آتے ہوئے اس حادثے کی رہی سہی کمی پوری کر دی اور اسے سائیکل سے اڑا کر دور بالکل ان سیڑھیوں کی دہلیز میں سجدہ ریز کروا دیا..... گندی سی سیڑھیوں پہ وہ کسی روئی کے کالے کی طرح جا پڑا..... اوندھے منہ..... سائیں سائیں..... کئی سناٹے دماغ میں گھسنے لگے۔ ڈوبتے ذہن سے اس نے کئی گڈمڈ چہرے دیکھے..... دھندلے دھندلے سے..... اور اسے محسوس ہوا کہ اس کے سر سے بے تحاشہ خون بہہ رہا ہے..... سرخ سرخ خون..... پھر کئی چہروں کے خاکے اس کی نگاہوں میں گڈمڈ ہو کر گم ہو گئے۔

ذہن کے سناٹے چھٹے تو وہ ہوش میں آگیا۔ آنکھ کھلی تو وہ ایک صاف ستھرے میکتے کمرے میں سرمائی شیل کی رضائی اوڑھے بستر میں پڑا تھا۔ اس نے جلدی سے نظریں ادھر ادھر گھمائیں۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ "میں یہ کیا ہے۔" اس نے اپنے دکھتے ذہن پہ زور ڈالا تو وہ سب کچھ یاد آگیا۔ اس نے بے ساختہ اپنا ہاتھ سر پہ پھیرا... اور... واقعی پٹی بندھی تھی... اور ہاتھ پہ بھی... سر اور ہاتھ کی رگوں میں کھنچاؤ سا تھا۔ "اوہ میرے خدا۔" وہ درد کی شدت سے کراہ اٹھا... سامنے دروازے میں ایک سایہ ابھرا۔ وہ وہی تھی۔ سرخ ساڑی باندھے پریشان پریشان...

"تت... تم"..... وہ پوری قوت سے چیخنا چاہتا تھا مگر آواز حلق سے نہ نکل سکی.... نفرت کا تلخ جذبہ پوری شدت سے زخموں میں ٹیسیں اٹھاتا گزرنے لگا۔

وہ کسی چاہنے والی گھریلو عورت کی طرح اس کی طرف لپکی "آپ کو بہت چوٹیں آئی ہیں۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے' سر میں درد تو نہیں ہے اگر ہے تو آپ بیٹھیں میں بام لگائے دیتی ہوں۔"... اس نے ہمدردی اور پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بام کی شیشی اٹھائی جو قریب ہی رکھی تھی۔

وہ سلگ سا گیا "نہ' نہیں میں گھر جاؤں گا۔" اس نے جسم سے رضائی کو پرے پھینکا اور کھڑا ہو گیا بے ساختہ اٹھنے سے زخموں میں کئی درد کی لہریں اٹھیں۔ اس نے بے چین ہو کر اچھلا ہونٹ چبا ڈالا۔ وہ تڑپ کر اس کے پاس آئی۔

"آپ تھوڑی دیر تو لیٹیں...." وہ اس کے بے حد قریب تھی۔ اس کے جسم سے بے نام سی خوشبو اڑ کر اس کے نتھنوں میں بسنے لگی۔ یکایک اس کا سر چکرانے لگا اور وہ درد کی شدت سے تڑپ کر وہیں پلنگ پر بیٹھ گیا۔

وہ اس کے قریب بیٹھ گئی... اس نے حمید کو ہاتھ کے دباؤ سے بستر پر لٹایا اور بڑے پیار اور انہماک سے اس کا سر دبانے لگی۔

حمید کے دل میں نفرت کے لاوے کھولنے لگے۔ ایک بازاری عورت اس کے جسم کو ہاتھ لگائے۔ یہ اسے گوارا نہ تھا۔ نفرت آمیز جذبات سے گھبرا کر اس نے بیلا کو پرے دھکا دے دیا.... پوری طاقت سے... وہ تیورا کر دور زمین پر بچھی دری پر جا گری... مگر اس کی آنکھوں میں کوئی دکھ یا غصہ کچھ بھی نہ تھا... وہ زیر لب مسکرا رہی تھی' وہ اور جل گیا۔ "بڑی ڈھیٹ عورت ہے۔ ہزاروں مردوں کو برت کر جو بیٹھی ہے۔" اس نے غصے سے بستر کو چھوڑا۔ گندہ غلیظ' ناپاک بستر۔ ہزاروں بیماریوں کا مسکن... اس کا دل الٹنے لگا... اس نے پلنگ کے نیچے رکھے اپنے جوتوں کو گھسیٹا اور وہیں کھڑے کھڑے پاؤں میں پھنسانے

لگا... سوزے پاؤں میں نہیں تھے۔ اس نے مانگے بھی نہیں... وہ مسکراتی اس کے قریب آگئی اور اسے بازو سے تھام لیا... وہ سلگ گیا۔ اس نے جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑا لیا۔ "میں ایک وفادار شوہر اور ایک باپ بھی ہوں۔ تم میری ضرورت نہیں ہو سمجھیں۔؟" اس نے نگاہوں سے زہر انڈیل کر اسے گھورا۔ وہ مسکراتی مسکراتی چپ سی ہو گئی... اور شکایتی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے دوبارہ اس کا بازو پکڑ لیا بڑی اپنائیت سے.... "مو... مجھے تم سے محبت ہے۔" وہ نہ جانے کس طرح بولی تھی۔ "میں تمہاری ضرورت نہیں تو کیا....! تم تو میری ضرورت ہو۔" وہ عجیب گہرائی میں ڈوب کر بولی... وہ ششدر رہ گیا اور بدحواسی میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس نے اپنی متجسس نگاہیں چاروں طرف دوڑائیں۔ ایک کونے میں اس کی سائیکل کھڑی تھی۔

"یہ میں نے اوپر منگوالی تھی اور صاف بھی خود ہی کر دی۔" وہ چہک کر بولی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اپنی سائیکل اٹھائی اور سیڑھیاں اترنے لگا.... بیلا نے جلدی سے لپک کر اسے صدا دی۔ "سنو! پھر آؤ گے نا..." اس کی آواز میں ہزاروں ارمان مچل رہے تھے۔ امید ڈوب رہی تھی' ابھر رہی تھی۔ ایک حوصلے میں کتنے افسانے پنہاں ہوتے ہیں۔ وہ کسی مورتی کی طرح ساکت کھڑی اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں بے پناہ التجائیں تھیں۔

دن یونہی گزرتے رہے۔ سائیکل کا پہیہ گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر کی طرف چلتا رہا اور جب بھی حمید اس فلیٹ کے سامنے سے گزرتا۔ اس کے دل میں نفرت کے سوتے اسی طرح پھوٹتے رہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حمید کے گھر میں بچوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ اب وہ چار بچوں کا باپ بن چکا تھا.... گڈو پپو آگیا۔ پپو پہ گلو اور پھر بے بی آگئی اور تنخواہ بھی پانچ سو سے آٹھ سو ہو گئی مگر.... مہنگائی بڑھ گئی آٹھ سو روپے سکڑتے جا رہے تھے اور ضرورتیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اس کے روشن چہرے پر فکروں کے جال پھیل گئے تھے۔ کالے گھنگریالے بالوں میں چاندی اترنے لگی.... وقت کی چھاپ نے نرم چہرے کو اداسخت کر دیا۔ رقیہ کا سڈول جسم.... مہنگائی کی طرح بے ڈول اور پھیلتا جا رہا تھا۔ وہ کچھ اور دبلا ہو گیا تھا آنکھیں میلی سی ہو گئی تھیں۔ وہ محبتیں وہ چاہتیں سب کچھ اپنی اصلی چمک پہ زنگ لگا کر دل کے کسی کونے میں فقیر کی طرح سکڑی جا رہی تھیں۔ محبت طلب کرتی مگر مجبور..... وہی سڑک وہی دفتر وہی گھر..... مگر بچے بڑھ رہے تھے۔ وہ بڑے ہو رہے تھے۔ اسکول کے خرچ' کھانے کا خرچ' پہننے کا خرچ.... اف... یہ مسائل...! اس کی اکڑی ہوئی گردن جھکانے کے لیے کافی تھے... محبتوں کی طرح نفرتیں بھی گردن جھکا کر

بیٹھ گئی تھیں۔ رقیہ بھی چڑچڑی ہوتی جارہی تھی۔ بچے بڑھ رہے تھے' ۸۰۰ سو روپے سکڑ رہے تھے۔ سرکار بچوں کے تناسب سے تنخواہ کیوں نہیں بڑھاتی؟..... مہینے کا آخری دن' اذیت ناک' فاقہ زدہ' یاس دلانے والا دن..... سارے گھر میں خاموشی سی چھاجاتی۔ بچے بھی بجھے بجھے رہتے رقیہ بھی بڑبڑاتی رہتی..... اس اذیت ناک ماحول میں وہ بھی بجھ سا جاتا۔ سوچوں کے خانہ بدوش قافلے ذہن میں ڈیرا جمالیتے..... اور وہ اس درد کو اندر ہی اندر دبائے خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتا۔

"پاپا!..... میرے یونیفارم کا شرٹ پھٹ گیا ہے۔" گڈو منہ پھلا کر کہتا۔

"میں ہاکی لوں گا پاپا۔ سب کے پاس ہے۔ میرے پاس نہیں ہے۔ اسی وجہ سے لڑکے مجھے ٹیم میں شامل نہیں کرتے۔" گلو اپنا دکھڑا الگ سنا رہا تھا۔ "پاپا ہاف ٹائم میں میرے پاس پیسے نہیں ہوتے۔ سب بچے چیزیں کھاتے ہیں۔ ہمیں آپ پیسے دیا کریں۔" وہ سگ اٹھتا اور یہ تمام جملے ایک بے بس انسان کی طرح سنتا اور پی جاتا۔ ویران ویران آنکھوں سے بچوں کے معصوم چہرے دیکھتا اور گھٹ کے رہ جاتا۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ گاڑی کیسے کھنچے گی....." رقیہ کی باورچی خانے سے جھنجلائی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ "کیوں بھئی کیا ہوا؟"

"لو کیسی معصومیت سے پوچھ رہے ہیں؟ جیسے ساری ذمے داری میری ہے۔ حد ہوگئی۔ میں کہتی ہوں کب تک یوں بھوک سے مارتے رہو گے؟..... بچے بھی بڑے ہورہے ہیں۔ دوسری کوئی نوکری کیوں نہیں کرلیتے؟ اس موئی کلرکی سے چپکے رہو گے۔" رقیہ نے ڈبے سے دال کا ایک ایک دانہ جھاڑ کر دیکھی میں ڈال کر چولہے پر چڑھادیا اور بڑبڑاتی ہوئی اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

"آٹھ سو بھی کوئی حیثیت رکھتے ہیں آج کل کے زمانے میں' وہ تو پہلی تاریخ کو ہی کنارے لگ جاتے ہیں قرض خواہوں کے پاس اور باقی مہینہ پھر قرض سے چلنا شروع ہوجاتا ہے۔ پتہ نہیں پیسا کب ہماری قسمت میں آئے گا۔ ہماری زندگی تو یونہی گزر گئی نکڑوں میں۔ جل جل کر' لیکن آپ نے آج تک کوئی دوسرا کام بھی تلاش کیا۔ وہ شہناز کے میاں بھی تو شام کو پانچ سو روپے کی دوسری نوکری کررہے ہیں۔"

آخر یہ بیویاں ہر مرض کی وجہ بھی مرد کو اور دوا بھی مرد ہی کو کیوں سمجھتی ہیں۔ اب مرد بھی کیا کرے؟ کوئی باہر ریڑھیوں پر رکھ کر نوکریاں تو بیچ نہیں رہا ہے کہ پسند کرکے جو دل چاہے وہ نوکری لے لو۔ باہر تو حیثیت دیکھی جاتی ہے۔ میری حیثیت صرف کلرکی سے لے کر چوکیدار ہی تک محدود ہے۔ کاش کہ میرا بھی کوئی آفیسر دوست ہوتا۔ اس نے بڑی حسرت سے سوچا' اس نے اپنے بھٹکتے خیالوں کو روک لیا۔ کس کے پاس جاؤں کوئی بھی تو ایسا نہیں کہ کچھ دے سکے۔ ہر کوئی اپنی چادر کو کھینچ کھینچ کر جسم ڈھانپ رہا ہے

کسی اور کو کیا دے گا؟" "واہ میرے مولا واہ۔"

خیر..... اس نے دفتر جانے کے لیے سوچا اور اٹھ کھڑا ہوا باہر آنگن میں رکھی سائیکل کو میلے کپڑے سے پونچھنے لگا..... ناکارہ سائیکل..... اسے بالکل اپنی طرح لگی زبردستی گھسیٹ گھسیٹ کر زندگی گزارنے والی شخصیت..... !سائیکل صاف کرتے کرتے اسے وہ دن یاد آگیا جب وہ چند گھنٹوں کے لیے بیلا بائی کا مہمان بنا تھا..... اوہ میں بھی کہاں چلا گیا۔ اس نے خیالوں کو جھٹکا..... گھر میں چھائی ویرانی دل گھبرائے دے رہی تھی۔ بچے بڑے مایوس سے' تھکے تھکے سے اسکول کی تیاری کررہے تھے۔ ان کے معصوم اور اداس چہرے دیکھ کر وہ اور گھبرا کر سہم گیا۔ اپنی بے بسی پہ رونا سا آگیا۔ واقعی فیملی پلاننگ والے صحیح کہتے ہیں کہ بچے خوشحال گھرانہ۔" گڈو میٹرک میں تھا۔ کلاس کے ساتھ اس کی ضرورتیں بھی بڑھ گئی تھیں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی ضرورت ہر روز ناامیدی۔ وہ بچی بھی چڑچڑی اور ضدی بنتی جارہی تھی۔ حمیدنہ یہ بات محسوس کرتی تھی مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا..... یہ بچے آخر سمجھتے کیوں نہیں کہ باپ جو کچھ بھی کرتا ہے صرف بچوں کی خوشحالی کے لیے کرتا ہے۔ اب وہ کیا کرے کہ خدا نے اسے کلرکی کے قابل سمجھ کر ساری خوشیاں سمیٹ کر دور پھینک دیں..... اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے سائیکل کو دروازہ کھول کر باہر دھکیلا.....

"اتنی سنتے ہو..... آج کہیں سے کچھ قرض لے آنا..... اب تو گھر میں کچھ بھی نہیں بچا۔ محلے میں بھی مانگنے کو اب کوئی گھر نہیں چھوڑا کس سے مانگوں؟..... اب تو شرم بھی آنے لگی ہے۔" رقیہ غصے اور دکھ سے سلگ کر بولی..... وہ سب کچھ سن کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ چہرے پر مایوسی کے مزید سائے پھیل گئے' وقت سے پہلے ہی وہ بوڑھا ہونے لگا تھا..... وہ اپنے مسائل میں الجھا الجھایوں ہی سائیکل کو کھڑکھڑاتا بازار تک آگیا..... بیلا بائی اپنی بالکونی میں کھڑی تھی..... اس نے کچھ بھی محسوس نہ کیا۔ بس کسی روبوٹ کی طرح چلتا چلا گیا..... بیلا بائی کے جنون کو وہ اب نظر انداز کرگیا تھا۔ مجھ سے محبت کرتی ہے! ہوں گندگی کے ڈھیر سے بھی محبت کی خوشبو نہیں آسکتی..... !محبت اور گندگی کے ڈھیر سے آخ تھو..... توبہ..... !دفعتہ میں وہ سارا دن کی تھکاوٹ بیلا بائی اور سستی سے کام کرتا رہا..... قرض کی بابت اس نے اپنے تمام دوستوں کو ٹٹولا لیکن ہر جواب مایوس کن تھا۔ اسی ادھیڑبن میں دفتر کا وقت ختم ہوا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بجھے بجھے دل سے باہر نکل آیا..... خالی ہاتھ گھر کیسے جائے.....؟

ذہن میں الجھنوں کی یلغار ہورہی تھی۔ نہ جانے کس طرح وہ اس راستے پر آگیا جہاں کالے کی دکان تھی۔ وہ دکان پر آکر رک گیا۔ رقیہ کی سوالی نظریں۔ بچوں کے سوکھے سوکھے چہرے..... اومیرے خدا..... وہ دھم سے بڑبڑایا۔ کالے نے ایک نظر اس پر ڈالی اور سادا الاپچی والا پان بنانے لگا۔ کالے کی پھرتی بھی ست

ہوتی جارہی تھی... اس کے ہاتھوں کا رنگ سرخ ہو گیا تھا۔ بالوں میں سفیدی رنگ جما چکی تھی۔ جس پر خضاب اور بھی مضحکہ خیز نظر آرہا تھا۔ چہرے پر جھریوں کے آثار تھے لیکن آواز میں اب بھی جوانی تھی۔

"کیوں بابو... آج کچھ اداس ہو... کیا بات ہے۔" کالے نے ہمدردی جتائی۔

"کچھ نہیں کالے بھائی۔" ... وہ بس یہی بول سکا... اور سڑک پر آتے جاتے راہ گیروں کو دیکھنے لگا... اس کی بھٹکتی نظریں پھر اوپر چلی گئیں... وہ گیلری میں کھڑی تھی اور اسے ہی دیکھ رہی تھی... آج نہ جانے کیوں... حمید کی تھکی تھکی نظریں وہیں جم کر رہ گئیں۔

"تم میری ضرورت ہو۔ میں تمہاری ضرورت نہ سہی۔" سالوں پہلے کا سڑا بسا جملہ جو دماغ کے کسی گوشے سے نکل کر اس کے ذہن پر تیرنے لگا اور ذہن و دل میں کئی راہیں روشن ہو گئیں۔

"میں اس کی ضرورت کیوں ہوں۔ زمین یا پیسے والا ہوں اور نہ... اتنا جوان... جتنے اسے کئی اور مل جاتے ہوں گے۔ پھر!... مگر اب تو وقت بدل گیا ہے... اب شاید اگر اب بھی وہ میری راہ کیوں تکتی ہے۔" اس نے تھک کر سوچا... تو پھر... اس نے ایک فیصلہ کیا اور اپنی جیب کا آخری سرمایہ ۵۰ پیسے کالے کے حوالے کیے اور سائیکل گھسیٹتا دھیرے دھیرے ٹیڑھیوں کی جانب بڑھا جو نیلی گیلری کو جاتی تھیں۔ اس نے اپنی بوڑھی سائیکل باہر کھڑی کی اور بے دم... سے ٹیڑھال شکستہ قدموں سے ٹیڑھیوں پہ چڑھنے لگا۔ جیسے وہ سیڑھی نہیں بلکہ پل صراط ہو۔ وہ بھاری بھاری قدموں سے دروازے تک آیا اور دروازہ پکڑے چند لمحوں تک سوچتا رہا۔ اس کے قدم من من بھر کے ہو گئے تھے۔ وہ انھی بوجھل قدموں سے دروازے میں داخل ہو گیا۔

"تت... تم آگئے... آگئے نا..." بیلا تیزی سے آگے بڑھی... اس کی آنکھوں میں محبت کی جوت جل اٹھی اور اشتیاق دوآتشگی میں چلتی ہوئی اس کے قریب آگئی۔ سفید ساڑی میں ہلکے ہلکے سفید بال سجائے وہ کسی گھریلو خاتون کی طرح لگ رہی تھی پاکیزہ پاکیزہ..."

"آؤ... آؤ... اندر آؤ..." وہ اسے اشتیاق سے دیکھ کر تیزی سے بولی تھی... وہ کسی مشین کی طرح بے جان بے جان سا کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ وہی کمرا تھا۔ جہاں وہ چند سال پہلے آیا تھا۔ زخمی ہو کر' اس دن اور آج کے دن میں کوئی بھی تو دیوار کھڑی نہ تھی... جیسے کچھ بھی نہ گزرا ہو۔ وہی بیلا' وہی کمرا اور وہی محبت اور نفرت کی کش مکش... اوہ... اس دن کے آنے اور آج کے آنے میں کتنا فرق تھا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے... وہ کمرے کے دروازے پر کھڑا خود کو سنبھالتا رہا... کمرے میں کہیں بھی طوائفانہ پن نہیں تھا۔ صاف ستھرا کمرا' بستر پر سرخ چادر بچھی ہوئی تھی اسے یاد آیا کہ اس دن بھی بستر سرخ تھا۔ آج

سنبھالا ہوا تھا۔ صاف ستھری دیواریں' جن پہ سفیدی کی ہوئی تھی اور جوانی کی طرح چمک رہی تھیں ایک کرسیوں کا سیٹ اور زمین پر بچھی ہوئی دری اور ایک ٹیبل... کونے میں رکھی لوہے کی الماری جس میں قد آدم آئینے لگے تھے... وہ نڈھال سا ہو کر آگے بڑھا اور پھر بے سدھ ہو کر بستر پہ جیسے گر پڑا... اس نے خود کو اس ماحول میں ڈھالنے کے لیے سر کو ہاتھوں میں ٹیک دیا... بیلا خاموشی سے اس کو دیکھ رہی تھی آنکھوں میں کئی ستارے جگ مگ کر رہے تھے۔

"تم آہی گئے نا..." ... وہ بڑے سکون سے اور پیار سے اس کے قدموں میں زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی "مجھے تمہارا ہمیشہ سے انتظار تھا۔" اس نے اس کے سر پر نکلے ہاتھ کو ہولے سے اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا... وہ خاموش تھا... مگر دل و دماغ بغاوت پر کمربستہ تھے۔ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس کا دل گھبرانے سا لگا... دل میں آیا کہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ جائے دور بہت دور... مگر... ساری راہیں بند تھیں۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔

"تم بہت پریشان نظر آرہے ہو... کیوں؟" ... وہ کسی ماں کی طرح ہمدردی لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھوں میں اور ہمدردی' پیار' تشویش بہت کچھ تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ "یہ طوائف ہے' ہاں گندی عورت' کتنی آسانی سے پیسے کما لیتی ہے...؟" اس نے بے چارگی سے سوچا اور اس کے احساسات سلگنے لگے تھے...

وہ اس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ بغور دیکھ رہی تھی جیسے وہ اس کی صدیوں پرانی دوست ہو یا پھر بیوی اور ہمدرد اور مہربان۔ اسے خاموش دیکھ کر اس نے ایک طویل سانس لی... اور اس کے ہاتھ پر انگلیاں پھیرنے لگی۔

"تم مجھے شاید کچھ بھی نہیں سمجھتے' کچھ بھی نہیں... مگر میں تمہیں بہت کچھ سمجھتی ہوں... بہت کچھ... تمہیں شاید یاد ہو... میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمہاری ضرورت نہ سہی مگر تم میری ضرورت ہو۔" وہ آنکھوں کے دیپ جلاتی سرسراتی آواز میں بولی۔

"ہاں"... وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں آخر بول پڑا... "مجھے یاد ہے۔"... وہ نظریں جھکا کر بولا... بیلا کی آنکھوں میں دیپ جلنے لگے۔

"اور میں اس بنیاد پر آیا ہوں... کہ تم... اپنی جو بھی ضرورت ہو پوری کر لو... اور مجھے کچھ روپے دے دو۔" یہ الفاظ ادا کرنے میں کئی صدیاں گزر گئیں۔ کئی بار وہ مرا' جیا' مگر نہیں... وہ کہاں مرا' وہ تو وہ تھا اور بچوں کے لیے پیسے کمانے آیا تھا۔

"کک... کیا۔" .... وہ نازک سی عورت پوری طرح لرز کر آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی مگر وہ فوراً سنبھل گئی... اور اس سے پرے ہٹ کر سر جھکا کر دری پر بیٹھ گئی جیسے ان الفاظ کے زہر کو ہضم کرنے میں لگی ہو۔

کمرے میں قبرستان جیسا سناٹا تھا جیسے وہ زندگی سے آزاد دو مردے ہوں۔ ٹھنڈے جسم۔ بے کار، احساس۔ مگر نہیں وہ تو احساسات کے سمندر میں ڈوبتے ابھرتے دو انسان تھے۔ سلگتے، جاگتے، سوچتے انسان۔ حمید کو اپنے الفاظ کے اس اثر کی امید نہ تھی۔ وہ تو سمجھا تھا کہ وہ اٹھے گی یہ سن کر ہنسے گی، اترائے گی۔ خوشی سے اسے چومے گی... اور.... پھر؟ آگے سوچ ساکت ہوگئی۔ وہ اپنے الفاظ کو بار بار ذہن میں دہرانے لگا کہ ان میں کتنا زہر پوشیدہ تھا اور کتنا شہد اور وہ اس عورت کو دیکھنے لگا جو جوانی کی آخری سیڑھی پر آکر رک گئی تھی۔

اچانک بیلا نے سر اٹھایا اور مسکرانے لگی اسے دیکھ کر... جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ تک نہ کھیلی بلکہ وہ سپاٹ آنکھیں لیے اسے دیکھتا گیا.... اس کی بے حسی پر وہ اور بھی خفا ہوا خوب دل کھول کر... وہ حیران رہ گیا.... جب وہ ہنس چکی تو چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ پھر وہ ایک دم اٹھی اور اس کے قدموں میں آکر بیٹھ گئی۔ سر جھکا کر اس نے اس کے جوتے اتارنے شروع کر دیے۔ بڑی چاؤ سے.... پھر موزے اتارے۔ پھر اس نے الماری سے تیل کی شیشی اٹھائی اور ہولے ہولے اس کے سر میں تیل ملنے لگی اور آہستہ آہستہ اس کی انگلیاں اس کے بالوں میں پھسلتی رہیں۔ حمید کی سمجھ میں کچھ بھی تو نہیں آرہا تھا۔ یہ کیا ہے... اس کا یہ عمل اس کی سمجھ سے بالا تر تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چھت کی کڑیاں دیکھتا رہا۔

"تم بھی سوچتے ہوگے کہ یہ آخر چاہتی کیا ہے۔" وہ اچانک ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولنے لگی۔ "میں پتا نہیں کیا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں، بے حد پیار... مگر نہیں...؟" وہ الجھ سی گئی۔ "صاحب جی... بس کروں... کیسے بتاؤں..." وہ ہنس کر بولی۔

وہ اور الجھ کر اسے دیکھنے لگا... وہ اس کی نگاہوں میں جھانک کر مسکرا پڑی۔ "صاحب جی ہر عورت ایک ہی خمیر سے بنی ہے۔ رحم دل، جذباتی، صبر کرنے والی، اور ایک!" وہ رک سی گئی۔ "ایک خوبصورت گھر کی آرزو مند جو اس کا اپنا ہو۔ جس کو اس کے لیے اس کا بے پناہ چاہنے والا شوہر بنائے۔ جس میں اس کے اپنے بچے ہوں... دونوں محبت کے محافظ۔" وہ ہولے ہولے اس کے سر میں انگلیاں سر سراتی ہوئی بول رہی تھی "تم بھی سوچ گے کیسی پاگل عورت ہے۔ برسوں سے میرا یوں انتظار کر رہی ہے۔ ہاں

عمر بن عبدالعزیز اپنے عہد کے خلیفہ تھے ایک رات مسجد میں گئے وہاں کوئی شخص سو رہا تھا۔ اندھیرے میں آپ کا پاؤں اس کے بدن سے لگ گیا اس نے سر اٹھا کر "کہا تم پاگل ہو؟" عمر بن عبدالعزیز نے فوراً جواب دیا "نہیں۔" آپ کے ساتھ محافظ تھا اسے غصہ آیا کہ یہ شخص مسجد میں راستہ روکے لیٹا ہے اور خلیفہ سے یوں مخاطب ہوا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز نے محافظ کو روک دیا اور کہا "غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے پوچھا تھا کہ تم پاگل ہو ہمیں نے کہہ دیا کہ نہیں۔ بات ختم ہوئی جھگڑے کی کیا ضرورت ہے۔"

مرسلہ: روف اسلم آرائیں کراچی

واقعی پاگل ہوں۔ عورت ہوں نا... طوائف بن گئی مگر میرے اندر کی عورت تو طوائف نہیں بنی نا۔ مجھے اس اندر والی عورت نے بڑا تنگ کیا ہے صاحب جی۔" وہ سسک پڑی تھی۔

"یہاں ہزاروں مرد آئے اور چلے گئے۔ ہر کوئی اپنی آگ بجھانے آیا اور چند روپے میری جھولی میں ڈال کر چلا گیا... میرا یہ جسم ہر روز بکتا رہا... مگر قسم سے.... صاحب جی... میری روح کبھی بھی نہ بک سکی۔ کوئی خریدار ہی نہ ملا ایسا جو جسم کے ساتھ میری روح کا بھی سودا کر سکے۔" ... وہ عجیب دکھ سے ہنسی... اور حمید کو حیران حیران دیکھ کر ہنس پڑی۔ اس نے تیل کی شیشی اٹھائی اور الماری میں جا کر رکھ دی اور تولیہ سے اس کی گردن اور پیشانی کا تیل پونچھنے لگی۔ حمید کو پتا نہیں کیوں وہ اس وقت رقیہ سے بھی زیادہ اچھی اور خوبصورت لگی۔

"اچھا ایسا کرو صاحب جی.... چل کر نہالو..." وہ اسے بستر سے اٹھاتی ہوئی بولی۔ "جب تک میں چائے بناتی ہوں... شام ہوگئی ہے نا۔" وہ ایک ادا سے بولی... وہ کچھ بھی نہ بول سکا اور کسی معمول کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اسے بازو سے پکڑ کر غسل خانے میں لے گئی۔ اسے غسل خانے میں چھوڑ کر فوراً ایک سفید شلوار قمیص کا جوڑا نکالا اور اسے غسل خانے کے دروازے پر لٹکا دیا۔ وہ بڑی خوش خوش نظر آرہی تھی... ساری کا پلو اس نے کمر سے باندھ لیا تھا۔

"صاحب جی۔ یہ سوٹ دروازے پر لٹکا ہوا ہے۔ نہا لو تو پہن لینا۔" اس نے جلدی سے سوٹ لے لیا۔ نہا کر باہر نکلا تو وہ بستر ٹھیک کر رہی تھی... وہ بالوں کو تولیہ سے پونچھتا ہوا پلنگ پہ آبیٹھا تو وہ جلدی سے نکلی اور آئینہ لے آئی اور بڑے پیار سے اس کے بال سنوارنے لگی... حمید کو پتہ نہیں کیوں وہ طوائف اچھی لگنے لگی... وہ عجیب نظروں سے بیلا کو دیکھنے لگا۔ اس نے کنگھا واپس رکھ کر اسے مسکرا کر پیار دیا لگا ہوں سے دیکھا اور باہر چلی گئی۔

چند ہی لمحوں میں وہ گرم گرم چائے چینی کے خوبصورت سیٹ میں رکھ کر لے آئی۔

"ابھی ابھی تازے بنائے ہیں یہ پکوڑے... کھا کر دیکھو..." وہ بڑی محبت سے ایک پکوڑا اس کے م میں ڈالتے ہوئے بولی... حمید کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ نفرت کے جو آتش فشاں اس کے دل میں پل رہے تھے۔ وہ یکایک خاموشی کے ایک بیکراں سمندر میں ڈوب گئے۔

بیلا نے دو چائے کے کپ بنائے اور مسکرا کے ایک اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور خود بالکل لگ کر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ بڑے بے تکلفانہ انداز میں جیسے دونوں ایک دوسرے کے پرانے شیدائی ہوں۔ ہر روز ملتے جلتے ہوں۔ اسے یہ بے تکلفی نہ جانے کیوں عجیب سی لگی۔

"صاحب جی۔" وہ مسکرا کر بولی... "میرا دل چاہتا ہے کہ تم روز یونہی تھک کر دفتر سے گھر آؤ اور میں دن بھر تمہاری راہ تکتی رہوں۔ تمہارے کپڑے دھوؤں... چائے بنا کر تمہیں دوں۔ تمہارے سر کی مالش کروں... کتنی اپنایت ہوتی ہے میاں بیوی کے رشتے میں۔ صاحب جی میں تڑپتی رہی ہوں... عورت کے اصلی مقام کو پانے کے لیے۔" اس کی آنکھوں میں دکھ کے ڈورے کھنچ گئے پھر وہ اداسی سے بولی۔ "ماں بننے کے لیے۔ بیوی بننے کے لیے مگر میں ساری عمر سرابوں میں دوڑتی رہی... میں طوائف ہوں صاحب جی وقتی بھوک مٹانے والی غذا..." وہ نم نم پلکیں جھپکانے لگی۔

"تم واحد مرد تھے۔ جس میں شوہر بننے کی صلاحیتیں تھیں۔ میرے ذہن میں جو مٹا مٹا سا آوارہ خاکہ تھا شوہر کا' وہ میں نے تمہارے سانچے میں پرو دیا... پھر ہر روز صبح شام کسی بیوی کی طرح تمہارا انتظار کرنے لگی..." وہ چونک سا گیا... دھڑ دھڑ دھڑ... نفرت کی عمارت دھڑام سے گر پڑی۔ "میرے اندر کی جو عورت ہے نا... صاحب جی وہ بڑی ضدی ہے... بڑی ہی ضدی۔" اس نے ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگایا... دل میں ٹھہرے سمندر میں طوفان سا آگیا تھا۔ وہ ہر چیز کو باہر پھینکنے پہ تل گئی۔ برسوں کا بوجھ ہلکا ہو رہا تھا۔

"صاحب جی... یہ کمرا..." وہ کمرے کی دیواروں کو دیکھنے لگا... "یہ کمرہ میں نے کب سے صرف تمہارے لیے مخصوص کر دیا ہے۔" وہ کسی معصوم بچے کی طرح مسکرا کر بولی۔ "اس میں کوئی بھی نہیں آسکتا۔ نہ اس پلنگ پر کوئی سو سکتا ہے۔ بھلا کوئی میاں بیوی کے بیڈ روم میں آسکتا ہے؟" وہ سادگی سے اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اور وہ گڑبڑا سا گیا۔ "اوہ میرے خدا اتنی چاہتیں اتنی سچائیاں۔" اسے سب خواب لگا...

"پتہ ہے میں نے ہر سردی میں تمہارے لیے سوئیٹر بنائے ہیں۔ دکھاؤں؟" وہ موج کی طرح لہرا کر اٹھی اور الماری کھول کر کئی سوئیٹر لے آئی۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ اس کی بے تابیاں' شوق' چاہتیں؟ "یہ گزشتہ سال کا ہے۔ یہ اس سال کا... یہ تو تمہیں پورا آجائے گا۔"

وہ سحر زدہ سا سب کچھ سن رہا تھا۔ دیکھ رہا تھا۔ بیلا کو اس کے نہ بولنے کا کوئی دکھ نہ تھا۔ "یہ موزے، رومال۔ میں ہر عید پر تمہارے لیے خریدتی رہی ہوں۔" وہ اندرونی جذبوں کو ظاہر کرتے ہوئے بچھا ہوئی جا رہی تھی۔

"اچھے ہیں نا!" وہ بچوں کی طرح بے تابی سے بولی۔

"آ... ہاں... اچھے ہیں۔" وہ اس کا دل رکھتے ہوئے بولا۔ اس کی چاہتوں کے سامنے وہ دبا جا رہا تھا۔

"یہ سارے گھر لے جانا۔ ہوں، اب تو بچے بھی بڑے ہو گئے ہوں گے۔ میں نے دیکھے ہیں۔ کبھی تمہارے ساتھ جا رہے ہوتے ہیں۔" وہ دکتے اور شگفتہ چہرے سے بولی۔ "یہ دے دینا بڑے بیٹے کو، آخر سے میں ان کی ماں ہوں۔" وہ کئی موزے کے جوڑے اسے دکھاتے ہوئے بولی ماں کہتے کہتے اس کے چہرے پر کئی جذبے لرزنے لگے اس کو اس مظلوم سی پیاسی عورت پہ ترس آ گیا۔

"ان سوئیٹروں میں سے بھی جو جی چاہے لے جانا... سردیاں آ رہی ہیں۔ بچوں کو ضرورت ہو گی... ہے نا؟" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"یہ طوائف ہے... نہیں یہ عورت ہے۔ مکمل ماں۔ مکمل بیوی۔"

"صاحب جی۔" وہ ایک دم اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھول گئی۔ وہ پریشان سا ہو گیا۔ "مجھے ماں بناؤ گے نا....؟" وہ ایک دم بول پڑی.... اور وہ پریشان ہو کر اس پاگل سی عورت کو دیکھنے لگا۔ "میں نے ہر آنے والے اس بچے کو ختم کر دیا جو میرے غیر پسندیدہ مرد کی اولاد تھا۔ میں اپنے پسندیدہ مرد کے بچے کی ماں بننا چاہتی ہوں۔" وہ کسی جذبے کے تحت سرخ ہوتی ہوئی اس سے لپٹ کر بولی... "میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ صاحب جی۔ مجھے یہاں سے لے چلو۔ اب کماتے کماتے میں تھک گئی ہوں۔" وہ سسک کر بولی... حمید پریشان اور کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"ارے گھبراؤ مت صاحب جی میں تمہارے گھر نہیں چلوں گی۔ میں اپنا گھر خود بناؤں گی.... تمہاری بیوی بچوں کے لیے زہر نہیں بنوں گی.... بس صاحب جی مجھے زندگی کے چند لمحے دے دو... میری بھٹکتی بے منزل زندگی کو سہارا دے دو... مجھے اپنے بچے کی ماں بنا دو۔ صاحب جی شریف آدمی کا بچہ بھی اسی جیسا شریف ہو گا۔ ماں کو گناہ کی دلدل سے نکال لے گا۔" وہ جھر جھری لیتے ہوئے بولی... اس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ حمید کو ایک سسکتی، تڑپتی معصوم سی عورت پر بے پناہ پیار آ گیا، ترس آ گیا۔ اس نے بے ساختہ اسے اپنی آغوش میں بھر لیا۔ ساری نفرتیں آنسوؤں کے سیلاب میں بہہ گئیں.... وہ بھی ہولے ہولے رو رہا تھا کہ اتنی صداقتوں کے سامنے ساری زندگی ہیچ نظر آنے لگی تھی۔

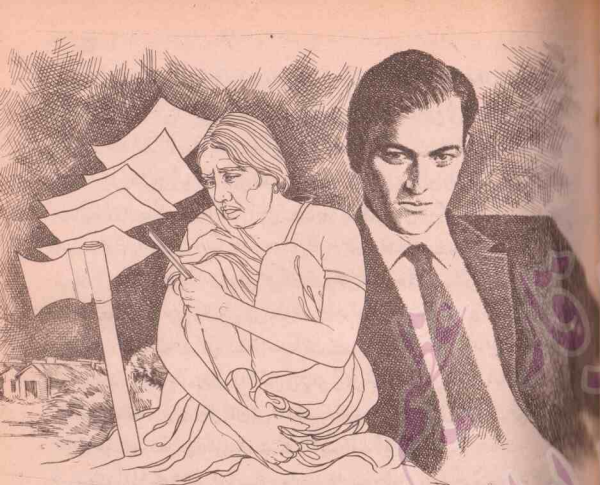

وہ یوں بیٹھے تھے جیسے ملاح اپنی کشتیاں ڈبونے کے بعد ساحل پر بیٹھے اُٹھتی موجوں کو تک رہے ہوں اُن کے راستوں میں تیز پُول آگ آئے تھے، سفید پرتنی کا بھرم رکھتے رکھتے ان کے پاؤں زخمی ہو گئے تھے۔ ایک دوسرے کا بھرم ٹوٹ جانے کا خوف اُن کے گرد پھیل چکا تھا

خالدہ اسد

بھرم

سرخ اینٹوں کا فرش دھو دھو کر چمکایا جا رہا تھا۔ جگہ جگہ سے ادھڑی اجڑی دیواروں کا بھرم رابعہ اپنی سفید پوشی کی طرح رنگین کاغذوں سے آنے کی لئی بنا کر رکھ لیا۔ میز پوش اور تکیے کے غلاف بد گئے۔ جو محنت شاقہ' اور رابعہ کے سلیقے کی منہ بولتی تصویر تھی آنگن میں پڑا ٹوٹی ٹانگ والا تخت ٹھاک کراس قابل بن گیا تھا کہ دادی اماں کی خوبصورت مخمل کے جھالروں والی ریشمی چادر ڈال کر دہ کملائے اور اسے فخر سے ڈرائنگ روم کی زینت بنایا جاسکے چادر کی نرم گرم مخملیں سطح پر ہاتھ پھ ہوئے رابعہ کو راحت اور آسودگی کا مسرت بخش احساس ہو رہا تھا۔ شکر ہے۔ دادی اماں تج سے واپس یہ چادر تو لے آئی تھیں۔ برسوں پرانی سہی مگر اچھے وقتوں کی یاد دلاتی ہے۔ کشن' دری' گجراتی مٹی خوبصورت شیشے سے مزین ڈیکوریشن پیس جو ہمیشہ ایسے موقعوں کے منتظر رہتے تھے کہ جب نگت در او یا سمین کے رشتے کے لیے کوئی آئے تو جھٹ ٹرنک سے باہر نکل آئیں۔ بقول دادی اماں اور امی' خا مہمانوں کی آمد پر ان سب چیزوں کا استقبال کی تیاریوں میں شامل ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ مہمانو واپسی کے ساتھ اور میزبانوں کی شان میں اضافے کے بعد یہ چیزیں واپس اپنی اصلی جگہ پہنچ جاتی تھیں آج تو معاملہ ہی اور تھا' آج تو تایا ابا آرہے تھے۔ افریقہ والے تایا ابا!

یہ وہی تایا ابا تھے جو اپنے ابا جی سے جایداد کے بٹوارے پر ناراض ہو کر گھر تو گھر وطن تک چھوڑ چلے گئے تھے اور بقول دادی اماں "ہماری طرح اجڑے پجڑے نہ تھے' ان کی افریقہ کی دولت الدین چراغ کی طرح مشہور تھی۔" لاکھوں میں کھیلتے تھے ابھی کچھ عرصہ پہلے انھوں نے اپنا ٹھکانا کراچی میں تھا مگر یہ خبر بھی ان لوگوں کو اسی خط سے ملی تھی وہ تو یہ سمجھے ہوئے تھے کہ وہ افریقہ میں ہی ہیں۔ خط کم سال دو سال بعد بھولے سے وہ لکھ دیتے تھے' چند برسوں سے یہ سلسلہ بھی منقطع تھا۔ دادی بیچاری صبر کر چکی تھیں کہ اچانک ان کا خط ابا جی کے نام آگیا تھا کہ ان کی فیملی کراچی منتقل ہو چکی ہے۔ کار جمانے کی تگ و دو میں وہ انھیں اپنی آمد سے فوری مطلع نہ کر سکے' اب فراغت ملی ہے تو وہ ان سے خیدر آباد آرہے ہیں۔ سب گھر والوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ دادی اماں گئے الگ اودھم مچا دیا۔ برسوں بعد ملنے والے بیٹے کی آمد نے انھیں حواس باختہ کر دیا وہ بچوں پر بار بار برس رہی تھیں اور تایا ابا کی لاکھوں کی جایداد کا ہوا دکھا دکھا کر ان سب کو بہلائے دے رہی تھیں۔ پہلے تو صرف اتنا معلوم تھا کہ تا ابا آنا چاہتے ہیں مگر آج تو اس فیصلے پر آخری مہر ثبت ہو چکی تھی یعنی تایا ابا نے اپنی آمد کی تاریخ بھی لکھ دی تھی۔ ابا جی صبح صبح بینک سے اپنی جمع پونجی نکال لائے اور امی جی کے ہاتھ پر رکھ کر بڑی متانت او

بھوگی سے بولے۔

"رابعہ کی ماں سوچ سمجھ کر خرچ کرنا خیال رہے بھائی جان کو کسی تنگی کا احساس نہ ہونے پائے۔ اں ذرا ہاتھ کھینچ کر خرچ کرنا جانے کب تک ان کا قیام رہے۔" ابا جی دہرے فلسفے میں امی جی کو الجھا رہے تھے اور امی جی اتنے ڈھیر سارے کرارے نوٹ دیکھ کر اور حواس باختہ ہو گئی تھیں۔ دور بیٹھی دادی اماں دلن کی طرح امی جی کے ہاتھوں کو گھورے جا رہی تھیں۔ ان کی نظروں کی تپش امی جی نے محسوس کر ل' ان کی ساری بشاشت دم توڑ گئی اور وہ نوٹوں کو دوپٹے تلے چھپا کر اندر کو لپکیں دادی اماں نے برا سامنہ ا۔ جھریوں بھرے چہرے پر مزید سلوٹوں کا جال بچھ گیا اور وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی لوٹا اٹھائے باتھ روم میں گھس گئیں۔ جب سے بیٹے کا خط ملا تھا ان کے پیٹ میں بار بار درد اٹھنے لگا تھا۔

رابعہ کے دل میں نرم نرم اور سحر زدہ جذبے ابھرنے لگے اسے اپنے چھوٹے سے گھر پر پیار آنے لگا تھا یہاں اس کے تایا ابا آنے والے تھے۔ کبھی وہ اپنی کم مائیگی کے احساس سے سلگنے لگتی کہ کاش ہم تایا ابا کا شایان شان استقبال کرتے۔ مگر کہاں؟ منگائی' قرضے' بہن بھائیوں کی تعلیم' دوا دارو اکیلے ابا جی کمائی میں کہاں کہاں بھرائی ہوتی۔ آنگن میں تین بیریاں سر اٹھائے کھڑی تھیں اور ابا جی کی کمر جھک رہی تھی۔ عادل اور سلمان چھوٹے تھے پورا گھر گلے گلے مفلسی میں دھنسا ہوا تھا لوگوں سے کچھ امیدیں وابستہ تھیں۔ یا پھر اب.... شاید تایا ابا کے آنے سے اس گھر کی قسمت بدل جائے۔ رابعہ کے دل میں نئی امیدیں سر اٹھانے لگیں۔ تایا ابا کے جوان بیٹے بھی تو ہیں کیا پتا تایا ابا اس غرض سے پاکستان آگئے ہوں اور یہاں بھی اسی مقصد کے لیے آرہے ہوں۔ اگر ایسا ہو جائے تو کتنا اچھا ہو! آرزوؤں کے رنگ دھنک ن کر نگاہوں کے سامنے پھیل گئے اور غریب کی آرزو بھی کیا' جنگل میں اگا ہوا خودرو پودے کا پھول۔ نہ الی کا آرزومند اور نہ رکھوالے کا امیدوار' کوئی دیدار کرنے والا بھی نہ ملے تو اپنی خوبصورتی سمیت ے پر ننگا سوکھ کر گر جاتا ہے۔ ایسی خودرو آرزوؤں کا دم توڑنا یا بیدار ہونا ایک ہی بات ہے مگر دل تو ہے ناداں سپنے دیکھے چلا جاتا ہے۔ رابعہ مسکرا پڑی۔

تایا ابا کیا آئے گھر بھر میں بہار اتر آئی رونق ہی رونق بکھر گئی سب سے لپٹ لپٹ کر ملے۔ دادی سے گلے ملتے وقت ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ان کا کھلتا گندمی رنگ سیاہی مائل ہو چکا تھا دادی بار بار یہ فقرہ دہرا رہی تھیں' نماز دھو کر فارغ ہوئے تو سفید براق دستر خوان پر رابعہ نے ناشتہ چن دیا یاسمین اور نگہت بھی ہاتھ بٹا رہی تھیں' ایک کر کھانے کی چیزیں پیش کرتی رہیں مگر رابعہ کا سلیقہ اور رکھ رکھاؤ اسے سب میں ممتاز کیے ہوئے تھا اس کی شکل و صورت بھی دونوں بہنوں سے اچھی تھی سب سے بڑی بات کہ دادی اماں کی زیادہ

خدمت بھی وہی کرتی تھی جس پر خوش ہو کر دادی اماں نے اس کی قسمت کی بلندی کی پیش گوئی کر دی تھی اور رابعہ اس پیش گوئی کے حوالے سے نئے خواب دیکھنے میں حق بجانب تھی۔ عادل اور حمید دائیں بائیں کرسیوں پر بیٹھے بڑے سلیقے اور شائستگی سے تایا ابا سے مصروف گفتگو تھے۔ پورا گھر تایا ابا کو متاثر کرنے کی فکر میں بچھا جا رہا تھا۔ نگہت اور یاسمین کو امی نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ خبردار جو انگی بول کر اس فضا کا تاثر کم کرنے کی کوشش کی لہٰذا وہ دونوں تو وقفے وقفے سے نمودار ہو کر مزید کچھ لانے لے جانے کے علاوہ کسی معاملے میں حصے دار نہ تھیں تایا ابا پورے گھر کو تو سینی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ بچے کتنے مہذب اور شائستہ ہیں خاص طور پر رابعہ ان کو بے حد پسند آئی تھی۔ وہ بار بار اس کے گھڑاپے کی تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے تھے لگتا تھا کہ انھیں اس صاف ستھرے گھر کی ہر شے اور ہر فرد نے متاثر کر لیا ہے وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے اور پھر تایا ابا نے ان سب کے لیے لائے گئے تحفوں کا بکس کھولا۔ یہاں بھی امی کا سکھایا ہوا درس کام آیا۔ اپنی اپنی بے تابی چھپانے میں وہ سب کامیاب ہو گئے تھے۔ تینوں بھتیجیوں اور بھابی کے لیے جاپانی کے خوبصورت کڑھے ہوئے دوپٹے' رنگ برنگی چوڑیاں سلمان اور عادل کے لیے بوسکی کے کرتے شلوار دادی اماں کے لیے آئرش لینن کا جوڑا' ابا جی کے لیے گھڑی' حمید کے لیے ایئر گن۔

"اف اللہ اتنی سوغاتیں۔" ہارے تشکر کے سب جھکے جا رہے تھے۔ کون کہتا ہے کہ نظر اور جھل پیار او جھل دور رہنے سے تو تایا ابا کا پیار اور بڑھ گیا تھا کبھی کبھار لکھے گئے خطوں کے ذریعے انھوں نے ہم کی تعداد' ان کی عمریں کبھی کچھ یاد رکھا ہوا تھا وہ لکھ پتی تھے تو یقیناً مصروف آدمی بھی تھے مگر ان بچوں ا چھوٹی چھوٹی خواہشات نہیں بھولے تھے۔ بھلا ان کو کیا معلوم تھا کہ رابعہ نگہت یا سمین بھی سرو کی طر بڑھ گئیں اب عادل اور سلمان نے سر نکالا ان کے ہر طرح کے حالات سے بے خبر ہوتے ہوئے بھی با تھے گھر کے ہر فرد کو ان پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

دادی اماں تو ان دس بارہ دنوں میں واری نیاری ہو کر تھک چکی تھیں مگر دل تھا کہ سیر ہی نہ ہو پا را بچ ہے اولاد اولاد ہی ہوتی ہے بھلے بال بچے دار ہو کما کو ہویا بڑھاپے کو پہنچ چکی ہو' ماں باپ کو ہمیشہ بار پاؤں چلتی دکھائی دیتی ہے۔ کھانے پینے سے فراغت کے بعد دادی اماں برسوں کے بچھڑے بیٹے کا سر گ میں رکھے دنیا جہاں کا پیار نگاہوں میں سمیٹے باپ کو اور تول تول کر گفتگو کر رہی تھیں وہ کب سے ا موقع کی تلاش میں تھیں کہ بیٹے سے اس کے دل کی بات پوچھیں انھیں ہمہ وقت اپنے غریب بیٹے کی ا تین جوان بیٹیوں کی فکر رہتی تھی امیر بیٹے کی اچانک آمد نے دل میں امید کی شمعیں روشن کر دی تھیں

عمل کر بات کرنے سے ڈرتی تھیں' بیٹے کے مزاج کا اندازہ نہیں تھا جانے کیا بات بری لگ جائے اور وسوں کا بچھڑا' بوڑھی آنکھوں کو پھر انتظار کی راہ دکھا جائے کیا معلوم اس پڑھی لکھی نازونعم کی پروردہ اولاد میرے ان حرماں نصیب بیٹے کی فیملی میں شامل نہ ہو سکتی ہو۔ رابعہ پوری کی پوری اپنی ساری خوبیوں بیت ان کے سامنے ان کی آنکھوں تلے مسکرا مسکرا کر حوصلہ دلا رہی تھی "دادی اماں میرے تایا ابا سے ات تو کرو' دادی اماں تم ڈرتی کیوں ہو۔ مجھ جیسی لڑکیاں تو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے نہیں ملتیں۔ اگر تایا ابا کا بیٹا بہت ہی پڑھا لکھا خوبصورت اور مالدار ہے تو میں بھی اپنی خوبیوں میں کسی سے کم نہیں اور پھر میں ان کا خون تو ہوں۔"

"ظالم! بیٹے تجھے رابی کیسی لگی؟" دادی نے دھیرے دھیرے کچھ کہنے کا حوصلہ پکڑا۔

"بہت ہی اچھی بچی ہے اماں بہت اچھی مجھے تو بے حد اچھی لگی ہے۔"

"پھر بیٹا میں اعظم سے بات کروں؟ کئی جگہ سے رابعہ کے لیے پیغام آچکے ہیں مگر ابھی کسی سے ہاں یں کی ہے ایک جگہ تو بات پکی ہوتے ہوتے رہ گئی تھی جانے کیوں مجھے یہ یقین تھا کہ میری رابعہ تیرے گھر ہی جائے گی۔"

"اماں! بس آپ کی ہو اور پوتے تو ابھی افریقہ ہی میں ہیں میں انھیں جلد بلوالوں گا پھر سوچیں گے۔" ظم نے قول موں جواب دیا تو دادی اماں چونک پڑیں ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔

"میری بہو بی پرائے ملک کی ہے جانے کس مزاج کی ہو۔ ہم اسے پسند آئیں نہ آئیں' کیا معلوم اور پھر ر بچے بھی بڑے ملکوں میں پڑھے ہوں گے اپنوں سے دور رہے' انھیں بھلا چچا کی محبت کیا ہو گی یہ ادی باتیں تو تجھے ہی طے کرنا ہوں گی۔ انھیں اپنی بوڑھی دادی کے ارمانوں کا کیا خیال ہو گا میرا بیٹا تو تو ں ہے نا۔" وہ بے حد افسردہ ہو گئیں۔

"نہ اماں! ایسی بات نہ کریں میں نے بچوں کو تعلیم ایسی دی ہے کہ وہ آپ سب کو خوب جانتے ہیں انھیں پتا تھا کہ اپنوں میں جانا ہے سب ہی بہت محبت کرنے والے بچے ہیں کیا ہوا جو تعلیم ہوئی دولت ں نہیں رشتے تو نہیں توڑ سکتیں۔"

اس حوصلہ افزا جواب پر دادی اماں کھل اٹھیں۔ اماں نے اپنے حسابوں دونوں خاندانوں کو مضبوط ں میں باندھ دیا تھا۔ چپکے چپکے ساری باتیں ایک دوسرے کو پاس ہو گئیں اور سارا گھر خوش ہو گیا۔ اگلے دن کرتے ہوئے گزرنے لگے سب نے مقدور بھر ناظم تایا کی خدمت کی انھیں حیدر آباد کی ساری ج گاہیں دکھا ڈالیں۔ شاہی بازار' رانی باغ' چڑیا گھر اور شیشے کے کام کے کارخانے تک جا کر دکھائے

ریڈیو اسٹیشن کی سیر بھی کروائی حالانکہ سب جانتے تھے کہ ان چیزوں سے تایا ابا کو بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی تھی وہ تو ٹکر ٹکر گھوم پھر کر آنے والے آزاد پکھیرو تھے مگر بچوں سے ان کی بے پناہ انسیت کا ثبوت تھا کہ وہ ان کے ساتھ ساتھ گھومتے رہے۔

ایک ایک کرکے تین دن بیت گئے بچوں کے لیے یہ وقت چنگیوں میں گزرا تھا مگر سفید پوشی کا بھرم رکھنے والوں کے لیے یہ دن صدیاں بن گئے تھے۔ مجبوریاں تو انسان کی نیندیں اڑا لے جاتی ہیں۔ دھواں دھواں چہرے سلگتے دلوں کا آئینہ بن جاتے ہیں یہی حال ابا میاں کا تھا تیس صبر آزما دن گزر چکے تھے اور ان دنوں کی کوئی رات ایسی نہیں گزری تھی جس نے ابا میاں کو سکون کی نیند سونے دیا ہو۔ سفید پوشی کے بھوت انھیں رات کو آ آ کر ڈراتے رہتے تھے آنے والے دنوں کا خوف ان کی نیند کا دشمن بن گیا تھا ابا کسی صورت جاہی نہ چکتے تھے جانے یہ گھر کیوں اس قدر پسند آگیا تھا۔ چہروں پہ جھوٹی امارت کا ماسک لگاتے لگاتے سب گھر والے تھک چکے تھے۔ ایک دوسرے کی صورتیں سوالیہ نشان بن کر جواب طلب کر رہی تھیں۔ ابا کی جھکی ہوئی کمر مزید جھک رہی تھی۔ قرضے مانگ مانگ کر کہاں تک اپنی مصنوعی امارت کا بھرم رکھتے۔ اب تو یہی رہ گیا تھا کہ بیچ چوراہے پر کھڑے ہو کر موت کے نام پر چندہ اکٹھا کرکے اپنی عزت بچالیں نگہت کے کانوں کی بالیاں تک پٹڑیوں میں اتر چکی تھیں اس گھر کو آنے والے راستے میں ببول کے کانٹے اگ آئے تھے کہ یہاں آتے ہوئے اجی کا دل کانپا کرتا مبادا گھر میں قدم رکھوں اور ہر طرف کی دیواریں گر چکی ہوں مگر ان دیواروں کو سنبھالا دینے والے بھی اڑی اڑی رنگت لیے ان کے منتظر رہتے کہ شاید وہ کہیں سے نیا قرض لے آئے ہوں۔ رابعہ نے ننھے سلمان کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ ان خوبصورت دیواروں کو نہ چھونا اندر سے جن نکل آئے گا مگر جب وقتے وقتے سے سلمان میاں کو رشوت میں ملنے والی میٹھی گولیاں بند ہو گئیں تو احتجاج کے طور پر اس نے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دیواروں پر رنگین کاغذ نوچ ڈالے اور پلستر اکھڑی دیواریں سچ مچ جن بن کر گھر والوں کو ڈرانے لگیں لگتا تھا تایا ابا بھی شاید فرصت ہی فرصت نصیب تھی کہ ہمہ وقت دیوان پر لیٹے شعر موزوں کرتے رہتے ایک دفعہ کروٹ بدلی تو دیوان کا ٹوٹا پایا فریادی بن گیا دو تین اینٹیں جما کر رابی اور سلمان نے اسے کھڑا کیا چادر ڈال کر کے دیوان کا عیب چھپایا اور تایا ابا نے اپنا شغل پھر شروع کر دیا۔

پاس پڑوس والوں نے قرض دینا بھی بند کر دیا تو پھر پتلی دال پکنے لگی روٹ کھانے والا ہو تو کرا نوٹ کب تک ساتھ دیتے تایا ابا کی رکابی میں زیادہ گھی ڈال دیا جاتا تایا ابا پھر بھی بدمزا نہ ہوئے شاید بدیسی بیوی کے ہاتھوں اونگے بونگے کھانے کھا کر وہ بھی تھک چکے تھے دال پنچارے لے کر کھاتے اور

رابعہ کی تعریف کرتے نہ تھکتے اور جب پتلی دال بھی نہ رہی تو امی جی بدحواس ہو کر دادی اماں کی طرف لپکیں پہلے تو دادی اماں ٹکر ٹکر دیکھا کرتیں لگتا تھا چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے مگر وہ ایک چونی بھی بہو کی ہتھیلی پر نہیں رکھیں گی۔ امی جی کا مارے غصے کے ٹمپریچر انتہائی ہو گیا کہ بس نہ چلتا تھا ابھی بڑی بی کا خون ہی نوچ لیں۔ بڑھیا قبر میں لے کر جائے گی۔ غضب خدا کا بچے اپنا گولک تک توڑ کر دے چکے تھے مگر یہ اماں مایا پر سانپ بنی بیٹھی ہیں اپنی اولاد پر خرچ کرنے کو تیار نہیں یہاں عزت نیلام ہو رہی ہے اور انھیں پروا ہی نہیں یہی تو وجہ ہے کہ ان کی ساری اولاد ان سے منہ پھیرے رہی۔ برسوں بعد روٹھا بچہ آیا تب بھی ان کا رویہ نہ بدلا "امی جی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی رہیں۔ دادی نے جیسے کان ہی بند کر لیے تھے گھر بھر کی ٹوٹیاں کافور بن کر اڑ چکی تھیں گھر پر قبرستان کا گماں ہونے لگا' نہ رو سکتے تھے نہ ہنسنے کو دل چاہتا تھا ایک ہی فکر گھر بھر پر سوار ہو گئی تھی کہ کسی طرح تایا ابا اپنے گھر سدھاریں مگر ایسا لگتا تھا تایا ابا کو تو یہ قبرستان ہی پسند آگیا تھا۔ رومان پرور ماحول' دیہی فضا' اصلی دودھ مکھن اور کروخالص' نگہت جل کر کباب۔ کام کر کر کے وہ بھی تھک چکی تھی۔ "ہنگامہ پرور شہروں میں رہنے والے یہ دولت مند صاحب اور بھلا اتنا پرسکون ماحول اور اتنی خاطر مدارات چھوڑ کر کیوں جانے لگے۔ ان کے صاحبزادے تو کبھی کے اڑ بھاگتے ہوں گے گھروں میں ہا" ہو والی پارٹیاں ہوتی ہوں گی جبھی تو سکون کے ترسے ہوئے صبح کے آثار کو اور رات کے سوئے دن کے بارہ بجے اٹھتے ہیں جب تک ان کی برسوں کی تھکن نہیں اتر جاتی یہ یہاں سے نہیں جائیں گے۔" نگہت کی آواز اونچی ہونے لگتی تو رابعہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی۔

پھر نگہت اور عادل نے چپکے سے حمید کو قاصد بنا کر تایا ابا کے پاس بھیجا کہ اسے کراچی لے چلیں اس کی چھٹیاں ہونے والی ہیں اس طرح کم از کم ان کا پروگرام تو معلوم ہو گا کہ حضرت کب جا رہے ہیں حمید تو بھرا ہوا تھا وہ غریب بازار سے سودے لا لا کر آدھ موا ہو چکا تھا۔ جب سے تایا ابا آئے تھے زور سے بولنے اور چیخنے تک کو جوتے ترس گئے تھے نگہت اور عادل نے اسے اپنا ہمراز بنا کر تایا ابا کے پاس کراچی کا پروگرام بنایا تو وہ کھل اٹھا اور مشورہ پاتے ہی تیر کی طرح ڈرائنگ روم کی طرف بھاگا۔

"تایا ابا! تایا ابا! پلیز مجھے اپنے ہمراہ کراچی لے چلیں نا۔ مجھے کراچی دیکھنے کا بڑا ہی شوق ہے' میری چھٹیوں کے دو ماہ کی چھٹیاں ہو رہی ہیں' کراچی کی بہت تعریف سنی ہے' وہاں منوڑا اور کلفٹن بھی ہے' وہ بھی دیکھوں گا اور کیا نام ہے؟ وہاں کا جہاں بکرے کے برابر جوئیں ہیں' کیا نام ہے؟" یہ کہتے کہتے حمید کی نظر تایا ابا پر پڑی تو اس کا دل بجھ سا گیا اپنی ترنگ میں اسے مہلت نہ ملی کہ تایا ابا کے تاثرات پہلے ہی پڑھ

لیتا۔ وہ اس کی بات پر مسخروں کی طرح مسکرائے جارہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں کہ میاں اپنی اوقات دیکھو ڈھنگ کا کپڑا تو تن پر ہے نہیں چلے ہیں کراچی دیکھنے۔ حمید کا ذرا سامنہ نکل آیا اس نے دل ہی دل میں تایا ابا کو کوسا کہ اوپر اوپر سے محبت جتاتے ہیں اندر سے ان کا دل پیار سے کتنا خالی ہے اور پھر اتنی شان دار شخصیت رکھنے والے تایا ابا جو دن میں دو سوٹ بدلتے ہیں اتنی خوشبوئیں چھڑکتے ہیں رنگ رنگ کی ٹائیاں لگاتے ہیں ہم جیسے مسکین صورت وحشت ماروں کو لے کر گھومنے میں کون سی ان کی عزت میں اضافہ ہوگا بیچارے ڈرتے ہوں گے کہ لوگ پوچھیں گے یہ کون ہے تو کیا جواب دیں گے۔ حمید کو تایا سے ہمدردی سی ہونے لگی منہ لٹکا کر بولا "تایا ابا! آپ کے ساتھ جاؤں گا ضرور مگر وہاں مارٹن روڈ پر میرا دوست ہاشم ہے اس کے پاس ٹھہر جاؤں گا۔"

"بھئی لوگوں کے پاس رہنے کی کیا ضرورت ہے اپنا گھر جو ہے مگر ایک بات ہے کہ تم بہت کام کے آدمی ہو' سارا دن گھر کے سودے لاتے ہو' اماں کے سب کام تم ہی کرتے ہو بھلا بھابی تمہیں جانے دیں گی؟"

حمید یہ سن کر خوش ہوگیا پیار سے ان کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"اچھے تایا ابا آپ لے چلیں سودا بھائی لایا کریں گے اور اماں نے بھی اجازت دے دی۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" تایا ابا نے بے دلی سے ہامی بھرلی۔ حمید خوش خوش باہر نکلا مگر اس کے روپہلے ارمانوں پر خزاں چھاگئی وہ تو تایا ابا کے جانے کا پروگرام معلوم کرنے گیا تھا مگر اپنی بات طے کرکے لوٹ آیا اور اسی بات پر باہر ہڑبونگ مچی ہوئی تھی سب گنگنا اور عادل کو سو سو خرافات سنا رہے تھے۔

کمبختو! اپنے حال نہیں دیکھتے اور اس لنڈورے کو بھی تیار کردیا' کیا لے کر جائے گا لینے کو تو سب خود تھے مگر دو گے کیا؟ خالی ہاتھ ہل ہل کرتا بڑا اچھا لگے گا۔" حمید پر نظر پڑتے ہی امی جی کا بلڈ پریشر مزید ہائی ہوگیا۔

"ادھر آ نتو کی شکل! بے غیرت فریاد تو کر آیا اب ٹکٹ اور خرچ کے پیسے کہاں سے لائے گا وہ تیرے ماموں تو نہیں کہ مفت میں سیر کرادیں گے خبردار جو جانے کا نام لیا۔"

"امی کون سا لاکھوں کا خرچ ہے ایک ٹکٹ ہی تو لینا ہے سو تایا ابا لے دیں گے وہ لے جارہے ہیں جانے دیں اس بہانے حمید عیش کرے گا۔" نگہت نے دبی زبان سے طرفداری کی۔ دادی اماں کے کان میں بھی اس معاملے کی بھنک پڑگئی بہو کے طعنے سن کر ان سے رہا نہ گیا جھلا کر بولیں۔

"شرم کرو بے غیرتو! پہلی دفعہ تایا نے منہ لگایا اپنے عیش وعشرت کے دن چھوڑ کر تم سے ملنے آیا ہے کوئی تمہاری طرح ننگا بوچا نہیں ہے کہ کرایے کے پیسے تک نہ دے گا کم بختو اتنا کچھ ساتھ لایا اسی

احسان مان لو۔ جو منہ میں آیا بکنے بیٹھ گئے ہو شرم کرو شرم۔" انھوں نے بہو کی طرف انگلی اٹھائی تو حمید پر گھڑوں دل کو کچھ ہونے لگا' سہما ہوا یتیموں کی طرح کونے میں کھڑا تھا۔ دادی اماں کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ ہائے ہائے کا ورد کرتی کمر پر ہاتھ رکھے اٹھ دیں' اپنے پیچھے گھسٹتے دوپٹے کو اٹھائے بغیر گھٹنوں کے زمین پر بیٹھ کر ٹین کا ٹرنک گھسیٹا اور ہزاروں چیتھڑوں میں سے ایک پوٹلی نکالی پھر ٹٹول ٹٹول کر طرمندنہ کی طرف گیا ہوا سو کا نوٹ نکالا اور بہو کی طرف بڑھایا۔

"یہ لے' دو حلوہ سوہن کے ڈبے منگوالے میلے میں سے جو دو دوپٹے اعظم لایا تھا وہ اور حلوہ حمید کے ساتھ کردینا۔"

امی جی کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ نوٹ کی خوبصورتی تازگی اور کرارے پن کا ہاتھوں سے مزا لیا اور باہر صحن میں آگئیں۔ "پہلے کھانے کا تو کچھ کرلوں صبح سے آدھ سیر گوشت کے لیے خوار ہورہی ہوں۔"

امی جی نے دل ہی دل میں سوچا اسی لمحے سلمان میاں کے چیخنے کی زبردست آواز آئی امی بدحواس ہوکر اور بھاگیں صحن کا دروازہ ڈیوڑھی میں سے بند تھا امی ڈرائنگ روم کی طرف لپکیں۔ تایا ابا شعر موزوں کرنے میں مگن تھے یا پھر چھت کی کڑیاں ملا رہے تھے' امی بدحواسی میں دیوان سے ٹکرائیں' یکدم وہ گھرائے تب تک امی سلمان میاں کے کمرے میں پہنچ چکی تھیں۔ دادی اماں نے ہری مرچوں کے ہار سکھا کر اور کمرے میں سفید چادر پر رکھ دیے تھے سلمان میاں نے دولہا بننے کے شوق میں وہ ہار گلے میں ڈال لیے تھے اور جب مرچوں نے اپنا کام دکھایا تو چلا چلا کر سارا گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔ سارا گھر ان کے اردگرد جمع ہوگیا کوئی شدھ مل رہا تھا کوئی بالائی اور گھی مگر سلمان میاں کی چیخیں عرش بریں پر پہنچ رہی تھیں جب وہ روتے روتے نڈھال ہوگیا تو دادی اماں کی گود میں سوگیا اور سب کے اوسان بحال ہوئے۔ امی جی کو یاد آیا کہ انھیں گوشت منگوانا تھا اس کے ساتھ انھیں دادی اماں کا دیا ہوا سو کا نوٹ یاد آیا۔ جسے وہ اس ہنگامے کی نذر میں بھول چکی تھیں' اور وہ اب ان کے ہاتھ سے غائب ہوچکا تھا شاید سلمان میاں کو بہلانے کے لیے وہ ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

"یا اللہ! ابھی میرے ہاتھ میں تو تھا۔" امی جی سخت پریشان تھیں انھوں نے چپکے چپکے سب جگہیں کھنگال لیں مگر نوٹ نہ ملا۔ امی کی پریشانی کا آہستہ آہستہ سب کو پتہ چل گیا۔ سو روپے ایسی رقم نہ تھی جس کی گمشدگی پر تشویش نہ ہوتی اور اب چپکے چپکے سب نوٹ ڈھونڈ رہے تھے دادی اماں آنکھوں ہی آنکھوں میں بہو کا لہو پی رہی تھیں۔ حمید اور عادل الگ سراسیمہ تھے' رابی آپا دور گھڑونچی کے آس پاس

منڈلا رہی تھیں کیونکہ امی جی سلمان میاں کا منہ دھلوانے وہیں گئی تھیں۔ امی جی سب کے چہروں پر نوٹ تلاش کر رہی تھیں۔ نوٹ کوئی بھی چرا سکتا ہے اس کی ضرورت سب کو ہے مگر کسی کے چہرے سے نوٹ شان دار سراغ نہ ملا اب سب کی نظریں حمید کے ہر قدم کے ساتھ اٹھ رہی تھیں ابا کو اس پر پورا شک کی ٹائیاں اپنے کمرے میں آکر آواز دی۔

"حمید"

"جی ابا!"

"ادھر آؤ" اور حمید لرزتی ٹانگوں سے ابا کے کمرے میں پہنچا۔

"دیکھ حمید سچ سچ بتا دے نوٹ کہاں ہے؟ ورنہ میں تیری چمڑی ادھیڑ دوں گا۔"

"مگر ابا جی میں نے نوٹ نہیں لیا۔" وہ گھگھیا کر بولا۔

"خاموش بدذات چوری اور سینہ زوری تجھے پیسوں کی ضرورت تھی تو مجھ سے مانگ لیے ہوتے کمبخت چوری کر کے لے گا اتار کپڑے۔" وہ تلاشی لینے پر اتر آئے۔

"مگر ابا جی خدا کی قسم نوٹ میں نے نہیں لیا"

"اتار کپڑے ـــــ سارے اتار ـــــ یہ بھی اتار ـــــ ہاں بنیان بھی"

زیر جامہ کے علاوہ حمید کے تن پہ کچھ نہ رہا مگر نوٹ پھر بھی نہ ملا۔ آخر نوٹ گیا کہاں؟

"تو کسی کو دے تو نہیں آیا؟" ابا نے شکی انداز میں پوچھا مگر پھر یاد آگیا کہ یہ تو سب کے سامنے دیر سے کھڑا تھا۔

سارا ماحول عجیب سا ہو گیا تھا سب یوں بیٹھے تھے جیسے ملاح کشتی ڈبو کر بیٹھے ہوں اس کھسر پھسر اور مار دھاڑ کی آوازیں یقیناً تایا ابا کے کانوں میں پہنچ گئی تھیں تبھی تایا ابا دیوان سے اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتے دادی اماں کے پاس آئے آخر ان سب کے کنگلے پن کا تایا ابا پر بھید کھل ہی گیا دادی اماں کے کو وہ سن چکے تھے اور امی جی کی واویلا بھی۔ آہستہ سے بولے۔

"اماں بہت دن رہ لیا فرم والے الگ پریشان ہو رہے ہوں گے یہاں کچھ ایسا دل لگ گیا تھا کہ جانے کو جی نہیں چاہا۔ خیر اب اجازت دیں آج شام کی گاڑی پکڑ لوں گا۔ ہاں حمید چلنے کو کہہ رہا تھا اس سے کہیں کہ تیار ہو جائے۔"

امی جی نے سکھ کی سانس لی ابا جی تھوڑے سے نادم تھے کہ ان کی حمید پر گرجنے کی آواز بھائی جان نے نہ سن لی ہو۔

تایا ابا سب سے بے نیاز اپنا اٹیچی کیس بند کر رہے تھے سب بچے نظروں ہی نظروں میں خدا کا شکر ادا کر رہے تھے کہ کسی صورت تایا ابا نے جانے کی تیاری تو کی۔ حمید کو بھیجنے پر کوئی رضامند نہ ہوا اور وہ جاتا بھی کیسے اکلوتا نا تو گم ہو چکا تھا جو اس گھر کی کل پونجی تھا۔

تایا ابا سب کے سروں پہ باری باری ہاتھ پھیرتے امی جی کے پاس آئے۔ بھابی آپ فکر مند نہ ہوں۔ آپ ضرور سوچتی ہوں گی کہ کچھ بھیج نہ سکی تمہیں خود اسٹیشن سے کچھ چیزیں خرید کر آپ کی طرف سے لے جاؤں گا ایک ہی بات ہے میں جلد ہی پھر آؤں گا تو واپسی میں حمید کو ضرور لے جاؤں گا پھر آپ کا کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ وہ رابعہ کی طرف دیکھ کر مسکرائے مگر ان کی مسکراہٹ کسی کو اچھی نہ لگی چلتے وقت انہوں نے بچوں کی ہتھیلی پر بھی کچھ نہیں رکھا۔ دادی اماں کو صاف پتہ چل گیا کہ انہوں نے گھر والوں کی باتیں سن لی ہیں وہ خفا خفا نظر آرہے تھے عادل اور ابا جی تایا ابا کو گاڑی پر بٹھا کر واپس آئے تو سب نے اطمینان کی سانس لی نوٹ کا ماتم تو پورے مہینے ہوتا تھا مگر تایا ابا کے جانے سے اس نوٹ کا غم بھلا ہو چکا تھا اور اس وقت سب ہلکے پھلکے ہو کر اپنے چہروں سے نقلی نقاب اتارے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔

حیدر آباد کا اسٹیشن نکل گیا تو تایا ابا نے بھی اطمینان کی سانس لی۔ کرب اور اذیت کے تیس دن صدیوں پہ بھاری ہو گئے تھے دکھ کی طویل راتیں اور بے چارگی کے وہ نازک لمحے انگارہ بن کر ان کا کلیجہ جلاتے رہے تھے ان کا خیال تھا کہ بھائی کا حیدر آباد میں اچھا کاروبار ہو گا جیسا کہ وہ اپنے خطوط میں لکھا کرتا تھا مگر یہاں تو روٹی کے لالے پڑے دیکھے خیال تھا کہ وہ اپنا کاروبار جمانے کے لیے بھائی سے کچھ رقم لیں گے افریقہ میں ان کا بزنس چوپٹ ہو چکا تھا پیسے پیسے کو محتاج ہو گئے تو پاکستان بھاگ آئے جو تھوڑی سی رقم تھی وہ یہاں کاروبار کے بہانے لوگوں نے ٹھگ لی تھی اب ایک بھائی کا سہارا تھا وہ بھی کنگال نکلا ادھر ادھر سے قرض لے کر بھائی کے لیے قیمتی تحفے خریدے تھے کہ امیر بھائی کو پہلے خوش کرنا لازمی ہے یہ سب کوششیں رائگاں گئیں۔ اب کس منہ سے واپس کراچی جاتے کہ اس لینے دینے اور سیر و تفریح میں اب روپیا بھی پاس نہ رہا تھا واپسی کے لیے کرایے کے پیسے تک نہیں رہے تھے تبھی تو دیوان پر پڑے چھت کی کڑیاں گنتے رہتے مگر اللہ بڑا سبب الاسباب ہے اگر بھابی بدحواسی میں ڈرائنگ روم سے نکلتے وقت دیوان سے ٹکرانے کے بعد اپنا نوٹ نہ گراتیں تو ان کی امارت کا بت دو چار روز بعد کس طرح ٹوٹتا۔ تایا ابا نے دل ہی دل میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

گاڑی فراٹے بھرتی کراچی کی جانب رواں دواں تھی۔

غرور آسمانوں پر رقص کرنے والوں کو زمین کی پستیوں میں دھکیل دیتا ہے
زمین پر اکڑ کر چلنے والے ایک نہ ایک روز کڑکڑاتی اور جکڑ لینے والی زمینوں
میں پیوست ہو جاتے ہیں
وہ بھی مغرور تھی اور اپنے انجام کو پہنچی ایک عبرت ناک کہانی

آسیہ سلیم قریشی

آبگینے

کمشنر ہاؤس کی وسیع و عریض عمارت رنگین روشنیوں اور قمقموں سے جگمگا رہی تھی، لمبے چوڑے لا... میں شامیانے تنے تھے اور بے شمار کرسیاں قطار در قطار رکھی تھیں۔ ایک طرف اونچا سا اسٹیج بنا ہوا ... جس پر صوفے لگے تھے اور اوپر پھولوں کی چادر تنی ہوئی تھی۔ بے شمار مہمان قیمتی لباس پہنے ہاتھوں میں مشروبات کے گلاس تھامے خوش گپیوں میں مصروف تھے، بیرے صاف ستھری وردی میں ملبوس ٹر... اٹھائے سرو کرتے پھر رہے تھے۔ آج غازی آباد کے کمشنر حیدر علی کی اکلوتی بہن ربیعہ کی شادی تھی۔
نوجوان خوبرو حیدر علی نہ صرف یہ کہ ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا بلکہ وہ بہت بڑا زمیندار بھی تھا۔ شہر ... قریب ہی ان کی بے شمار زرعی آراضی تھی جس کی دیکھ بھال اس کے دو چھوٹے بھائی عثمان، جاوید علی اور اس کے والد حماد علی خود کرتے تھے۔ ہر سال لاکھوں روپے کی فصل فروخت ہوتی تھی پھر وہ کیسے نہ اپنی اکلوتی لاڈلی بہن کی شادی پر دل کھول کر خرچ کرتے۔
سیاہ شیروانی اور سفید شلوار میں ملبوس حیدر علی بہت جچ رہے تھے۔ وہ مہمانداری میں مصروف تو ... لیکن ان کی نظریں بار بار داخلی دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ وہ شدت سے کسی کی آمد کے منتظر ... اور پھر ان کی نگاہیں جگمگا اٹھیں۔ سرخ مرسیڈیز کو اندر آتے دیکھ کر وہ کھل اٹھے اور تیز تیز قدم اٹھاتے

...ی کی طرف بڑھے۔ انھوں نے خود ہی بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا ان کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ چھ ...ال۔ ہاں چھ سال بعد آج وہ دوبارہ اس ستمگر کٹھور حسینہ کو دیکھیں گے۔ دھڑکنیں بے قابو ہونے ...یں۔
"ہیلو۔ حیدر بھائی!" کار کا اگلا دروازہ دھڑ سے کھلا اور دو نوجوان لڑکے بڑی بے تابی سے اترے اور ...سے لپٹ گئے۔ حیدر ان کے بیچ دب کر رہ گئے۔ وہ دونوں ان کے چچا زاد بھائی ندیم اور شاہد تھے۔
"بس بھئی۔ بس کرو اب ہمیں بھی ملنے کا موقع دو۔" انھیں محمود چچا کی رعب دار آواز آئی تو وہ ان کی ...طرف مڑے اور جھک کر ان کے گھٹنوں کو ادب سے ہاتھ لگایا۔
"جیتے رہو میرے بچے میرے بیٹے۔" چچا محمود علی نے نہایت شفقت سے اپنے سینے سے بھینچ کر ان کی ...انی چوم لی تو لمحے بھر کے لیے حیدر علی کا دل بھر آیا۔ ہاں کتنی آرزو تھی انھیں کہ وہ اپنے پیارے محمود ...کے بیٹے بن جائیں، ان کے داماد کہلائیں..... لیکن۔ لیکن حیدر نے کرب سے آنکھیں بھینچیں اور ...ی کوشش کرنے لگے۔
"واہ چچا جان واہ۔ بھتیجی کی شادی میں مہمانوں کی طرح شریک ہوئے ہیں آپ تو۔ میں ہی کیا امی اور

ابو بھی سخت ناراض ہیں آپ سے۔" وہ شکایتی انداز میں بولے۔

"ہم کیا کرتے حیدر بیٹے۔ ان کی طبیعت کافی خراب رہی ہے ڈاکٹر نے سفر کرنے سے سختی سے روک دیا تھا۔ ہم نے تو محمد صاحب سے کہا بھی کہ آپ گھر آرام کیجئے ہم سب شادی میں شریک ہولیں گے لیکن یہ بعد تھے کہ ربیعہ کی شادی میں ضرور شریک ہوں گے ہوائی جہاز سے یہ سفر کر نہیں سکتے تھے۔ آخر ان کی وجہ سے ہمیں بھی موٹر پر سفر کرنا پڑا۔ کراچی سے غازی آباد کا چھ سو کلومیٹر کا سفر ہم نے چار دنوں میں پورا کیا ہے راستے میں ٹھیرتے ٹھیرتے آئے ہیں۔" غوثیہ چچی کی آواز آئی تو حیدر ان سے لپٹ گئے۔

"آداب حیدر بھیا۔" قریب کھڑی دو حسین الڑکیوں نے ہنستے ہوئے سر جھکایا۔ حیدر نے زور زور پلکیں جھپکائیں اور انھیں بغور دیکھا۔ چچی سے دور ہو کر دوبارہ کار میں بے تابی سے جھانکا لیکن گوہر مقصود وہاں نہ تھا۔ نادیہ۔ نادیہ افسردہ دل کراہ اٹھا۔

"شمی... بینا... کیا کیا نادیہ نہیں آئی ہیں؟" وہ بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

"کہاں جی... وہ نوابزادی صاحبہ تو اپنی دو درجن سہیلیوں کو ساتھ لے کر شان پور گئی ہوئی ہیں ان احمق لڑکیوں پر اپنی زمینوں حویلیوں کی دھاک بٹھانے۔" ندیم جل کر بولا۔

"اور کیا... نادیہ باجی کی وجہ سے ہمارا ایک دن ضائع بھی ہو گیا ورنہ تو ہم کل ہی یہاں پہنچ جاتے کراچی سے آتے ہوئے ہم لوگ شان پور چلے گئے تھے کہ نادیہ باجی کو ساتھ لیتے آئیں گے لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا' کہنے لگیں مجھے غازی آباد جانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ امی ابو نے کتنا سمجھایا کہ تمھاری تایا زاد بہن کی شادی ہے اور تمھارا شریک ہونا ضروری ہے لیکن وہ ناک بھوں چڑھا کر بولی میری سہیلیوں کو بہت شوق تھا دیہات دیکھنے کا اور میں خود انھیں مدعو کر کے ساتھ لائی ہوں اب میں انھیں کیسے واپس بھگا دوں' ویسے آج ان کی سہیلیوں کو واپس کراچی جانا تھا۔ ابو ایک کار دیں چھوڑ آئے ہیں اور سختی سے باجی کو تاکید کی تھی کہ وہ سہیلیوں کو روانہ کرتے ہی خود بھی غازی آباد پہنچ جائیں میرا خیال ہے وہ آج رات یا کل صبح تک پہنچ ہی جائیں گی۔" پیاری سی بینا جو حیدر کے چھوٹے بھائی عثمان علی کی مگیتر تھی اس نے تفصیلاً بتایا۔ اب سب عزیز و اقارب ان کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے ملنے ملانے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ حیدر چپ چاپ وہاں سے کھسک کر اپنے بیڈ روم میں آ گئے اور تھکے تھکے انداز میں پلنگ پر ڈھیر ہو گئے اپنا دایاں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیا۔ انھیں محسوس ہوا جیسے کسی نے ان کے سینے پر ایک بھاری پتھر رکھ دیا ہے۔ سانس لینا دوبھر ہو گیا تو وہ اٹھے اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے۔ سرد ہوا کے جھونکے تپتے چہرے سے ٹکرانے لگے مگر وہ ہر تکلیف سے بے خبر اس بے رحم لڑکی کے متعلق

سوچ رہے تھے۔

"نادیہ... نادیہ... کیا بگاڑا ہے میں نے تمھارا۔ کیوں مجھے مرمر کے جینے کی سزا دے رہی ہو۔ کیوں برسوں سے میرے ارمانوں کے گلشن کو آگ لگا رہی ہو۔" انھوں نے چکراتا ہوا سر کھڑکی سے لگا لیا اور زمین کی سطح پر ایک ہیولا ابھرنے ڈوبنے لگا۔ پھر وہ ایک واضح صورت اختیار کرتا چلا گیا۔ بے بس ہو کر حیدر علی نے دل تھام لیا۔

نادیہ اس کے چچا محمود علی کی سب سے بڑی بیٹی تھی اور بچپن ہی سے اپنے تایا زاد حیدر سے منسوب تھی۔ دونوں کا بچپن ایک ساتھ کھیلتے کودتے گزرا تھا پھر نہ جانے محمود چچا کے ذہن میں کیا سمائی کہ ان پر پولیس کرنے کی دھن سوار ہو گئی اور وہ اپنے خاندان سمیت کراچی شفٹ ہو گئے وہیں کوٹھی بنوالی بچوں کو اسکول میں داخل کرا دیا نہایت صلح سلوک سے دونوں بھائیوں یعنی حماد علی اور محمود علی نے جائداد تقسیم کر لی کیونکہ شان پور کراچی کے نزدیک پڑتا تھا اس لیے وہ تمام تر زمینیں اور حویلی محمود علی نے لے لی اور حماد علی نے غازی آباد سے نزدیک والی زمینیں سنبھال لیں' دونوں بھائیوں میں بے حد محبت تھی اسی لیے تو نادیہ کے پیدا ہوتے ہی حماد نے بھائی سے حیدر کے لیے اس کا رشتہ مانگ لیا تھا اور نادیہ سے چھوٹی بہن دینا کو عثمان سے منسوب کر دیا تھا۔ وہ تو محمود چچا کے دونوں بیٹے ندیم اور شاہد ربیعہ سے عمر میں کافی چھوٹے تھے ورنہ ربیعہ کا رشتہ باہر ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

محمود علی کو اپنے لیے چوڑے گندمی رنگت اور سیاہ گھنگریالے بالوں والے خوبصورت بھتیجے حیدر سے پناہ محبت تھی۔ نادیہ بھی پہلی اولاد ہونے کی وجہ سے ان کے دل کی دھڑکن تھی۔ بے پناہ لاڈ پیار اور ہر قسم کی الٹرا ماڈرن سہیلیوں نے اسے بری طرح سے بگاڑ کر رکھ دیا تھا اب وہ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی۔ نہ وہ کسی کی بات مانتی' نہ نصیحت پر کان دھرتی' جو جی میں آتا کر گزرتی تھی اور محمود علی کے دل کو اس دن دھچکا سا لگا۔ جب ان کی منہ چڑھی لاڈلی نور نظر نے اپنے منگیتر حیدر علی سے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے نہایت بد تمیزی اور بیہودگی سے سب کے سامنے حیدر علی کی طبیعت توہین کی۔ تب محمود علی کی آنکھیں کھلیں۔ وہ بپھر اٹھے لیکن وہ تخلیقی مٹی جس سے نادیہ کا خمیر اٹھایا گیا تھا عادات کی بھٹی میں پک پک کر فولاد ہو گئی تھی جس پر اب کسی شے کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ ماں باپ کی ساری آہ وزاریوں نے بھی اس فولاد کو نہ پگھلایا تو محمود علی کا دل بکھر کر رہ گیا۔ مان ٹوٹ جائے تو انسان کا سنبھلنا دشوار ہو جاتا ہے محمود علی پر دل کا شدید دورہ پڑا جان کے لالے پڑ گئے لیکن نادیہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔ وہ حیدر علی سے شادی نہیں کرے گی۔ کبھی نہیں کہاں وہ گنوار۔ اجڈ حیدر اور کہاں وہ الٹرا ماڈرن۔

ہر محفل کی جان شوخ و شنگ، سیماب صفت نادیہ۔

محمود علی ہمیشہ اپنی چھٹیاں اپنی زمینوں پر گزارتے تھے اس بار بھی جب بچوں کے اسکول اور کالج کی چھٹیاں ہوئیں تو وہ سب کو لے کر شان پور پہنچ گئے اور ہمیشہ کی طرح اپنے بھائی حماد علی کے خاندان کو بلوا بھیجا۔ ربیعہ عثمان اور جاوید تو ان کے بلاوے پر شان پور پہنچ ہی جاتے تھے لیکن حیدر باپ کا ہاتھ بٹانے وہیں رک جاتا تھا اور پھر فصلوں کی کٹائی کے بعد جب وہ فارغ ہو کر شان پور پہنچتا تو اکثر ایسا اتفاق ہوتا کہ اس کی نادیہ سے ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ نادیہ سیلانی طبیعت کی مالک ایک جگہ ٹک کر بیٹھ نہ سکتی تھی۔ وہ یا تو اپنے کالج گروپ کے ساتھ یا کسی عزیز سہیلی کے پاس ہل اسٹیشن گئی ہوتی تھی اور بے چارہ حیدر جو جذبات و شوق کا سمندر سینے میں دبائے دریا تک پہنچتا تھا، دیدار محبوب سے محروم رہ جاتا۔ یہی آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے آٹھ سال گزر گئے تھے اب حیدر علی کی نگاہوں میں نادیہ کا ایک مٹا مٹا سا خاکہ تو تھا لیکن دل و دماغ کی خیالی تصویر کہرا نقش چھوڑ چکی تھی۔ اس کے ذہن نے خود کو بہلانے کی خاطر نادیہ کے مٹے مٹے سے خاکے میں تیز اور من پسند رنگ بھر دیے تھے۔ رات کی تنہائیوں میں نادیہ کا حسین سراپا نگاہوں کے سامنے لہرانے لگتا تو وہ تکیے کو بانہوں میں بھینچے تصور یار میں کھو جاتا اور اس کے رگ و پے میں ایک سرور ایک خمار انگڑائیاں لینے لگتا۔

عثمان خاصا سمجھدار ہو چکا تھا۔ ایک بار جب محمود چچا نے سب کو شان پور مدعو کیا تھا تو حیدر نے عثمان کے ذہے زمینوں کی دیکھ بھال لگا دی اور اور وہ خود اڑتا ہوا غازی پور پہنچ گیا۔ ربیعہ اور جاوید اس کے ساتھ تھے ربیعہ جانتی تھی کہ اس کا لاڈلا بھائی نادیہ سے کتنی شدید محبت کرتا ہے۔ وہ بھائی کا مذاق اڑاتی رہتی تھی اور سنجیدہ اور متین سا حیدر زیر لب مسکرا رہا تھا۔ آج تو ان کا دل خوشیوں کے ہنڈولے میں جھول رہا تھا۔ برسوں بعد پیاس بجھنی تھی۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں نادیہ سے محو کلام تھا ان کا ذہن حسین خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ... وہ مجھے دیکھ کر کس قدر خوش ہو جائے گی پہلے اس کی حسین آنکھیں حیرت و استعجاب سے پھیل جائیں گی پھر چہرے پر دھنک رنگ بکھر جائیں گے۔ دھیرے دھیرے نگاہیں شرم و حیا کے بوجھ سے جھکتی چلی جائیں گی وہ شرما کر وہاں سے بھاگ جائے گی لیکن میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا اور بانہوں میں لے کر دل کی بے تابیوں کا حال کہہ ڈالوں گا۔ اپنی بے چینی و بے رنگ راتوں کے قصے سناؤں گا۔ وہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے مصمم فیصلے کر رہا تھا لیکن جب وہ شان پور پہنچے تو اس کے تصورات کے محل زمیں بوس ہو گئے آرزوؤں کے پھول کھلا کر رہ گئے۔ محمود صاحب، خوفیہ خانم اور ان کے بچے تو اسے دیکھ کر خوشی سے دیوانے ہو اٹھے شاہد تو اس طرح حیدر کے گلے لپٹا کہ ندیم کو اسے کھینچ کھانچ کر ہٹانے

میں دس منٹ لگ گئے اور جب وہ خود گلے لگا تو شمی اور بیتانے اسے ۔۔۔ چھوٹی بہن بیتا بھائی کی اس کی محبت اس کی زندگی نادیہ الگ صوفے پر لاپروائی سے بیٹھی سرد سرد نگاہوں

نے سر سے پاؤں تک حیدر کا ایکس رے لیا بادامی شلوار قمیص میں ملبوس حالانکہ وہ بہت اچھا لگ رہا تھا لیکن نادیہ کو وہ پسند نہ آیا پھر جیسے اس کے منہ میں کسی نے کڑوی گولی رکھ دی وہ بری بری شکلیں بنانے لگی حیدر کی والہانہ نظریں تو اس کے وجود سے لپٹی جا رہی تھیں وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ تو اس کے تصورات کے عین مطابق تھی۔ "اے میں نے کہا حضور حیدر بھائی ذرا ہوش میں آیئے۔" شاہد نے ہنستے ہوئے اسے زور سے جھنجوڑا تو وہ چونک اٹھا اس کی وارفتگی پر سب نے ہی قہقہے لگائے تھے۔

"توبہ... توبہ حیدر بھائی کی نظریں تو نادیہ باجی کے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ کتنی دیر سے ابو پوچھ رہے تھے کہ حیدر میاں یہ اس بار تم سب کام دھندا چھوڑ کر پہلے کس طرح آ گئے؟ اور آپ نے جواب ہی نہیں دیا۔" ندیم ہنستا ہوا بولا۔

"اچھا... کہاں... کہاں ہیں چچا جان۔" وہ جھینپ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"وہ ابھی بھتیجے کی مجنونانہ حرکت دیکھ کر ہنستے ہوئے بیوی سمیت یہاں سے ٹل گئے ہیں تاکہ بھتیجے صاحب شوق و تسلی سے اپنی منگیتر کا دیدار کریں۔" ندیم نے شوخی سے کہا۔

"بکواس بند کرو ندیم۔" نادیہ بھنا کر کھڑی ہو گئی نیلی جینز اور جیکٹ پہنے کندھوں تک کٹے ہوئے سیاہ بالوں تلے اس کا سرخ و سفید حسین چہرہ جگمگا رہا تھا۔ حیدر بے اختیار اس کی طرف بڑھے اور اس کے گداز کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

"نادیہ... نادیہ شاید تم نے مجھے پہچانا نہیں ہے؟" وہ ارمانوں کے دیپ جلائے بولے۔ یقیناً نادیہ نے مجھے پہچانا نہیں ہے شبھی تو اس قدر بے رخی اور سرد نظروں سے غیروں کی طرح دیکھ رہی ہے۔ حیدر نے خود کو تسلی دی۔

"جی نہیں... حیدر علی صاحب میں نے آپ کو فوراً پہچان لیا تھا۔" وہ ان کے ہاتھ بیدردی سے جھٹک کر بولی تو حیدر کے ذہن پر تاریکیاں چھانے لگیں عجیب سی سنسناہٹ وجود میں پھیل گئی ارمانوں بھرا دل بیٹھے دھڑکنا ہی بھول گیا۔ وہ سکتے رہ گئے۔

"حیدر علی... آپ کو پہچاننے میں تو مجھے ذرہ بھر بھی دشواری نہیں ہوئی جیسا میں نے سوچا تھا ویسا ہی پایا ہے۔" وہ طنز سے بولی۔ "اور ابو کہتے ہیں کہ میری شادی تم سے ہو گی۔ نہیں کبھی نہیں۔" اس نے سرگوشی کی تو حیدر کی رہی سہی امیدیں بھی دم توڑ گئیں۔

ہر محفل کی جان شوخ و شنگ اے میرے متعلق جیسا سوچا تھا ویسا ہی پایا ہے لیکن مجھ سے تو پوچھو کہ میں
محمود علی سے... محبت کے پہلے رنگ خاکے میں جو ارمانوں کے رنگ بھرے تھے تمہاری شکل و
صورت تو ہو بہو ویسی ہی ہے لیکن تمہارا یہ تکبرانہ انداز۔ یہ گفتگو اسے کیا نام دوں؟" حیدر دکھوں کے
گرداب میں گھومنے لگا۔ نادیہ لاپروائی سے کندھے اچکاتی چلی گئی۔

"حیدر بھیا... حیدر" ربیعہ کی رندھی ہوئی آواز کانوں میں پڑی تو وہ حواسوں میں آنے لگا۔ "بھیا میں نے تو پہلے بھی کتنی بار آپ کو آگاہ کیا تھا کہ نادیہ بہت ہی تک چڑھی بدتمیز اور پاگل سی لڑکی ہے لیکن آپ مانتے ہی نہیں تھے اور حیدر کو یاد آنے لگا کہ جب بھی ربیعہ وغیرہ چھٹیاں گزارنے کے بعد غازی آباد واپس آتی تھیں تو وہ ان سے عثمان وغیرہ سے کرید کرید کر نادیہ کے متعلق پوچھتا تھا اور ان سب کی متفقہ رائے یہی ہوتی تھی کہ نادیہ بہت منہ زور بدکلام و بے باک لڑکی ہے لیکن حیدر کے دل و دماغ پر تو بچپن کے نقش کندہ تھے وہ دھیمے دھیمے لہجے میں بات کرنے والی نازک و پیاری سی نادیہ ایکدم کیسے بدل سکتی ہے۔ وہ ان کی بات جھٹلاتا اور آج... آج تو اس نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا تھا وہ اس کے تلخ رویہ اور انداز گفتگو دیکھ چکا تھا اور جیسا کہ سب کی زبانی سنا تھا اس سے بڑھ کر ہی پایا تھا اور پھر اس کے بعد نادیہ نے لڑنا بھڑنا روزانہ کا معمول بنا لیا تھا اول تو وہ حیدر سے سیدھے منہ بات ہی نہ کرتی تھی۔ سامنا ہوتا تو کترا کر، نظر انداز کر کے نکل جاتی کبھی کبھار بہن بھائیوں کے ساتھ تاش یا بیڈ مٹن کی بازی لگ رہی ہوتی تو حیدر کے پہنچتے ہی وہ کھیل ادھورا چھوڑ کر اٹھ جاتی۔ ایک دن تو حد ہی ہو گئی لان میں بیٹھے چائے پیتے پیتے شاہد اور جاوید نے اعلان کیا کہ جو کوئی بھی انہیں بیڈ مٹن میچ میں ہرا دے گا۔ وہ دونوں جیتنے والے کو زبردست دعوت دیں گے۔

"چلو میرے ساتھ مقابلہ کرلو۔" نادیہ میز سے ریکٹ اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

"پلیز میں آپ کا پارٹنر بنتا ہوں۔" حیدر بھی ریکٹ سنبھال کر اٹھ گیا۔

"جی نہیں مجھے آپ کا پارٹنر نہیں بننا ہے چلو ندیم تم آجاؤ۔" وہ نخوت سے بولی تو حیدر شرمندہ ہو گیا۔

"ارے باجی... ایک نہ ایک دن تو آپ کو ہمیشہ کے لیے حیدر بھائی کا لائف پارٹنر بننا ہی ہے پھر ابھی سے ان کی پارٹنر بن جایئے تاکہ ایڈجسٹ ہونے کی عادت پڑے۔"

"بکواس بند کرو کمینے۔" نادیہ نے بپھر کر اس زور سے ریکٹ پھینکا کہ سیدھا ندیم کی پیشانی سے جا ٹکرایا۔

"اف اللہ؟" ندیم سر پکڑ کر بیٹھتا چلا گیا۔

"نادیہ! تمہیں کیا خدا کی مار پڑ گئی ہے پاگل ہو گئی ہو کیا؟" نادیہ سے ڈیڑھ سال چھوٹی بہن بینا بھائی کی
پر تڑپ اٹھی۔

"دفع تمیز سے بات کرو تم... اور یاد رکھو اگر کسی نے میرے نام کے ساتھ حیدر کا نام لیا تو سب کے سر
ڑ دوں گی۔" وہ گرجی اور کرسی کو ٹھوکر مارتی ہوئی نکل گئی۔

"او نہہ تمیز سے بات کرو بڑی نوبزادی ہے نا۔ شکر ہے ندیم سر نہیں پھٹا اور آنکھ بچ گئی۔" شمی بھائی کی
ولی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"پتا نہیں یہ نادیہ آپا آخر اتراتی کس بات پر ہیں شاید اپنی سفید چمڑی پر۔ ارے میرا بھائی بھی کوئی گرا
نہیں ہے اسے کیا لڑکیوں کی کمی ہے خواہ مخواہ دشمن ہو رہی ہے ان کی۔" ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو
وہ حیدر سے لپٹ گئی۔

دن ابا جان کو لاڈلی کی باتوں کا پتا چلا تو گولی مارنے سے بھی نہیں ہچکچائیں گے حیدر بھائی اپ دل
ت کریں۔"

"لیکن شمی گولی مارنے سے تو مسئلہ حل ہونے سے رہا زبردستی کا میں قائل نہیں ہوں۔ ہٹو بڑھو آج
سے دو ٹوک بات ہو ہی جائے تو بہتر ہے۔" حیدر نے مضبوط لہجے میں کہا تو کشیدگی و بدمزگی بڑھنے کے
ے سب نے متفق کر کے اسے روک لیا لیکن حیدر کے دل پر آبلے بننے اور پھوٹنے رہے۔ وہ حیران
یقین تھا اور نادیہ کا رویہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ یہاں تک کہ نادیہ کے اکھڑے ہوئے ناروا سلوک کو
ی اور خوفیہ خانم نے بھی شدت سے محسوس کیا تھا اور انہوں نے بیٹی کو نہایت نرمی و محبت سے
اک رشتے کا احساس دلانا چاہا لیکن نادیہ تو جیسے بہری ہو گئی تھی وہ تو کچھ سننے پر آمادہ ہی نہ تھی اور
ہاؤں پٹختی کمرے سے باہر نکل گئی۔ محمود علی سخت پریشان تھے۔ خود چچی خوفیہ بھی دل گرفتہ نظر
اور بیٹی کے دل شکن رویے کی تلافی کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ باقی رہے ندیم شاہد۔ اور شمی
بھی حیدر سے والہانہ محبت کرتے تھے لیکن نادیہ جیسی ڈھیٹ لڑکی پر ان کا زور نہیں چلتا تھا۔

حول میں کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی ان حالات میں حیدر کے لیے شان پور میں رہنا بے حد دشوار ہو گیا
اس نے واپس جانے کی ٹھان لی۔ ایسی قربت کا کیا فائدہ کہ وہ اپنی محبت کو دور سے دیکھ دیکھ کر تڑ
اور چھو بھی نہ سکے۔ تلخ باتیں سن کر جواب بھی نہ دے سکے۔ اپنے آتشی جذبوں پر مجبوری کا بند
رکھے۔ جہاں ہر لمحہ ہر گھڑی ٹکراؤ کا خدشہ ہو وہاں سے ٹل جانا بہتر تھا۔ اسے چچا محمود اور خوفیہ
بے حد ادب و لحاظ تھا اور نہ یہ سب کچھ سہنا اس کے لیے بے حد دشوار تھا۔ وہ ضبط کھونے لگا تھا۔

بارہا دل چاہا کہ وہ نادیہ کے نرم و گداز نازک وجود کو یا نخوں کی زنجیر میں جکڑ کر اس طرح جھنجوڑے کہ اس میں چھپی تمام نفرتیں کدورتیں ایک ہی بار باہر آجائیں لیکن نادیہ تو اس کے سائے سے بھی بدکتی تھی یہاں رہنے کا کیا فائدہ تھا۔ حیدر نے جلدی جلدی سوٹ کیس میں کپڑے بھرے اور کمرے سے باہر آیا۔ چچی کے کمرے میں جھانکا وہاں کوئی نہیں تھا شاہد اور ندیم کے کمرے بھی خالی تھے البتہ بڑے کمرے سے باتوں کی آواز آرہی تھی وہ ادھر بڑھا شمی ربیعہ جاوید بینا کیرم کھیلنے میں مصروف تھے ندیم اور شاہد قالین پر اوندھے لیٹے ٹیپ سن رہے تھے اور صوفے پر دونوں پاؤں اوپر اٹھائے نادیہ لیٹی انگلش ناول پڑھ رہی تھی۔

"اچھا یارو! ہم تو چلے۔" حیدر نے جیسے ایک دم دھماکہ کردیا سب ہڑبڑا کر اٹھ گئے یہاں تک کہ نادیہ بھی اٹھ گئی۔

"آ..... آپ کہاں جارہے ہیں حیدر بھیا؟" بینا پریشان ہوکر لپکی۔

"میں واپس غازی آباد جارہا ہوں بینا۔ تم فکر مت کرو میں پہنچتے ہی تمہارے عثمان کو بھیج دوں گا۔ چارہ وہاں بیٹھا اداس ہورہا ہوگا اور مجھے بددعائیں دے رہا ہوگا۔" حیدر بمشکل ہنسا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کو جانے کی اور عثمان تو ویسے بھی آتے جاتے رہتے ہیں آپ سالوں بعد نکلے ہیں۔" شمی اور ربیعہ نے ان کا بازو جکڑ لیا۔ شاہد بھاگ کر ماں کو بلا لایا۔ وہ گھبرائی ہوئی آئیں۔

"حیدر بیٹے یہ کیا' یکایک تم نے جانے کی تیاری کرلی؟"

"وہ چچی جان بس کام کاج کرنے کی عادت ہے نا فارغ بیٹھا نہیں جاتا ویسے بھی بے چارے عثمان کو زمینداری کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔" وہ بہانہ بنا کر بولا۔

"نہ بچے... میں تو ابھی تمہیں نہیں جانے دوں گی ارے تمہارے تو چچا بھی آج کراچی چلے گئے ہیں اگلے ہفتے آئیں گے تب تم ان سے اجازت لے کر جانا۔" وہ پریشان تھیں۔

"چچی جان میں پھر آجاؤں گا۔ اب آپ مجھے جانے ہی دیں تو اچھا ہے۔" وہ ذرا مضبوط لہجے میں بولا تو غوثیہ خانم نے ہتھیار ڈال دیے۔ حیدر کی حالت وہ بخوبی سمجھ رہی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ نادیہ کے سلوک سے مایوس ہوکر وہ یہاں سے جارہا ہے۔

"اے لو بیٹا تم تو سامان باندھے کھڑے ہو دوپہر کا کھانا تو کھالو؟" وہ دکھ سے بولیں۔

"بالکل بھوک نہیں ہے چچی اماں' میری ٹرین جانے میں گھنٹہ رہتا ہے۔ جاوید میں کار یہیں چھوڑے جارہا ہوں تم اب مجھے اسٹیشن چھوڑ آؤ۔" حیدر نے بیگ اٹھالیا۔

"نہیں میں تمہیں کچھ کھائے بنا نہیں جانے دوں گی مجھے تمہاری عادت کا پتا ہے تم سے بھوک برداشت نہیں ہوتی ہے پھر جانے تم ٹرین میں کیا الم غلم کھاؤ گے۔ خدانخواستہ طبیعت نہ خراب ہوجائے؟ نادیہ مہارانی شنرادی اٹھ دفع کر ان موئی ماری کہانی کی کتابوں کو' ان کتابوں نے تجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ چل جاکر کھانا لگوا۔" غوثیہ خانم نادیہ پر برس پڑیں۔ نادیہ نے تیوری چڑھا کر گھورا اور کوئی سخت جواب دینے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر کچھ سوچ کر کتاب پٹخ کر چلی گئی دس منٹ بعد اس نے آواز دے کر کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ غوثیہ خانم نہایت محبت سے حیدر کا بازو تھامے ڈائننگ روم میں آگئیں اور اپنے ہاتھوں سے حیدر کی پلیٹ میں بریانی ڈالی۔

"چچی جان' آپ بیٹھیے نا میں خود کھانا لے لوں گا۔" حیدر نے انھیں زبردستی کرسی پر بٹھادیا۔ شمی' ربیعہ اور اداس اداس ندیم اور جاوید بھی آگئے۔ حساس شاہد نے کھانا کھانے سے انکار کردیا۔ اسے حیدر کا اچانک چلے جانا بہت دکھی کرگیا تھا۔

"اوہو چچو تو رکھے نہیں ہیں کھائیں کس چیز سے؟" ندیم جھنجلا کر بولا۔

"یہ آج نادیہ بیگم نے میز لگائی ہے نا۔ کیسے نہیں پتا چلے گا ان کے سگھڑاپے کا۔ نہ چمچ ملیں گے نہ پلیٹ۔" غوثیہ خانم نے طنز کیا۔

"اگر نہیں ہوں میں کسی کی' جسے چمچے چاہئیں وہ خود اٹھالائے۔" نادیہ نے آنکھیں نکالیں۔

"ہاں ہاں۔ صاحبزادی وہ تو ہم تمہارے زر خرید نوکر ہیں لونڈیاں ہیں۔ بی بنو صبح دس بجے سو کر اٹھتی ہیں ناول رسالے سنبھال بیٹھتی ہیں۔ باقی وقت سیر سپاٹے یا فلمیں دیکھنے' گانے سننے میں گزرتا ہے' مجال ہے کہ گھرداری کی طرف ذرا سی بھی توجہ ہو۔ کبھی کچن میں جھانکنے کی ضرورت محسوس کی ہو۔" غوثیہ ویسے ہی نادیہ سے سخت ناراض تھیں ان کا دل چاہ رہا تھا وہ نادیہ کی گت بنائیں اس کی طبیعت کی صفائی کردیں وہ بگڑ گئیں تو حیدر نے معاملہ سنبھالنے کی کوشش کی۔

"رہنے دیجیے چچی جان۔ چچ نہیں ہیں تو کیا ہوا آج سنت رسول پر عمل کرتے ہوئے ہاتھوں سے کھالیں گے پانچوں انگلیاں شوربے میں ڈبو ڈبو کر ثواب بھی ملے گا اور کھانے کا مزا بھی آئے گا۔" حیدر نے ہنستے ہوئے نوالہ بنایا اور چچی کے منہ میں ٹھونس دیا پھر دوسرا نوالہ اپنے منہ میں ڈالا۔ ندیم شمی وغیرہ بھی انھیں سے کھانے لگے لیکن نادیہ کے چہرے کے زاویے بننے بگڑنے لگے وہ تیوری چڑھائے انتہائی حقارت و نفرت سے حیدر کو دیکھنے لگی اس کے کھانے کا انداز اس کے طبع نازک پر گراں گزر رہا تھا حیدر کی نظر اس پر پڑی تو وہ پوچھ بیٹھا۔

"نادیہ صاحبہ آپ کیوں نہیں کھا رہی ہیں؟" وہ تو یہ سوال کر کے اپنی مصیبت کو آواز دے بیٹھا۔

"اوشٹ اپ۔" وہ حقارت سے بولی اور ہاتھ مار کر اپنی پلیٹ دور پھینک دی۔

"کون کہا سکتا ہے تمہارے ساتھ۔ جنگلی کہیں کے کیا تمہیں چارڈینٹ لوگوں میں بیٹھ کر کھانے کی تمیز کسی نے نہیں سکھائی؟" وہ گرجی۔

"نادیہ۔" غوشیہ خانم نے تشویشناک انداز میں آواز دی اور حیدر نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں سختی سے بھینچ لیں۔

"امی۔ چپ رہیے آپ... یہ طریقہ ہے کھانا کھانے کا' کتوں کی طرح لپ لپ کرتے ہوئے نیچے چاٹ کر ہونٹوں پر زبان پھیر رہے ہیں۔ انھیں اتنا خیال نہیں کہ ان کے سامنے دوسرے لوگ بھی بیٹھے ہوئے ہیں جنہیں ان کی تھرتھری انگلیاں دیکھ کر کراہیت سے ابکائیاں آرہی ہوں گی اور آپ اس گنوار جاہل سے میری شادی کرنا چاہتی ہیں؟" آتش فشاں ابل پڑا۔

"نا... د... یہ۔" غوشیہ خانم نے لرزتے ہاتھوں سے گلاس اٹھایا اور نادیہ کے دے مارا۔ وہ ایک طرف ہٹ گئی۔

"امی... کچھ بھی کہیے مجھے اس سے شدید نفرت۔" نادیہ ہانپتی ہوئی بولی اور مڑ کر وہاں سے بھاگ گئی۔

غوشیہ خانم تو جیسے ہوش کھونے لگیں ان کا جسم بری طرح کپکپا رہا تھا۔ شمی اور بینا ماں سے لپٹ گئیں۔ ربیعہ انھیں زبردستی پانی پلانے کی کوشش کرنے لگی اور حیدر وہ تو غصے سے کھول رہا تھا اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی ابھی نادیہ کا قصہ تمام کردے وہ اٹھا اور تیزی سے نادیہ کے کمرے میں داخل ہو کر اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ نادیہ کھڑکی کے قریب کھڑی تھی گھبرا کر پلٹی تو حیدر کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی روح فنا ہو گئی وہ تو قہر و غضب کا دیو تا لگ رہا تھا۔

"گٹ... گٹ... آ... آوٹ۔" لیکن آواز تھرا کر رہ گئی۔ حیدر تیزی سے بڑھا اور اس کی گردن دونوں ہاتھوں میں دبوچ لی۔ وہ پھڑپھڑا کر رہ گئی۔

"نادیہ محمود... اگر ہم اپڈ گنوار محبت کرتے ہیں تو نفرت کرنا بھی جانتے ہیں اگر تم نے چیخنے یا گلا پھاڑ کے بکنے کی کوشش کی تو یہیں تمہیں زندہ گاڑ دوں گا۔" اس کی آواز میں اس قدر سختی تھی کہ نادیہ کی نا کپکپانے لگیں تیزی و طراری ہوا ہو گئی۔

"اچھا تو میں گنوار ہوں' جاہل ہوں' کتوں کی طرح کھاتا ہوں لیکن... تم... تم کیا ہو۔ تم کتنی تیز

ہو۔ تمہیں تو بڑوں سے بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں ہے تم تو ماں باپ سے گفتگو کے آداب سے ناآشنا ہو۔ زبان دراز کتیا تو تم ہو جو ہر بڑے چھوٹے کا لحاظ کیے بغیر بلاوجہ بھونکتی ہو۔ تمہیں اپنے ماڈرن ہونے پر بہت گھمنڈ ہے؟ یہی آداب سکھاتی ہے تمہاری تہذیب؟ نادیہ آج میں تم سے سب کچھ اگلوا لوں گا اگر تم نے جھوٹ بولا تو خدا کی قسم یہیں تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا اور مجھے پوچھنے والا کوئی نہیں ہو گا خود بلا محمود اور چچی تمہارے جسم کا قیمہ کتوں اور گدھوں کو کھلائیں گے۔" حیدر نے اس کی گردن دباتے ہوئے کہا۔ وہ زرد ہو رہی تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔

"تو بتاؤ نادیہ محمود۔ کیا تم کسی لڑکے سے محبت کرتی ہو؟ کسی سے شادی کے عہد و پیمان کیے ہیں؟ یقیناً کوئی وجہ ہے تبھی تم مجھ سے اتنی متنفر ہو۔ ورنہ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ تم نے مجھے آٹھ سال کے بعد دیکھا ہے پھر تم میرے بارے میں کچھ جانے بغیر کیسے میری دشمن ہو سکتی ہو بولو ہے کوئی بوائے فرینڈ؟" اس نے غرایا۔

"نہیں مم... میرا کسی لڑ... لڑکے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" وہ اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

"تو... پھر مجھ سے نفرت کی کیا وجہ ہے؟" حیدر نے دانت بھینچے۔

"تم... تم... آ... آپ میرا آئیڈیل نہیں ہیں؟" وہ بے تحاشا رو دی اور حیدر جو برسوں سے اس کی محبت دل میں چھپائے دیوانہ وار اسے پوجتا چلا آرہا تھا۔ اس کے آنسو دیکھ کر مر... مر گیا۔ اس نے ایک دم نادیہ کی گردن چھوڑ دی وہ لڑکھڑا کر اس کے سینے سے ٹکرا گئی اور ہولے ہولے کھانستے ہوئے گردن سہلانے لگی حیدر نے اسے بانہوں میں جکڑ ہی تو لیا۔

"نادیہ... بے وقوف لڑکی۔ یہ تم کن چکروں میں پڑ گئی ہو اگر اس طرح دنیا میں ہر کسی کو بن مانگے خواہشیں اور من پسند چیزیں ملنے لگیں تو جنت کی خواہش کون کرنے لگا۔ ادھورے خواب دیکھنا چھوڑ دو کہ کسی اس کی تعبیر بہت بھیانک ہو گی ایسا نہ ہو تمہیں پچھتانا پڑے۔ تم لڑکیاں تصورات و خیالات کی سنہری دنیا میں رہنا پسند کرتی ہو تمہاری جذباتی سوچیں تمہارے لیے ایک صنم بھی تراش لیتی ہیں جسے تم دل کے مندر میں سجا کر ان دیکھے دیوتا کو پوجے چلی جاتی ہو اور تمام دیوتا اس دن اوندھے منہ آگرتے ہیں جب تمہیں حقیقت کی دنیا میں رہنے والا ایک جیتا جاگتا انسان جو کہ تمہارے من مندر میں بسنے والے دیوتا سے بالکل مختلف اور برعکس ہوتا ہے ہاتھ پکڑ کر اپنی دنیا میں لے جاتا ہے پھر سچ مچ کر رہ جاتے ہیں۔ نادیہ تم بھی قصے کہانیوں کی دنیا سے نکل کر دیکھو۔ یہ خیالات یہ احساسات ہم مشرقیوں کے لیے نہیں

ہیں۔ مغرب کی اندھی تقلید اس طرح مت کرو کہ تمہارے آباؤ اجداد کی عزتیں تمہارے بیکے ہو
قدموں تلے روندی جانے لگیں اور مس نادیہ وہ وقت کیوں بھول گئی ہو جب ہم سب اکٹھے اسی حویلی
رہتے تھے اس وقت تمہیں شہر کی ہوا نہیں لگی تھی' اس کی چمک دمک سے تمہاری آنکھیں چکا چوند نہیں
ہوئی تھیں' تم گاؤں کی سیدھی سادی معصوم لڑکی تھیں اسی حویلی میں آج جس جگہ ڈائننگ ٹیبل ہے
پہلے وہیں زمین پر دسترخوان بچھایا جاتا تھا اور ہم سب مل کر ہاتھوں سے کھایا کرتے تھے۔ شہر جاتے ہی
میں اتنی زبردست تبدیلی آئی ہے کہ تم اپنی تہذیب اپنی قدریں بھلا بیٹھی ہو۔ نادیہ جو لوگ تیزی سے
سرابوں کے پیچھے بھاگتے ہیں وہ اس طرح اوندھے منہ گرتے ہیں کہ پھر انھیں سہارا دینے والا بھی کوئی
نہیں ہوتا۔ یاد رکھنا تم بھی کسی ایسے اندھے کنویں میں گروگی کہ کوئی نکالنے کے لیے نہیں بڑھے گا اور
اپنی آواز کی بازگشت سنتے سنتے ختم ہو جاؤ گی۔ نادیہ بیگم... یہ تم نے مجھے جاہل کس طرح کہہ دیا ہے۔ میں
حیران ہوں؟ بی بی تم تو اب بی اے میں پہنچی ہو اور میں آج سے چار سال پہلے بی ایس سی میں فسٹ
پوزیشن لے چکا ہوں۔ میں نے سوچا تھا کہ جب کرنا ہی زمینداری ہے تو پھر تعلیم کا کیا فائدہ۔ لیکن اب
.... اب تم نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے' تم نادیہ ان بے وقوف احمق لڑکیوں میں سے ہو۔ جو
عزت شرافت اور خلوص کی قدر نہیں کرتیں بلکہ بناوٹ اور دکھاوے کی ایکٹنگ پر جان دیتی ہیں۔" وہ
سے بولا۔

"نادیہ بے فکر رہو۔ میں زبردستی نہیں کروں گا۔ نہ ہی تم سے شادی کر کے تم پر ظلم ہونے دوں گا۔
اپنے آئیڈیل کی تلاش جاری رکھو۔ جس وقت بھی تمہیں اپنی پسندیدہ ہستی مل جائے نا تو مجھے فوراً بتانا۔
میں خود تمہاری شادی اس سے کرا دوں گا یہ میرا تم سے وعدہ ہے؟" حیدر مڑ کر دیکھے بنا وہاں سے نکل
گیا۔

پھر وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس چلا آیا۔ چچا کے بلانے کے باوجود دوبارہ کبھی شان پور نہ گیا۔ اس
نے اپنے والد حماد علی سے صاف صاف کہہ دیا کہ اب عثمان اور جاوید زمینداری سنبھالنے کے قابل
ہو گئے ہیں اسے مزید تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی جائے۔ وہ شہر شفٹ ہو گیا اور بڑی محنت سے پڑھنا
شروع کر دیا۔ ایم ایس سی امتیازی نمبروں سے پاس کیا پھر مقابلے کا امتحان بھی دے ڈالا اور پنجاب بھر میں
اول پوزیشن حاصل کی' کچھ عرصے کے بعد وہ ملتان میں ڈی سی لگ گیا لیکن وہ مطمئن نہیں تھا وہ آگے
بڑھنا چاہتا تھا ترقی کے زینے 'ایک' ایک نہیں۔ دو' دو کر کے چڑھنا چاہتا۔ ایک ضد تھی ایک دھن تھی
جس کی وجہ سے وہ انتھک محنت کر رہا تھا اور آج چھ سال کے بعد وہ غازی آباد کا کمشنر تھا۔ شمی اور بینا کی

امی اسے نادیہ کے متعلق معلومات فراہم ہوتی رہتی تھیں۔ نادیہ نے ایم اے کے بعد پڑھائی چھوڑ دی
تھی۔ کئی ایک لڑکے اس کی طرف بڑھے تھے مگر نادیہ نے انھیں پرکھنے کی کوشش کی ان میں کوئی نہ کوئی
نقص نکال کر انھیں دھتکار دیا۔ ابھی تک اسے اپنا من چاہا خواہوں کا شہزادہ نہ مل سکا تھا۔ یہ سنتے ہی حیدر
علی کے حسین گندمی چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ بکھر جاتی تھی والدین نے لاکھ اصرار کیا زور دیا لیکن
حیدر نے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ جانے اس نے دل میں کیا ٹھانی تھی؟

○○○

اسے دیکھے برسوں بیت گئے تھے اب تو دل کے جذبے منہ زور اور باغی ہو گئے تھے اس ظالم کو دیکھنے کے
لیے دل تڑپ رہا تھا مچل رہا تھا۔ ربیعہ کی شادی پر اس نے بڑے ارمانوں سے چچا محمود اور ان کے خاندان
والوں کو جلد از جلد کارڈ بھجوایا تھا جلد پہنچنے کی تاکید کی تھی اور وہ شدت سے ان کی آمد کا منتظر تھا۔ وہ نادیہ
کو دیکھنا چاہتا تھا اور اس کی دلی خواہش تھی کہ نادیہ بھی اسے دیکھے اور حیران ہو' پشیمان ہو' اپنی غلطی کا
اعتراف کرے۔ کیا اب بھی وہ اسے جاہل جٹ گنوار کہنے کی ہمت کرے گی؟ حیدر علی جو پہلے بھی ایک ہیرا
تھا لیکن اب سج سنور کر اس کی تابانی میں اضافہ ہو گیا تھا اس کی شخصیت میں تحیر آمیز تبدیلی رونما ہو گئی
تھی وہ ہر لحاظ سے کسی بھی حسین لڑکی کا آئیڈیل ہو سکتا تھا۔ اس پر بے شمار حسینائیں جان چھڑکتی تھیں
لیکن وہ تو دل کے دریچوں پر مضبوط سا قفل لگائے بے حس بنا بیٹھا تھا۔

"حیدر بھیا!" کسی نے زور سے اس کا بازو ہلایا۔ حیدر نے چونک کر خالی خالی نظروں سے دیکھا۔ اس
کی عزیز بہن ربیعہ مایوں کے پیلے جوڑے میں ملبوس اس کے پاس کھڑی تھی پیچھے ہی شمی اور بینا بھی سجی بنی
کھڑی تھیں۔

"تم نہیں آئی ناوہ چڑیل نادیہ؟" ربیعہ سلگ کر بولی اسے بھائی کے دکھ کا احساس تھا۔

"تو... تو کیا ہوا... یہ میری بینا اور شمی جو آگئی ہیں۔" حیدر سنبھل کر بولے اور ربیعہ کو گلے لگا لیا۔

"بھیا مجھے بے وقوف مت بنایئے' میں سب جانتی ہوں خدا سمجھے اس کو ڈھ مغز لنڈے کی میم نے آپ
کی زندگی برباد کر ڈالی اور خود بھی کہیں کی نہیں رہی۔" وہ رونے لگی۔

"ہائیں... ہائیں ربو یہ کیا حماقت ہے مجھے بھلا اس کی کیا پروا ہے؟" حیدر سٹپٹا گئے۔

"رہنے دیں۔ ایک آپ کی بھی خبر نہیں لگتی۔ خواہ مخواہ اس سنگدل احمق لڑکی کی پیچھے جوگ لے لیا
ہے اگر آپ کو نادیہ کی پروا نہیں ہے تو پھر آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے ہیں۔ میں آپ کو اس طرح بکھرا
بکھرا نہیں دیکھ سکتی۔" وہ بے تحاشا رونے لگی بینا اور شمی بھی پورے خلوص سے ساتھ دے رہی تھیں۔

"او ربویہ کیا حماقت ہے۔ سارا حلیہ بگڑ جائے گا تمہارا ارے بابا کرلوں گا شادی۔ خدارا تم تینوں رونا دھونا بند کرو۔" حیدر نے بڑی مشکل سے بہلا پھسلا کر ربیعہ کو اس کے کمرے تک پہنچایا۔

اگلے دن برات آئی۔ نکاح ہوا رخصتی ہوگئی حیدر بری طرح مصروف رہا تو دل کے زخم پھر سو گئے۔

دوسرے دن وہ سب ربیعہ کی سسرال دعوت ولیمہ میں شریک ہونے پہنچے رات کو دیر سے واپسی ہوئی پورچ میں محمود صاحب کی سرخ ٹیوٹا دیکھ کر حیدر کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔

"میرا خیال ہے نادیہ بیٹی آگئی ہیں؟" حیدر کی والدہ فرزانہ بیگم خوش ہو کر بولیں۔ حیدر جلدی سے باہر نکلا تو سامنے ہی ڈرائیور اقبال محمود صاحب سے باتیں کر رہا تھا اور وہ پریشان سے تھے۔

"حیدر بیٹے سنا تم نے 'نادیہ نہیں آئی وہ ضدی اپنی سہیلی کے ساتھ رحیم آباد چلی گئی ہے اور کار یہاں بھجوادی ہے۔"

"رحیم آباد؟" حیدر کا پی اے حمید گھبرا کر بولا تو سب چونک گئے

"ارے حمید تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" حیدر نے تو شادی کی وجہ سے دو ہفتوں کی چھٹی لے رکھی تھی پھر پی اے کا یہاں کیا کام! وہ اس طرف مڑے۔

"سر" وہ میں ضروری خبر لایا ہوں تمام افسران کی چھٹی گورنر صاحب نے منسوخ کردی ہے اور انھیں فوراً ڈیوٹی جوائن کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ علی پور.... شان پور میں زبردست سیلاب آگیا ہے بڑی نہر کا بند اچانک ٹوٹ گیا ہے اور بڑی تباہ کاری ہوئی ہے۔"

"سیلاب" حیدر رہی کیا' وہاں جو موجود سب لوگوں کے دل ڈوب گئے ان کی زمین اور گھر تو وہیں تھے اور پھر نادیہ.....؟

"اور صاحب قصبہ رحیم آباد تو بالکل غرق ہ گیا ہے کوئی ذی روح نہیں بچا۔" حمید آہستہ بولا۔

"ہائے میری نادیہ... اللہ میں مرگئی۔" خوشیہ خانم چکرا کر گریں' کئی ایک چیخیں ابھریں۔ شمی' بچانے رونا شروع کردیا۔ حیدر پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

"سر... جلدی چلیں گورنر صاحب نے میٹنگ بلوائی ہے۔" حمید نے حیدر کا بازو ہلایا تو وہ سحر زدہ سا جیپ میں جا کر بیٹھ گیا ان کے جاتے ہی سب کو ہوش آگیا ایک کہرام مچ گیا حماد اور عثمان سب کو پکڑ پکڑ کر اندر لے آئے تسلیاں دینے لگے جاوید نے جلدی سے ٹی وی لگایا خصوصی بلیٹن نشر ہو رہا تھا ہیلی کاپٹر میں سے کھینچی ہوئی فلم دکھائی جارہی تھی۔ قصبہ رحیم آباد کے در و دیوار کو تو پانی اپنے ساتھ بہالے گیا تھا بارہ بارہ فٹ اونچا پانی کھڑا تھا وہ سب وحشت زدہ نظروں سے یہ تباہ کاریاں دیکھ رہے تھے۔ اتنے گہرے

پانی میں تو کسی کے زندہ بچنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

"میری بچی... میری نادیہ... ہائے تجھے موت کہاں کھینچ لے گئی؟" خوشیہ خانم اور شمی بیناد غیرہ بلک رہی تھیں۔

"ضدی اور خود سر گستاخ اولاد کا یہی انجام ہوتا ہے بیگم۔" محمود علی سنگ کر بولے۔ اچانک حادثے نے انھیں چکرا کر رکھ دیا تھا دماغ سوچنے سمجھنے سے قاصر تھا۔ رات دھیرے دھیرے گزرنے لگی وہ سب لوگ اعلیٰ قیمتی لباسوں میں ملبوس صوفے یا قالین پر بکھرے پڑے تھے۔ لباس بدلنے کا ہوش کسے رہا تھا۔ ان کے کان ریڈیو کی آواز کی طرف لگے ہوئے تھے۔ جہاں سے وقفے وقفے کے بعد بلیٹن نشر ہو رہے تھے حکومت نے ہنگامی حالات کا اعلان کردیا تھا۔ کشتیاں اور ہیلی کاپٹر متاثرہ علاقوں پر گردش کر رہے تھے۔ امداد کے لیے پہنچ گئی تھی۔

حیدر ساری رات غائب رہے صبح تھوڑی دیر کے لیے آئے تو سب نے انھیں گھیر لیا لیکن ان کے افسردہ چہرے پر تو مایوسی کے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے وہ ہیلی کاپٹر پر رحیم آباد کا چکر لگا آئے تھے ہر سمت پانی ہی پانی اور کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ وہ نادیہ کی زندگی سے مایوس ہو کر لوٹ آئے اب وہ کس منہ سے سب کو تسلی دیتے کوئی امید دلاتے۔ امید کے دیے تو بجھ گئے تھے۔ پانی نے یوں بے خبری میں چھاپہ مارا تھا کہ لوگوں کو بھاگنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ حیدر کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر گھر کے در و دیوار چیخوں سے تھرا اٹھے۔ حیدر تیزی سے جیپ میں بیٹھ کر چلے گئے نادیہ... نادیہ یہ سرکش موذی لہریں تمہارے نازک کومل وجود کو کہاں سے کہاں بہا کر لے گئی ہیں' تم بھی تو ایک بپھری ہوئی سرکش موج تھیں نا... لیکن یہ سنگدل لہریں تو تم سے بھی زیادہ منہ زور نکلیں۔ حیدر نے اسٹیرنگ پر سر رکھ دیا۔

حیدر نے نادیہ کا غم اپنے دل کے نہاں خانے میں دفن کردیا اور خود فرض کی پکار پر سب کچھ بھلا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ جگہ جگہ امدادی کیمپ قائم کردیے گئے تھے۔ وہ ہر جگہ خود جاتے کیمپوں میں روتے بلکتے لوگوں کو تسلی دیتے۔ وہ کیمپ میں ادھر ادھر بکھرے شکستہ وجودوں کو غور سے کچھ جستی نظروں سے دیکھتے۔ شاید ان میں کہیں انھیں اپنی گم گشتہ محبت بھی مل جائے لیکن ہر گزرتا دن اس کی مایوسیوں میں اضافہ کر رہا تھا اور جب دو ہفتے گزر گئے اور نادیہ اور اس کی سہیلی کے خاندان کی کوئی خبر نہ ملی تو محمود علی نے دل پر جبر رکھ کر اس کے قل بھی کروادیے اس دن آدھے گھنٹے کے لیے حیدر گھر آئے اور اپنے کمرے میں جا کر بے تحاشا رو پڑے۔ نادیہ... نادیہ مجھے شمی نے بتایا تھا کہ اب شاید تم پچھتاوے کی آگ میں جل رہی ہو کہ تم نے اچھے اچھے رشتے ٹھکرا کر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ تم ظاہر نہیں کرتی تھیں لیکن تم

اپنے کیے پر پشیمان اور نادم تھیں اور شرم کے مارے میرے سامنے آنے کی ہمت نہیں کرتی تھیں۔ کاش میں نے ہی ضمی کی بات مان لی ہوتی اور تمہیں بانھوں میں لے کر اپنی چاہت کا اقرار کروالیا ہوتا؟ لیکن میں تو چوٹ کھائے ہوئے مرد کی طرح اسے انا کا مسئلہ بنا کر ضدی ہو گیا تھا۔ کچھ بننے کی دھن میں دیوانہ ہو بیٹھا تھا اور تمہیں فراموش کر کے ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا۔ دکھ اور پچھتاوے کی شدت سے انھوں نے اپنے ہونٹ کاٹ ڈالے پھر وہ اٹھ کر دفتر چلے گئے۔

آج شہر کے مخیر حضرات نے مل کر بہت سا کھانا پکوایا تھا جو وہ ٹرکوں میں لاد کر کمشنر صاحب کے پاس لائے تھے کہ وہ کھانا سیلاب زدہ علاقے میں چل کر کیمپوں میں تقسیم کروادیں۔ حیدر علی تھکے تھکے سے اٹھے اور اپنی جیپ میں جا بیٹھے۔ دو گھنٹے کے سفر کے بعد وہ پہلے کیمپ تک جا پہنچے وہاں عجیب عبرت ناک منظر تھا اونچے اونچے ٹیلوں پر چھولداریاں اور پھٹے ہوئے خیمے لگے ہوئے تھے بہت سے لوگ ادھر ادھر کے گرد چاروں طرف سے رسیاں باندھ کر اپنی ماں بہنوں کو پردے میں بٹھا کر خود باہر زمین پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اس المیے سے کوئی سبق سیکھنے کے بجائے کچھ بگڑے ہوئے نوجوان اپنی موٹر سائیکلوں موڑوں پر وہاں پہنچے ہوئے تھے وہ رنگیں کپڑے پہنے ٹیپ ریکارڈ لیے مصیبت زدہ لڑکیوں عورتوں کو تاکتے جھانکتے پھر رہے تھے۔ کمشنر کی موٹر رکتے ہی سب ادھر ادھر بھاگ گئے۔ ٹرک پر سے دیگیں اترتی دیکھ کر بہت سے بچے جن کے تن پر چیتھڑے لٹک رہے تھے وہاں جمع ہو گئے۔ آہا کھانا ملے گا۔ روٹی آگئی۔ وہ اپنی ننھیں کمزور آوازوں میں خوشی سے چلانے لگے۔ مرد بھی بھاگ کر آنے لگے اور نہایت سختی سے بچوں کو پیچھے دھکیلتے خود آگے بڑھنے لگے ایک شور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا ان کی حالت زار پر حیدر کا دل بھر آیا کل تک جانے ان میں سے کتنے ایسے صاحب حیثیت لوگ ہوں گے جن کے دسترخوان پر کتنے بھوکے کھا کھاتے ہوں ان کی نوازشوں سے کتنے گھروں کے چولھے جلتے ہوں گے آج وہی قہر خداوندی کے مارے ہوئے مصیبت زدہ لوگ اناج کے ایک ایک دانے کے محتاج تھے اور ندیدی نظروں سے ان دیگوں کی طرف دیکھ رہے تھے دیگوں کے منہ کھل گئے تو لوگ ہاتھوں میں جھولیوں میں چاول ڈلوانے لگے دھکم پیل مار کٹائی ہونے لگی۔ بچے پاؤں تلے آنے لگے سپاہی، رضاکار اور فوجی مل کر ان لوگوں کو ہٹانے لگے لیکن ان بھوکے فاقہ زدوں پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ زور لگا رہے تھے دھکے کھا رہے تھے بھی کی یہی کوشش تھی کہ وہ سب سے پہلے دیگ میں سے اپنا حصہ لے لیں ایسا نہ ہو کہ کھانا ختم ہو جائے وہ بھوکے رہ جائیں یہ پاپی پیٹ کی آگ انھیں لڑنے بھڑنے پر مجبور کر رہی تھی جن لوگوں نے اپنی عورتوں کو رسیوں پر چادریں تان کر اندر پردے میں چھپایا ہوا تھا اب وہ خود ہی انھیں باہر لا کر کھڑا کر رہے تھے

کر جاؤ... جاؤ اپنے حصے کا راشن لے لو یہ تضاد یہ مجبوری دیکھ کر حیدر کی آنکھیں دھندلا گئیں اس نے اپنے دانت ضبط کی شدت سے بھینچ لیے اور پھر تین چار عورتیں ایک دوسرے کو دھکیلتی باہر بھاگیں ان میں سے ایک لڑکھڑائی درخت کو پکڑ کر سنبھلی اور پھر دامن پھیلائے اپنے حصے کا راشن لینے ان کی طرف بھاگی حیدر نے ایک دیگ اپنی طرف کرلی اور ڈبے بھر بھر کر پھیلے ہوئے دامنوں میں چاول ڈالنے لگا وہ لڑکی دھکے دیتی آگے بڑھ رہی تھی۔

"ارے پرے ہٹ لائن میں لگ۔ کیا آگے بھاگی جا رہی ہے؟" ایک مرد نے اس لڑکی کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ لڑکھڑا کر حیدر کے قدموں پر آگری۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے تم مرد لوگ دوسری طرف جاؤ یہاں صرف خواتین کو کھانا ملے گا۔" حیدر نے گرج کر کہا تو سپاہی نے مردوں کو دوسری طرف دھکیل دیا حیدر جھکا اور اپنے قدموں پر منحنی چیتھڑوں میں ملبوس وجود کو آہستہ سے اٹھایا۔ حیدر کے توانا بازوؤں میں کمزور کلائی کی ہڈیاں کڑکڑانے لگیں بھوک اور فاقے سے لڑکی کا چمڑا ہڈیوں سے جا لگا تھا اس نے آہستہ سے لڑکی کو کھڑا کیا اس کا چہرہ مٹی میں لتھڑا ہوا تھا وہ بے آواز رو رہی تھی شاید بھوک اور فاقوں نے اس سے بولنے کی ہمت و طاقت بھی چھین لی تھی

"لو بی بی تم کھانا کھالو۔" حیدر نے چاول کا ڈبہ بھر کر نکالا تو لڑکی نے جلدی سے اپنے بوسیدہ دوپٹے کو پھیلایا۔ چاول دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی اس نے گھی سے تر بتر دوپٹہ سینے سے لگایا اور مٹھیاں بھر بھر کر چاول منہ میں ڈالنے لگی حیدر وحشت زدہ نظروں سے دیکھنے لگا لڑکی چاول چبائے نگلے جا رہی تھی اور پھر حیدر کی نگاہیں دور بھٹکنے لگیں پتا نہیں نادیہ بھی ہے یا واقعی مرگئی ہے اگر زندہ ہے تو کہاں ہوگی؟ وہ..... وہ بھی اسی طرح بھوک سے بلک رہی ہوگی؟ وہ یہ سوچ کر کپکپا اٹھا اس نے سر تھام لیا۔

"او میرے خدایا یہ عبرت کس قدر وحشیانہ طریقے سے کھا رہی ہے اور کپڑوں سے کس قدر بدبو آرہی ہے۔" ایک آفیسر نے انگریزی میں کہا اور ناک پر رومال رکھے دور ہٹ گیا لڑکی پاگلوں کی طرح کھانے میں مصروف تھی۔ کئی ایک خدا ترس لوگ جو شہر سے ساتھ آئے تھے عبرت کا اظہار کرتے کان پکڑ پکڑ کر خدا سے اپنے گناہوں کی معافیاں مانگ رہے تھے۔

"جناب کمشنر صاحب۔ آپ جیپ میں جا کر بیٹھیں کھانا ہم تقسیم کرلیں گے۔" ایک آدمی نے کہا۔

"ہاں... ہاں مسٹر حیدر علی آپ ادھر آجائیے۔" ایک آفیسر نے آواز دی۔

"حیدر علی!" لڑکی جو مٹھیاں بھر بھر کر چاول نگل رہی تھی ایک دم رک گئی ہاتھ ہونٹوں تک آکر رک

گیا اس نے نظر بھر کر بادامی شلوار کرتے میں ملبوس... افسردہ سے حیدر علی کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھا شاید پیٹ کا دوزخ بھرتے ہی سوچنے کی صلاحیتیں بیدار ہونے لگی تھیں پھر لڑکی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اسے اچھو لگ گیا وہ بے تحاشا کھانسنے لگی دوپٹہ ہاتھ سے گر گیا۔

"پانی لاؤ... جلدی پانی لاؤ۔" حیدر گھبرا کر چیخا اور پھر خود بھاگ کر جیپ میں سے اپنا فلاسک نکال کر کپ میں پانی ڈالا اور لڑکی کے ہونٹوں سے لگا دیا اور اس کی پشت تھپکنے لگا لڑکی نے بے اختیار حیدر کا گریبان اپنی دونوں مٹھیوں میں جکڑ کر اس کے سینے میں منہ چھپا لیا اور کھانسے چلی گئی۔

"ارے ارے... یہ کیا کر رہی ہو ' کمشنر صاحب کے کپڑے خراب ہو رہے ہیں۔" ایک آفیسر نے لڑکی کو دور دھکیل دیا وہ ڈولتی ہوئی زمین پر جا گری۔

وہ لڑکی سینے سی لگی تو جانے کیوں حیدر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے وجود میں سلگتے آتش فشاں پر کسی نے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پھینک دیے ہوں حیدر پریشان ہو گیا اور غور سے زمین پر بکھرے وجود کو دیکھنے لگا الجھے میلے بال چہرہ مٹی سے لتھڑا ہوا۔ قمیص کا دایاں بازو غائب تھا اور دوسرا بازو دھجیاں بنا جھول رہا تھا سامنے سے بھی کپڑے کے ٹکڑے غائب تھے یہی حال شلوار کا تھا وہ بھی بری طرح پھٹی ہوئی تھی حیدر اس کے چہرے میں شناسا سے نقش ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر اس کی آنکھیں خوف و حیرت سے پھیلنے لگیں۔ چھ سال پہلے والی مغرور شہزادی نادیہ اور زمین پر پڑے بے یار و مددگار ہڈیوں کے ڈھانچے کے نک سک ملنے جلنے لگے... کیا... یہ... یہ؟ اور حیدر تھرا اٹھا۔

"نادیہ!" وہ دیوانہ وار چیختا ہوا جھپٹا کہ سب پریشان ہو گئے حیدر نے تیزی سے نادیہ کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ وہ مجنونانہ انداز میں اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھامے پکار رہا تھا۔ "نادیہ... نادیہ۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ نادیہ نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور روتے ہوئے حیدر کو پیار سے نثار ہونے والی نظروں سے دیکھا۔ سوکھا کمزور ہاتھ اس کے بالوں کی طرف بڑھا مگر پھر وہ بے ہوش ہو گئی چھ سال پہلے ہاتھ سے چاول کھاتے دیکھ کر مغرور نادیہ کو ابکائیاں آنے لگیں تھیں اور وہ اسے اجڈ گنوار جنگلی کے خطابات سے نوازتی اپنے کمرے کی طرف دوڑی چلی گئی تھی مگر حیدر نے آج اسے جس انداز سے کھاتے دیکھا اسے نہ ابکائی آئی نہ اس نے اس جنگلی لڑکی کو کوئی سزا دی۔ پانی کی تباہ کاریوں نے اس لڑکی کے حواس اس قابل کہاں چھوڑے تھے کہ وہ اپنوں میں واپس لوٹ سکتی۔ حیدر کو سامنے پایا تو اپنوں کی دھندلی تصویریں زائل ہو گئیں اور حیدر علی نے اس کو یہ سزا دی کہ کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ ضبط کے باوجود آنسوؤں نے اس کا چہرا بھگو ڈالا تھا۔

جذبوں کے اندھیرے اُجالے میں پلنے والی اس دوشیزہ کی کہانی
جو یکسانی اور اکیلے پن کے خول سے باہر نکلنا چاہتی تھی
ایک تلخ تجربہ، جو اُس نے کیا تو زہر پورے وجود میں پھیل گیا کچھ کر مٹ جانے والی لڑکی کی داستان

آسیہ رزاقی

ذات کے قیدی

بادلوں کو بھی ایک دوسرے سے ٹکرا کر خوشی ہوتی ہے' اسی ٹکراؤ کا نتیجہ بجلی کی چمک اور کڑک ہوا ہے' اسی ٹکراؤ سے بارش جنم لیتی ہے اور زمین کی سوکھی کوکھ کو سیراب کرتی ہے پھر زمین کے خزانے نئے نئے پودے ثمراتے لہلہاتے ابھرتے ہیں۔ کونپلیں ہریالی پاتی ہیں۔ ٹنڈ منڈ درخت انگڑائی لے کر ہرا ہوتے ہیں اور جسم میں اگنے والی نئی نویلی کونپلوں کو پیار سے دیکھتے ہیں۔ ہواؤں کی گرم جوش مہار بادلوں کے درمیان لہراتے ہیں بل کھاتے ہیں گنگناتے ہیں۔ ہمارا جہاں گنگنا اٹھتا ہے۔ بہار سب کے لیے خوشیوں کا پیغام لاتی ہے اگر بادل نہ ٹکرائیں تو نہ بارش ہوگی اور نہ بہار آئے گی۔ قدرت کے ہر عمل میں ایک مصلحت پوشیدہ ہے۔ ہر مصلحت میں عمل کا پیغام ہے۔ جدوجہد کی ترغیب ہے مگر خیام کو اس کے خیال سے اتفاق نہ تھا۔ وہ آج اسے صلح و آشتی کا پیغام دے رہا تھا اور وہ بحث کر رہی تھی۔ خیام جانے کیوں اتنا سنجیدہ تھا۔

"آفتاب دلہن۔ بس اب میری ننھی بی بی کے ہاتھوں میں بھی کنگن پہنا دو۔" سلطانہ بوا کو اس سے ازلی بیر تھا۔ اس کی آزادی سلب کرنے کا ہر حربہ وہ امی کو بتا چکی تھیں۔ اس کی آزادی اور شوخی کو وہ ہڑونگا پن اور بے حیائی کہتی تھیں۔ انھیں حرا اور خیام کی نہ سمجھ میں آنے والی لڑائی سے سخت کوفت ہوتی تھی۔

"بوا سب سے پہلے تم کنگن پہنو پھر میں بھی ہاتھ بھر کر چوڑیاں چڑھالوں گی۔" وہ چڑ کر بولی۔

"اوئی۔" سلطانہ بوا اچھل پڑیں۔ "میں تو شادی کا کہہ رہی ہوں۔"

"میں بھی شادی کا کہہ رہی ہوں۔" وہ بے پروائی سے نیل پالش کے رنگ پرکھ رہی تھی۔

"میں آپ کی شادی کا کہہ رہی ہوں۔ اب ہو جائی چاہیے۔" بوا کچھ جھلا گئیں۔

"میں بھی۔ سچ بوا!۔ آپ ایک شادی کرلیں۔ میں چار کر کے بتا دوں گی۔" سلطانہ بوا کے ہاتھ سرد ناگر پڑا۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر اس بے حیا لڑکی کو تکنے لگیں۔ بعد میں خیام نے اسے بہت جھاڑا۔

"ایمان سے تم نہایت کمینی چیز ہو۔ کیا کہا تھا ذرا پھر سے کہنا۔"

"ہاں تو کیا ہوا۔ میں نے کہا تھا بوا ایک کرلیں تو میں چار اور کروالوں گی۔" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ خیام ہنسنے لگی مگر خیام کچھ کم کمینہ نہ تھا۔ چھوٹے چچا کے سامنے معصوم بنا اس کی بے باکی اور بدزبانی اور کی شکایت کر رہا تھا۔

"صاحبزادی چار شادیاں کرنا چاہتی ہیں۔ یقین نہیں تو خیام سے پوچھ لیں۔" بوا نے مفصل رپ دی۔ چھوٹے چچا سوچ میں پڑ گئے۔

خیام کو پکچر جانے کی جلدی تھی۔ شومئی قسمت حرا کا بھی سہیلیوں کے ساتھ پروگرام بن گیا تھا نے کہا۔

"تم جا تو رہے ہو اسے بھی ساتھ لے جاؤ۔ اکیلی کیسے جائے گی!" اور اب حرا اپنے لمبے گھنے بال برش کر رہی تھی اور اسے قطعی جلدی معلوم نہیں ہوتی تھی۔

"خدا کے لیے میری پکچر مس ہو جائے گی۔"

"اچھا اور میرے متعلق کیا خیال ہے۔"

"ارے میری پوری نسل مجھے کوس رہی ہوگی۔ ٹکٹ میرے ہی پاس ہیں۔"

"اچھا تو تم سب کو پکچر دکھا رہے ہو اور میں اپنی سہیلیوں کی دست نگر ہو کر جا رہی ہوں۔ تف ہے پر۔" وہ بگڑی۔

"اوہ۔ خدا کے لیے حرا! تم یہ جھاڑ جھنکار کٹوا کر شرافت سے انسانیت کے جامے میں آسکتیں؟" خیام مسلسل بول کر اسے بوکھلا رہا تھا۔ اس کے بال خیام کو سخت ناپسند تھے۔ پورا گھنا تھا سلجھے ہیں۔

"کیا ہے۔" وہ ہاتھ روک کر اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگی۔ "دن رات جن کی خدمت کرتی ہوں۔ سیکڑوں روپے ماہانہ جن کی پرورش پر خرچ کر رہی ہوں۔ ان کے بارے میں...."

"اے ہے۔ منھی بی۔ کس کی پرورش پر سیکڑوں خرچ کر رہی ہو۔" بوا کم سنتی تھیں مگر کبھی کبھی زیادہ ان لیتی تھیں۔

"اپنے بالوں پر۔ جن کی پرورش اتنی محبت اور لگن سے کرتی ہوں۔"

"وہ کون؟" بوا خوفزدہ ہو گئیں۔ "بال کیا۔ بال بچے؟"

"میرے اپنے ہیں۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ برش کو نفاست سے صاف کیا پھر بالوں میں رین کر کنگھی ہو گئی۔

بوا آنکھیں پھاڑے کھڑی تھیں۔ "کون۔ کتنے ہیں منھی بی۔"

"اونہہ۔ نظر مت لگا دینا۔" اس نے تنک کر کہا پھر خیام سے بولی۔ "چلو۔"

"تمہارے اس جنگل نے آج پکچر کا کباڑا کر دینا۔" وہ جھنجلایا۔ "کٹواؤ جی۔ کہاں کا عذاب پالا ہے۔"

"بالوں گی۔ پالوں گی۔ میرے اپنے ہیں۔ کسی سے مانگ کر تو نہیں لائی۔" وہ چڑ کر بولی۔ بوا دہشت زدہ رہ گئی تھیں۔

"کیا زمانہ آن لگا ہے۔ کنواریاں کیسے کیسے بچوں کو پال رہی ہیں۔ اللہ رحم کرنا۔ اب میں آفتاب کو یہ بات کیسے بتاؤں۔ نہیں یہ بات ہرگز بتانے والی نہیں۔" بوا بڑبڑائیں

حرا میں برداشت کی کمی تھی اور خیام کو چھیڑنے ستانے کی عادت تھی۔

"میں تو کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔" اس نے مزید چڑایا۔ "بیکار میں سر پر ٹوکرے کا بوجھ سیکڑوں کا بے کار۔ بے ضرورت۔"

"اچھا۔" حرا نے پلٹ کر خیام کے سر پر جھپٹا مارا۔ "میں آج تمہارے بال بھی نہیں چھوڑوں گی۔"

خیام نے سر پیچھے کر کے اسے آگے دھکا دیا۔

"ہلو ہٹو۔ میں نے اگر ایک بال بھی پکڑ لیا تو رو دو گی۔"

"خیام دیکھو میں بہت برداشت کر رہی ہوں۔"

"اچھا اچھا۔ پکچر کا تو ستیاناس ہو چکا اب دوستوں کے سامنے ذلیل نہ کر دینا۔"

"دل کی کمینی ہے۔" دانت پیس کر اس نے دل میں کہا۔ جب انٹرول میں بیرے نے بہت عدد کوک

کے دام طلب کیے اس نے بیرے کے اشارے پر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ "کھی کھی کھی ہی ہی۔" بس آوازیں آئیں۔ جانتی ہے کہ میری جیب خالی ہے مگر ہے جو کمینی۔ دوستوں سے چندہ کر کے بیرے کا ادا کیے۔ راستے میں دونوں میں جھگڑا ہوا۔

"واہ تم نے ہی تو کہا تھا ذلیل نہ کرو نا۔ تم چاہتے تھے میں اپنی سہیلیوں میں ذلیل ہو جاؤں۔ انھوں پکچر دکھائی تو میں کوک بھی نہ پلاتی؟ اتنی گئی گزری بھی نہیں ہوں۔" اس نے برا مان کر کہا۔

"تو پلا دی ہوتی اپنے پاس سے۔" طنز سے خیام نے کہا۔

"آہا۔ تمھاری موجودگی میں؟ واہ سب کو پتا تھا کہ تم دوستوں کو فلم دکھا رہے ہو۔ میرے لیے نہیں کر سکتے؟"

"آئندہ جو کبھی تمھارے ساتھ کہیں جاؤں تو خیام نہیں بھنگی کہنا۔" وہ جلا بھنا گھر کے اندر چلا گیا۔ گنگناتی اندر آئی۔ رات کو جب خیام سونے کے لیے لیٹا حمرا سے قطعی خفا تھا۔ دوستوں کے سامنے قدر شرمندہ کیا تھا چڑیل نے پھر کھانے پر اپنے ابا' امی کے سامنے اس کا مضحکہ اڑاتی رہی۔ اس میں آکر کہا۔ "مت بات کرو۔ میں نہیں تم سے کلام کرتا اگر بولوں تو چمار کہنا۔" اور اس نے تو تھا کہ اس سے بات نہیں کرے گا۔ صبح آنکھ کھلتے ہی بھینی بھینی خوشبو سے دماغ معطر ہو گیا یونہی کر دیکھا۔ گلاب کے پھول سرہانے رکھے تھے آہا۔ تو صلح کی کوشش' مگر میں اتنا بھی کمزور نہیں۔ بولوں گا۔ ہر وقت لڑنا جھگڑنا۔ نوچ کھسوٹ جنگلی بلی کی طرح۔ کسی کا ڈر نہ رعب من مانی کرتی پھرا ناشتے پر بار بار پیروں سے اسے ٹھونگے دیتی رہی۔ خیام بے خبر بیٹھا ناشتا کرتا رہا۔ پھر اخبار اچانک حمرا نے پیر بیچ کر کہا۔

"امی پھر چائیے نا! میں جاؤں؟" خیام نے دیکھا وہ بڑے اچھے کپڑے پہنے بنی سنوری کھڑی تھی۔

"کیسے جاؤ گی؟ کہا تو ہے ابا کو آنے دو۔ دس منٹ انتظار نہیں کر سکتیں۔" چچی کہہ رہی تھیں۔

"اچھی بات ہے پھر دیر ہو جائے گی۔ فائن دینا پڑے تو جرمت مت کیجیے گا اور آج فنکشن بھی تو ہے۔"

"افوہ حمرا! اتنی دور کے کالج میں داخلہ کیوں لیا تم نے۔"

"آپ اجازت دیں تو میں شمو سے کہلوا دوں۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ جاتی ہے۔ میں بھی چل ہی گی۔" اس نے تکھیوں سے خیام کو دیکھا۔ وہ کچھ بے چین ہو گیا۔

"اے ہے۔ غیروں کا احسان۔" امی سوچ میں پڑ گئیں۔

"اپنوں سے غیروں کا احسان اچھا ہوتا ہے امی۔" وہ منہ پھلا کر بولی اور پیر پٹختی ہوئی باہر کو چلی۔

"ہاں ہاری ہوں شمو کی طرف' اگر شمونہ گئی تب بھی اس کا بھائی تو آفس ضرور جائے گا۔ انکار نہیں کرے گا میرے لیے۔ بڑا با اخلاق ہے۔ خاطر کرتے نہیں تھکتا میری تو۔"

"خیام کیا تم نہیں جاؤ گے آج یونیورسٹی؟"

وہ اچھل پڑا۔ "جی.... جی... جاتا ہوں۔"

"تو دیا۔ پھر اسے بھی لیتے جاؤ۔ دیر ہوئی تو فائن ہو جائے گا۔" امی کو فائن سے بہت خوف آتا تھا۔

پھلائے راستہ طے کرتے رہے۔ کالج کے گیٹ پر اتر کر اس نے مسکرا کر کہا۔

"میں پھر مجھے لینے بھی آؤ گے نا۔" وہ ہنستی ہوئی اندر چلی گئی اور ہونٹ کاٹتا خیام واپس ہوا مگر واپسی اسے لینا نہیں بھولا۔ بات نہیں کی۔ گو حمرا مسلسل چیختی رہی۔ "افوہ۔ دشمن ہو میرے۔ کیوں اتنا ہو رہے ہو۔ بدذات خیام میں گر جاؤں گی۔ لڑکیوں رہے ہو۔ اوئی یہ کیا۔ میں ابھی گر جاتی۔ کیا فل ہو گئیں۔ کمبخت۔" خیام نے اس کی بکواس پر دھیان نہ دیا اور اسکوٹر تیز چلاتا رہا لڑاتا ہوا۔ ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا۔ وہ چلائی۔ "بچاؤ۔ بچاؤ۔" رفتار کم کر کے خیام نے مڑ کر دیکھا۔ حمرا شدید پڑ گیا تھا۔ راہ گیر مڑ مڑ کر انھیں دیکھ رہے تھے' بعض ان کی طرف آنے لگے۔ خیام نے پھر کر دی۔ حمرا نے سکچا کر خیام کی پیٹھ میں کاٹ لیا۔ وہ بلبلا گیا۔ یک دم انجن بند کر کے کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہے؟"

"کاٹا ہے دانتوں سے۔"

"کیوں کاٹا۔" وہ غرایا۔

"تم مجھے مارنے پر تلے بیٹھے تھے۔ اب گھر چلو ابا سے پٹائی نہ کروائی تو کہنا۔"

"ہاں۔ میں بتاؤں گا۔ پٹائی کس کی کب اور کیسے ہوتی ہے۔"

حمرا نے اس نے منہ چڑا کر کہا۔ "چمار صاحب پٹیے ابا کے سامنے۔" مگر حمرا کے ابا گھر پر نہیں تھے۔ ہوا ہوا گیا تھا۔ چچی سے شکایت کی۔ وہ اسے سمجھانے لگیں۔ "بیٹا اسے معاف کر دو نا سمجھ' نادان ہے۔ واشت نہیں کرو گے تو کون کرے گا۔" خیام چپ ہو گیا۔ تھی وہ پٹڑی سے اتری ہوئی۔ حد سے زیادہ اور اکتاہٹ کا شکار رہتی۔ خیام سے بے تکلفی تھی اور بے تکلفی بڑھ جائے تو زبان قابو میں رہتی مگر اس کے تو ہاتھ بھی بے قابو تھے۔ حمرا اس حقیقت سے ناواقف تھی کہ وہ خیام کی منگیتر

ہے۔ یہ ان کے بزرگوں کا فیصلہ تھا اور ابھی حمرا کو بے خبر رکھا گیا تھا مگر دنیا میں اس کا واحد دوست اور غم خوار، غمگسار خیام ہی تھا۔ اس سے لڑ جھگڑ کر، ضد کر کے بسور کر، رو کر وہ اپنی ہر بات منوا لیتی تھی۔ اس بہت ستاتی مگر اس کی ہر اچھی بری بات سن بھی لیتی تھی۔ اسے غم تھا نہ فکر مگر چچی اس کی فکر میں گھلی جا رہی تھیں، کہیں کوئی یہ نہ کہہ دے وہ نہ کہہ دے۔ یوں نہ سمجھے ان کی خدمت اور قربانیوں پر حرف آئے۔ وہ حمرا کی آزاد فطرت کو کسی طرح پابند نہ کر سکی تھیں اسی لیے ڈرتی رہتی تھیں۔ خیام اور وہ دوسرے کے بہترین دوست، بدترین دشمن تھے یہ خیال خیام کا تھا۔ خیام کے بازوؤں پر حمرا کے ناخنوں کی خراشیں ہمیشہ تازہ رہتیں۔ وہ بھی جواب میں اس کے چٹکی بھر لیتا۔ کبھی گال پر چٹکی لیتا تو کبھی اس کے رخسار آگ کی طرح تپتے۔ بوا نے ایک دفعہ اس سے پوچھا۔ "ننھی بی۔ یہ منہ کیوں لال ہو رہا ہے۔"

"بس اس کی مرضی۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"لگ رہا ہے جیسے خون ابل رہا ہو۔"

"ہاں ایک کتے کی حرکت ہے۔ پاگل کتے کی۔" وہ جانتی تھی خیام لان میں ٹہل رہا ہے۔ وہ سیڑھیوں پر بیٹھی بال سلجھا رہی تھی۔ "میں نے زیادہ منہ لگا لیا تھا۔ کتا ٹھہرا۔ اوقات سے بڑھ گیا۔ پاگل ہو گیا۔"

بوا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "کتا آیا کہاں سے۔" وہ بہت دیر یہی سوچتی رہیں۔ خیام کے نام ایک خط تھا۔ وہ بہت مسکرا مسکرا کر پڑھ رہا تھا۔ حمرا نے اچانک جھپٹا مارا مگر خیام ہوشیار تھا۔ "میرا خط ہے میرا ذاتی قطعی پرائیویٹ۔"

"تو دکھا دو ناکس کا ہے؟"

"میرا تو کوئی لور (Lover) ہی نہیں۔ مجھے کون خط لکھے گا۔"

"اچھا مگر میں نہیں دکھا سکتا۔" وہ بے مروت بن گیا۔ حمرا کو مایوسی تو ہوئی مگر اس نے خیام کی موجودگی میں سارا کمرا تلاش کر مارا، خط نہیں ملا۔ جانے کمبخت نے کہاں رکھ دیا تھا۔ ملا نہیں۔ وہ ناامید ہو کر جانے ہی والی تھی کہ باتھ روم میں سے خیام نکلا۔ سرتولیے سے رگڑتا ہوا۔ "یہاں خط نہیں ہے چلو یہاں سے۔" حمرا کو ضد ہو گئی۔ اس نے اس کے سامنے ہی از سر نو تلاشی لینا شروع کر دی۔ "ارے ارے۔" خیام چلاتا رہا مگر بستر زمین پر، الماری کی درازیں پلنگ پر اور درازوں کے کاغذات کمرے میں اڑتے پھرے۔ خط کہیں نہیں تھا۔

"اللہ کرے مر جاؤ۔ نامراد کینے کہاں رکھا ہے خط؟" وہ روہانسی ہو کر مارنے کو دوڑی۔

"میری گرل فرینڈ کا ہے۔ میرے کلیجے میں رکھا ہے۔ یہ دیکھو۔" اس نے اوپری جیب تھپتھپائی۔ کھانے کے دوران اس نے نہایت بدتمیزی سے چاول پلیٹ میں میز پر گراتے ہوئے جنگلی پن سے کہا۔ "امی خیام کی گرل فرینڈ کا خط آیا ہے۔ سچ۔ ارے وہ کراچی والی نہیں، ایبٹ آباد والی۔ نہیں پنڈی والی تو کل مری میں ہے کمبخت۔ یہ تو ایبٹ آباد والی کا تھا۔ خیام نے مجھے بھی دکھایا۔ بڑا مزا آیا۔" چچا میاں ہاتھ روک کر خیام کو گھورنے لگے۔ وہ بوکھلا گیا۔

"سچ امی۔ بے چاری نے بڑی لجاجت سے لکھا ہے کہ دو دن کے لیے ایبٹ آباد ضرور آجاؤ موسم بڑا خوشگوار رومینٹک ہو رہا ہے۔"

چچا میاں ایک دم کھڑے ہو کر چنگھاڑنے لگے۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا بیہودگی ہے۔ یہ خط تم نے حمرا کو دکھایا؟ کون ہے یہ بدبخت، اسی کے لیے خوشامد ہو رہی تھی کہ ہماری ٹیم پنڈی جا رہی ہے میچ کھیلنے، تو یہ بہانہ تھا۔"

"چچا میاں۔۔۔ آپ تو بس۔ یہ بات نہیں۔۔۔ وہ حمرا۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ بات۔۔۔" وہ ہکلاتا رہا مگر چچا میاں کو شدید غصہ آگیا تھا بطور سزا خیام کا جیب خرچ بند۔ خیام خوشامدیں کرتا رہا۔ صفائی پیش کرتا رہا مگر بے سود۔ وہ کچھ سننے کے موڈ میں نہ تھے۔

"تم دن بدن بگڑتے جا رہے ہو۔ میں تمہیں بگڑنے نہیں دوں گا سمجھے! شرافت کے دائرے میں رہو ورنہ جا نکلو۔ جیب گرم ہو تو خواہشیں بھی بڑھتی ہیں۔ اب میں دیکھوں گا کہ تم کس طرح۔۔۔ اور یہ خط و کتابت۔۔۔ ہونہہ۔ پنچھو را پن۔"

"چچا میاں وہ غلط۔۔۔ وہ کوئی نہیں ہے۔" مگر چچا میاں کمرے سے باہر جا چکے تھے۔ خیام میز پر مکا مار کر کھڑا ہو گیا۔ چچی کے باہر جاتے ہی اس نے کس کر حمرا کی پیٹھ پر دھموکا جڑا۔ حمرا پیٹھ سہلاتی ہوئی مسکرائی کہ آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ بڑے زور کا گھونسا مارا تھا خیام نے۔

"اب چھپاؤ گے مجھ سے کوئی چیز؟"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ازل کا ذلیل ہو گا تو تمہیں کچھ دکھائے۔" وہ چنگھاڑا لیکن شام سے پہلے ہی اسے پیسوں کی اشد ضرورت پیش آگئی۔ چھوٹے چچا سے مانگے انھوں نے بھویں اچکا کر کہا۔ "واپس کہاں سے کرو گے؟"

"کہیں سے بھی کروں گا جلد ہی ادا کروں گا۔"

"کیا چوری کرو گے؟ جیب خرچ تو بند ہو گیا ہے۔" چھوٹے چچا بغور اسے دیکھ رہے تھے۔

"ہاں چاہے چوری کروں ڈاکا ماروں۔ آپ کا قرض ادا کردوں گا۔" وہ بھنا کر بولا۔

"مجھے کوئی ارمان نہیں تمہیں چور ڈاکو کے روپ میں دیکھنے کا' ہتھکڑی بیڑی میں پابند۔" وہ خشک لہجے میں بولے۔ خیام کا غصہ عروج پر تھا کمرے کی ساری چیزیں تہ و بالا کردیں کہ شاید کچھ رقم کبھی کی رکھی رکھائی مل جائے۔ رات تھی کہ چلی آرہی تھی سر پر اگر رات تک پچاس روپے نہ ملے تو... کسی کی جان جائے گی اور میرا وعدہ جھوٹا ثابت ہوجائے گا۔ اس نے بوا سے بڑی لجاجت سے بھی رقم کا مطالبہ کیا۔

"اے بھیا۔ ہم تو سچ کہتے ہیں۔ اگر ہوتے تو آپ پر سے صدقے مگر کیا کریں ہیں ہی نہیں۔"

"بوا جی سے کہو۔"

"اے ہے میاں سے ڈر لگتا ہے۔"

"اچھا تو حرا سے کہو۔ میں بہت جلد ادا کردوں گا مگر ابھی ایک مکار لومڑی تھی سمجھ گئی کہ بوا خیام کے لیے مانگ رہی ہیں ہنس کر بولی۔ "میں دے بھی سکتی ہوں۔ دوں گی بھی مگر پہلے ذرا دیکھوں گی۔" خیام بال نوچ کر رہ گیا پھر جیب سے خط نکال کر اس کے ہاتھ میں ٹھونس کر کہا۔ "لے مرے ارمان پورا کر۔" شرارت سے آنکھیں نچاتی فتح کے احساس سے مسکراتی خط پڑھ کر گنگنانے لگی۔

"اب دیر نہ کرو۔ حرا پلیز مجھے جلدی ہے۔" وہ گڑگڑا رہا تھا مگر حرا چک پھیریاں سی لیتی گنگناتی پھر رہی تھی جب قریب آئی تو بھنا کر خیام نے اسے کھسوٹ ڈالا۔ دھکا دے کر پلنگ پر گرایا۔ اس کی مٹھی سے الماری کی چابی چھین لی اور تیزی سے الماری کھول کر سارے کپڑے نیچے گرادیے۔ کپڑوں کے نیچے پرس رکھا تھا۔ نہایت پھرتی سے زپ کھول کر اس نے مٹھی بھر روپے نکالے' سرخ جلتی آنکھوں سے حرا کو دیکھا۔ وہ اب بھی پلنگ پر لیٹی مسکرا رہی تھی۔ خیام تیزی سے باہر چلا۔ آواز آئی۔ "ازل کی ذلیل۔ میری الماری بند کر کے جاؤ۔" خیام تیزی میں تھا۔ چھوٹے بچا کی ہائیں ہائیں سنی ان سنی کر کے ان کی جیب سے کار کی چابی لی اور دوڑ کر گاڑی میں جا بیٹھا جب حرا دوڑتی ہوئی باہر آئی تو وہ گیٹ سے باہر جا رہا تھا۔

"کوئی مجھ جیسا مجبور و بے کس نہ ہوگا۔" صبح وہ لان میں ٹہل ٹہل کر بقول حرا گھاس روند رہا تھا اور اپنے پالتو بلے سے باتیں کر رہا تھا۔ "جس کے پاس ایک کوڑی نہ ہو اس کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔" جیب خرچ ایک جھوٹوں کی جمعدارنی نے بند کروادیا۔ پہلے ہی کینٹین کا قرض چڑھا ہوا ہے۔ اس دن سارے سورنیوں کو کوک پلایا وہ ابھی تک دوستوں کا ادھار باقی ہے۔ کم بخت روز مانگتے ہیں کنجوس۔ کنجوس۔"

ٹھوٹے چبانے برآمدے میں شیو کرتے کرتے ایک ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔ "جس سے مانگتا ہوں۔ وہ آنکھیں دکھاتا ہے۔" وہ پھر بولنے لگا۔ "میں جوان ہوں' تندرست ہوں۔ بتادوں گا کہ میں بھی کچھ کر سکتا ہوں۔ نوکری کروں گا' مزدوری کروں گا' خون پیئوں گا' خون پیئوں گا' سب کچھ کر سکتا ہوں۔ کسی کا دست نگر ہو کر رہنا۔ تف ہے بس اب پتا چلا کہ دنیا میں کوئی کسی کا نہیں۔ نہ دوست نہ محبوب۔ بس جو ہے وہ پیسا ہے۔ ہر شخص اسی کے عشق میں مبتلا ہے مگر میں ایسا نہیں ہوں۔" ہار سنگھار کے پیڑ کے نیچے بیٹھی کرائے کی کیوٹکس ناخنوں پر سے چھڑاتے ہوئے ریتی پر پھونک ماری۔

"میرے پیسے ادا کردو۔ مجھے بھی سخت ضرورت ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"تم..... شرن۔ نسوان۔ تم کو تو آزادی ہے کہیں سے بھی مارلو گی۔ آنسو بہا کر' خوشامد کر کے یا بھوک ہڑتال کی دھمکی دے کر۔" خیام نے تیزی سے کہا۔

"تو تم بھی یہی کرو۔ تمہیں کس نے روکا ہے۔"

"میں مرد ہوں جی۔" وہ اکڑ کر بولا۔ "ان اوچھی کمینی حرکتوں سے نہیں زور بازو سے پیسا کماؤں گا۔"

"اچھا تو جلدی کرو نا مجھے بھی کل ان سورنیوں کو پکچر دکھانا ہے اس دن کا ادھار چکانا ہے۔"

"اف۔ فوہ۔ تم۔ تم خود غرض۔ جانتی نہیں ہو میں نے کس اعلا مقصد کے لیے تم سے قرض لیا تھا؟ مگر تم اعلا صبر کہاں کر سکتی ہو۔ ثواب میں حصے دار بننے کی تمہیں خواہش ہی نہیں۔ کمینی کہیں کی۔"

"اچھا بس۔ ٹھیک ہے مجھے ثواب نہیں چاہیے۔ تم ہی کماؤ ہاں جاؤ نا۔ کیا کہہ رہے تھے ابھی۔ وہ بیچو۔ کون اور کیا مجھے بھی دنیا میں بھی خریدلوں گی۔ دانت میں درد ہے۔" وہ بن کر انگلی سے دانت ہلانے لگی۔

"منجن۔؟" خیام نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ ابھی تو کہہ رہے تھے منجن بیچوں گا مگر مجھے پتا ہے کچھ کرو گے دھرو گے نہیں۔ منجن بیچوں گا۔ ہونہہ۔ کاہل۔"

"اچھا۔ تو اسی بات پر شام کو تمہیں پیسے مل جائیں گے۔" وہ غصے میں تلملاتا ہوا کیوٹکس کی شیشی کو ٹھوکر مار کر گراتا ہوا وہاں سے چلا آیا۔ حرا کی چیخوں' کوسنوں سے بے نیاز۔ کمال ہے وہ خون اور فن بیچنے کو کہہ رہا تھا اور وہ بے حس بڑھی گھوڑی منجن سمجھی۔ کمینی۔ اس نے دانت پیسے تب کچھ تسکین ہوئی۔ رات کو اس نے سنجیدگی سے حرا کو کچھ نوٹ لا کر دیے۔

"افوہ۔ دن بھر میں اتنا منجن بک گیا۔ کمال ہے پھر تو یہی کاروبار کرو تم۔ اتنا منافع اور کسی کام میں نہیں

ہوگا۔"

"کیا بک گیا؟ انجن؟ اب کون سا انجن بک گیا۔ ریڈیو کی خبروں میں تو انجن خریدنے کا سنا تھا۔" بوا نے کان کھڑے کیے۔

"منجن۔" حمرا نے سنجیدگی سے کہا۔ "دانت مضبوط کرنے والا۔ بوا تم نئے دانت اگوانا چاہتی ہو؟"

"اوئی نہیں۔ اب کیا اگیں گے۔" بوا خوفزدہ ہو گئیں۔ "بوڑھے منہ مہاسے تو سنا تھا۔ اب دانت بھی..... اور اگر اگ گئے سچ مچ تو لوگ کیا کہیں گے کہ اس عمر میں دانت اگانے کا منجن..... تو میاں۔۔ پھر کیسا ہے وہ منجن۔ سچ مجھے بھی دینا۔ شاید..... بھئی کئی کھائے برسوں ہو گئے اور چنے بھی....."

"میں نے خون بیچا ہے۔" خیام چنگھاڑ کر بولا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"تو کل ہی خون بیچ کر اپنی ضرورت کیوں نہ پوری کی۔" حمرا کس قدر بے حس تھی۔

"کل۔ خون کے بیوپاری اپنا کاروبار بند کر کے چھٹی منا رہے تھے اس کے علاوہ..... جب کوئی قرض خواہ تقاضا کرتا ہے تو غیرت مند انسان جان دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ کل قرض میں نے فرض کے لیے لیا تھا۔"

"اس فرض کے لیے آیندہ بھی ضرورت پڑ سکتی ہے؟"

"ہاں۔ کیوں نہیں" اس نے منہ پھلا کر کہا۔ "مگر وہ اب ڈسچارج ہو گیا ہے۔"

"کون۔۔ کون؟"

"وہی سجاد۔ پچھلے ہفتے اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ میں نے ہاسپٹل میں داخل کروا دیا تھا۔ اسی کے انجکشنوں اور بلوں کی ادائیگی کے لیے ضرورت تھی۔ سوچا تھا چچا میاں سے مانگ لوں گا مگر تم ابلیس کی شاگرد بن کر ٹیک کام میں رخنے ڈالنے آ گئیں نہ صرف میرا جیب خرچ بند ہوا بلکہ مجھے ذلیل بھی کروایا۔"

"افوہ۔۔۔ بھئی۔۔ اب مجھے کیا پتا تھا۔" وہ کراہی۔

"تم ہمیشہ میری دشمنی پر کمربستہ رہتی ہو۔ اب آج خون بیچ کر تمہارا قرض ادا کیا ہے آیندہ اگر ادوں....."

"نا..... نا....." بس حمرا نے بچوں کی طرح چہکار کر اسے اگلا فقرہ بولنے سے روکا۔ "تم ارادوں کے اتنے مضبوط بھی نہیں ہو۔ چلو۔ جانے دو۔ لو یہ پیسے سجاد ہی کو دے دینا۔ بیچارا۔ مجھے کیا خبر تھی۔"

"شکریہ۔ میں نے اس کے بل ادا کر دیے ہیں۔ چار بوتل خون بیچا ہے۔ کوئی مذاق نہیں۔" حمرا نے

ملگوک نظروں سے اسے دیکھا۔

"چار بوتل! لگتا تو نہیں۔ بچے کھچے تو لگ رہے ہو پہلے جیسے۔"

"تو تمہارا مطلب تھا کہ مر جاتا؟" حمرا کے پیٹ میں بھلا بات کہاں ٹکتی۔ اس نے امی سے جڑ دیا۔ انھوں نے سر تھام لیا۔

"اے بیٹا۔ میں کیا مرگئی تھی۔ مجھ سے کیوں نہ مانگ لیے۔ خون کیا اتنا سستا تھا کہ جھٹ بیچ آئے۔"

"مہنگا تھا تبھی بیچا اور اب تو روز یہی کرنا پڑے گا۔ جیب خرچ۔" وہ منہ پھلا کر بولا۔

"اب چپ رہو۔ خبردار۔ تم مجھ سے اپنی ضرورت کے پیسے لے لیا کرو۔ جب جیب خرچ بحال ہو۔ واپس کر دینا۔" چچی کو شرارت سوجھ رہی تھی۔ وہ مسکرا رہی تھیں۔ "بھئی تمہیں قرض مانگنے کی عادت ہے اس لیے کہہ رہی ہوں۔"

"چچا میاں ناراض ہوں گے۔" وہ ہچکچا کر بولا۔

"نہیں۔ میں ان کو بتا دوں گی کہ قرض دیا ہے مگر خدا کے لیے اب خون کا نام نہ لینا اور بیٹا ذرا ہاتھ سنبھال کر خرچ کیا کرو اسی لیے تمہارے باوا نے تمہیں یہاں بھیجا ہے کہ تمہاری عادتیں کچھ ٹھیک ہوں۔ فضول خرچی تو اچھی نہیں ہوتی۔"

"جانتا ہوں۔" خیام نے خفگی سے کہا۔ "مگر اب اتنا کم بھی خرچ نہیں کر سکتا کہ کسی کی مدد نہ کروں اور یہ جو حمرا ہے نا۔ بہت کم ظرف ہے۔ کیا جانا اگر وہ چچا میاں سے خط کا ذکر نہ کرتی اور پتا ہے بچی' وہ خط میرے دوست کا تھا۔ مروکا۔ کمینی نے جھوٹ بولا۔"

"اور میں اگر ان سے کہوں گا تو وہ یقین تھوڑی کریں گے جب تک حمرا خود انھیں یقین نہ دلا دے اور وہ کبھی نہیں کہے گی۔"

اگر ایک دو دن وہ نہ لڑتے تو ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ اصل میں شروعات خیام کی طرف سے ہوتی۔ وہ جب اپنے گھر سے سدھارنے کے لیے آیا تھا۔ پانچ بہنوں سے لڑتا' جھگڑتا' چھین جھپٹ' لپا ڈگی' چھیڑ چھاڑ کی عملی ٹریننگ لیے ہوئے۔ حمرا تھوڑی پڑی سے اتری ہوئی ضرور تھی۔ لڑاکا نہیں تھی مگر خیام نے اسے بھی اپنے مدمقابل بنایا تھا۔ حمرا کی امی جنھوں نے اسے چھے ماہ کی لے کر پالا تھا اور جو اب حقیقی ماں کی مامتا سینے میں چھپائے اسے ہر آفت سے بچانے میں سینہ سپر رہتی تھیں' خیام کی حرکتوں پر ہنستی رہتی تھیں اسی لیے خیام کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی اگر حمرا ترکی بہ ترکی جواب نہ دیتی تو خیام سے پٹ جاتی ہار جاتی

اسی لیے وہ ڈھیٹ بن گئی۔ اب تو چچا میاں نے اسے حرا سے منسوب کر دیا تھا اور وہ ان کے کاروبار کا مستقبل میں مالک بننے کے لیے کاروباری گر سیکھ رہا تھا۔ یونیورسٹی سے آنے کے بعد اسے دفتر میں حاضری دینا پڑتی۔ وہ اپنے باپ سے زیادہ چچا سے ڈرتا تھا مگر چھوٹے چچا جن کو صرف شکار سے دلچسپی تھی خیام سے بے تکلف تھے۔ خیام ان کو گردانتا ہی نہیں تھا۔ چچا میاں ہر معاملے میں اصول کے پابند تھے بس حرا کے لیے ان کے دل کا گوشہ کچھ نرم تھا۔ حرا ان کی اپنی اولاد نہ تھی۔ بڑے بھائی بھاوج ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے تھے انھوں نے یتیم بھتیجی کو سینے سے لگالیا۔ حرا کو ماں باپ کا نعم البدل مل گیا تھا مگر چچا میاں نے اس سے یہ کبھی نہیں چھپایا کہ وہ ان کی اولاد نہیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کسی دوسرے سے یہ خبر اسے ملے اور وہ بدظن یا دکھی ہو جائے۔ اسے ماں باپ کی موت کا زیادہ دکھ نہ تھا جو والدین گھر میں بچوں کو بلکتا چھوڑ کر تفریح میں مگن رہتے ہوں بچوں کو توجہ اور محبت سے محروم رکھتے ہوں ان کے ہونے اور نہ ہونے سے فرق ہی کیا پڑتا ہے اور پھر اسے ماں سے زیادہ چاہنے والی آغوش مل گئی تھی جنھوں نے رات دن کا سکون کھو کر اس کی پرورش کی۔ وہ ہر معاملے میں حرا کی بہتری کو مدنظر رکھتی تھیں اس کی ہر ضد پوری کرنا فرض سمجھتی تھیں مگر غلط اقدام پر ٹوکتی بھی تھیں۔ اسی لیے حرا کو ان کی ذات پر کامل یقین تھا۔ وہ مثالی ماں تھیں لیکن وہ خود اس وقت سے ڈرتی تھیں کہ کہیں حرا اپنی کسی پوری نہ ہونے والی ضد پر ان کو ماں نہ ہونے کا طعنہ نہ دے دے۔ چچا میاں نے اسی خطرے کے پیش نظر خیام سے اس کی نسبت طے کر دی تھی۔ دونوں کی طبیعتیں اور مزاج ملتے ہیں۔ کئی سال سے ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچان گئے تھے۔ مستقبل میں کسی غلط فہمی کا خطرہ نہ تھا۔ اس دن خیام نے جب چچی سے حرا کی زیادتیوں کی شکایت کی تو انھوں نے سمجھایا کہ بس کچھ دن کی بات ہے۔ شادی کے بعد تم خود ہی اسے سمجھانا۔

"وہ شادی کے بعد بھی نہیں سدھرے گی۔" خیام نے مایوسی سے کہا تم بھی تو اس سے لڑتے ہو تم بھی ہاتھ اور زبان روک لو شاید وہ بھی ٹھیک ہو جائے۔" چچی نے مسکراہٹ دبا کر کہا۔ خیام نے سوچا۔ ٹھیک تو کہتی ہیں چچی۔ آخر میں بھی آپے سے باہر ہو جاتا ہوں اگر ہم پیار محبت سے رہیں تو اچھا لگے گا۔ اس نے حرا سے کہا نرمی سے سمجھایا حرا نے بغور اسے دیکھا۔ "بات کیا ہے؟ پیسے چاہئیں؟ ابا سے سفارش کروانا ہے؟ ٹیسٹ میں رہ گئے۔"

"نہیں۔ نہیں۔ افوہ۔ بات تو سمجھو۔"

"تو پھر دفتر میں غبن کر لیا ہے اور مجھے سازش میں شریک کرنا چاہتے ہو۔" حرا آج کل جاسوسی ادب پڑھ رہی تھی۔

"بکو مت"۔ وہ جھلایا۔ "کبھی تو میری بات بھی مان لیا کرو۔"

"اوہو۔ یقیناً کسی گرل فرینڈ کا چکر ہے۔ شادی کے لیے ابا سے سفارش یا امی کہوں کوئی دوسری گڑبڑ تو نہیں؟"

"سورنی' جمعداروں کی جمعدارنی' بکواس کرتی ہے۔" خیام نے اس کا ہاتھ مروڑ ڈالا۔ حرا نے تیز ناخنوں سے اس کی گردن کھسوٹ لی۔ خیام اسے گھورتا رہا۔ وہ اپنے بال درست کرنے لگی جو کشمکش میں بکھر گئے تھے۔

"کیا تم سمجھتی ہو' میں کبھی سنجیدہ نہیں ہو سکتا۔"

"نہیں۔ کبھی نہیں۔ مرتے دم تک نہیں۔" اس نے یقین سے کہا۔

مگر میں سنجیدہ ہوں۔"

"مجھے یقین نہیں کہ چند منٹ سے زیادہ میں تمہاری سنجیدگی برداشت کر سکوں اور میں' میں تو ابھی ایک منٹ میں سنجیدہ ہو سکتی ہوں۔ کاج کے ڈرامے میں....."

"افوہ۔ میں ڈرامے کی بات نہیں کرتا۔ دیکھو نا۔ ہم بڑے ہو گئے ہیں بچوں کی طرح لڑتے کتنے برے لگتے ہیں۔"

"تو مت لڑو۔ میں نے کب ہاتھ جوڑے ہیں کہ آؤ لڑو۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔

"تم اپنی بکواس بند نہیں کر سکتیں۔" وہ جھلا گیا۔

"کیا؟ یہ اتنا رعب کس پر جما رہے ہو۔ میں نہیں سنوں گی۔" اور پھر اس نے اپنے فلسفے سے خیام کو آگاہ کیا۔ "بادل ٹکراتے ہیں اور بارش برستی ہے۔"

خیام سنجیدہ تھا۔ "دیکھو ہمیں دنیا میں رہنا ہے۔ آسمانی نہیں بلکہ زمینی فلسفے کی تعلیم لینا چاہیے۔ کچھ دن بعد تو ہماری شادی ہو جائے گی پھر یہ عادت تو بہت تکلیف دے گی۔"

حرا نے آنکھیں پھاڑیں "۔ شادی؟ کس کی؟"

"افوہ سخت کوڑھ مغز ہو بھئی۔ میری اور تمہاری۔"

"کس کے ساتھ۔" حرا کا سانس تیز ہونے لگا تھا۔

"ارے میری تمہارے ساتھ۔ تمہاری میرے ساتھ اور کس کے ساتھ؟"

حرا کھڑی ہو گئی۔ "یہ تمہیں کس نے کہا ہے؟"

"چچا میاں اور ابا جان کا فیصلہ ہے' کیوں؟ تم کو....." خیام اس کا چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس کی رنگت دم بدم بدل رہی تھی۔ پہلے سرخ۔ پھر زرد۔ پھر سفید۔ پھر وہ ایک دم بھاگتی ہوئی زینے کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر غائب ہو گئی۔ خیام ششدر کھڑا رہ گیا۔ کیا اسے خیام سے شادی منظور نہیں۔ وہ کسی اور کو چاہتی ہے مگر نہیں۔ اتنے دن کے ساتھ میں کبھی اس نے خیام سے بیزاری ظاہر نہیں کی تھی' وہ اسے ناپسند نہیں کرتی۔ نفرت نہیں کرتی پھر..... کیا بات ہو سکتی ہے پھر وہ سارا دن اوپر ہی رہی' خیام نیچے ٹہلتا رہا۔ اگلی صبح خیام کے سرہانے گلاب کے پھول مہک رہے تھے۔ یہ صلح کا پیغام تھا۔ تیزی سے کھانے کے کمرے میں جاتے ہوئے اس نے کتنے ہی فقرے سوچ لیے۔ ڈائننگ ٹیبل پر چچی اکیلی بیٹھی تھیں۔

"حرا کالج گئی؟"

"ہاں۔ بابا کے ساتھ گئی ہے۔ بیٹا تم لیتے آنا۔"

اس دن اس کا دل کہیں نہیں لگا۔ وہ یونیورسٹی نہیں گیا۔ گھر بھی جانے کو دل نہ چاہا۔ کالج کی چھٹی کے وقت وہ گیٹ پر کھڑا تھا۔ حرا آئی' اداس چہرہ' پریشان بال جیسے کچھ سوچتی رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ خاموشی سے اسکوٹر پر بیٹھ گئی۔ "گھر نہیں' کہیں اور چلو۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ خیام اسے پارک لے گیا۔ وہاں وہ کبھی کبھی آتے تھے۔ وہ بینچ پر جا کر بیٹھ گئی۔ خیام اسکوٹر سائے میں کھڑا کر کے آگیا۔ بینچ درخت کے سائے میں تھی۔ حرا ایک پتے کو نوچ رہی تھی۔ خیام دور درختوں پر نظر جمائے ہوئے تھا۔

"تم نے سوچا آج میں تم کو گھر سے دور کیوں لائی ہوں؟"

"ہوں۔" خیام چپ رہا حرا نے لمبی سانس لی۔ خیام بینچ پر بیٹھ گیا۔ حرا نے اس کی پیٹھ سے اپنی پیٹھ لگا لی۔

"یوں ٹھیک ہے۔ اسی طرح میں بات کر سکوں گی اور مجھے یہ جھجک نہیں ہو گی کہ تم مجھے گھور رہے ہو۔"

"کیا تم مجھ سے ڈرتی ہو؟"

"نہیں۔ اصل میں خیام! میں کافی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ تم سے بات کروں۔ یہ ہر وقت کا دنگا فساد ختم کر کے انسانوں کی طرح رہیں۔ کبھی کبھی یوں لگتا تھا جیسے ہم انسان نہیں۔ کتے بلیاں ہیں۔ لڑائی میں بیٹھ کر بات کرنے کے لائق نہیں۔ عادت ہی پڑ گئی ہے غصہ کرنے' بھڑک جانے کی مگر جب تم نے یہی بات کہی تو میں بہت خوش ہوئی۔ تم مجھے بہت اچھے لگے۔ میرے اور تمہارے مزاج اور حالات کتنے ہم آہنگ ہیں۔"

"تم وہ بات کہو جس کے لیے اس گرمی میں یہاں لائی ہو۔" خیام جھلانے لگا۔

"وہی بتا رہی ہوں۔" اس نے اداسی سے کہا۔ "دراصل۔ اب میں بہت اکتا گئی ہوں۔ اس قدر تیز رفتار' بھاگ چھوڑ والی زندگی' بھگدڑ' صبح ہوتی ہے تو ہم دونوں لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ رات تک جانوروں کی طرح چیختا چلاتا' نوچ کھسوٹ' جیسے ہماری زندگی کا کوئی اور مقصد ہی نہیں۔ میں تھک گئی ہوں۔ عاجز آگئی ہوں۔ یہ سورج کی تیز شعاعیں اور شور مجھے ناگوار لگنے لگا ہے۔ شاید میں اپنے ماحول سے تنگ آگئی ہوں۔ ایک ایسی ٹھنڈی سایہ دار جھاڑی میں بیٹھنا چاہتی ہوں جہاں دھوپ چھن چھن کر میرے جسم پر پڑے۔ آنکھوں کو خیرہ نہ کرے۔ ایک باوقار خاموش ماحول سکون' سکون تم سن رہے ہو۔"

"ہاں۔۔ سن رہا ہوں۔" خیام نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "حرا انسانی فطرت کے عین مطابق تمہاری خواہش ہے۔ تم اس ماحول سے فرار چاہتی ہو۔" خیام نے مڑ کر درد مندی سے اسے دیکھا۔ "میں یقین دلاتا ہوں۔ میں تمہیں بدلا ہوا ماحول دوں گا۔ پرسکون باوقار ماحول' ٹھنڈا سایہ دار گھر اور محبت بھرا دل۔ تم کیوں نہیں سوچتیں نہ چکا چوندھ والی زندگی جو تمہیں ناپسند ہے وہاں محبت ہے' خلوص ہے' بے غرضی ہے۔ میں جانتا ہوں تم اس ماحول کے بعد دوسرے ماحول سے بھی اکتا جاؤ گی مگر میں تم کو ہر خوشی دینے کے لیے ہر قسم کی قربانی دے سکتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں تم میرے سوا کہیں خوش نہیں رہ سکتیں۔ تمہیں کوئی بھی وہ حقیقی مسرت نہیں دے سکتا جس کی تم متلاشی ہو۔ میں تمہیں جانتا ہی نہیں پہچانتا ہوں۔ ہم اپنا طرز زندگی بدل سکتے ہیں مگر اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ کیونکہ ہم اسی ماحول کی پیداوار ہیں اور انسان کی خواہشات کی کوئی حد نہیں۔ مگر ہر خواہش تو پوری نہیں ہوتی نا۔"

"نہیں۔۔ نہیں۔" حرا نے بے چینی سے کہا۔ "میں اکتا چکی ہوں' یہ گھر' یہ ماحول' یہ چہرے' میں سب کچھ نیا چاہتی ہوں۔"

"چہرے!" خیام دانت پیس کر تیزی سے مڑا۔ حرا جو اس کا سہارا لیے ہوئی تھی گر گئی۔

"ہاں۔ چمرے۔" وہ چلا کر بولی۔ "میں ان چمروں کو دیکھ دیکھ کر تھک چکی ہوں۔ مجھے نئے چاہئیں۔ نئی زندگی چاہیے۔"

"جہنم میں جاؤ۔" خیام کھڑا ہو گیا۔ غصے سے اس کا رنگ لال ہو گیا۔ "پچھتاؤ گی۔ تمہارا خیال تمہارے ان خیالات پر چچا میاں تمہیں گولڈ میڈل دیں گے؟"

"میں کسی کی پروا نہیں کرتی۔ خیام میں ہمیشہ تمہاری سفارش کرتی رہی ہوں۔ کیا تم میری ذرا سی بھی نہیں سن سکتے؟" اس نے اتنی لجاجت سے کہا کہ خیام کا دل بے چین ہو گیا۔

"کہو کیا چاہتی ہو۔"

"میں اس گھر' اس ماحول سے دور جانا چاہتی ہوں۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ "میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔ تم سفارش نہیں کرو گے؟" اس کا دل بھر آیا تھا۔

"کروں گا۔" خیام بلا ارادہ بول اٹھا۔ "مگر حرا! انہوں نے تم کو پالا ہے' تمہارے ناز اٹھائے ہیں' ضد پوری کی ہے اور اتنی محبت کی ہے کہ شاید۔"

"انہوں نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا۔" اس نے سختی سے کہا۔ "ان کی اولاد نہیں تھی۔ گود لے کر انہوں نے محرومی سے نجات پائی' میں نے ان کی تشنہ آرزوؤں کو سیراب کیا۔ ان کی تنہائی کو تسکین پہنچائی کیا یہ سب کچھ نہیں؟ اگر میں نہ ہوتی۔ یا میرے ماں باپ ہوتے تو میرے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار ہوتا؟"

"تم غلط طریقے پر سوچ رہی ہو۔ وہ تم سے محبت کرتے ہیں۔ بے پایاں محبت' بے غرض' سچی محبت۔ تم نے یوں کیوں سوچا؟"

"اس لیے کہ اب میں اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنا چاہتی ہوں اس لیے بھی کہ بچپن سے میں یہ سن سن کر تنگ آ چکی ہوں کہ میرے ماں باپ مر چکے ہیں۔ میں اس گھر کی محض پروردہ ہوں۔ کاش مجھے یقین ہوتا کہ یہ گھر' یہ ماحول' یہ والدین میرے اپنے ہیں۔ یہ فضا میری ہے۔ میں کبھی چھاؤں کی آرزو نہیں کرتی اسی تیز روشنی میں پڑی رہتی مگر میں جانتی ہوں' تم جانتے ہو' سب جانتے ہیں کہ یہاں میرا کچھ نہیں سوائے محبت کے اور وہ اب پھر مجھے اسی جگہ قید کرنا چاہتے ہیں۔ اسی ماحول میں' انہی چمروں میں۔ جن میں گھبرا گئی ہوں۔ تم بہت اچھے ہو۔ میرے بہترین دوست ہو۔ مگر تمہارے ساتھ زیادہ دن نہیں رہ سکتی۔ پانچ سال تو ہو چکے ہیں۔ اب میں تبدیلی چاہتی ہوں۔" خیام جانتا تھا وہ جو کہتی ہے کر کے رہتی ہے۔

"میں تمہاری تمام آرزوئیں پوری کروں گا۔ تمہیں اس ماحول سے دور لے جاؤں گا۔" اس نے رکتے ہوئے گلے سے کہا۔

"نہیں۔ سب بیکار ہے۔ میں اپنے طور پر زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔"

وہ دوپٹے کی بتیاں بٹ رہی تھی۔ خیام کو ہر طرف سناٹا محسوس ہو رہا تھا۔

"تم بغاوت کرو گی؟ ہمت ہے چچا میاں سے ٹکرانے کی؟"

"تم ساتھ دو تو میں پہاڑ سے بھی ٹکرا سکتی ہوں۔" اس نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ خیام پر اس نے بوجھ ڈالا دیا' پہاڑ کا وزن۔

"کون ہے وہ؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔ آنسوؤں کا گھونٹ سا بھر کر اس نے کہا۔

"امایوں" ۔ اور پھر اس نے سب کچھ بتا دیا۔ وہ ایک سرمایہ دار ہے۔ نہایت با اخلاق' شائستہ' خوبصورت' طرحدار ان کی ملاقات کالج میں ہوئی اور وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ وہ کسی فنکشن کی وجہ سے کالج بلایا گیا تھا۔ حرا سے ملنے کے بعد کئی بار کالج خاص طور پر آیا۔ اس نے حرا کو شریک زندگی بنانے کی آرزو ظاہر کی تھی مگر وہ جانتی تھی کہ اس کے باوا کبھی غیروں میں اس کی شادی پسند نہیں کریں گے۔ اسے خیام کی سفارش کی ضرورت تھی۔ وہ ایک دفعہ ان کے گھر بھی گئی اور کتنا عجیب خواب ناک ماحول تھا وہاں مدھم سروں میں گنگناتی بہار کے نغمے دل کو لبھاتے ہوئے سفید ریشمی پردے ہوا میں لہراتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے پریوں کا دیس ہو' خوابوں کا جزیرہ' روش پر بکھرے ہار سنگھار کے پھول' گلابوں کی خوشبو' باغ میں اچھلتے فواروں سے مسرتوں کی اڑتی ہوئی پھوار' ٹھنڈی ہواؤں کی بھیگی ہوئی گنگناہٹیں' امایوں کے مدھم لہجے میں باتیں کرنے کا دلنشیں انداز۔ یہ اس کی آرزو تھی کہ اس ماحول کو ... اس افسانوی' شاہانہ فضاؤں میں لہرائے اگر خیام چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے اور خیام سکتے میں آ گیا۔ اب وہ گھر پہنچے تو چچی ان کی منتظر تھیں۔

"تم کہاں گئی تھیں۔ اتنی دیر کیوں لگا دی۔" انہوں نے پوچھا۔ حرا کی تیوری پر بل آ گئے۔ اس نے خیام کو دیکھا۔ "مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں کہ تم کالج سے کہیں اور جاؤ۔"

"خیام تم نے سنا۔" حرا نے پیر پٹخ کر کہا۔ "جاؤں گی۔ جاؤں گی۔ جہاں جی چاہے گا جاؤں گی۔" اور سیڑھیوں سے اوپر چلی گئی۔

اب خیام نے انھیں سب کچھ بتا دیا۔ وہ سر تھام کر رہ گئیں۔ وہ دل جلی اور موڈی تھی' مگر یہ بیزاری؟

دوسرے دن صبح ہی وہ خیام کے کمرے میں آ گھسی۔ "تمہارے شادیاں آئے ہیں۔" اس نے تیز آواز میں مطلع کیا۔

چھٹی تھی۔ خیام دیر تک سونے کا پروگرام بنا کر سویا تھا۔ مگر حرا کی آواز صور اسرافیل سے کم نہ تھی۔ وہ جھپٹ کر بیٹھ گیا۔ "بلاؤ۔ آجاؤ شاہد میاں۔" یہ شاہد میاں خیام کے نخیالی عزیز تھے۔ حرا نے انھیں "شادیاں" بنا دیا تھا۔ وہ ان کی نفاست سے سنوری مانگ' تیل میں چمکتے بال دیکھ کر ہنسی تھی۔ شاہد میاں نہایت ادب سے سر جھکائے۔ تہذیب کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے بڑے مشکل الفاظ سے مزین گفتگو کرتے۔ شاہد کی چھوٹی بہن خیام کے لیے آہیں بھرتی۔ شاہد کا خیال تھا کہ اگر خیام کی شادی خاندان میں ہوئی تو رفعت سے بہتر دلھن انھیں کہیں نہیں ملے گی۔ وہ خیام سے شادی نہ ہونے کے خیال سے ہی دہل جاتی ہیں۔ ناکامی کا صدمہ اٹھانہ پائیں گی اور خودکشی کرلیں گی۔ بہت غیرت مند خاتون ہیں۔ حرا نے کہیں کو خودکشی کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے خیام سے سفارش کی۔ "اللہ خیام ان سے کہہ دو نا کہ تم ان سے شادی نہیں کرو گے۔ میں انھیں خودکشی کرتے دیکھنا چاہتی ہوں خیام نے اسے گھورا۔ "دلالت کے ساتھ اب بے رحمی اپنانا چاہتی ہو۔"

شادیاں اندر آئے تو خیام نے گرم جوشی سے استقبال کیا۔ انھوں نے جھک کر سلام کیا۔ "آج پھلی تھی۔ رفعت نے کہا خیام کو کھانے پر بلالیں۔" شادیاں مسکراتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ "شام کو ہمارے کے ہاں عصرانے پر جانا ہے آپ بھی مدعو ہیں۔"

"کیا آپا جمیلہ کی شادی ہو رہی ہیں۔" حرا چہک کر بولی۔

"جی نہیں۔" شادیاں نے مہذب انداز میں جھک کر کہا۔ "ان کی شادی تو بیس برس پیشتر ہو چکی۔ اس عصرانہ ہے۔ شادی نہیں ہے یعنی کہ....."

"میں بھی شادی کر رہی ہوں۔" حرا نے کہا۔ "آپ بھی میرے عصرانے' ظہرانے وغیرہ میں آیئے گا۔" شادیاں نے اسے بغور دیکھا' وہ گلاب کے پھول کی پنکھڑیاں نوچ رہی تھی۔

"میں عنقریب خیام سے شادی کرنے والی ہوں۔" اس نے تلخی سے کہا۔ "رفعت صاحبہ کو بھی ضرور لائیے اور آج تو یہ کہیں نہیں جاسکیں گے' آج ان کا میرے ساتھ پروگرام ہے۔"

شادیاں فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اچھا۔ اجازت۔"

"شادی پر تو آئیں گے نا۔ میں انتظار کروں گی" وہ بڑی لگاوٹ سے کہہ رہی تھی۔

"ٹھہریے شاہد میاں۔" خیام نے سختی سے کہا۔ "میں آپ کے ساتھ چل رہا ہوں۔" وہ جلدی سے باتھ روم میں گھس گیا۔ شادیاں ہاتھ مل رہے تھے۔ حرا غصے میں آگ بھبھوکا وہیں کھڑی انھیں گھورتی رہی وہ اور بھی نروس ہو گئے۔

"کم ظرف۔ خود غرضوں کے سردار اعلیٰ مرجاؤ۔" وہ اسے کوسنے لگی۔ خیام نے جاتے جاتے اسے مڑ کر دیکھا۔ "میرا آج ہمایوں کے ساتھ پروگرام ہے سنا کیپنے۔" وہ چلائی

"میرے بغیر مربھی نہیں سکو گی۔" خیام نے ٹھنڈے لہجے میں کہا اور چلا گیا۔ حرا نے گملوں کے پودے باہر سے نکال کر پھینک دیے گملے لڑھکا کر توڑ دیے۔ "اللہ نے چاہا تو اسکوٹر کا ایکسیڈنٹ ہو گا آج۔" اس نے چلا کر کہا اور دھم دھم کرتی زینہ چڑھ گئی۔ خیام رات دیر گئے آیا۔ چچی نے اسے بلا کر سرگوشی میں بتایا۔ "حرا نے باوا کو خط لکھ دیا ہے۔ وہ پڑھ کر آپے سے باہر ہو گئے۔ حرا کمرا بند کیے بیٹھی رہی۔ کھانا نہیں کھایا۔ باوا کہیں گئے ہیں' جاتے جاتے مجھ سے کہہ گئے ہیں۔" اس سے کہو کہ اپنا دماغ درست رکھے یہ ضد ایسی نہیں کہ پوری کر سکیں۔" چچی کے مشورے پر خیام اوپر چلا گیا۔ پھیلی ہوئی چاندنی میں وہ سفید بینچ پر بیٹھی تھی۔ نہ جانے کیا سوچ رہی ہو گی۔ خیام کی آہٹ پر بغیر ذرا جنبش کیے بولی۔ "آگئے رفعت کے سرتاج۔" اس کے سرد لہجے نے خیام کو جھنجوڑ دیا۔ وہ بھی برا بھلا کہنے لگا۔ اس نے حرا کے بازو پکڑ کر ہلا ڈالے "آگئے اپنی اوقات پر۔ چلو ہٹو ادھر۔ ناخنوں سے تمہاری آنکھیں نہ پھوڑ ڈالوں۔ رفعت صاحبہ کے کندھے پر ہاتھ دھرے پھرو گے۔ لاٹھی کھٹ کھٹ کرتے۔"

خیام کے اوپر اوس سی پڑ گئی۔ غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ کاش ایسا ہوتا۔ اس کی آنکھیں نہ ہوتیں کہ وہ یہ سب نہ دیکھتا۔ حرا کا بدلا ہوا انداز بغاوت' بھٹکی ہوئی روح کی مانند چاندنی میں سفید لباس پہنے کس قدر الگ تھلگ انوکھی لگ رہی تھی۔ وہ بینچ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور ٹھنڈی چاندنی کی پرنور چادر کو پھیلے لگا جو یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھی۔ لان کے سبزہ زار پر' سرو کی چوٹیوں پر مکانوں کی چھتوں پر کتنی پیاری چاندنی ہے' اور کیسا مقدس سماں۔ یہ پرسکون فضا' یہ نرم چاندنی' یہ خنک ہوائیں' حرا کیوں اس کے سوا اور کیا چاہیے! رات آتی ہے' چاندنی کی پاکیزگی' ستاروں کی جھلمل شمعوں میں زندگی گزر جاتی ہے۔ ان لیے صبح ہوتی ہے' پرنور اجالوں سے سورج کی کرنیں عمل کا پیغام لے کر آتی ہیں۔ ہمارے ارمان' ہماری خواہشیں' ان پرنور اجالوں' تاریک راتوں کی مرہون منت ہیں۔ روشنی' اندھیرا' ہم دونوں منزلوں کے مسافر ہیں۔ ان سے بچ نہیں سکتے۔ یہ رات کا اجلا پہر' یہ مدماتی ہوائیں' پرسکون فضا' اور ہمیں کیا

چاہیے۔ خالق کائنات نے ہمیں ہر نعمت سے نوازا ہے۔ ہم ان سے رخ موڑ لیں تو یہ قصور کس کا ہے۔ حرا تم بولتی کیوں نہیں۔ گونگی تو نہیں ہو گئیں۔" حرا رو رہی تھی۔ خیام کے دل پر چوٹ سی لگی۔

"تم روتی کیوں ہو۔ آنسو ضائع نہ کرو حرا! میں تم سے ہمیشہ ہمیشہ اتنی محبت کروں گا' اتنی محبت کہ تم اس میں غرق ہو جاؤ گی۔ میں تمہاری ہر خدمت پوری کروں گا۔ تمہارے سارے دکھ اپنے سینے میں چھپا لوں گا تمہیں دور لے جاؤں گا جہاں ہم ابد تک رہیں گے۔ تم نے سنا! میں تمہارے بغیر ادھورا رہ جاؤں گا اور تم میرے بغیر مکمل نہیں ہو گی۔ ہم ادھر ادھر دو حصوں میں بٹ کر کیسے زندہ رہیں گے۔ کیسے خوش رہ سکیں گے۔ چلو میں تمہیں بتاؤں۔"

"نہیں نہیں۔ میں کچھ نہیں سنوں گی۔ ہاں میں تمہارے بغیر خوش نہیں رہ سکوں گی۔" اس نے آنسو پونچھ لیے۔ "مگر میں تمہارے ساتھ زندگی بھر نہیں رہ سکتی۔ میں تم سے اکتا چکی ہوں۔"

"اکتاہٹ کا ایک علاج ہے۔" خیام نے اداسی سے کہا۔ "میں ابا جان کے پاس چلا جاتا ہوں۔ جب تم بلاؤ گی تبھی آؤں گا۔"

"میں ہمایوں کی بغیر نہیں رہ سکتی۔" حرا آنسوؤں سے بھرے کانپتے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "مجھے ہمایوں چاہیے۔"

"ہمایوں کوئی کھلونا تو نہیں۔" خیام کے دل کا درد آواز میں سما گیا۔ "مگر میں کر ہی کیا سکتا ہوں"۔

"تم ابا سے کہو کے تو وہ مان جائیں گے۔" وہ دردناک انداز میں رو رہی تھی۔ بے بسی اور محرومیوں میں چکراتی ہوئی آواز' دل خراش آواز خیام سر سے پیر تک کرب کے زہر سے کپکپا رہا تھا۔ خیام کے ارادوں میں کوئی کمزوری نہ تھی مگر یہ دراڑیں' جو حرا کی ہر ہچکی کے ساتھ بڑھتی جاتی تھیں۔

"میں نے ہمایوں سے کہا تھا کہ میں سب دیواریں گرا دوں گی جو رکاوٹ میرے سامنے آئے گی میں اسے چکنا چور کر دوں گی۔ مگر اب مجھے پتا چلا کہ ڈینگیں مارنا کتنا آسان ہے' عمل کرنا کتنا مشکل ہے۔ میں بالکل بے سہارا ہوں۔ تمہاری مدد کے بغیر کچھ کرنا نہیں چاہتی۔ انہوں نے مجھے پالا ہے میرے ناز اٹھائے ہیں۔" اس کی آواز میں تلخی گھل گئی تھی۔ "مگر مجھے ہمایوں سے محبت ہے۔ اس گھر سے نفرت ہے تم سے' امی سے' ابا سے۔" اچانک وہ ہوش کھو بیٹھی۔ مایوسیوں نے اسے پاگل کر دیا۔ "اصل نسل کے کینے۔" وہ اس پر حملہ آور ہوتے ہوئے چلائی۔ خیام نے مدافعت میں ہاتھ تک نہیں ہلایا "میں تیرا خون پی جاؤں گی۔ میری مدد کرنا۔" وہ اچانک رو پڑی۔ پھر کھڑے ہو کر بولی۔ "محبت کرتا ہوں۔ ایسی ہوتی ہے

محبت؟ تم نے میرے لیے کیا کیا؟ کبھی کوئی نشانی؟ کوئی تحفہ؟ نہیں' بس لڑنا آتا ہے۔ ایسی ہوتی ہے محبت؟ محبت میں تو انسان کو مرنا بھی پڑ جاتا ہے' قربانی دینا پڑتی ہے' کونسی قربانی دی تم نے۔ کبھی میری خطا کا الزام اپنے سر لیا ہے؟ مجھے بچانے کے لیے نہر میں کودے' ہمیں ڈوب بھی جاتی تب بھی تم نہ بچاتے۔ خود غرض۔ تم بھلا مجھے کیوں مصیبت سے بچاؤ گے؟ اور میرے سر پر مصیبتیں نازل کرو گے۔ جھوٹے' کاہل الوجود' لفنگوں کے استاد' میں مر جاؤں گی اور تم میرے لیے زبان ہلانے کی تکلیف بھی نہیں کرو گے۔" وہ بکے جا رہی تھی۔ خیام نے اپنے کانپتے جسم کو زمین پر گرنے سے بچانے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے ہتھیلیوں سے کنپٹیاں دبالیں اور مدھم آواز میں بولا۔

"جو تم کہو گی۔ وہ کروں گا تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔" اس نے اپنی امنگوں کو تھپک کر سلا دیا۔ محبت کے سوتے کا منہ بند کر دیا۔ مصلحتوں کے انبار تلے آرزوئیں سسکتی رہیں مگر حرا کی ہنسی کے لیے۔ حرا کی خوشی کے لیے۔ وہ چچا میاں سے لڑا' چچی کو سمجھاتا رہا۔ چھوٹے چچا کی خوشامدیں کیں اگر مایوس ہو کر حرا بہت سے چھلانگ لگا دیتی وہ اس کے ٹوٹے ہوئے وجود کو بھی سینے سے لگاتا مگر اس کے ہاتھ ہیر نہیں دل ٹوٹ جاتا ہے اور اسے جوڑنے کا مسالا خیام کے پاس نہیں تھا پھر ہمایوں کی والدہ اور بہنیں بڑے کروفر سے تشریف لائیں۔ انہوں نے حرا کی انگلی میں ہیرے کی بیش قیمت انگوٹھی پہنا دی۔ اس کے بعد انہوں نے درخواست پیش کی چونکہ ان کے گھرانے میں غیروں سے شادی کا رواج نہیں اور ہمایوں نے اپنی مرضی اور ضد سے یہ رشتہ کیا ہے اس لیے اس کے گھرانوں کے قرینے اور دستور کو سمجھنے نیز ہونے والے سسرال والوں کے مزاج اور عادات جاننے کے لیے وہ حرا کو ایک ہفتے کے لیے اپنے گھر بلانا چاہتی ہیں۔ یہ مدت طویل بھی ہو سکتی ہے۔ حرا کی خوشی پر منحصر ہے کہ وہ کتنا عرصہ وہاں قیام پسند کرتی ہے۔ خیام کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ وہ تلملا گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ حکم دے رہی ہیں' چچا میاں شاید انکار کرتے مگر ہمایوں نے نہایت شائستگی سے' نہایت اپنائیت اور منت کے انداز میں ان سے کہا کہ یہ والدہ کی خواہش ہے اور ان کی ہر خواہش پورا کرنے کا انھوں نے عزم کیا ہے۔ یہ ان کا فرض اولین ہے۔ امی خود بھی حرا کو قریب سے دیکھنے کی خواہشمند ہیں تاکہ اس کے مزاج سے آگاہ ہو سکیں۔ اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی' وہ والدہ اور بہنوں کی تحویل میں رہے گی۔ آپ لوگ جب چاہیں آ کر مل سکتے ہیں' ساتھ لا سکتے ہیں۔ چچا میاں آسانی سے رضامند نہیں ہوئے مگر حرا پہلے ہی رضامند ہو چکی تھی۔ چچی بھی حرا کی خاطر یہ شرط قبول کرنے پر تیار ہو گئیں۔ چچا میاں نے نہایت رکھائی سے کہا۔ "آپ ہی کی امانت ہے چاہے آج

ہی لے جائیں۔" ہمایوں جھک کر ان کے ہاتھوں سے اپنی آنکھیں رگڑنے لگے۔ ان کی والدہ کو چچا میاں کا لہجہ پسند نہیں آیا۔ ان کے تیور بدل رہے تھے۔ چچی نے رفع شر کے لیے کہہ دیا۔ "اگر آپ پہلے سے اطلاع کر دیتے تو میں تیاری کر رکھتی۔ آپ کی چیز ہے بخوشی لے جائیں مگر آج ممکن نہیں۔" ہمایوں نے فوراً کہا۔ "بجا فرمایا آپ نے میں کل گاڑی بھیج دوں گا۔ آپ بھی ہمراہ تشریف لائیں اور آپ بھی۔" انھوں نے خیام سے کہا جو کھڑا ہونٹ چبا رہا تھا۔

"یہ ہمارے ہاں کا رواج ہے۔" ہمایوں کی والدہ نے کچھ رک کر سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "اب ہے آپ کو ناگوار نہ ہو گا۔ جب بھی کوئی نئی لڑکی ہمارے خاندان میں شامل ہوتی ہے ہم اسے چند روز لیے لے جاتے ہیں۔ اس طرح وہ سب سے مل کر شادی سے پہلے ہی خود کو اس ماحول میں ڈھالنے کی تربیت حاصل کر لیتی ہے۔ دراصل ہمایوں کی دادی صاحبہ غیروں میں شادی پسند نہیں کرتیں۔ آپ جانتی ہیں۔" انھوں نے حرا کی امی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "آج کل کے لڑکے لڑکیاں بزرگوں کے فیصلوں پر اعتماد نہیں کرتے اور بزرگ انھیں ناتجربہ کار سمجھتے ہیں اس لیے یہ رواج پڑ گیا۔ میرے چھ بیٹے ہیں میں چار بہوئیں لا چکی ہوں۔ ایک عزیزوں سے باقی تین غیر ہیں۔ ان کے ساتھ بھی اسی طرح ہوا تھا دراصل یہ پسند کی شادیاں۔" انھوں نے ایک نگاہ بیٹے کی جانب ڈالی جو بڑے دل آویز انداز میں مسکرا رہا تھا۔ ان شادیوں میں شرم وحیا کا دخل تو ہوتا نہیں جو ہمارے آپ کے زمانے میں تھا لڑکیوں کا منگیتر کا ہاتھ لینا بھی بے حیائی تصور کی جاتی تھی مگر اب لڑکے لڑکیاں اپنی مرضی سے شریک زندگی کا انتخاب کرتے ہیں۔"

انھوں نے تیز نظر حرا کی طرف ڈالی جو لڑکیوں کے درمیان بیٹھی ہنس رہی تھی اور ہمایوں کی نظریں اسی جانب نگراں تھیں۔ ہمایوں کی والدہ نرم آواز سے بول رہی تھیں۔ خیام کو وہ ایک بڑی سی مکڑی کی مانند لگیں جو حرا کے گرد جالا بن رہی ہو۔ خیام سوچ رہا تھا۔ حرا نے کیا دیکھا؟ یہ پراسرار آنکھوں والا بڑی بی مدھم لہجے میں دھیرے دھیرے باتیں کرنے والا ہمایوں اپنی دلکش جاذب نظر شخصیت کے باوجود ڈرامے کا کردار لگ رہا تھا۔ اس کی دونوں بہنیں ہونٹ چبھائے سرد نظروں سے حرا کو گھور رہی تھیں۔

اس رات خیام نے ایک خواب دیکھا۔ ایک بڑی سی چمگادڑ جو اپنے پروں پر حرا کو اڑائے لیے جا رہا ہے۔ حرا دور افق کی طرف جا رہی ہے۔ چمگادڑ نے مڑ کر خیام کی طرف دیکھا اور خیام نے دیکھا وہ ہمایوں سے مشابہ تھی۔ خیام پسینے پسینے ہو گیا۔ صبح اس نے حرا کو گھور گھور کر دیکھا اور پھر ڈرتے ڈرتے اپنا خواب سنایا۔ حرا نے سرد نگاہوں سے اسے دیکھا "جلتے ہو؟"

"نہیں۔۔۔ خوفزدہ ہوں۔"

"میں آج جا رہی ہوں۔" اس نے توس چائے کے ساتھ نگلتے ہوئے کہا۔ "اگر وہ چمگادڑ کی اولاد ہوئے تو ڈرا واپس آجاؤں گی بس۔۔۔ اب خوش؟ ویسے یہ رواج بہت اچھا ہے۔ اس سے دونوں فریق اپنی کمزوریوں سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ کم از کم مجھے تو یہ بہت پسند آیا۔"

"تو۔۔۔ تم آجاؤ گی اگر کوئی بات تمھیں ناگوار ہوئی؟" خیام نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

"میں!" حرا نے کھڑے ہو کر میز پر زور سے ہاتھ مارا۔ "میں وہیں مرجاؤں گی اور کبھی واپس نہیں آؤں گی۔ سنا تم نے!" اس نے لال آنکھوں سے خیام کو گھورا۔ "میں تمھاری کوئی حسرت پوری نہیں ہونے دوں گی۔ تم حاسد ہو میری بربادی کے خواہاں۔ تم میری محبت کو پروان چڑھتا نہیں دیکھ سکتے تو جاؤ یہاں سے۔"

خیام اوپر بالکونی میں کھڑا تھا وہ نیچے نہیں آیا۔ ہمایوں کی گاڑی آئی اور چچی حرا کے ساتھ اس میں بیٹھ کر چلی گئیں۔ کوئی چیز خیام کے سینے میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ وہ سر سے لے کر پیر تک ٹھنڈی لکیری گزرتے محسوس کر رہا تھا۔ کوئی اس کے پاس آیا مگر اسے خبر نہ ہوئی۔

"چلی گئی۔" اس نے سلطانہ بوا کی آواز سنی۔ "میری ننھی بی پر کوئی جادو کر دیا ہے ان لوگوں نے ورنہ یہاں گھر کو چھوڑ کر جاتیں بھلا؟ شادی کے نام پر دس نصیحتیں کرتی تھیں۔" خیام دور ہوتی گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔ "آنسو پونچھ لو میاں۔ مرد آنسو کے ساتھ حوصلہ بھی بہا دیتے ہیں۔" بوا نیچے چلی گئیں۔ خیام نہیں رویا تھا اب اس کی آنکھ میں آنسو آگئے۔ گھنٹہ بھر بعد چچی آگئیں۔ کسی نے ان سے کچھ نہیں پوچھا۔ سب خاموش تھے۔ صرف چھوٹے چچا بندوق صاف کرتے ہوئے کسی کو گالیاں دے رہے تھے۔

ہمایوں کی مسرت اس کے چہرے سے چھلک رہی تھی مگر انھیں اپنے جذبات پر قابو تھا جب تک امی وہاں سب لوگ بیٹھے رہے۔ امی کے جاتے ہی ہمایوں کی والدہ بہنیں جانے کدھر چلی گئیں۔ وہ تنہا رہ گئی گھر خواتین اور لڑکیاں ادھر ادھر سے گزرتی ہوئی اسے دیکھتی ہوئی چلتی پھرتی نظر آتی رہیں۔ اس کا ددھیال تھا خاندان کے سب لوگوں سے اس کا تعارف ہو گا مگر وہ تو تنہا بیٹھی تھی پھر کچھ دیر بعد ہمایوں آگئے اور ان کی تینوں بہنیں بھی۔ اس رات کھانے کے بعد وہ ہمایوں کی بہنوں کے ساتھ چاندنی میں ٹہلتی رہی۔ وہاں میں رات کی رانی کی مہک رچی ہوئی تھی۔ تینوں بہنیں اس سے نہایت اخلاق اور اپنائیت سے پیش

آرہی تھیں۔ ان کی آوازیں بہت مدھم اور لہجہ شیریں تھا۔ حرا کو اپنی آواز کم کرنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ لیکن اتنی بد تہذیب بھی نہیں تھی کہ ان کی آوازوں پر اپنی آواز غالب رکھتی۔ اسے امی جان کے سامنے والا کمرا دیا گیا تھا۔ بے حد پر تکلف اور نفاست سے سجا ہوا۔ رات بھر وہ بے چین رہی۔ نیند الجھن۔ نرم بستر کی پریشانی، صبح ایک ملازمہ ناشتے کا پوچھنے آئی تو وہ بوکھلا گئی، اس نے کہہ دیا۔ "وہ کریں گے وہی وہ بھی کرلے گی۔" ناشتے کی میز پر گھر کے سارے ارکان موجود تھے۔ وہ کچھ جھجکتی اندر آئی۔ سب کو آداب کر کے وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ناشتا خاموشی سے کیا گیا صرف ہمایوں اور بہن راحیلہ اس سے مخاطب رہے۔ بے حد پر تکلف ناشتہ تھا۔ پراٹھے، سادہ پوریاں، دال بھری، آملیٹ، آلو کی ترکاری، کھٹی چٹنی میٹھی چٹنی، دودھ، دلیہ، مٹھائی، کیک، بسکٹ، وہ سٹپٹا گئی۔ وہ جسم کو سے بچانے کے لیے بغیر مکھن کے توس کالی چائے کے ساتھ نگلتی تھی۔ یہ تفصیلی ناشتا دیکھ کر پر گئی۔ بارے ہلکا ناشتا کیا۔ سب کے اصرار پر کہ دیا کہ رات نیند نہیں آئی اس لیے ناشتا نہیں کیا۔ بڑے کمرے میں سب جمع تھے۔ راحیلہ اسے بھی وہاں لے گئی۔ امی جان دوسری عورتوں سے باتوں مصروف تھیں پھر نوکر آئے اور امی جان سے ہدایتیں لے کر چلے گئے۔ وہ حرا کی طرف متوجہ ہوئیں اس سے اس کے خاندان کے دوسرے لوگوں کے بارے میں سوالات کرتی رہیں پھر ہمایوں اپنے بھائی ماموں کے ہمراہ امی سے دفتر جانے کی اجازت طلب کرنے آئے۔ کچھ دیر باتیں کر کے امی سلام کرنے کے بعد قدرے ہچکچاتے ہوئے حرا کی طرف مڑے۔ دوسری خواتین کی معترض نظروں کیے بغیر حرا سے کہا۔ "آئیے مجھے گیٹ تک چھوڑنے نہیں چلیں گی آپ؟" حرا نے نظر اٹھا کر مسرور اور تابناک چہرے، باوقار سراپے کو دیکھا۔ ان کی نظروں میں بھی پسندیدگی تھی، وہ مسکرا تھے۔ حرا کھڑی ہو گئی۔ انھوں نے چپکے سے کہا۔ "امی جان سے اجازت لے لیجیے۔" حرا کی بالیں گئیں۔ سب کی نظروں کے سامنے آہستہ آہستہ ہمایوں کے ساتھ چلتی وہ امی جان کے قریب آئی۔ پر ایک اچٹتی نگاہ ڈال کر ہمت پیدا کر کے اس نے آہستہ سے امی جان سے کہا۔ "اگر آپ اجازت ..... تو میں....." وہ رکی، ہمایوں کو دیکھا "گیٹ تک ان کو چھوڑ آؤں؟"

"نہیں" امی جان کے مغرور لبوں سے یہ لفظ گولی کی طرح نکلا۔۔۔ ذلت کی یہ گولی کھا کر حرا لڑکھڑا گئی۔ ہمایوں نے نظروں سے اسے سہارا دیا۔ ان کے چہرے پر دبی دبی جھنجلاہٹ صاف دیکھی تھی۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا مگر انھوں نے زبان سے ایک لفظ نہیں کہا۔ مڑ کر واپس چلے گئے۔

ں جان نے تحقیر کے انداز میں جانے کس کو کہا "راحیلہ" ایک جابر فرمانروا کی طرح انھوں نے کسی دیکھے بغیر کہا۔ "ہمایوں کی مہمان کو ان کے کمرے میں پہنچا دو۔"

راحیلہ حرا کا ہاتھ پکڑ کر اس کے کمرے میں لائی۔ حرا ذلت کے احساس سے سن ہو گئی تھی۔ راحیلہ ی سے کہا۔ "ہمایوں کچھ زیادہ ہی آزاد اور بے باک ہیں۔ آپ نے امی جان سے اجازت طلب کر اچھا کیا۔ آپ کی اس بات سے امی جان خوش ہوئیں مگر وہ ہمایوں سے ناراض ہو گئی ہیں۔ آپ ں ہیں نا اس لیے ابھی تو یہاں کی ہر بات نئی معلوم ہو گی پھر کچھ دن بعد آپ..... عادی ہو جائیں راحیلہ کے کھوکھلے الفاظ بھی اس تحقیر کو کم نہ کر سکے۔ حرا کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ پھیل گئی راحیلہ واپس چلی گئی مگر حرا خاموش ساکت کرسی پر بیٹھی رہی۔ کافی دیر بعد اس نے ہمایوں کی آواز ں جان کا کہا سامنے ہی تھا مگر دروازہ پر دبیز پردے اسے گیلری سے او جھل کیے ہوئے تھے۔ امی ی خفت اور محبت سے عاری سخت آواز اس کے کانوں میں پہنچی مگر وہ الفاظ نہ سن سکی۔ کچھ دیر بعد کے کمرے کا پردہ اٹھائے کھڑے تھے۔ حرا خالی خالی نظروں سے انھیں دیکھتی رہی۔

مجھے افسوس ہے میری وجہ سے آپ کو شرمندگی اٹھانا پڑی اسی لیے میں معافی مانگنے آگیا ہوں۔ مجھے نہیں۔ حرا میں نادم ہوں۔" حالانکہ حرا کو یقین تھا کہ وہ اب بھی امی جان کی اجازت کے بعد اس میں آئے ہیں لیکن وہ کچھ بول نہ سکی۔ وہ اسے امی جان کی سخت گیری اور بدمزاجی کے مختلف باتے رہے۔ انھوں نے کہا کہ امی جان کو خوش رکھ کر ان کے احکامات کی تعمیل کر کے ہی وہ اس اپنی جگہ بنا سکتی ہے۔ ان کی خوشنودی حاصل کرنا اس کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ہمایوں نے کہ وہ ان کی توقعات پر پورا اترے گی۔ ہمایوں کے دو بھائی امی جان سے بغاوت کر چکے تھے۔ نیوں میں شادیاں کیں وہ اب یہاں نہیں رہتے مگر عید بقرعید یا کسی تقریب پر مہمانوں کی آتے ہیں۔ ان کی بیویوں نے امی جان کو خوش کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنے شوہروں کو لے گئیں اور یوں ان کے بزرگوں کی یہ بات سچ ثابت ہوئی کہ غیر لڑکیاں ان کے خاندان کے لیے ثابت نہیں ہوتیں۔ ہمایوں اس بات کو غلط ثابت کرنے کے لیے ایک غیر لڑکی کا تعاون چاہتے ے متاثر ہو کر انھیں یقین دلایا کہ وہ ان کی مدد کرے گی۔

اب میں امی جان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے گھنٹوں خاموش، مودب بیٹھی بڑی بوڑھیوں کی باتیں سنتی رہتی ہوں۔" حرا نے خیام کو بتایا۔ جب وہ تیسرے دن ہمایوں کے ساتھ واپس

چلی گئیں اور حرا ناخنوں کی کاٹ چھانٹ اور تازہ رنگائی کے دوران خیام کی اداسی کی پروا کیے بغیر اپنی روداد سنا رہی تھی۔ "امی جان ابھی تک تو پہلے دن جیسی ہی سخت گیر اور بیزار دکھائی دیتی ہیں۔ مجھے وہ ایسی دیوی لگتی ہیں جن کے سامنے نذرانوں کے ڈھیر لگ گئے ہیں مگر اس کی سیری نہ ہوتی ہو۔"

"دیوی قربانی مانگتی ہے۔" خیام نے بے دلی سے کہا۔ "قربانی دو۔"

"شاید۔" حرا نے لمبی سانس لی۔ "جان کی قربانی دے کر تو میں ان کو نرم کر سکوں۔"

مگر جان جانے کے بعد اس کی خوشنودی میرے کسی کام آنے والی نہیں بس ہمایوں کی زندگی ہو گی۔"

"چچ... چچ... بے چارا" خیام نے سنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "نہ ماں کو خوش کر سکے گا نہ تمہیں پا سکے گا۔ ہا ہا بد قسمت ہمایوں۔"

شام کو ہمایوں اسے لینے آئے تو وہ محافظ خاتون بدستور ان کے ہمراہ تھیں۔ وہ کار میں بیٹھنے لگی تو ہما نے برآمدے کے ستون کی اوٹ سے برآمد ہو کر بلند آواز میں کہا۔ "دیوی قربانی مانگتی ہے۔"

ہمایوں کا موڈ خراب تھا' انہوں نے راستے میں حرا سے بات نہیں کی۔ حرا نے مخاطب ہونا چاہا تو انہوں نے بھنا کر اوٹ پٹانگ جواب دیا' اسے جھڑک دیا' حرا تلملا گئی' جی چاہا چلتی کار سے کود جائے مگر صبر کیے بیٹھی رہی انہوں نے کار گیراج میں لے جا کر کھڑی کی۔ وہ محافظ خاتون کے ہمراہ جونہی چلا کہ ہمایوں کی خالہ زاد بہن ہیں اوپر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس نے ہمایوں کی گرج سنی جانے کس پر برس رہے ہیں کس پر ان کی نرم میٹھی آواز کس قدر بدل گئی تھی وہ سراسیمہ ہو گئی اور دیر تک اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی رہی۔ رات کو کھانے پر ہمایوں موجود نہ تھے۔ حرا کو تنہائی اور اجنبیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس سے کھانا نہیں کھایا گیا وہ چپکے سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ چند لمحوں بعد راحیلہ نے آ کر اس سے کہا کہ امی جان اس کی یہ حرکت بالکل پسند نہیں آئی۔ اس نے سخت بدتمیزی کا ثبوت دیا ہے۔ کھانے پر سب کا ساتھ دے کر انتہائی بھونڈی حرکت کی ہے۔ حرا شرمندہ ہو گئی اس نے بھوک نہ ہونے کا عذر کر دیا مگر راحیلہ نے کہا۔ "آپ کو جو کچھ کہنا ہو۔ امی جان سے کہیے۔" حرا سلگ اٹھی۔ ایسا کونسا بڑا جرم کیا تھا اس نے وہ کوئی سخت بھنّایا ہوا جواب دیتے دیتے رک گئی' اسے فوراً احساس ہوا کہ وہ اپنے گھر میں نہیں۔ ہمایوں کے گھر پر ہے۔ یہاں جو منہ میں آئے بک دینا انتہائی بدتمیزی سمجھی جائے گی۔ یہاں اس کی نہیں' امی جان کی حکومت ہے اور وہ یہاں شاید محض آزمائش کے لیے آئی ہے اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئی

واپس بھیجا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے ہمایوں اس کے سلسلے میں ابھی بہت دور نہ گئے ہوں۔ وہ راحیلہ کی تیز نظروں سے گھبرا کر اٹھی اور امی جان کے کمرے میں گئی۔ سست قدم' مری مری چال سے' اسے بالکل ایسا لگا جیسے وہ قربانی دینے جا رہی ہو۔ "دیوی قربانی مانگتی ہے۔" کوئی اس کے کانوں میں گنگنایا۔ امی جان کے کمرے میں ان کی بیٹیاں' ایک بہو اور چند دوسری عورتیں تھیں۔ حرا کو دیکھ کر سب ایک دم چپ ہو گئیں۔ وہ حرا کو معترض نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں جو امی جان سے بھوک نہ ہونے کی وجہ سے میز سے اٹھ آنے پر معذرت خواہ تھی۔ امی جان نے اسے معاف کر دیا۔ گو اتنا اضافہ بھی کیا کہ آئندہ ایسی کوئی حرکت وہ برداشت نہیں کریں گی ذلت و بے چارگی کے احساس سے حرا تلملا کر رہ گئی' تو گویا وہ دھمکی پر عمل کرائی تھیں۔ اس نے ہمایوں کو سب کچھ بتایا جب وہ صبح اس سے ملنے آئے۔ اس نے ان سے کل کے رویے کے موڈ کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ امی جان کی دھمکی کا کہ کر چپ چاپ ان کا منہ دیکھنے لگی۔ وہ بھی چپ ہو گئے پھر بولے۔ "میں خود مختار نہیں ہوں اور بقیہ دو بھائیوں کی طرح جائداد' کاروبار اور خاندان سے بے تعلق رہنا بھی نہیں چاہتا۔ میں امی جان کے حکم کے تابع ہوں' سارا کاروبار امی کے نام ہے۔ اس کے باوجود میں نے آپ سے شادی کی ضد کر کے ہمت کی ہے اور امی جان نے جو کچھ رواداری کا مظاہرہ اس سلسلے میں دیا ہے وہ صرف اس لیے کہ میں نے اپنی محنت مشقت اور جدوجہد سے اس کاروبار کو یہاں تک پہنچا دیا ہے۔ امی جان میری کاوشوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ میں ان کے حکم اور مرضی کا پابند ہوں۔"

حرا لمبا سانس لے کر رہ گئی۔ باغیانہ فطرت اسے اکسا رہی تھی باوجود اس گہری پرجوش محبت کے جو ہمایوں سے تھی۔ وہ ہمایوں کی سعادت مندی کو بزدلی کا طعنہ دینے سے نہ رک سکی۔ ہمایوں نے برا نہ مانا۔ اس موضوع کو ٹال گیا۔ گھر میں ہمایوں کی اس سے ملاقات پر کوئی پابندی نہ تھی لیکن گیٹ تک یا لان سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی البتہ جب شام کو سب لان میں یا باغ میں بیٹھے ہوں۔ وہ ہمایوں کے ساتھ سنگ مرمر کی مہتابی پر بیٹھ کر گپ شپ کر سکتی تھی' چہل قدمی کر سکتی۔ البتہ اسے اپنی آواز پر قابو رکھنا تھا۔ وہ اچانک زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑتی لان میں سب دھیمی اور نرم آواز سے باتیں کر رہے تھے اچانک مڑ کر دیکھنے لگتے۔ امی جان کی تیوری کے بل اسے احساس دلاتے کہ اس نے کوئی غلط حرکت کر ڈالی ہے۔ ہمایوں کی کوشش ہوتی کہ وہ اس کی بلند آواز پر کوئی پردہ ڈال دیں۔ وہ خود بھی زور سے ہنس پڑا یا کوئی گنگنانے لگتے تاکہ حرا کی بلند آوازی کا تاثر ضائع ہو جائے۔ حرا کو یہاں کی خاموشی سے وحشت ہونے لگی۔ یا اللہ کسی کے گلے میں آواز ہی نہیں۔ سب سرگوشیوں میں باتیں کرتے (حرا کے

حساب سے) جیسے سازشیں کر رہے ہوں۔ اسے امی جان کی نصیحتیں سننا پڑتیں۔ "آہستہ بات کرنا کی نشانی ہے۔ زور سے بولنا بدتمیزی ہے۔ اوچھا پن ہے اور..... جانے کیا کیا ہے۔" حمرا دن بھر اور شام کا انتظار کرتی رہتی جب ہمایوں آئیں گے اور وہ ان کے شاندار سراپا کو آنکھوں میں مطمئن ہوگی پھر دن بھر کی زبان بندی کی مدت بھی ختم ہو جائے گی۔ تمام وقت کتابیں پڑھ پڑھ جاتی۔ گھر کی لڑکیاں جانے کن کاموں میں مصروف رہتیں۔ دوپہر کو تمام کمروں کے پردے جاتے، کولر آن کر دیے جاتے نیم اندھیرے میں سرد سرد ماحول میں آنکھیں مندنے لگتیں۔ اسے ہی نیند سی آئی رہتی۔ ٹھنڈے تاریک کمرے میں سرگوشیاں، دبی دبی ہنسی کی آوازیں، گیلری میں قدموں کی آہٹیں، آہ یہ خوابناک ماحول شروع میں بہت بھلا لگا، پریوں کا دیس، خوابوں کا جزیرہ، قیام کے پانچویں روز ہی وہ اکتا گئی بے حس خاموش فضا اس کا جی چاہا زور سے چیخ مار کر یہاں کو دے، قہقہے لگائے، شور مچائے اور راحیلہ کی پرسکون خاموشی توڑ دے۔ امی جان کی حکم دیتی زبان سے کھینچ لے۔ ہمایوں کی خوبصورت آنکھیں پھوڑ دے۔ لمبے ناخنوں سے ان کے گورے گورے خراشیں ڈال دے۔ ان کی ساری وجاہت سارا حسن کھرچ ڈالے۔ نوچ لے۔ مگر..... وہ مسہری پر رونے لگی۔ یہ کیسا امتحان ہے۔ اسے ابھی تک یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ آزمائش میں فیل ہوئی یا پاس کرو، یہ پسند نہیں، وہ پسند نہیں۔ حکم۔ حکم۔ اس طرح کوئی کیسے دوسروں کے دستور طریقے اپنا سکتا کم از کم حمرا کو ابھی تک پتا نہیں چلا کہ وہ کون سے دستور اور طریقے ہیں جن کو اپنا کر وہ امی خوشنودی حاصل کر سکتی ہے۔ روتی ہوئی حمرا ہمایوں کو روز سے زیادہ اچھی لگی جیسے گلاب کی شبنم کے قطرے۔ انھوں نے اسے چپ کرانے کی کوئی کوشش نہ کی جب وہ بھڑاس نکل جانے چپ ہوگئی تو ہمایوں سے خفا تھی۔ "میں گھر جاؤں گی، امی یاد آ رہی ہیں۔" اس نے بسور کر کہا۔

یہ بسورتی ہوئی بچوں جیسی ضد کرتی حمرا اور بھی پیاری لگ رہی تھی۔ انھوں نے گھبرا کر کہا۔ ایک ہفتہ نہیں ہوا۔ کیا آپ گھبرا گئی ہیں پھر پوری زندگی کیسے گزرے گی۔"

"نہ گزرے میری بلا سے۔" اس نے تنک کر کہا۔ "آپ کہیں اور چل کر رہیں ورنہ میرا م جائے گا۔"

"ہوں۔ میں آپ کی خاطر دنیا بھی چھوڑ سکتا ہوں مگر... جس کاروبار کی ترقی کے لیے، خاندان خوشحالی کے لیے میں نے رات دن سخت محنت کی ہے، اسے وسعت دی ہے۔ اسے اب میں نہیں سکتا۔ میں نے دن کا چین، رات کی نیند اس لیے حرام نہیں کی تھی کہ آسمان تک پہنچا کر پھر دامن

سیلابِ خوں

خلیفہ سلیمان ابن عبدالملک کا وزیر تھا۔ سپہ سالار یزید نے اہل حجان کی شوریدہ سری اور بغاوت کو سختی سے کچل کر رکھ دیا۔ اہل حجان پر شباب ہر طوفان کے سیلاب خوں سے نچلا بیٹھ کر آنا پسند نہ کرتا اور پھر اس کی روح فی گھائل ہو گئی۔ وہ سات ماہ تک اہل حجان کا محاصرہ کیے رہا مگر نتیجہ نہ نکلا۔ اہل حجان پہاڑی علاقے میں رہتے تھے جہاں کا راستہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ ایک خرسانی کسی طرح پہاڑ پر چڑھ گیا اور اہل حجان کے عقب میں جا پہنچا۔ واپس آتے ہوئے اس نے بہ طور یادگار ان میں مختلف نشانات بنائے اور یزید بن مہلب کو خبر کی۔

یزید نے تین سو منتخب سپاہی اس راستے پر روانہ کیے اور حملے کا منصوبہ بنایا۔ منصوبہ کامیاب رہا۔ اہل حجان بے خبری میں مارے گئے۔ میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ جس وقت مسلمان گھڑسوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے گرز میں گھڑسوار گرز میں گھڑسوار بانی کے ساتھ قول کر اس قدر دہشت سے بھاگ طفیانی آ گئی۔ یزید کی چشم پوری کرنے کے لیے اس سے بھاگنے والوں کی آہ و پکار لیا گیا۔ اس معرکے میں چالیس ہزار کرد مارے گئے۔

"برا۔ آپ اس طرح سوچیے بھی نہیں۔ آپ کو میرا ساتھ اسی صورت میں دینا ہوگا کہ میں جہاں ہوں۔ امی جان کے ساتھ۔ جب بھائی ہارون اور صفدر نے شادی کے بعد کنارہ کشی اختیار کی تھی میں اسی وقت عہد کر لیا تھا کہ غیروں میں شادی کر کے دکھاؤں گا کہ غلطی کس کی ہے اگر بھائی ہارون اور بھابی چاہتے تو بیویوں کو یہیں ساتھ رہنے پر مجبور کر سکتے تھے۔ کوشش کرتے محبت سے، نرمی سے، طریقے سے، انسان خود کمزور ہو اور الزام دوسرے کو دے یہ زیادتی ہے۔" سنجیدگی سے مدھم آواز میں بولتے ہوئے وہ بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ کسی بادشاہ کی طرح پر شکوہ، پر جلال۔ حمرا متاثر ہوئے بغیر نہ

"آپ بہت مضبوط قوت ارادی کے مالک ہیں۔" حمرا نے نیچی نظر کر کے کہا۔ "مگر میں... ایسی نہیں

"انسان ارادہ کر لے کہ یہ کام مجھے کرنا ہے تو راستے کی تمام دیواریں معمولی سی کوشش سے خود بخود گر جاتی ہیں۔ یہ میرا تجربہ ہے۔ آپ بھی مضبوطی سے ارادوں کے دامن تھام لیجیے۔ بہادری سے پھر کوئی مشکل نہیں رہے گی۔ جب میں نے کاروبار سنبھالا ہے تو یہ سمجھی کا خیال تھا کہ رہا سہا سرمایہ بھی میں ڈبو دوں گا۔ بہت مخالفتیں ہوئیں۔ بحث مباحثے، مجھے کافی دقت پیش آئی۔ آخر کار میں نے امی جان کو منوا لیا پھر بھی مخالفت کے جھکڑ چلتے رہے مگر میں جما رہا۔ اب سب مجھے مان گئے ہیں میری محنت میری لگن اور حوصلے کی داد دیتے ہیں۔ اسی مضبوط قوت ارادی سے کام لے کر میں نے امی جان کو آپ سے ملنے پر رضامند کیا ہے ورنہ ان کے خیال میں خاندان میں لڑکیوں کی کمی نہیں۔ اسی لیے میں امی جان کی مخالفت کے سامنے سر جھکا دیتا ہوں۔ بخدا انسان ارادہ کر لے تو خدا کو پا سکتا ہے۔ آپ....." انھوں نے

جھک کر اس کا چہرا دیکھا۔ "مجھے شرمندہ تو نہیں کریں گی۔ میرے اعتماد اور یقین کو ٹھیس تو نہ پہنچائیں گی؟" حرا گم صم کھڑی رہی۔ "ہم بعد میں سب کچھ ٹھیک کرلیں گے۔ میں اور آپ۔" وہ بڑی درد مندی سے اپیل کررہے تھے۔ حرا کا دل پگھل رہا تھا۔ وہ سب کچھ بھول گئی۔ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ہمایوں کے چہرے پر بشاشت ٹھہر گئی۔ "شکریہ۔" انھوں نے کہا۔ "افوہ۔" حرا نے سوچا... یہ تکلفات' یہ شکریہ۔ شکریہ۔ کم از کم حرا سے تو انھیں یہ تکلف نہیں کرنا چاہیے مگر بچپن سے شعور میں رچی بسی روایات فراں برداریاں۔ شام کو وہ سر اٹھائے ہمایوں کے ساتھ روش پر ٹہلتی رہی۔ اسے کچھ پروانہ تھی کہ اس کے پاس کرسیوں بینچوں اور بنے پر بیٹھے خواتین وحضرات اس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں۔ ماما کی گردن موڑ کر اس کو دیکھنے سے کیا بگاڑ لیں گے' وہ زور زور سے ہنستی رہی۔ وہ ہمایوں کا اعتماد تھی اور ہمایوں سے محبت کرتی تھی جنھوں نے اس گھر کی خوشحالی کے لیے' خاندان کی بہتری کے لیے دن رات چین لٹایا تھا۔ خون جگر دیا تھا۔ ہمایوں جو حرا سے محبت کرتے تھے۔ مضبوط... پراعتماد... گہری... ہمایوں دل پر حرا کی حکمرانی تھی۔ وہ جتنا بھی ناز کرتی کم تھا۔ اس کو اپنی برتری' اپنے تفاخر کا احساس تھا مگر وہ اس کا اظہار نہ کرسکی مگر ہمایوں کے خوبصورت چمکتے دمکتے چہرے نے یہ ظاہر کردیا کہ وہ اور حرا اس معاملے میں برابر کے شریک ہیں۔ جونہی رات کی رانی کے کنج میں وہ پہنچے۔ نیم تاریکی سے فائدہ اٹھا کر ہمایوں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ وہ چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر دور جا کھڑی ہوئی اور اس نے بولی۔ "بلاؤں راحیلہ کو؟" ہمایوں کھسیانے ہوگئے۔

"واہ میں تو بھول ہی گیا۔ راحیلہ کے لیے دوا بھی لانا تھی۔ وہ بیمار ہے مگر حرا... ایسا لگتا ہے کہ اس کی آمد نے گھر کو پرستان بنا دیا ہے۔ میں اپنے آپ میں نہیں رہا۔ ایسا کیوں ہے؟" ہمایوں حرا کی قربت میں مسرور تھے۔ مخمور تھے لیکن وہ اپنی دلی کیفیت چھپانا چاہتے تھے۔ اظہار میں بخل سے کام لے رہے تھے اور حرا چاہتی تھی وہ بولتے رہیں اس کی تعریف و توصیف میں خوبصورت الفاظ استعمال کریں۔ داستان محبت چھیڑیں تو صبح ہوجائے۔ عمر دو بیاں میں گزر جائے۔ اس کی محبت کی معراج ہو جائے۔ ہمایوں ہر معاملے میں گمبھیر تھے۔ بہت ہی متاثر ہوتے تو چند الفاظ کہتے۔ حرا نے تو اپنی زندگی ان کے وقف کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ یہ ہمایوں کی پہلی محبت تھی تو حرا کی بھی اولین محبت تھی۔ اس محبت کے لیے' اس اعتماد اور یقین کے لیے جو ہمایوں کو حرا پر تھا وہ سب کچھ لٹانے کو تیار تھی۔ اپنی انا' عزت نفس لیکن یہ محض اس کے جذباتی محسوسات تھے۔ جب امی جان نے اس کو بلا کر کہا کہ وہ حرا کی شوخی کو اس نظر سے نہیں دیکھتیں۔ اس کو اپنا رویہ تبدیل کرکے مہذب اور نیک لڑکیوں کی طرح رہنا ہوگا۔ اپنی

قابو میں رکھنا ہوگا۔ ہنسی پر کنٹرول کرنا ہوگا۔ بلند آواز کی ہنسی سے خود آرائی اور غرور جھلکتا ہے۔ انھوں نے ہمایوں سے بھی کہا کہ انھیں بیجوڑا پن پسند نہیں اور آج حرا نے انھیں کافی دکھ پہنچایا ہے۔ اب آئندہ کل حرا کا اس گھر میں آخری دن ہوگا۔ وہ اس کی جانب سے کوئی مزید تکلیف دہ حرکت برداشت نہیں کریں گی۔ ہمایوں تو خاموش کھڑے تھے۔ مگر حرا کا خون کھول رہا تھا۔ نہیں۔ وہ کسی بھی قیمت پر اپنی عزت نفس کا سودا نہیں کرسکتی۔ یہ بہت مشکل تھا۔ ناممکن۔ وہ تیز تیز سانسوں کو کسی طور ہموار نہ کرسکی۔ امی جان کے زیر حکومت رہنا۔ ان کے احکام کی پابندی کرنا۔ اب اس کے لیے ممکن نہ رہا تھا۔ وہ حیران تھی کہ اس کی بے لگام زبان یہاں آکر کیوں اس قدر خاموش ہوگئی ہے۔ وہ چاہے تو ابھی اس گھر کی تہذیب و تمدن کو اپنی زبان کی تیز دھار سے کاٹ پھاڑ ڈالے اور دھجی دھجی کرکے اسے ان کے منہ پر دے مارے۔ اپنے کمرے میں وہ بے تاب بیقرار سمندری لہروں کی مانند ادھر سے ادھر ہو رہی۔ جھلائی ہوئی۔ کتابیں میز سے زمین پر پٹخ ڈالیں۔ تکیہ صوفے پر پھینکا اور کشن مسہری کے نیچے گھسیڑ دیے۔ مگر اس کی تسکین نہیں ہوئی۔ کتنا اچھا ہوتا اگر وہ وہیں غصے کا اظہار کرکے دل ٹھنڈا کرلیتی۔ باہر بڑی بی کو پتہ چلتا کہ وہ چابی کی گڑیا ہے نہ بے جان لٹو جسے وہ اپنی مرضی اور خواہش سے جب چاہیں نچا دیں۔ چکر دیتی رہیں۔ وہ خاموشی سے چکر کھانے والی نہیں۔ غصے نے اس کے تن بدن کو پھونک ڈالا۔ اس کل آخری بات ہمایوں سے ہوگی۔ پھر چاہے اسے ہمیشہ کے لیے اس خوابوں کے جزیرے کو خیرباد کہنا پڑے۔ ایک فیصلہ کرکے وہ سوگئی۔ صبح دیر تک لیٹی رہی۔ اس نے ناشتے کے لیے انکار کردیا راحیلہ کو جانے آئی تو اس کی سرد نگاہوں اور خشک لہجے نے اور بھی بھڑکا دیا۔ اس نے اپنی پسند کا بھڑکیلا سا لباس پہنا۔ بالوں میں رولر لگائے اور ناخنوں کی دیکھ بھال میں لگ گئی۔ ہونہہ۔ کب تک وہ اپنی خواہشیں پشت ڈالتی رہی جب کسی کو اس کی پروا نہیں تو وہ بھی کیوں کرے۔ یہ بھی کوئی محبت ہے ایسے ہی کی جاتی ہے؟ میرے دل کو جو اچھا لگے گا میں وہی کروں گی اس نے سوچا اور چہرے پر کدورت کے آثار میں بغاوت کے آثار لیے وہ ہمایوں کا انتظار کرنے لگی۔ ہمایوں راحیلہ کے ساتھ آئے۔ ان کے اصرار پر اس نے کہہ دیا۔ "ایک دن ناشتہ نہ کیا تو مر نہیں جاؤں گی۔ مرغن کھانے اور بھاری ناشتہ کرکر کے میں تنگ آگئی ہوں۔"

"میں نے ارشد سے کہہ دیا ہے وہ ابھی چائے لے کر آئے گا۔" ہمایوں نے کہا۔ راحیلہ اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ "یہ میرا پسندیدہ لباس ہے۔" حرا نے مسکرا کر شوخی سے کہا۔ "میں نے سوچا۔ آج اس گھر میں میرا آخری دن ہے ابھی تک میں یہاں کے طور طریقے دیکھتی رہی تھی۔ سب کی پسند ناپسند پرکھتی

رہی تھی۔ آج اپنی پسند اپنے طور طریقے بھی کیوں نہ دکھلا دوں۔ میں آج اپنی مرضی کا لباس پہننا چاہتی ہوں۔ اپنی مرضی سے کھانا پینا' اٹھنا بیٹھنا چاہتی ہوں۔"

"آپ اس میں بہت اچھی لگ رہی ہیں۔" راحیلہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اس کی آواز میں مایوسی تھی۔ اداسی۔

"آپ کا جسم بے حد خوبصورت ہے متناسب اور سڈول۔" ہمایوں تعریفی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ "ہمارے ہاں کسی کا جسم اتنا خوبصورت نہیں کیوں راحیل۔ میں غلط تو نہیں کہتا۔"

"ٹھیک کہتے ہو ہما بھائی۔" راحیلہ مری ہوئی آواز میں بولی۔ حمرا کو ہنسی آگئی۔ "اس قدر تربتر ناشتہ کر کے کوئی سڈول کیسے رہ سکتا ہے۔" اس نے طنز کیا (آج جانا تو ہے ہی) "جسم ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا ہما بھائی دل بھی تو کوئی چیز ہے مگر ہم تو دل کی بات زبان پر لا نہیں سکتے۔" راحیلہ نے اداس اداس سرد نگاہوں سے حمرا کو چھوا۔ "آپ۔" اس نے پھر کہا۔ "کتنی خوش قسمت ہیں اپنی پسند اپنی مرضی سے سب کچھ کر سکتی ہیں۔ مگر ہم کبھی امی جان' کبھی ہما بھائی کی مرضی اور خواہش تلے اپنی آواز میں اپنی آواز دبانے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ ہم ان کے دست نگر ہیں۔" حمرا نے چونک کر راحیلہ کو دیکھا یہ درد' یہ سوز' یہ محرومی کا انداز کہاں سے لیا راحیل نے وہ سرد نظریں وہ حقارت بھری سرد مہری..... تو..... راحیلہ وہ نہیں ہو نظر آتی ہے۔ ہمایوں کے چہرے پر تاریک سایہ آکر گزر گیا۔ انھوں نے راحیلہ کو ملامت بھری نظروں سے دیکھا۔ راحیلہ ان کی نظروں کا مقابلہ کرتی رہی اچانک ہمایوں مڑے اور باہر چلے گئے حمرا نے راحیلہ کو تھام لیا۔ وہ غصے سے کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ "ہاں ہم بے بس ہیں ہم محض قربانی کی گائے ہیں۔" اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ "ہم امی جان اور ہما بھائی کے اشاروں پر چلنے کے لیے مجبور ہیں جو بھی کوئی موقعہ ہماری تمناؤں کے پورا ہونے کا آتا ہے ہما بھائی ہمارے درمیان آجاتے ہیں۔" راحیلہ نے مڑکر حمرا کو گھورا سینے پر ہاتھ مار کر اس نے چلا کر کہا۔ "میں عورت ہوں میں ہما بھائی کی بہن ہوں۔ میں۔ آپا۔بی بی۔ ہم کب تک ہما بھائی کی مصلحتوں کی صلیب پر لٹکتے رہیں گے؟" حمرا نے لرزتی کانپتی راحیلہ کو پکڑ کر پلنگ پر بٹھایا اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "کیا دکھ ہے آپ کو بتائیے میں ہمایوں کو بتاؤں گی۔"

"کیا آپ وہ نہیں جانتیں؟" راحیلہ نے طنز سے کہا۔ "انھیں ہما کا وجود نظر نہیں آتا؟ وہ اپنا گھر بسانے کی خواہش کر سکتے ہیں۔ مگر ہمارے لیے..... کیا کیا انھوں نے؟ وہ خاندان کے کرتا دھرتا ہیں۔ انھوں نے احسانوں کے بوجھ لاد دیے ہیں پورے خاندان پر۔ عزت۔ دولت شان و شوکت دی۔ وہ اب ملک بھر میں

معزز خاندان سمجھا جاتا ہے۔ مگر وہ اپنی پہلی حیثیت فراموش کر چکے ہیں جب ہم ایک چھوٹے گھر میں رہتے تھے ابا کا کاروبار فیل ہو گیا تھا۔ ہم چٹنی روٹی کھاتے اور پیوند لگے لباس پہنتے۔ ابا کی خواہش تھی کہ سب بہن بھائی مل جل کر پیار محبت سے رہیں۔ دکھ جھیلیں۔ یا خوشی سمیٹیں۔ سب۔ مگر ہم ان کی خواہش پوری نہیں کر سکے امی جان کی حکومت میں ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔ انھوں نے ابا پر بھی ہمیشہ حکم چلائے لیکن..... ان دنوں ہم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔" راحیلہ نے آنکھوں میں بھرے آنسو ہتھیلی سے پونچھ ڈالے۔ "اب..... ہم نے اس عالی شان محل میں رہنا سیکھ لیا ہے قیمتی لباس پہن کر اکڑنا آگیا ہے مگر اب ابا نہیں رہے جو ہمیں مل جل کر سکھ دکھ جھیلنے کی نصیحت کریں۔ خوشیاں تو محض ہما بھائی کے لیے ہیں۔" وہ اداسی سے مسکرائی۔ جس رفتار سے ہم نے ترقی کی۔ اسی رفتار سے جھوٹ اور خود غرضی کو اپنایا۔ مگر میں آج بھی وہی ہوں مجھے اپنی حکومت چاہیے۔ جہاں میں سر اٹھا کر چلوں۔ اپنی مرضی سے آ جا سکوں۔ مگر یہ ہما بھائی کو منظور نہیں۔ یہ عالی شان گھر۔ جہاں بھٹکتی روحوں کی چیخیں گونجتی ہیں۔ مگر کوئی سننے والا نہیں۔ اس قیمتی لباس میں ہمارا سب کچھ چھپ گیا ہے۔ ہم معزز ہو گئے ہیں مگر خدارا ہم سے ہماری زندگی نہ چھینو۔ ہمیں جینے کا حق چاہیے۔" راحیلہ جوش میں تھی۔ اس کی آواز بلند ہو گئی اس کو سن کر آپا اندر سے آگئیں۔ یہ سب بہنوں میں بڑی تھیں۔ انھوں نے دروازہ بند کر دیا اور سرگوشی میں بولیں۔ "راحیلہ راحیلہ۔ چپ ہو جا۔ کشور صاحب کی بیگم آئی ہوئی ہیں۔ تمہاری آواز باہر جا رہی ہے۔" راحیلہ نے کھڑے ہو کر لاپروائی سے کہا۔ "جانے دو۔ میں حمرا بیگم سے بات کر رہی ہوں۔ یہ اس گھر کی ہونے والی مالکہ ہیں نا تو ہما بھائی تک ہماری آواز پہنچائیں گی۔" وہ حمرا کے روبرو آگئی۔ اور اسے تیز نظروں سے دیکھنے لگی۔ حمرا حواس باختہ پریشان کھڑی تھی۔

"جب تک آپا اور بی بی کی شادی نہیں ہو گی۔ اس گھر میں کوئی دلہن نہیں آئے گی۔ یاد رکھیے۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔ آپ سے پہلے بھی ہما بھائی تین لڑکیوں کو یہاں لا چکے ہیں۔ ان کو ہر حسین لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے۔" وہ حمرا کے اڑتے رنگ کو دیکھ کر طنزاً ہنسی۔ "وہ ہمیشہ مڈل کلاس کی لڑکیاں پسند کرتے ہیں۔ وہ خوابوں میں شہزادوں کی منتظر رہتی ہیں اور ہما بھائی ان کو باور کراتے ہیں کہ وہ وہی شہزادے ہیں۔ وہ لڑکیاں واپس جا چکی ہیں۔ سب نے ان کو وارننگ دی تھی۔" وہ پھر مسکرائی۔ "مگر آپ سب سے مختلف ہیں مجھے آپ کے جانے کا بہت افسوس ہو گا۔" اس نے مضبوطی اور سنجیدگی سے جملہ پورا کیا اور اٹھ جانے کو پلٹی۔ پھر دروازے کے پاس رک کر اس نے حمرا کو شرارے برساتی آنکھوں سے دیکھا۔ "یاد رکھیے ہما بھائی کو بتانا نہ بھولیے۔ آج ہی آپا بی بی کی شادی کی بات کا تصفیہ ہو جائے ورنہ کل..... میں اتنے

برسوں کی ہما بھائی کی بنائی ہوئی عزت کو ملیا میٹ کر سکتی ہوں۔ خود کشی کر سکتی ہوں۔ خود کشی کر کے کسی کے ساتھ فرار ہو کر....." اس نے دروازہ کھولا باہر نکل کر زور دار آواز سے بند کیا حواس باختہ دیوار سے لگی کھڑی رہی۔ آپا بڑبڑائیں۔ "پاگل ہو گئی ہے۔ امی جان ڈکٹیٹر ہیں۔ ہمایوں ان سے بھی قدم آگے ہیں۔ ان کو اپنی پیدا کی ہوئی دولت شان و شوکت پر غرور ہے۔ انھیں بہنوں کے لیے مناسب بر نہیں ملتے اپنوں کو وہ اس قابل نہیں سمجھتے اور غیر کوئی ان سے متاثر نہیں ہوتا۔ لڑکیوں کی عمریں نکل رہی تھیں۔ ہمایوں سمجھتے تھے کہ اب وہ اپنی زندگی اسی گھر میں عیش و آرام میں گزار دیں۔ ہارون اور صفدر بھائی جب ہمایوں کی مرضی کے خلاف اپنی شادیاں کرنے لگے تو امی جان نے انھیں گھر سے نکال دیا۔ وہ ہمایوں کے اشارے پر چلتی رہیں اور اپنے اشاروں پر دنیا کو چلاتی رہیں۔ کاروبار۔ جائداد سب امی جان کے نام تھا مگر سکہ ہمایوں کا چلتا تھا اب دو بھائیوں نے دونوں بہنوں کے لیے رشتہ مانگا تو ہمایوں نے ٹال دیا یہ وہ امی جان سے مشورے کا بہانہ کر کے وقت گزارنا چاہتے تھے۔ انھیں ان کی اپنی شادی کی زیادہ فکر تھی۔ یوں بھی وہ سوچتے تھے کہ متوسط طبقے کے لوگوں میں رشتہ کرنے سے ان کی سسکی ہوگی وہ ان کی بہنوں کو عیش و آرام سے پالیں گے جن کی وہ عادی ہو چکی ہیں۔ مگر انھوں نے کبھی بہنوں سے اس معاملے میں رائے نہیں لی۔ وہ جو اس تاج محل کی سنگینی سے بیزار ہو چکی تھیں انھیں ایک گھر چاہیے تھا جس پر وہ حکمرانی کریں شوہر جس کی تابعداری اور بچے جن کے ناز اٹھائیں مگر ہما بھائی ان کی یہ آخری امید بھی توڑ دی۔"

"اور وہ تین لڑکیاں۔" حرا لڑکھڑاتی آواز میں بولی۔

"وہ..... وہ بھی امی جان کی حکومت سے بیزار ہو گئیں اور ہمایوں کی ساری کوشش رائگاں گئی۔"

"امی جان۔ آخر چاہتی کیا ہیں؟" حرا نے اٹک اٹک کر سوال کیا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔

"وہ جانتی ہیں شادی کے بعد ہمایوں ان کے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ شاید بیوی کے اشاروں پر چلنے لگیں۔ حالانکہ وہ دولت کے پرستار ہیں وہ کبھی اس دولت کو نہیں چھوڑیں گے۔" آپا چلی گئیں۔ حرا ناشتہ لایا مگر حرا کی بھوک پیاس غائب ہو چکی تھی۔ یہ پریوں کا خوبصورت دیس خوابوں کا جزیرہ۔ کے مذہب بااخلاق مکین یہ سفید ریشمی سرسراتے پردے گیلری میں ابھرتی مدھم قدموں کی آہٹیں سرگوشی میں باتیں کرتے لوگ امی جان کی حکومت دبدبہ یہ نیم تاریک اجالوں میں گھرے سامان سے مزین کمرے قید خانے کی طرح بو جھل خاموشی جرائم کی آماجگاہ کی مانند سناٹا بے حس سرد لمحات روح پر برف گر رہی ہو یہاں اجالوں کو تاریکی میں قید کر لیا جاتا ہے۔ خوشبو پھولوں میں بند رہتی ہے

بے مقصد بے بس۔ محبت تماشا اور انسان کھلونا۔ حرا دوپہر تک ہمایوں کی منتظر رہی مگر وہ نہیں آئے اسے اضطراب چین لینے نہ دیتا تھا۔ بے بسی اور مجبوری سناٹے اور گہرے ہو گئے سب لوگ آرام کے لیے کمروں میں جا چکے تھے حرا بے قرار روح کی مانند گیلری میں گھومتی رہی۔ اداسی نے جسم و جاں کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ رونے کے لیے بے چین تھی مگر آنسو خشک ہو چکے تھے وہ گیلری میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ سہ پہر کو کسی نے جگایا ہمایوں آج گھر نہیں آئے تھے اور حرا کے دو دن قیام پہ پہلی بار ہوا تھا ورنہ وہ دوپہر کو ضرور آتے تھے کیا وہ منہ چھپانا چاہتے تھے۔ مگر کب تک؟ ہمایوں نے راحیلہ کے بدلے ہوئے رویے سے سمجھ لیا تھا کہ وہ آج حرا کو ضرور حقیقت سے باخبر کر دے گی شاید اسی لیے وہ منہ چھپائے بیٹھے تھے انسان اپنے خدوخال پر کتنے ہی ایوان تعمیر کر لے لیکن اندر کا کھنڈر آشکار ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ گرتی ہوئی دیواروں کو ریشمی پردے کب تک سہارا دے سکتے ہیں۔ آج ہمایوں کے خدوخال نقاب گر جانے کے بعد کتنے کریہہ نظر آ رہے تھے۔ حرا آخری بات کیے بغیر گھر سے جانا نہیں چاہتی تھی وہ زبان پر قفل لگائے وقت گزار رہی تھی۔ شام کو سب لوگ لان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ حرا حسب معمول روش پر ٹہلتی ہوئی رنگ برنگی مچھلیوں کو دیکھتی رہی دور سے لان میں کرسیوں اور سبزے پر بیٹھے لوگ کسی ڈرامے کے کردار لگ رہے تھے جیسے ابھی پردہ گرے گا سین بدل جائے گا۔ راحیلہ کی بہن بی بی ادھر سے گزریں۔ حرا کو دیکھ کر مسکرائیں حرا نے ان سے کھل کر باتیں کیں۔ وہ بھی آپا اور راحیلہ کی ہم خیال تھیں انھیں بھی عیش و آرام نہیں۔ گھر کی خواہش تھی۔ اماں بھائی بہن نہیں سسرال کی چاہت تھی۔ جہاں وہ خواہ اپنی روٹی کھا کر اپنی تمناؤں کی تکمیل کر سکیں۔ ہما بھائی کی ضد نے ہمیں عمر کی ان منزلوں میں لا کھڑا کیا تھا کہ ہم شاندار مستقبل کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ بی بی نے نرم اور غمناک آواز میں اسے بتایا۔ "جب بھی کوئی ہماری تمناؤں میں رنگ بھرنے کا مقصد لے کر ادھر آتا ہے اسے اس خاندان کی شایان شان شرطوں سے سابقہ پڑتا ہے اور ہم اس راستے کو تکتے رہتے ہیں۔ جہاں سے کوئی برات آئے اور ہمیں ڈولی میں بٹھا لے جائے مگر..... راحیلہ کی بات الگ ہے وہ چھوٹی ہے' مزاج کی تیز اور کڑوی اسے مامون بھائی کی حمایت حاصل ہے۔ اس لیے اس کی زبان رک نہیں سکتی۔ یوں بھی وہ جانتی ہے جب تک بڑی بہنوں کی شادیاں نہیں ہوتیں۔ راحیلہ کی باری نہیں آسکتی یہ ہمایوں کا فیصلہ ہے۔ راحیلہ خاموش رہ کر آگ میں جلنا نہیں چاہتی اس کے بے شمار رشتے آئے مگر امی جان ہم دونوں کا عذر کر کے مسترد کرتی رہیں۔" حرا کو اس گھر میں بس آج ہی رہنا تھا۔ اگر ہمایوں آجاتے تو وہ رات کے کسی وقت بھی روانہ ہو جاتی تھی۔ اگر وہ نہیں آئے تو اس کا پکا ارادہ رات کو ٹھہر جانے کا تھا۔ وہ جاتے جاتے ہمایوں کو آئینہ

دکھانا چاہتی تھی۔ ان کو شرمندہ اور پشیمان دیکھنا چاہتی تھی وہ وہیں سلگتی رہی اس فضا اس ماحول میں اس کی کمی محسوس کریگا۔ اس سے پہلے بھی تین حسین لڑکیاں آزمائش کے لیے آکر جا چکی تھیں۔ ان کی کتنی مجبوریاں ہوں گی۔ یا شاید وہ بیچارا ابھی ابھی ماں کے جبر کے سامنے بے بس ہے کیا امی جان کا کوئی وظیفہ ہے جس سے وہ سب کو اپنا معمول بنالیتی ہیں۔ امی جان کیا ہیں؟ آج ان کا تصور بھی کتنا لگ رہا تھا وہ حیران رہ گئی بے خیالی میں ہمایوں کی بے نیازی اور دغابازی پر پیچ و تاب کھاتی چپا کے پاس قریب سے گزری تبھی اچانک چھٹی حس نے اسے آنے والے خطرے سے آگاہ کردیا۔ وہ پلٹی مگر ہو چکی تھی پھنکار کے ساتھ ایک نرم لجلجی شے اس کی پنڈلی سے لپٹ چکی تھی چیخ مار کر اس نے پیر اس کے جسم کا رواں رواں خوف اور دہشت سے کھڑا ہو گیا تھا پیر جھٹکتے ہوئے اپنے ہی زور میں وہ زمین گر گئی اس کی پے در پے چیخوں سے سارا لان گونج اٹھا۔ جب سب لوگ اس کے قریب پہنچے تو اس کا رنگ سفید ہو رہا تھا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کو دیکھا اور ٹوٹتے لہجے میں بولی۔ "مجھے سانپ کاٹ لیا ہے۔"

خیام کو خود اندازہ نہ تھا کہ صبح سے اسے بے چینی کیوں ہے گو اسے معلوم تھا کہ آج حرا واپس آرہی ہے صبح ہمایوں آئے تو چچی نے ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ خود جا کر اسے لے آئیں گی۔ چچی نے رات کا وقت دیا تھا۔ ہمایوں نے خاموشی اختیار کرلی تھی وہ روزانہ صبح آفس جاتے ہوئے ضرور چند منٹوں کے لیے آجاتے۔ اس ایک ہفتے میں چچا میاں بھی ان کے رکھ رکھاؤ گفتگو کے سلیقے اور ادب و اخلاق سے بہت متاثر ہوئے تھے مگر وہ حرا سے ابھی تک خفا تھے اس نے ان کے گھرانے کی عزت کو غیروں کے سامنے حقیر کردیا تھا۔ خیام سے چچی نے کہا تھا "شام کو چلیں گے اس سر پھری کو لینے۔" تم تو جانتے ہو" خیام نے یونہی سر ہلا دیا۔ وہ کتنی دیر سے ریلنگ پر جھکا کسی نہ نظر آنے والی چیز کو گھور رہا تھا خیالات کی یورش تفکرات کا بوجھ وہ ایک ہفتے میں کتنا کمزور نظر آنے لگا تھا آئے گی۔ آئے گی ضرور جانے کے لیے۔ اسے کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ حرا اتنے دن خیام سے دور رہ سکتی ہے ایک بار کے بعد پھر دوبارہ آئی بھی نہیں۔ شاید وہ وہاں بہت خوش ہے چچی دوبارہ جا کر اس سے مل آئیں تھیں وہ بھی مطمئن تھیں۔

ایک مشہور سپیرا بلوا لیا گیا تھا اس نے بغور زخم دیکھا متفکر ہو کر سر ہلایا اپنے جھولے سے دوا نکال کر زخم پر لگائی۔ پنڈلی پر بندھی پٹی کو اور کس کر باندھا کچھ ہدایات دیں اور کہا۔ "انھیں جگاؤ سونے نہ دو یہ بہت خطرناک ہے زندگی بچانے کی صورت یہی ہے کہ یہ جاگتی رہیں۔" ہمایوں نے ڈاکٹر کو بلا لیا تھا ماموں

سلیم کو پکڑا لائے تھے اور گھر میں ہلچل مچی ہوئی تھے سب کے چہرے فق تھے۔ حرا امی جان کے فکر کے مارے کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ اچھا۔ تو کوئی حادثہ انھیں پریشان بھی کرسکتا ہے اس کے آس پاس کھڑے لوگوں کا جمگھٹا تھا وہ ان کے ہونق چہروں کو دیکھ کر بے حد سراسیمہ ہوئی تھی کچھ دیر بعد ہی اسے احساس محسوس ہوا۔ اس گھر میں تو ویسے ہی آنکھیں مندی جاتی تھیں۔ اسے تو سانپ کے زہر کا نشہ تھا وہ پوری قوت ارادی سے کام لے کر آنکھیں پھاڑے لیٹی تھی۔ سارا جسم سن تھا ٹانگ پر جگہ جگہ کسی نوکیلی شے نے دو ران خون بند کردیا تھا اچانک جھونکا سا آیا اور چلا گیا تھی۔ "میں سونا نہیں چاہتی۔" اس نے نرمی سے اس کے شانے کو چھوا۔ "آپ نہیں سوئیں گی حرا' جاگنے کی کوشش کریں۔ آئیں باتیں کریں۔ نیند کو بھگائیں۔" حرا جانتی تھی کہ بیداری ہی زندگی ہے۔ مگر وہ ان لوگوں کے پریشان چہروں کو ہراساں تھی۔ گو اس کی قوت برداشت بہت مضبوط تھی لیکن وہ امی جان راحیلہ اور دوسری تمام خواتین کی پریشانی سے خود بھی پریشان ہو گئی تھی۔ ایک جھونکا اور آیا اس نے آنکھیں پھاڑیں۔ ہمایوں وہیں بیٹھے تھے۔ "گھبرائیں نہیں ہم سب آپ کے پاس ہیں۔ آپ کو سونے نہیں دیں گے۔" حرا نے اپنی آنکھیں کھول کر انھیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوبصورت نظر آرہے تھے پر شکوہ' پر جلال' شاندار انھیں بغور دیکھنے لگی۔ ہمایوں نے بے باکی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "حرا۔ پلیز۔ آپ مجھے یوں نہ دیکھیں۔"

".... آپ آپا اور بی بی کی شادی طے کردیں۔ اگر میں زندہ رہی تو سمجھوں گی آپ وعدے کے اتنے سچے ہیں۔ اگر نہ بچ سکی ... تو یہ ارمان دل ہی میں رہ جائے گا کہ ....." وہ بات پوری نہ کرسکی۔ ہمایوں نے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔ "حرا سب کچھ ہو جائے گا۔ آپ جب دوبارہ یہاں آئیں گی تو اپنے ہاتھ سے کام کریں گی۔ میری یہی خواہش ہے۔" ہمایوں اسے یقین دلانا چاہتے تھے۔

"میں نہیں آپ خود کریں گے۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اگر ذرا بھی آپ میں انسانیت ہے تو آپ میری بات مان لیں۔ ورنہ ...." جوش میں اس کی نیند غائب ہو گئی۔ وہ ہمایوں سے لڑتی رہی۔ ان کے مستقبل کے لیے جھگڑتی رہی وہ جو سمجھتے تھے کہ شاید حرا راحیلہ سے تین سابقہ لڑکیوں کا سن کر متنفر ہو جائے گی لڑے گی۔ مگر وہ تو آپا اور بی بی کے لیے ضد کر رہی تھی۔ وہ مجبوریاں بیان کر رہے تھے۔ ابھی جو دونوں بہنوں کا رشتہ آیا تھا۔ وہ بہت معمولی لوگ تھے خاندان کے ہی لیکن دور کے رشتے دار برابر کی حیثیت کے نہیں تھے۔ ہم سب اپنی مجبوریوں کے خول میں بند ہیں ہمایوں نے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "کوئی نہیں جانتا کہ دوسرے کی کیا پریشانی ہے آپ محتمد ہو جائیں۔ تو میں

بتاؤں گا میری مجبوری کیا ہے۔"

"میں ابھی فیصلہ چاہتی ہوں۔" حمرا نے طیش میں آکر کہا۔ راحیلہ کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور وہ دور جا کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

"مجھے یہ بھی تو دیکھنا ہے یہ لوگ کس لیے رشتے کے طالب ہوئے ہیں بعض لالچی تو محض ہمارے پیسے کی طلب میں ہی ادھر آتے ہیں۔ میں جہیز کے نام پر جو کچھ ان کو دوں گا اس سے ان کے حرص کی تسکین نہیں ہوگی۔ اس لیے مجھے...."

"آپ کچھ نہ دیں۔ صرف ان کے ہاتھ ان کے ہاتھوں میں دے دیں۔ آپ کی بہنوں کو دولت نہیں چاہیے۔ انھیں آپ کی خیرات کی نہیں محبت کی ضرورت ہے۔"

"یہ سب خیالی باتیں ہیں۔ تصوراتی۔ کچھ دن میں ہی پتہ چل جائے گا۔ مگر میں اس وقت کو آنے سے روکنا چاہتا ہوں۔ عملی زندگی میں جس چیز کی ضرورت ہے وہ پیسہ ہے جو لوگوں کے پاس نہیں ہوتا یا ہمیشہ ساتھ نہیں دیتے۔" ہمایوں اسے بتا رہے تھے۔

"تو پیسہ بھی ہمیشہ ساتھ نہیں رہتا۔" حمرا جوش میں اٹھ کر بیٹھ گئی اس کے دل پر زبردست چوٹ لگی تھی۔ شاید سمجھ رہے ہوں گے کہ حمرا بھی ان کی دولت کے لالچ میں یہاں آئی ہے وہ اچانک کمزوری محسوس کرنے لگی۔ جسم کی جان نکلی جا رہی تھی نیند کے حملے کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے زور سے کہا۔ "میں سونا چاہتی ہوں جینا چاہتی ہوں۔" مگر نیند برابر دباؤ ڈال رہی تھی۔ آنکھوں پر پانی کے چھینٹے دیے جا رہے تھے لیکن نیند۔ میٹھی نیند۔ سہانی نیند مدہوش نیند۔ ہمایوں اس کا سر ہلا رہے تھے۔ "جاگئے۔ جاگئے حمرا۔" امی جان نے قرآن شریف پڑھ کر اس پر پھونکا۔ پانی کے چھینٹے دیے۔ دو کھڑے لوگ بھی پاس آگئے۔ اچانک حمرا نے آنکھیں کھولیں۔

"میں نے بہت اچھا خواب دیکھا ہے میں بہت خوبصورت باغ میں کھڑی ہوں۔ جہاں پھول ہی پھول ہیں۔ چاندنی ہے۔ خوابوں کا جزیرہ۔" وہ غنودگی میں کھونے لگی۔ "سانپ ہی سانپ.... میں کتنی پیاری تھی۔ وہ پھر غوطہ کھا گئی۔

✷

خیام چچی کے مجبور کرنے پر چھوٹے چچا کی کار پر انھیں لے کر آیا تھا۔ اس شرط پر کہ وہ دیر نہیں لگائیں گی اور وہ اندر بھی نہیں جائے گا گیٹ پر کھڑے چوکیدار نے گیٹ کھولتے ہوئے سلام کرنے کے بجائے گھبرائے ہوئے لہجے میں خیام سے کہا۔ "سانپ نے ڈس لیا۔ بہت زہریلا تھا۔ سپیرا آیا تھا

اور روک کر خیام نے پوچھا۔ "کس کو کیا ہوا؟"

"بی وہ.... جو بی بی آئی ہوئی تھیں۔ آپ کی بیٹی۔" اس نے چچی سے کہا۔ اس وقت اندر سے ایک ملازم بھاگا ہوا آیا۔ "میں سپیرے کو بلانے جا رہا ہوں۔ بی بی کو نیند آ رہی ہے۔" نیند بہت خطرناک ہے" چوکیدار نے خیام سے کہا اور وہ ڈرائیور کو پکارتا ہوا دوسری طرف بھاگا چچی سفید چہرہ لیے ہوئے خیام کو تک رہی تھیں۔ خیام گاڑی سے گولی کی مانند نکلا اور دوڑتا ہوا اندر چلا گیا۔ اس نے یہ گھر پہلے نہیں دیکھا تھا۔ پھر وہ گھستا چلا گیا۔ شور مچاتا ہوا "حمرا کہاں ہے۔ حمرا کہاں ہے" وہ ہر ایک سے پوچھ رہا تھا۔ گھر والے انجان چہرے کو یوں بوکھلایا ہوا درانہ انداز گھستے دیکھ کر حیران تھے پھر کسی نے کہا۔ "اوپر۔ اوپر" کمرے کی بالکنی میں ایک تخت پر کشنوں کے سہارے لیٹی حمرا ایک مجسمہ لگ رہی تھی سنگ مرمر کا۔ خیام سکتے کے عالم میں دروازے میں بچوں بیچ کھڑا اسے گھور تا رہ گیا۔ ہمایوں نے قریب کی کرسی سے اٹھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ "انھیں سونا نہیں چاہیے ہم جگانے کی تدبیر کر چکے ہیں۔" خیام جیسے خواب میں چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ اس کی ٹانگ پر کئی جگہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں ٹخنے پر لال دوا لگی ہوئی تھی۔ حمرا نے شوخ نیلے رنگ کے کارواں قمیص پہنی ہوئی تھی۔ جس پر سرخ مرغیاں بنی ہوئی تھیں سرخ شلوار اس کے جسم سے منڈھی ہوئی تھی اسے اپنے یہ کپڑے بہت پسند تھے۔ گووہ انھیں بہت کم پہنتی تھی۔ اسی وقت پہنتی تھی جب اسے کوئی ضد منوانا ہوتی۔ یا اپنی من مانی کرنی ہوتی۔ اس کے ابا کو لڑکیوں کا یہ پہناوا پسند نہیں تھا اس لیے وہ ان سے جب بھی خفا ہوتی۔ یہ کپڑے پہن کر بار بار ان کے سامنے آتی جاتی۔ پھر چچا ابا کہتے۔ "اس سے کہو ٹھیک ہے کام ہو جائے گا۔ مگر یہ کپڑے....."

اس کے اوپر کسی نے سفید دوپٹہ ڈال دیا تھا۔ خیام نے اسے نوچ کر پھینک دیا۔ "تم نے تو اسے زندہ ہی کفن پہنا دیا۔" اس نے ہمایوں کو گھورتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

"حمرا" اچانک وہ چلا اٹھا۔ اس کی چیخ سارے گھر میں گونج گئی "میں تمھیں مرنے نہیں دوں گا۔ مرنے نہیں دوں گا۔ اٹھو۔ جاگو۔ حمرا جاگو۔" وہ دیوانوں کی طرح اسے بری طرح جھنجوڑ رہا تھا۔ ہمایوں نے بیزاری سے کہا۔ "آپ انھیں تکلیف پہنچا رہے ہیں۔" خیام کی آنکھیں فرط غضب سے سرخ ہو گئیں۔ اس نے ہمایوں کے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ "آپ کے دیے ہوئے آرام کے لیے میں اسے موت کی وادی میں نہیں دھکیل سکتا۔" اس نے حمرا کے سرہانے اور آس پاس رکھے بے شمار کشن اٹھا کر زمین پر پھینکے۔ "یہ۔ یہ۔ آرام پہنچانے کی ترکیبیں۔ نیند نہ آتی ہو تو بھی انسان بے خبر سو جائے۔ ہٹاؤ انھیں۔" وہ تکیے اور کشن اٹھا کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "حمرا جاگو۔ جاگو۔ میں تمھیں سونے نہیں دوں گا۔" خیام

نے خوابیدہ حرا کے بال پکڑ کر نوچ ڈالے۔ حرا کی مدھم آواز سنائی دی۔ "میں جاگ رہی ہوں۔ میں سونا نہیں چاہتی۔"

"نہیں۔ آنکھیں کھولو حرا۔ دیکھو۔ میں آگیا ہوں۔"

"مجھے نیند آرہی ہے۔ بہت مزے کی نیند۔ مگر میں سونا نہیں چاہتی۔" پھر اس کے کانوں میں دور سے کوئی آواز سنائی دی۔ کہیں دور سے۔ حرا کسمسا کر آنکھیں کھول کر دیکھنے لگی۔ خیام اس کے منہ پر تھپڑ لگا رہا تھا۔ "اٹھ۔ اٹھ کمینی بھٹیارن اب بولتی کیوں نہیں گونگی ہوگئی کیا؟" ہمایوں نے بگڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "کیا کرتے ہیں آپ میں اس کی اجازت نہیں دونگا آپ کو۔" خیام پر بھوت سوار تھا اس نے ہمایوں کو دھکا دے کر گرا دیا۔ "چلے جاؤ یہاں سے ابھی تمہارا اس پر اختیار نہیں ہے میرا جو جی چاہے گا۔ میں کروں گا۔ تم سے اجازت کی مجھے ضرورت نہیں۔" ہمایوں بھونچکا سے تھا۔ اسی لہجے میں آج تک ان سے کسی نے بات نہیں کی تھی انھوں نے احتجاجاً حرا کی طرف دیکھا پھر اس کی امی کی جانب انھوں نے آنکھوں کو دوپٹے سے رگڑتے ہوئے کہا۔ "خیام جو چاہے کرنے دو اسے۔" حرا کے منہ پر تھپڑوں کی بارش ہو رہی تھی۔ وہ آنکھیں کھول کر مسکرانے لگی۔ خیام نے اس کا ہاتھ مروڑ ڈالا ہمایوں کی امی نے نرمی سے کہا۔ "بیٹا صبر۔ اس طرح تو....."

خیام چنگھاڑ کر بولا۔ "چلے جایئے آپ سب۔" اس نے ہمایوں کی جانب دیکھا۔ کمرے سے سب لوگ چلے گئے صرف راحیلہ وہاں کھڑی رہ گئی۔ وہ خیام کی چنگھاڑیں سن کر بھاگی ہوئی آئی تھی اور ایک نیا تماشا اس کے سامنے تھا۔ حرا کے اوپر نیند کا خاصا دباؤ تھا خیام نے اسے شانوں سے پکڑ کر اٹھا دیا تھا۔ اور اس کے منہ پر تھپڑ مار رہا تھا۔ حرا کے چہرے سے تکلیف کا اظہار ہو رہا تھا۔ "کیا کرتے ہو۔ سونے دو نا۔" وہ منمنائی۔ "نہیں۔ نہیں نہیں۔" خیام اس کے کان میں چیخا۔ "سونے نہیں دونگا۔ ازل کی کمینی۔ آج سارے بدلے لوں گا۔ ایک تھپڑ میں دانت توڑ دوں گا۔" جوش میں وہ جانے کیا کیا بک رہا تھا ارے تیرا ستیاناس جائے۔ اب چپ کیوں ہے۔ مقابلہ کیوں نہیں کرتی ہمت نہیں ہے نا۔" حرا کے کانوں میں ایک دلکش نغمہ گونجنے لگا۔ تہذیب و ادب کے اس عقوبت خانے میں یہ رس بھرا نغمہ اس کی روح کو سیراب کر رہا تھا وہ کتنی پیاسی تھی گھونٹ گھونٹ اس رس کو اپنے جسم میں اتارنے لگی بالوں کو خیام کے شکنجے سے چھڑانے میں رہی سہی نیند بھی غائب ہوگئی۔ ہار گئی نا مجھ سے ہار گئی۔ اب نہ کہنا میں کچھ نہیں کر سکتا۔" خیام کا گلا رندھا جا رہا تھا "ارے۔ ارے۔ اب تم مجھے اتنے زور سے مارنے لگے ہو۔" وہ حیران ہو کر کہہ رہی تھی۔ "کیا تم نے مجھے مٹی کی منہ بند صراحی سمجھ رکھا ہے جسے توڑ کر پیاس

بجھانا چاہتے ہو چلو ہٹو۔ دور ہو۔"

"پہلے تم بتاؤ اب سوؤ گی تو نہیں۔" خیام کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تھے جنہیں وہ آستین سے مسلسل پونچھ رہا تھا۔ راحیلہ نے منہ پھیر کر دوپٹے سے آنکھیں خشک کیں۔ حرا امی کے کندھے سے لگ کر رونے لگی پھر خیام کے شانے پر سر رکھ کر ہنسنے لگی۔ پھر اس نے راحیلہ سے کہا۔ "آج میرا یہاں آخری دن ہے مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہو تو معاف کر دینا۔" سپیرا آگیا تھا۔ از سر نو دوا لگا کر پٹیاں دوبارہ کس کر وہ حرا کو رات بھر جاگنے کی تاکید کر کے چلا گیا اس نے حرا کو جنبش کرنے سے منع کیا تھا۔ وہ رات خیام اور چچی کو وہیں گزارنی تھی۔ ابھی تک حرا خطرے سے باہر نہیں ہوئی تھی۔ اور ضروری تھا کہ خیام اسے باتوں میں لگا کر جگائے رکھتا۔ "اصل نسل کے بھکاری" حرا شوخی سے خیام کے بال بکھرا کر بولی۔ "اتنے دن دیکھنے تک نہیں آئے اگر مرجاتی تو کندھا دینے آجاتے۔ ہیں نا؟"

"اچھا تو اسی لیے یہ ڈھونگ رچایا تھا۔" خیام کی تیوری پر بل تھے۔

"تم پر ایک پکچر ادھار ہے۔"

"جینے کی بات کرو۔ ابھی موت چند قدم پر ہی ہے۔ کہیں پلٹ نہ جائے۔"

"پکچر سے بچنے کے لیے میری موت تو نہ بلاؤ۔ کنجوس کہیں کے۔"

"اچھا میرا جیب خرچ بند کروا کے بھی تمہیں چین نہیں ملا کہ سانپ سے ڈسوا کر انتقام پورا کر رہی ہو۔ ہونا کمینی۔" صبح سپیرا آیا۔ ڈاکٹر آئے حرا خطرے سے باہر تھی البتہ اس کا رنگ زرد تھا۔ رات بھر وہ پیاس سے تڑپتی رہی۔ مگر خیام اور کسی نے دو گھونٹ پانی تک نہیں پینے دیا اسی بات پر وہ خیام سے خوب لڑتی رہی۔ سپیرے نے کہا "یہ معجزہ ہے زہر بہت تیز تھا۔ مگر لڑکی بہادر ہے نیند سے جنگ جیت کر اس نے فتح میں زندگی حاصل کی ہے ہمایوں کو خیام کے طور طریقے پسند نہیں آئے وہ رات بھر پھر سامنے نہیں آئے اپنے کمرے میں شمل شمل کر رات گزاری صبح حرا کی امی نے اجازت طلب کی۔ ہمایوں کی امی نے وقت رخصت چند معذرتیں کیں۔ اتفاقیہ حادثے پر شرمندگی کا اظہار کیا مگر ہمایوں سامنے نہیں آئے البتہ کلی سے ہاتھ ہلا کر ٹاٹا کر لیا۔ حرا چپ چاپ تھی۔ خیام نے راستے میں کہا "اب تم اس گھر میں جانے کا نام بھی نہیں لوگی۔"

تیسرے دن حرا نے لان میں آہستہ آہستہ ٹہلنا شروع کر دیا۔ پراٹھے اور مرغن غذائیں کھا کھا کر میں بہت موٹی ہوگئی ہوں یہ نا؟"

"لو۔ وہ تمہارے ہمایوں صاحب آئے ہیں۔" خیام نے برآمدے سے اسے مطلع کیا۔ "ملنا چاہتے ہیں

تم سے۔" دوپٹہ شانوں پر پھیلا کر وہ ڈرائنگ روم میں آگئی بیلو۔ بیلو کے بعد بولے۔

"راحیلہ آپ کی منتظر ہے؟" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو آپ اسے لے کر آتے۔" حمرا نے خوش اخلاقی سے کہا۔ "لیکن یہ گھر شاید ان کے شایان شان نہیں۔"

دانتوں میں ہونٹ دبا کر ہمایوں نے بغور اسے دیکھا۔ "کیا آپ کوئی ڈرامہ کھیل رہی ہیں؟"

"شاید" حمرا نے دبی زبان میں کہا۔ "مگر میں کھلونا تو نہیں۔ آپ تو مجھ سے ہی کھیل رہے تھے۔"

"امی جان نے آپ کی خیریت دریافت کی ہے۔" انہوں نے غصے کو دبا کر نرمی سے کہا۔

"شکریہ ان کا۔ اور آپ کا بھی۔"

"حمرا۔" وہ قریب آکر سنجیدگی سے کہنے لگے۔ "کیا ہو رہا ہے آپ کو؟ میں نے آپ سے محبت کی ہے۔ آپ نے وعدے کیے ہیں۔ میری محبت کی پذیرائی کی تھی۔ میں وہی تو ہوں۔ آپ کے کہنے پر میں نے بہنوں کی شادی بھی طے کردی۔"

"سانپ کے زہر نے سب کچھ بھلا دیا ہے۔ یادداشت کھو چکی ہوں' نیام سے پوچھ لیں۔"

"کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔" وہ بھاگے۔ "میں خود ہی آگیا ہوں اور خود ہی معلوم کرلوں گا۔" اور وہ وہاں سے چلا گیا۔

✷

میں بہت بزدل ہوں۔ کم ہمت۔" حمرا خیام کے طعنوں سے عاجز آکر اہل پڑی۔ "ہمایوں کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے بہت بڑے دل بہت بڑے ظرف کی ضرورت ہے۔"

"مگر محبت کرنے والے تو بہت بڑے دل کے مالک ہوتے ہیں۔" خیام نے طنز کیا۔ "تم نے محبت کی تھی کہ مذاق؟"

"شاید وہ ایک مذاق ہی تھا۔" اب حمرا سوچتی تو حیران رہ جاتی۔ ماحول سے فرار کے لیے اتنے بڑے ڈرامے کی تو ضرورت نہ تھی مگر قدرت نے اسے ایک موقعہ دیا تھا۔ وہ اس سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کہاں کتنا جھوٹ ہے خود غرضی مکاری کن کے لیے ہے اور نیکی کن لوگوں کے لیے۔ اب پتہ چلا اس دنیا میں ہر شخص صرف اپنی غرض کے لیے جی رہا ہے۔ دنیا میں سرد جنگ جاری ہے کہیں نیکی کے لیے کہیں بدی کے لیے۔ ہم سب محض قیدی ہیں۔ ذات کے قیدی کوئی باہر سے خوبصورت دلکش حسین اور مقناطیسی حیثیت رکھتا ہے مگر کوئی نہیں جانتا کہ وہ اندر سے کتنا جاہ طلب مطلبی۔ کریہہ المنظر

اور خود غرض ہے جن کی زندگی کا مقصد محض اپنی ذات کا تحفظ اپنی ذات کی پرستش ہے وہ جو اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے تو شگفتہ کلیوں کو مسلنے سے دریغ نہیں کرتے تم جو بظاہر کٹکھنے کتے کی مانند جھگڑالو ہو۔ اور سے نرم دردمند بے لوث اور مخلص مگر تم بھی تو اپنی ذات کے سوا کچھ نہیں سوچتے۔ قربانی دیتے ہو تو ثواب کے لیے خدمت' صلے کے لیے۔ نیکی' جزا کی خاطر۔ تو لالچ کہاں نہیں میں جو عقیلی گائے کی طرح ہونگ اٹھائے ہر ایک کو مارنے پر تیار رہتی ہوں' اپنی ذرا سی خواہش کے لیے پستیوں میں گر سکتی ہوں۔ والدین کے خلوص کو ٹھکرا کر نئی دنیا بسانے کے شوق میں اپنا آپ بھی کھو بیٹھتی ہوں' میں بزدل ہوں۔ کم ہمت منافق۔ محبوب کے چہرے سے نقاب اترتے ہی خوفزدہ ہو کر بھاگ آئی۔" ہمایوں نے کہا تھا مگر مجھ کو مالیت کی زندگی راس آنا مشکل تھی۔ گو اس تجربے نے کوئی خوشگوار تاثر نہیں دیا تھا پھر بھی اپنی اس ہوتی محبت کی ناکامی پر ہمیشہ اداس رہو گی یاد رکھوں گی یادیں جو ہیں' یادیں جو مخزن ہیں۔ حمرا نے خیام سے کچھ نہیں کہا تھا وہ صرف سوچ رہی تھی۔

✷

شادیان لان میں کھڑے خیام کو پکار رہے تھے۔ حمیرا نے بیڈمنٹن ریکٹ اٹھایا اور کمر پر دوپٹہ کس کر بلے پر ڈٹ گئی۔ خیام الجھے الجھے انداز سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کافی بدل گئی تھی جب اس نے سروس کے لیے ریکٹ اٹھایا تو دیکھا کہ حمرا کی انگلی میں ہمایوں کی امی جان کی پہنائی ہوئی انگھوٹی نہیں تھی۔ انگلی خالی تھی۔ مگر حمرا کا کچھ بھروسہ نہیں دنیا کو حیران کرنے چونکانے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔

"مگر میں تم سے نہ تو متاثر ہوں۔ نہ احسان مند۔ میری جان بچانے کے لیے ایک رات کی نیند کی قربانی دے کر یہ سمجھو کہ تم میرے حقدار ہو گئے ہو سنا ازل کے احمق۔ میں نے ہمایوں کو جواب دے دیا۔"

"اور ان کی وہ ناکتخدا بہنیں۔ جن سے تمہیں بے حد ہمدردی ہے۔"

"ہمدردی۔ مگر اس تجربے نے مجھے اتنا تو بتا ہی دیا کہ نہایت قیمتی بلکہ انمول زندگی کی قربانی دے کر ہمدردی کی قیمت نہیں چکائی جا سکتی۔ اپنی صلاحیتیں زنگ آلود کرنے کی بجائے متبادل راستہ اختیار کیا جائے۔"

"اور وہ متبادل راستہ کونسا ہے؟"

حمرا زور سے۔" شادیاں۔ میں آج کل شادیاں پر روغن قازمل رہا ہوں ان کو ہمایوں سے متعارف کراؤں گی۔ راحیلہ انھیں یقیناً پسند کرے گی۔"

"پاگل ہو تم خیام جھلا کر چیخا۔" مجھے یقین ہے راحیلہ کسی سے محبت کرتی ہے۔ تبھی وہ باغی ہو رہی

ہے۔"

"اس گھر میں کوئی کسی سے محبت نہیں کرتا خیام۔ سب اپنے آپ سے محبت کرتے ہیں۔" اس نے خیام کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس سے پہلے بھی وہاں ہمایوں کی منظور نظر لڑکیوں کی آزمائش ہو چکی ہے۔

اور پھر شادیاں ہمایوں کی رفعت سے ملائیں گے۔ ہمایوں جو مجھ سے انکار سن کر اب جلد سے جلد شادی کے لیے تلے بیٹھے ہیں۔ رفعت کو فوراً پسند کرلیں گے۔ اور یہ پانچویں لڑکی ہوگی اس گھر کی۔

"ارے۔ ارے۔ ارے۔ کیا بے ہودگی ہے۔" خیام چلایا۔ "شاہد میاں بہت غیرت مند نوجوان ہیں۔"

"ارے تو میں کب ان کی غیرت کو للکار رہی ہوں۔ نہایت دردمند سے رشتہ ہی تو کروا رہی ہوں۔ کہ رفعت وہاں بہت خوش رہیں گی۔" ہمایوں سے اس نے ایک ہی سبق لیا تھا۔ کوشش جدوجہد اور کوششیں بار آور ہو بھی جاتی ہیں۔ خیام سر تھامے بیٹھا رہا لڑکی بالکل ہڈی سے اتر گئی۔ کیا تجربہ حاصل کیا ہے اس نے وہ لاپروائی سے اپنے جھاڑ جھنکار بال سلجھا رہی تھی۔ کنگھا کرکے اس نے بالوں کو پیچھے ڈالا۔ آبشار کی مانند پیٹھ پر گرے۔

"کچھ اپنے بارے میں بھی ارشاد فرمایئے۔" خیام نے اس کے خوبصورت بالوں کو غور سے دیکھا۔

"ہاں۔ ابا میاں نے مجھے میری حماقتوں' غلط اور غلط فیصلوں پر پچھتانے اور بے عقلی کا ماتم کرنے کے لیے کافی وقت دیا ہے۔"

"کتنا؟" خیام چلا اٹھا۔ "گئے کام سے' مارے گئے۔ دو سال تین سال۔ اس سے کم اور کتنا وقت دیا ہوگا چچا میاں نے۔ بڑے ڈکٹیٹر باپ ہیں۔ مگر اس کی سزا تو یہ تھی کہ فوری شادی کرکے بندھن میں باندھ دیا جاتا کمینی نے سب کو پریشان کرکے رکھ دیا تھا۔"

"پندرہ دن۔" حمرا نے مطمئن لہجے اور چمکتی ہوئی آواز میں کہا "ویسے۔ تم کہو گے تو میں بال کٹوا بھی دوں گی اور جو بھی تم حکم....."

"نہیں۔ نہیں۔" خیام نے سٹپٹا کر کہا۔ "میں اتنا خود غرض اور کمینہ بھی نہیں ہوں تمہاری طرح یہ۔ یہ بہت اچھے لگتے ہیں مجھے۔"

وہ ایسی تصویر بنانے کا خواہاں تھا جو اُسے فن کی بلندیوں پر پہنچا دے
اور پھر وہ بلند ہوتا چلا گیا، بلند.... اور بلند مگر کیسے؟
ایک انوکھی محبت کی اچھوتی کہانی جو دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی

فرحت ظفر

نذرانہ

"اوہ نو۔" میں مختلف ہاتھوں میں رنگین آٹو گراف بکس دیکھ کر بری طرح گھبرا گیا اور لڑکیوں کے چہرے اتر گئے۔ "REALLY SO RRY" میں نے دوبارہ کہا اور ایئرپورٹ کیفے کے لان کی طرف چل دیا۔

آج مجھے بے پناہ گھٹن محسوس ہو رہی تھی، جی چاہ رہا تھا کہ کسی ایسی جگہ پہنچ جاؤں جہاں کوئی نہ ہو کوئی بھی نہ ہو، اور میں اپنے سارے گزرے ہوئے، بے شمار یادوں سے بھرپور دنوں کو آواز دوں، انھیں سچے دل سے یاد کروں۔ بے ساختہ میرا ہاتھ اپنے سر کے بالوں کی طرف بڑھ گیا جن میں ہلکی ہلکی سفیدی چمکنے لگی تھی۔ دل ایک بار آہستگی سے ڈوبنے لگا۔ زندگی کتنی کم رہ گئی ہے مجھے شدت سے احساس ہوا۔

فلائٹ تین گھنٹے لیٹ تھی۔ میں نے سامنے رن وے کو خالی خالی سا دیکھا۔ تین گھنٹے بعد یہاں کتنی چہل پہل ہو گی۔ کئی لوگ یہاں آئیں گے، کئی یہاں سے چلے جائیں گے اور پھر میں بھی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ واپس اپنے وطن، اپنے گھر، لمبے عرصے کے لیے جی چاہا کہ ٹیکسی لے کر پورے لندن کا چکر لگاؤں۔ تین گھنٹے بہت طویل وقت ہے مگر آج تو مجھے سارے گزرے ہوئے دن بڑے دکھ سے یاد آ رہے ہیں۔ میں کہیں بھلا کیسے جا سکتا ہوں۔ میں نے ٹھنڈا سانس لے کر آسمان کی طرف دیکھا مگر وہاں بھی بہت اندھیرا تھا۔ رات رن وے پر سرسراتی پھر رہی تھی، چاند کہیں بہت دور کھو گیا تھا۔

"نینا تم کہاں ہو۔" میرا دل ہولے سے ٹوٹا اور درد بہہ نکلا مجھے اپنی آنکھوں میں سمندر ٹھاٹھیں مارتے ہوئے محسوس ہوئے۔

"تم کیا جانو نینا کہ تم نے اپنی زندگی سے جو ایک لمحہ چرا کر مجھے دیا تھا اس سے میں نے کتنی بڑی کامیابی حاصل کر لی ہے۔ تمھیں کیا معلوم کہ میں نے کتنے عرصے میں۔ کتنی مہارت کے ساتھ نازک اور نفیس سے شیشے پر خوبصورت رنگوں سے پینٹ کر کے وہ لمحہ امر کر دیا تھا۔ آج مجھے اس لمحے کے ساتھ اور بھی بہت سی باتیں یاد آ گئی ہیں۔ میں تمھیں زیادہ RESPONSE نہیں دیا کرتا تھا نینا شاید اس لیے کہ مجھے یقین تھا کہ تم مجھے بے انتہا پسند کرتی ہو، دیوانگی اور جنون کی حد تک، یہ سوچ کر کہ ایک لڑکی مجھ پر بری طرح مرتی ہے، میں اس کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتا تھا لیکن پھر بھی تمھیں اپنا کہہ کر مجھے ایک طرح SATISFACTION سی محسوس ہوتی تھی۔

مجھے یاد ہے نینا کہ فرح کا پہلا خط تم نے مجھے آفس میں لا کر دیا تھا۔ یہ خط نجانے کہاں کہاں ٹکریں

کھاتا ہوا میرے ادھورے پتے پر مجھ تک پہنچا تھا۔ میں نے خط پڑھا۔ اس میں صرف اتنا لکھا تھا۔

"سعد جی۔ آپ کی تصویریں، آپ کی پینٹنگز دیکھ کر یوں لگا کہ ایک دن آپ اس دنیا کے بہترین مصور کہلائیں گے۔" خط پڑھ کر میں ہنس دیا تھا۔ تم نے مجھے غور سے دیکھا تھا اور بجھ سی گئی تھیں۔ میں نے گھبرا کر تمھاری طرف دیکھا۔ مجھے تمھاری اداسی اچھی نہیں لگی میں نے فرح نامی لڑکی کا خط تمھاری طرف بڑھا دیا۔ خط پڑھ کر تم بھی ہنس دیں۔

"آپ تو تمھیں میرے علاوہ بھی لوگ پسند کرنے لگے ہیں۔" تم نے تھوڑا سا شاک کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ! نینا اگر میں ایسے خطوط پر توجہ دینے لگا تو جی لیا۔" میں نے بے زاری سے کہا اور ہم دونوں کلاس سے باہر آ گئے۔

پھر ایک روز میں شام کو تھکا تھکا سا گھر لوٹا تھا۔ فوارے کی لہروں کے ساتھ چاند بھی ڈوب اور ابھر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پانی میں چاند آہستہ آہستہ تیرتا پھر رہا ہے۔ میں اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ ٹیبل پر میری ڈاک پڑی تھی۔ ڈاک میں صرف ایک لفافہ تھا۔ اسے کھولا۔ فرح کی تحریر تھی۔

"سعد جی۔ سنا ہے خدا کو اگر سچے دل سے ڈھونڈا جائے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ آپ تو پھر سعد الحسن ہیں آرٹ کار میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے آپ تک پہنچ ہی گئی۔ دراصل مسئلہ صرف اتنا ہے کہ آپ بے پناہ خوبصورت تصویریں بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور مجھے اچھے لگتے ہیں۔ بے شمار دعائیں۔ فرح۔"

"بے وقوف لڑکی۔" میں ہنس دیا۔ "یہ لڑکیاں بھی کتنی احمق ہوتی ہیں۔ خاص طور پر ایسی لڑکیاں جو حساس لوگوں پر مرمٹیں وہ تو پرلے درجے کی احمق ہوتی ہیں۔" میں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ نجانے کیوں یہ مختصر خوبصورت سا خط مجھے اچھا لگا۔

صبح ہی صبح تم نے فون کیا کہ مجھے لینے آ رہی ہو اور پھر تم آ گئیں۔ میں لان میں تمھارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ تم نے بال سمیٹ کر بہت نفاست سے جوڑا بنایا تھا اور تمھارا چہرہ نکھرا ہوا تھا۔

"ہیلو سعد۔" تم کار سے اتر کر میرے پاس آ گئیں۔

"کیا بات ہے نینو۔" میں نے پوچھا۔ جواباً تم ہنس دیں۔ "بہت خوش ہو۔!" میں نے تمھارا چہرہ پھول کی طرح تر و تازہ محسوس کیا۔

"ہوں تو۔!" تم پھر ہنس دیں۔

"کیوں!" میں نے پھر پوچھا۔

"تم جو سامنے ہو۔" تمھارے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ پھیل گئی۔ نارنجی نارنجی سی لپ اسٹک

جھلملانے لگی اور میں ڈر گیا کہ اگر میں نے تمہیں یہ بتا دیا کہ میں اس وقت فرح کے نئے خط کے بارے میں سوچ رہا ہوں تو تم بگڑ جاؤ گی۔

"نینا اب میں ایک ایسی تصویر بنانا چاہتا ہوں جو میری تمام تصویروں کی سرتاج ہو۔ تمہارے ذہن میں کوئی آئیڈیا ہے؟" آفس پہنچ کر میں نے تم سے پوچھا۔

"تمہاری تو ہر تصویر سرتاج ہے۔" ہمیشہ کی طرح تم نے بے مقصد سا جواب دیا۔

"اوہ نینا پریکٹیکل باتیں کیا کرو یہ تو خوابوں کی باتیں ہیں۔ بے فائدہ۔" میں الجھ سا گیا۔ "میں چاہتا ہوں کہ ایک ایسی لڑکی کی تصویر بناؤں جو۔! جو بے انتہا اداس ہو۔" میں نے رک رک کر اپنا تصور واضح کیا۔

"تو۔ ایسا کرو سعد! ایک ایسی لڑکی بنا دو جو گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی ہو اور یہ تو تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔" تم نے اپنے مخصوص ٹھکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں میں یہی تو نہیں چاہتا۔ میں کسی ایسی لڑکی کی تصویر بنانا چاہتا ہوں جس کا چہرہ بالکل سامنے ہو۔ چہرے پر بے حد دھیمی سی مسکراہٹ ہو وہ لڑکی بے انتہا ہجوم میں ہو۔ اس کے لباس کا رنگ بہت شوخ ہو لیکن وہ لڑکی بالکل تنہا بلکہ انتہائی اداس ہو میں یہ کس طرح بناؤں۔ کس طرح؟" میں اپنے ذہن سے ہار کر طرح الجھ گیا۔

"کلب کی کسی ڈانسر کی تصویر بنا لو۔"

"نہیں اولڈ آئیڈیا۔ بالکل نہیں۔" میں نے تجویز رد کر دی۔

"سعد۔! فی الحال اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دو۔ لاشعور خود تمہاری مدد کرے گا۔" تم نے میری الجھن دیکھ کر مشورہ دیا۔

"نینا! یہ اپنی سائیکالوجی مت جھاڑا کرو۔ سمجھیں۔" میں نے تمہیں جھاڑ دیا۔

"اوں۔ اچھا تو سعد۔ او کے تم آئیڈیا سوچو۔" اور تم اپنا بیگ لہراتی ہوئی آفس سے باہر چلی گئیں۔ میں تمہیں بے وقوف لڑکی سمجھتا تھا جسے صرف مجھ سے دلچسپی تھی۔ میرے فن کے معاملے میں تم بالکل کورا تھیں۔

کچھ دنوں بعد مجھے فرح کا خط ملا، لکھا تھا۔

"سعد بی! آج میں گھر والوں سے بری طرح ناراض ہوں۔ وہ لوگ میری منگنی کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آج صبح میں نے امی سے کہہ دیا تھا کہ کالج سے مجھے لینے کے لیے گاڑی مت بھیجیے گا۔ میں خود ہی

آجاؤں گی تو پتا ہے کیا ہوا۔؟ امی نے سچ مچ گاڑی نہیں بھیجی۔ میں بس اسٹاپ پر تقریباً گھنٹا بھر کھڑی رہی۔ سورج میرے سر پر چمک رہا تھا اور میں درختوں کے سائے میں کھڑی پگھلتی رہی پھر جی چاہا کہ آپ اپنی مزدا لے کر آجائیں اور مجھے گھر ڈراپ کر دیں پھر میں بہت اداس ہو گئی اور اب میں گھر والوں سے نہیں بولتی۔ دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا ایک گلاس دودھ پی لیا تھا۔ میرا موڈ سخت آف ہے نجانے یہ بڑے لوگ چاہتے کیا ہیں؟"

اور بھی ایسی ہی بہت سی باتیں فرح نے لکھی تھیں۔ میں خط پڑھ کر ہنس دیا۔ فرح نے اپنا ایڈریس بھی لکھا تھا غالباً وہ جواب چاہتی تھی۔

"اس لڑکی کو مجھ سے اتنی دلچسپی کیوں ہے۔؟" میں نے سوچا۔ اسے میری گاڑی اور رنگ کا بھی پتا ہے اب کہ اس کا شہر میرے شہر سے کتنا دور ہے۔؟ پھر اسے کیسے معلوم ہو گیا۔؟ میں نے اس لڑکی کے بارے میں سوچنا شروع کیا، یہ لڑکی بے وقوف نہیں۔ معصوم ہے، مجھے فرح کے بے ساختہ خط پر پیار آنے لگا۔ کیوں نہ۔؟ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ "کیوں نہ ایک ایسی طالبہ کی تصویر بناؤں جو بس اسٹاپ پر کھڑی بس کا انتظار کر رہی ہو۔ سامنے چلچلاتی ہوئی دھوپ ہو اور وہ لڑکی ہاتھ میں کتابیں لیے اکیلی کھڑی ہو مگر نہیں اس طرح پھر ویرانی اور اکیلا پن لڑکی کے اردگرد ہو گا جب کہ میں چاہتا ہوں اس لڑکی کے اردگرد کوئی بھی ایسی چیز نہ ہو جس سے اداسی جھلکتی ہو۔ لڑکی کے گرد و نواح کا ماحول بے حد خوش گوار اور زندگی سے بھرپور ہو۔ وہ لڑکی بھی مسکرا رہی ہو لیکن اس لڑکی کی روح کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی اداسی تمام ہنگاموں اور ساری ہاؤ ہو کو اپنی لپیٹ میں لے لے اور پھر یوں وہ تصویر بے حد اداس ہو۔ بہت اکیلی بہت اکیلی۔"

"ارے بھئی نینا! کل فرح کا خط آیا تھا۔" اگلے روز شام کے وقت جب ہم کون کھانے گئے تھے تو مجھے یک لخت فرح یاد آگئی میں نے سوچا فرح کے متعلق مجھے تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہیے۔

"فرح! تم چونکیں۔" "کون فرح؟" تمہاری آواز ڈوبی ڈوبی سی تھی۔

"بھئی وہی جس کا خط ایک بار تمہارے سامنے ہی آیا تھا۔" میں نے تمہیں یاد دلانے کی کوشش کی۔

"اوہ۔!" تم نے گہری سانس لی۔ "تمہاری فین۔؟" تم ہنس دیں۔

"ہاں ہاں بڑے مزے کی باتیں لکھی ہیں اس نے۔"

"اچھا تمہیں اچھی لگیں؟" تمہاری آواز ڈوب گئی۔ "خط آفس کے ایڈریس پر لکھا تھا کیا؟" تم نے اپنی آواز کے درد کو چھپانے کی کوشش کی تھی مگر میں نے اسے محسوس کر لیا تھا۔

"ہاں ہاں بالکل آفس کے ایڈریس پر۔" میں نے بمشکل جواب دیا۔

"تو جواب دے دو نا۔" تم نے سامنے سے گزرتی ہوئی کار کو گھورنا شروع کر دیا اور بے حد اداس ہو گئی تھیں۔

"جواب۔؟ کیوں۔؟ میں اس قدر فارغ نہیں ہوں۔؟" میں نے بات کا رخ یکسر بدل دیا۔

"سعد۔! ایک بات کہوں۔ برا مت ماننا۔" تم نے اپنی براؤن آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

"کہو۔"

"سعد۔ خدا کرے تمہارا مستقبل بہت بہت روشن ہو مگر ان روشنیوں میں مجھے مت بھلا دینا۔ رہے ہونا۔"

تم نے آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر بات کی۔

"اوہ نو۔ سلی گرل۔ ہاؤ انو سنٹ یو آر۔" میں نے تمہارا ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھ میں چھپا لیا۔ اس لمحے تم مجھے بہت پیاری لگی تھیں۔

اب فرح کے خوبصورت اور مہکتے ہوئے خط میرے کمرے کی میز پر اکثر دکھائی دیتے تھے۔ فرح بہت اچھی لگنے لگی تھی مگر میں نے اسے کبھی خط کا جواب نہیں دیا تھا شاید اس لیے کہ فرح مجھے بہت پیار کرتی تھی اور جب کسی کو یہ بات کنفرم ہو جائے تو کسی بھی آدمی کے لیے یہ فخر کی بات ہوتی ہے۔ اس روز مجھے فرح کا خط ملا۔

"سعد جی! آج صبح سے نجانے کیوں مجھے آپ کے خط کا بہت شدت سے انتظار تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ کا خط نہیں آئے گا پھر بھی نجانے کیوں، مجھے آپ کے خط کا انتظار تھا۔ میں خود سے خواہ مخواہ الجھتی رہی اور پھر جب پوسٹ مین گزر گیا تو یقین ہو گیا کہ آپ کا خط نہیں آئے گا اگر آپ کو میرے خط برے لگتے ہوں تو بتا دیں۔ میں آئندہ آپ کو تنگ نہیں کروں گی۔ دراصل سعد۔ میرا کوئی دوست نہیں ہے ناجس سے میں اپنی تمام باتیں کہہ سکوں۔ بس یونہی نجانے کیوں ایسا لگتا ہے جیسے آپ میرے بہت پرانے دوست ہوں اگر آپ نے اب بھی جواب نہ دیا تو میں یہ سمجھ لوں گی کہ آپ میرے خطوط کو پڑھنا پسند نہیں کرتے اور میں کبھی بھی خط نہیں لکھوں گی۔ رائٹ؟

فقط فرح

رات کے دو بج رہے تھے۔ میرا جسم تھکن سے چور تھا۔ میں نے قلم اور کاغذ اٹھایا اور فرح کو خط لکھ دیا۔ یہ زندگی کا پہلا خط تھا فرح کے نام خط لکھ کر میں پریشان ہو گیا کہ میں نے کہیں تمہارے ساتھ

والی تو نہیں کر ڈالی۔

صبح میں نے فون کر دیا کہ میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔ تمہارا کالج اور میرا آفس نزدیک تھے۔ ویسے بھی تم میری کزن ہی نہیں منگیتر اور دوست بھی تھیں۔ تمہیں لینے کے لیے نکلا تو راستے میں فرح کے نام خط پوسٹ کر دیا پھر تمہارے ہاں پہنچ گیا۔ اس بار میں نے تم سے فرح کے بارے میں کوئی بات نہیں کی شاید اس لیے کہ فرح کا ذکر بے ضرر نہیں رہا تھا پھر ایسا ہوا کہ میری تصویروں کی نمائش کا وقت قریب آ گیا۔ ان رات بس نمائش کا جنون سر پر سوار ہو گیا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ میری بنائی ہوئی تصویریں اس قدر خوبصورت ہوں، اس قدر انوکھی کہ میرے بعد کوئی دوسرا ویسی عکاسی نہ کر سکے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ تم میرے اس جنون سے بہت کتراتی تھیں۔ میرے اس شوق میں کبھی تم نے دلچسپی نہیں لی تھی جب کہ میں تمہیں اپنے فن سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ رکھتی تھی۔ مجھے خطوں میں داد بھیجتی تھی۔ میرے فن کی باریکیوں پر گہرا اور جامع تبصرہ کرتی تھی۔

"اوہو سعد۔! کیا بورت ہے۔؟" ہر وقت نئی نئی تصویروں کے لیے آئیڈیے۔؟ ایک روز تم نے الجھ کر کہا۔

"نینا۔! یہ میرا شوق ہے۔" میں نے لفظ چبا چبا کر ادا کیے

"کیا مل جائے گا تمہیں۔؟ کیا دے دیں گی یہ تصویریں۔" تم بے زار بے زار سی تھیں۔

"فرح۔! پھر فرح مجھے خط لکھے گی میری حوصلہ افزائی کرے گی اور مجھے ڈھیر سارا سکون ملے گا۔" میرے دل نے اندر ہی اندر ہولے سے تمہارے سوال کا جواب دیا۔ تم مجھے دیکھنے لگی تھیں شاید تمہیں جواب کا انتظار تھا مگر میں خاموش رہا تم مجھے اب اجنبی سی لگنے لگی تھیں۔

"چلو باہر گھوم آئیں۔" تم نے موڈ خوش گوار کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں نینو! تم نے موڈ خراب کر دیا۔ اب نہیں، میں منافقت کا قائل نہیں ہوں۔ ٹھیک۔" میں نے ناراضگی سے کہا۔

"اوکے۔" تم نے ہنس کر کہا اور باہر چلی گئیں۔

پھر میری تصویروں کی نمائش شروع ہو گئی۔ بہت ہجوم تھا۔ لوگوں نے میری بہت تعریف کی، میرے فوٹو چھپے۔ ٹی وی پر میرے پروگرامز ہونے لگے اور ان دنوں فرح نے بہت خوبصورت خط لکھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی راتوں رنگین کھلتے ہوئے پھولوں جیسے مہکتی چھاؤں میں نرم روندیا جیسے خط۔ یوں لگتا تھا جیسے خط کے ہر لفظ، ہر فل اسٹاپ میں بہت سارا سچ چھپا ہے۔ میرے دل کے تہہ خانوں میں سکون کی مہک

پھیلنے لگی۔

مجھے ڈھیروں پبلسٹی ملی۔ باہر کے ممالک سے بہت آفرز آچکی تھیں اور مجھ میں آگے ہی آگے بڑھنے کا جنون روز بروز بڑھتا جا رہا تھا گو میں فرح کو بہت کم جواب دیتا تھا شاید میں اپنی انا اور وقار برقرار رکھنا چاہتا تھا مگر وہ متواتر مجھے خط لکھتی رہی تھی۔ ایک روز مجھے دو خط اکٹھے ملے ایک خط لندن سے آیا تھا دوسرا فرح کا تھا۔ پہلے میں نے فرح کا خط کھولا اس میں لکھا تھا۔

"سعد رات میں لان میں اکیلی پھرتی رہی۔ دُکھن میرے چاروں طرف پنجے گاڑے ہوئے تھی۔ سعد میں بہت اداس ہوں۔ بہت اداس مگر تمہیں کیا؟ یقین کرو سعد! میں ایسی زندگی گزارنے کا تصور ہی نہیں کر سکتی جس میں تم نہ ہوں۔ میں تمہارے بنا جی نہیں سکتی۔ میں تم سے الگ نہیں ہو سکتی۔ میرے ابو اور امی میری شادی کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ سعد۔! اس ہولناک تاریکی اور اس کربناک انگیز جدائی سے۔ مجھے بچالو مجھے اپنے پاس بلا لو مجھے اپنے پاس بلا لو۔ پلیز مجھے خود سے جدا نہ کرو۔

سعد۔! جی چاہ رہا ہے۔ میں بہت روؤں۔ بہت لیکن۔؟ لیکن کیسے۔؟ کس کی بانہوں میں منہ چھپا کر روؤں؟

اجازت فرح

کاغذ کے آخری حصے پر آنسوؤں کے دھبے نمایاں تھے شاید فرح نے اپنے آنچل کے کنارے سے اپنے آنسو صاف کیے ہوں گے۔ میں نے بلا ارادہ اپنے رومال کو دیکھا۔ میرا دل بند ہونے لگا۔ لمحے بھر کے لیے ساری دنیا ٹھہری ہوئی لگنے لگی۔

دوسرا خط لندن سے آیا تھا۔ یہ بہت بڑی آفر تھی۔ بہت بڑی سروس، بہت بڑی کامیابی، میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا لیکن، فرح! میرا دل پھر دکھی ہو گیا۔ بوجھل بوجھل۔ وزنی وزنی۔ ایک ہی تو دوست ملا تھا۔ وفادار، مخلص، بے غرض سچا۔ وہ بھی یوں اچانک..... میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا!

"فرح! بتاؤ۔ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔؟ فرح! تم تو میری ذات میں شامل ہو چکی ہو چکے، میں بھی تو تمہارے بنا نہیں جی سکوں گا۔ تم اگر چلی گئیں تو ایسی اپنایت اور مٹھاس سے بھرپور خط کون لکھے گا۔؟" سناٹا ایک دم میرے ذہن میں گھستا چلا آیا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں سامنے لندن کی سروس کی آفر چمک رہی تھی میں مسکرا دیا۔ اپنی قسمت پر اور پہلی بار نہایت پیار سے خط لکھنے لگا۔

"فرح۔! تمہارا خط پڑھ کر یوں لگا جیسے مجھ سے کوئی بہت قیمتی شے چھن رہی ہے۔ میں تمہارے

جذبات کی واقعی قدر کرتا ہوں۔ زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا ہے کہ تم میری زندگی کا اہم ترین حصہ ہو۔ تمہارے MISS ہونے کا مجھے بھی افسوس رہے گا مگر تم میری بات مانو۔ اچھی لڑکیوں کی طرح والدین کے کہنے پر شادی کرلو۔ میں آج کل میں لندن جا رہا ہوں۔ جانے کب لوٹوں۔ پتا نہیں لوٹوں گا یا نہیں۔ میری طرف سے مبارک باد۔"

"سعد"

یہ خط میں نے فرح کو پورسٹ کر دیا۔ چند روز بعد فون کی گھنٹی بجی میں نے فون اٹھایا دوسری طرف سے مترنم سی آواز ابھری۔ "سعد صاحب ہوں گے؟"

"جی۔۔ بول رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"میں۔۔ میں فرح بول رہی ہوں۔" آواز میں لرزش سی تھی۔

"فرح۔۔؟ فرح۔۔!" انجانی سی خوشی میرے جسم میں دوڑ گئی۔

"آپ۔ واقعی جا رہے ہیں۔" آواز میں کپکپی سی تھی۔

"ہاں۔ ارادہ تو ہے۔" میں نے خوش گواری سے کہا۔

"سعد۔۔ سعد۔!" آواز بھرانے لگی۔ مت جاؤ سعد نہیں جاؤ۔ میں اکیلی رہ جاؤں گی۔ میں مر جاؤں گی۔ دیکھو پلیز مت جاؤ۔" آواز اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ آواز بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

"بہادر بنو۔ بے وقوف نہ بنو۔" میں ہنس دیا۔ "میں پرسوں شام کی فلائٹ سے جا رہا ہوں۔" میں نے آرام سے کہا۔ فون پر کچھ دیر خاموشی رہی۔

"گویا۔ آپ واقعی جا رہے ہیں۔؟" وہ خود پر ضبط کر کے کچھ سوچ کر بولی۔ "میں۔ میں آپ کو ہی کال کرتی آؤں گی۔ آپ کو دیکھنے آؤں گی۔ آخری بار۔" اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنا ٹوٹی پھوٹی روح سمیٹ رہی ہے لیکن اس کی روح بکھری جا رہی تھی۔ "آپ کی زندگی کی وہ شام میری زندگی کی آخری شام ہوگی۔" فرح نے کہا۔ اس کے لفظ زخمی تھے اور باتیں ویران ہو رہی تھیں۔

"فرح! اتنی اداس نہ ہو۔ ہمت کرو۔ تم ایئرپورٹ پر مت آنا میرے ساتھ بہت سے لوگ ہوں گے۔ زیادہ سے زیادہ میں تمہیں ایک آٹوگراف دے سکوں گا اور شاید وہ بھی نہ دے سکوں۔" میں نے فرح کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"سعد! آپ میرا دل توڑے چلے جا رہے ہیں۔" فرح فون پر بری طرح رو دی۔ انتہائی ضبط کے باوجود

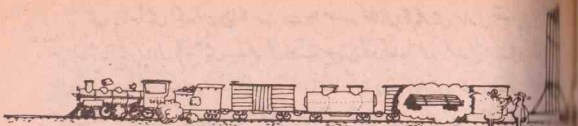

"اچھا۔ اچھا تم آجانا مجھے نشانی تو بتا دو میں نے آج تک تمہیں دیکھا بھی نہیں۔"

"میرے پاس۔ مسٹرڈ ٹویوٹا ہوگی۔" شاید فرح آنسو نگل رہی تھی۔ میری ٹویوٹا کا نمبر ایل' ای' زیڈ 5000 ہوگا۔" اس نے کہا اور فون سسکیوں کے ساتھ بند ہو گیا۔

فرح فون بند کر کے کتنا روئی ہوگی۔ بے وقوف' معصوم سی' کم عقل لڑکی' میں نے فون بند کرتے ہوئے سوچا۔ "سعد! کچھ حاصل کرنے کے لئے قربانی بھی دینا پڑتی ہے۔" میں نے خود کو تسلی دی۔ شاید میں اپنا احساس جرم دبانا چاہ رہا تھا۔ آخر میں نے ایک معصوم اور سچی لڑکی کا صاف و شفاف دل جو توڑ ڈالا تھا میں نے گھبرا کر اس تصویر کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا جو میری شاہکار تصویر ہونے والی تھی' فرح کی آواز مجھے مسلسل بے چین کر رہی تھی۔

"سعد۔! میں تمہیں روکوں گی نہیں۔ مجھے معلوم ہے۔ جانے والوں کو پیچھے سے آواز نہیں دیا جاتا۔" فرح نے فون بند کرتے ہوئے کہا تھا۔ "میں صرف تمہیں دیکھوں گی۔"

"سنیں! فرح۔! تم کون ہو۔؟ میں۔؟ تمہیں جاننے بنا تمہارے لیے کتنا پریشان ہوں۔ تم نے فون کیوں کیا۔؟"

"ہیلو سعد۔!" اچانک تمہاری آواز آئی۔ تم چند کتابیں ہاتھ میں لیے میرے سامنے موجود تھیں۔ تم بہت پریشان لگ رہے ہو۔" تم میرے سامنے والی چیئر پر بیٹھ گئیں۔

"فرح۔؟" میں ہنس دیا۔ "مجھے تو ابھی بہت دور جانا ہے۔ اپنے گھر سے بہت دور۔"

"سعد۔! کل شام ہم دونوں اکٹھے گزاریں گے۔ کہیں باہر چلیں گے۔" تم نے کہا اور میں مان گیا۔

☆

"کیا جانے کیا ہے۔؟ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرے اندر ایک الاؤ دہک رہا ہے۔ میں خود کو بہت بے چین محسوس کرتا ہوں' جب میں تصویریں بناتا ہوں تو مجھے بہت سکون ملتا ہے۔"

"اور یہی تصویریں تو تمہیں مجھ سے دور لیے جا رہی ہیں۔" تم نے دکھ سے کہا جب ہم اگلے روز لانگ ڈرائیو پر جا رہے تھے۔

"نہیں نینا۔! میں ایک دن دنیا کا سب سے بڑا مصور کہلاؤں گا پھر میں ساری تصویریں تمہارے قدموں میں ڈھیر کردوں گا۔" میں نے لحہ لحہ ڈوبتے سورج کو دیکھا۔ "اور تمہاری اسٹڈی کے اگلے سال تو باقی ہیں نا اس کے بعد صرف ایک سال اور انتظار کرنا پڑے گا پھر میں ستاروں سے تمہاری جھولی بھردوں گا۔ تمہیں اپنی دلھن بناؤں گا۔" تم ہنس دیں شاید تم نے میرے لہجے سے منافقت پڑھ لی تھی۔

اگلی شام مجھے یہاں سے بہت دور لے جانے والی تھی۔ آسمان پر ہلکے ہلکے سے بادل چھانے لگے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میرے شہر میں کوئی دور سے آنے والا تھا۔ بہت دور سے، بہت فاصلوں سے خدائے عظیم نے آسمان کو بادلوں سے سجادیا تھا۔ یہ شام بہت خوبصورت تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار زندگی سے بھرپور۔

تم بہت اداس تھیں۔ مجھے ایئرپورٹ پر چھوڑنے بہت سے لوگ آئے تھے۔ شام درختوں کی شاخوں میں الجھ رہی تھی۔ پارکنگ میں بہت سی رنگ برنگی کاروں کے رنگ جھلملا رہے تھے۔ ایئرپورٹ کی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ چاروں طرف اجالا تھا۔ سائے تھے اور روشنیوں کے سبب بھاگتی زندگی کا عجیب سا رنگ تھا۔

"سعد۔! اپنا بہت خیال رکھنا۔" تم نے کار پارک کرتے ہوئے پھر نصیحت کی۔ مجھے دیکھ کر پہلو میری طرف چلی آئیں۔

"سر آٹوگراف۔" انھوں نے کہا۔

"اوہ نو گرلز۔" میں لڑکیوں کو دیکھ کر ہمیشہ کی طرح مسکرایا۔

"فرح۔!" میں بری طرح چونکا، تبھی میری نظر سامنے مسٹر ڈٹویوٹا پر پڑی۔ جس کا نمبر ایل ایل ۵۵۳۲۱ تھا۔ تمہارے علاوہ اور بھی کچھ لوگ میرے ارد گرد تھے۔ تم نے بھی ایک نظر فرح پر ڈالی شاید میری نظروں کا تعاقب سبھی نے کیا تھا۔ میں نے دیکھا۔ میرے سامنے مسٹر ڈٹویوٹا کے پاس گہری کی ساری میں ملبوس سرخ و سفید رنگت والی سرو قد فرح موجود تھی۔

"فرح تم آگئیں۔" میں نے جی ہی جی میں فرح کو مخاطب کیا۔ "تم، تم تو بلا کی خوبصورت ہو۔ ایلی سے بھی زیادہ خوبصورت۔" فرح نے لمبے بال STEPS میں بہت نفاست سے سیٹ کیے تھے ہوا گلی سرخ لپ اسٹک میں ایک ہلکی اور بے نام سی اداس مسکراہٹ لرز رہی تھی۔ فرح میری طرف رہی تھی جیسے میرا سارا وجود آج کی شام اپنی گہری سمندر جیسی آنکھوں میں جذب کرلے گی ہمیشہ میں لاشعوری طور پر آگے بڑھا پھر بوکھلا کر کھڑا ہوگیا۔ فرح تھوڑا سا مسکرائی۔ میں نے دیکھا فرح کی

آنکھیں جیسے روپہلی سمندر میں تیرتی سیاہ آنکھوں میں دنیا جہاں کی اداسی، ویرانی اور بے بسی تھی۔

ارد گرد ہنگامہ تھا۔ بہت سے لوگ جمع تھے لیکن مجھے وہ بے حد اکیلی۔ بے حد تنہا محسوس ہوئی یوں لگا جیسے فرح کا دل ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو رہا ہے اس کی روح کرچی کرچی ہو رہی ہے اور مجھے میری مل گئی تھی۔ وہ تصویر جس کی مجھے برسوں سے تلاش تھی۔

میری تصویر تم تھیں۔ فرح۔!" درد کی ایک ٹیس میرے دل سے اٹھی میں تڑپ کر رہ گیا۔ میرا یہ لمحہ یہیں رک جائے گزر نہ پائے مگر وہ لحہ تیزی سے گزر گیا۔ میں فرح کے سامنے سے ہٹا تھا۔ فرح نے مجھے آواز نہیں دی۔ مجھے روکا نہیں۔ بس خاموشی سے دیکھتی رہی۔ اس کی خاموشی بھی۔ "سعد مت جاؤ۔ رک جاؤ۔" میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ فرح ابھی بھی دیکھ رہی تھی۔ میرا جی چاہا میں رک جاؤں، ٹھہر جاؤں۔ "سعد۔ میں تمہیں روکوں گی نہیں۔ علم ہے جانے والوں کو پیچھے سے آواز نہیں دیا کرتے۔" مجھے فرح کی آواز اپنے کانوں میں آتی ہوئی۔ فرح کی آنکھیں مسلسل میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ ایک مقناطیس مجھے واپس کھینچ رہا تھا مگر آگے بڑھ گیا۔ جنگلے کے قریب پہنچ کر میں نے مڑ کر دیکھا۔ فرح وہاں نہیں تھی۔ شاید وہ خاموشی سے جا چکی تھی۔ آنے والے ہر لمحے کے لیے۔ پھر وہ شام میری ساری زندگی میں پھیل گئی۔ میں نے اس شام کے لیے اپنا فن صرف کردیا۔ ایک تصویر بنائی پھر مٹادی۔ دوسری بنائی مگر مطمئن نہ ہوا پھر منظر کو کینوس پر بناتا رہا مٹاتا رہا اور چار سال کی مسلسل کوشش کے بعد میں اس ہجوم میں گھری اداس لڑکی کی تصویر بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس تصویر نے یورپ کی آرٹ گیلریوں میں تہلکہ مچادیا پھر کے اخبارات نے اسے بہترین تصویر قرار دیا اور مجھے بہترین مصور۔ میں نے فن کی دنیا میں وہ جگہ پالی جس کی تمنا مجھے برسوں سے تھی۔

تم بھی مجھے اسی مقام پر دیکھنے کی آرزو مند تھیں اور شاید فرح بھی یہی چاہتی تھی۔ اس تصویر کو مکمل کرنے میں میں اتنا منہمک ہوا کہ تمہیں خط لکھ ہی نہ سکا۔ تمہارے خط آتے رہے پھر بند ہوگئے اور میں نے فن کی دنیا میں اپنی منزل پالی تو تمہاری اور فرح دونوں کی یاد جاگ اٹھی۔ فرح جانے کہاں تھی مگر میں تمہیں خط لکھ سکتا تھا۔ بھیگتے ہوئے قلم اٹھایا۔ اپنی کامیابیوں کی داستانیں رقم کیں اور تصویر کا جذبہ جگایا اور ایک ماہ بعد خلاف توقع تمہارا جواب آگیا۔ میں نے بے تابی سے لفافہ چاک کیا اور لکھا تھا۔

سعد جی! یہ میری دلی تمنا تھی کہ تم دنیا کے مشہور مصور بنو۔ تمہاری تصاویر بین الاقوامی شہرت کی

حامل ہوں۔ تمہارے فن کی بلندی کے سامنے ہزاروں مصوروں کے قد چھوٹے ہو جائیں' اس اس محبت کی دیوانگی کہہ لو جو مجھے تم سے تھی مگر تم اپنے فن کے بارے میں سنجیدہ نہیں تھے۔ میں طرح سے تمہیں احساس دلانا چاہا اور اس دوران مجھے احساس ہوا کہ یہ مصور لوگ تخیل پرستی اہمیت دیتے ہیں۔ میں نے فرح کا روپ دھارا۔ یعنی فرح نامی لڑکی کے نام سے تمہیں خط لکھا۔ شاہکار تصویر کا اکثر تذکرہ کرتے تھے۔ ایک ایسی لڑکی کی تصویر جو ہجوم میں تنہا ہو۔ میں نے خطوط کے ذریعے ایسے بہت سارے مناظر کا تذکرہ کیا مگر تم انھیں قبول نہ کر سکے۔ ان دنوں جانے والے تھے تب میں نے آخری کوشش کی اپنی ایک قریبی سہیلی کو جو میری اور تمہاری آشنا تھی اس اداس لڑکی کا کردار ادا کرنے کے لیے تیار کیا۔ تم نہیں جانتے اس نے کتنی مشکل پارٹ ادا کرنے کی ہامی بھری تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس کے منگیتر نے اسے ایئرپورٹ پر قیامت آجائے گی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ میرے بار بار ہاتھ جوڑنے پر راضی ہوئی اور میرا انتخاب غلط نہیں تھا۔ اس نے واقعی بے مثال اداکاری کی۔ ایک تنہا اور اداس کے جذبات بڑی خوبصورتی سے اپنے اوپر طاری کیے۔ آخر اپنے کالج میں بہترین اداکاری پر انعامات بھی تو لے چکی تھی۔ تمہاری نظروں نے اس نظارے کو اپنے لیے محفوظ کر لیا۔ اس لمحے بنانے کے لیے تم نے اپنے فن کی پوری قوت صرف کر دی سو یہی میری خواہش تھی۔ تم نے اس تصویر ذریعے اپنا مقام پا لیا مگر اس منزل کو پانے کے بعد تم مجھے ہار گئے۔ ڈیڈی نے میری شادی کر دی۔ تک تمہاری سرد مہری کے سہارے اپنی بیٹی کو بٹھائے رکھتے۔ "فرح" کی شادی تو تمہارے جانے کے بعد ہی ہو گئی تھی۔ تمہارا خط ڈیڈی نے مجھے لا کر دیا تو یقین جانو میری سانس رک سی گئی۔ کامیابیوں کی خبریں میں نے پڑھ لی تھیں مگر میرے لیے یہ کتنے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ اس عظیم تر بنانے میں میری کوشش بھی شامل ہے۔ خدا کرے تم اور بلند اور بلند ہوتے جاؤ۔"

تمہاری خیر خواہ

اور آج مدتوں بعد میں واپس لوٹ رہا ہوں۔ تمہارا دیا ہوا تحفہ تمہاری نذر کرنے۔ آخر یہ تمہاری امانت ہی تو تھی۔ اس میں تم فرح کی صورت میں موجود ہو اور تمہاری اس عظمت و عبقریت تصویر سے بڑا اور کیا نذرانہ دیا جا سکتا ہے۔

سیماب کے دو خوب صورت ایوارڈ یافتہ افسانے

جب سے اُس نے برش سنبھالا تھا وہ تنہا تھی
اور ایک مہربان سایہ، جو راتوں کو بیٹے پاؤں آتا اور...
یتیم خانے کی سخت گیر نگراں کے مظالم کی شکار لڑکی کا فسانہ۔

سیماب

مہربان سایہ

فاطمی نے ہوش سنبھالا تو اس کے اردگرد ایک خلا تھا۔ گہرا' وسیع اور ہولناک۔ چاروں طرف ا
تھی جس کے دوسری طرف اسے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ ا
ماضی کیا تھا؟ اس کا مستقبل کیا ہوگا؟؟؟

اسے کچھ علم نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ ایک یتیم خانے کے ہوسٹل میں تھی جہاں اس جیسی
شمار لڑکیاں تھیں۔ اسی کی طرح انجان' بے آسرا' سہمی ہوئی اور وحشت زدہ۔ لڑکیوں کی بھیڑ میں
ہوئے ہر ایک اپنی ذات میں تنہا اور اکیلی۔ بڑی بڑی محروم آنکھوں والی یہ سب لڑکیاں لاوارث تھیں
کا دنیا میں کوئی نہیں تھا سوائے خدا کے۔

یا پھر وہی ایک دوسرے کی سب کچھ تھیں۔

لیکن فاطمی دیکھتی کہ وہاں ہر لڑکی اپنی ذات میں قید ہے صرف اپنے لیے سوچتی ہے۔ کسی کو کسی
ہمدردی نہیں۔ بڑی لڑکیاں چھوٹی لڑکیوں پر زیادتی کرتی ہیں اور وہ اپنے سے چھوٹی لڑکیوں پر اور فاطمی
سا معصوم ذہن کبھی کبھی سوچ سوچ کے تھکنے لگتا۔ اس نے "ماں" کا لفظ بارہا سنا اور پڑھا تھا ہر رات
پر لیٹنے کے بعد اس مہربان وجود کا تصور بھی کیا تھا لیکن وہ اس لفظ کی حقیقت سے نا آشنا تھی۔

ماں کے نرم و گداز وجود سے لپٹ کے سونے کی فطری خواہش اس کے دل میں اندر سے کہیں
اور دم توڑ جاتی۔ وہ اپنے بے جان بازو تکیے پر رکھے بھیگی آنکھوں کے ساتھ ہر رات سونے سے
کے بارے میں سوچا کرتی۔ ماں کے مہربان وجود اور خدائے رحیم و کریم کے متعلق۔ مہربان خدا
ہوتا ہے جن کی ماں نہیں ہوتی جن کا کوئی بھی نہیں ہوتا۔

فاطمی ہر روز پڑھتی "بسم اللہ الرحمن الرحیم" شروع کرتی ہوں میں اللہ کے نام سے جو بڑا مہر
نہایت رحم کرنے والا ہے مگر اسے ابھی خدا کے وجود کا احساس نہیں ہوا تھا' نہ اس کے رحم اور
مہربانی کا۔ ہاں وہ اکثر خواب میں ایک سائے کو دیکھتی تھی جو رات کی خاموشی میں بہت مدہم اور
قدموں سے اس کے بستر کی طرف بڑھتا دکھائی دیتا۔ نزدیک آکر وہ رک جاتا اور پھر فاطمی کو اپنے
اس کے نرم ہاتھوں کا ملائم لمس محسوس ہوتا۔ اس کے بعد وہ اپنا مہربان چہرہ جھکا کے اس کی پیشانی
ٹھنڈے ہونٹ رکھ دیتا۔ فاطمی کا جی چاہتا وہ بے ساختہ بازو اٹھا کے اس مہربان سائے کو اپنی گرفت
لے اور کبھی نہ جانے دے لیکن وہ کبھی ایسا نہ کر پائی۔ اس کے بازو بے جان سے بستر پر پڑے رہتے
سایہ غائب ہو جاتا۔ فاطمی کوشش کرتی کہ اسے پکارے لیکن وہ ناکام رہتی پھر اس کوشش میں
آنکھ کھل جاتی تب وہ اپنے اردگرد وہی مانوس خلا پاتی۔۔۔ گہرا' وسیع ہولناک اور تاریک۔

ان کی نگراں ایک تند خو' بدمزاج اور چڑچڑی عورت تھی جس کا نام میڈم شجاع تھا۔ ہوسٹل کا ہر کام
نگرانی میں ہوتا۔ ان کی اجازت کے بغیر کوئی اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کسی بھی لڑکی کی
غلطی پر وہ انھیں بری طرح پیٹ کے رکھ دیتی۔ ان کے نرم رخساروں پر تھپڑ مارتی' بال کھینچتی۔
کی پشت پر' کہنیوں اور گھٹنوں پر لکڑی کی چھڑی مارتی تو انھیں اپنے آنسو ضبط کرنے مشکل
ہو جاتے۔

ضدی اور سرکش لڑکیاں اس کے عتاب کا زیادہ شکار ہوتیں۔ اسے کسی پر بہت ہی طیش آتا تو وہ بال
دیوار سے اس کا سر ٹکراتی۔ اس سزا سے لڑکیوں کی جان جاتی تھی۔

ان کی مختلف ٹیچرز تھیں جو انھیں کڑھائی' سلائی' پکوان' کھیل اور تعلیم کے دوسرے مضامین کی
کراتیں۔ ان کے ہوسٹل کی حالت عام یتیم خانوں سے بدرجہا بہتر تھی اس لیے کہ انھوں نے سنا
ہوسٹل ایک ویلفیئر سوسائٹی کے تحت کسی بڑے آدمی نے قائم کیا تھا اور ابھی تک اسی کی سرپرستی میں
آدمی جس کا نام خواجہ غلام حسن خان تھا بہت کم موقعوں پر ہوسٹل میں دکھائی دیتا کسی خاص دن کی
یا ہوسٹل میں ہونے والی کسی خوشی پر جب ہوسٹل کی کوئی لڑکی بیاہی جاتی۔ ایسے وقت ہوسٹل میں
سے صفائی ستھرائی ہوتی اور ہر شخص اپنی جگہ چاق و چوبند دکھائی دیتا۔ خواجہ سارے ہوسٹل کا
کرتے۔

خواجہ صاحب کی شخصیت بڑی بارعب اور بردبار تھی۔ انھیں دیکھ کر ہر لڑکی مرعوب ہو جاتی اور
اٹھا تک بھول جاتی۔ وہ کسی لڑکی سے کوئی سوال کرتے تو وہ اپنی ٹیچرز کے سکھائے ہوئے جواب کسی
کی طرح دے کر خاموش ہو جاتی۔ ان کی ٹیچرز میں سے کوئی ایسی نہیں تھی جسے لڑکیوں سے
ہو۔ وہ سب ہی انھیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتیں۔ بات بات پر گھرکنا' ڈانٹنا' پھٹکارنا' پیٹنا اور پھر
شکایت کرنا ان کا معمول تھا۔ ساری لڑکیاں اپنی ٹیچرز سے نفرت کرتی تھیں۔ بعض
آور سرکش لڑکیاں' جو باغیانہ خیالات رکھتی تھیں' جان بوجھ کے انھیں تنگ کرتیں اور ایسی
سزاؤں کا نشانہ بنتیں' ان میں فاطمی کی سہیلی گلشن بھی شامل تھی جو کسی بھی طریقے سے ٹیچرز کو
کر مسرت محسوس کرتی تھی۔ انھیں جھنجلایا ہوا دیکھ کے اس کے چہرے کی خوشی دیکھنے کے
والی تھی۔ خواہ اس کے بعد اسے سزا بھگتنا پڑتی۔

والی اسے سمجھاتی کہ آخر ان باتوں کا فائدہ کیا ہے۔ وہ کیوں ایسا کرتی ہے اور جان بوجھ کے مار کھاتی
وہ اس کے کہتی۔

"فاطمی ہم ان کا کچھ بھی تو نہیں بگاڑ سکتے سوائے اس کے کہ انھیں کسی طرح تنگ کر سکیں اور فاطمی وہ بڑے سرور سے کہتی۔ "تو نہیں جانتی انھیں ستا کر اور چڑا کر مجھے کیسا لطف آتا ہے۔"

فاطمی اس کا یہ فلسفہ سمجھ نہ پاتی۔ گلشن کو مار کھاتے دیکھ کے اسے ہمدردی محسوس ہوتی اور نفرت کا احساس بھی ہوتا۔ وہ سوچتی۔ کیا ان عورتوں کے اندر مامتا کا وجود نہیں ہے۔ کیا ان میں سے کوئی عورت ماں نہیں ہوگی۔ لیکن پھر ایک روز ان پر یہ عجیب انکشاف ہوا کہ ان میں سے زیادہ تر میڈم شجاع سمیت' بے اولاد یا کنواری ہیں۔ اسے خدا کی بے انصافی کا احساس ہونے لگا کہ شاید ان میں سے کسی کی اولاد ہوتی تو وہ محبت سے محروم اور بے سہارا لڑکیاں بھی ان کی مامتا سے سیراب ہو جاتیں مگر وہ کھچڑی بالوں' جھریوں دار رخساروں اور پختہ چہروں والی ساری عورتیں اندر سے بنجر تھیں اور قدرت بدلہ ان یتیم لڑکیوں سے لے رہی تھیں۔

کبھی کبھی فاطمی کو اپنی ماں سمیت ان ساری ماؤں سے شدید نفرت محسوس ہوتی جنھوں نے اپنی اولاد یوں بے آسرا دنیا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

فاطمی نے گلشن اور اس کے گروپ کی لڑکیوں کے ساتھ کبھی حصہ نہیں لیا تھا اس لیے کہ اس کی فطرت میں ضد اور سرکشی نہیں تھی لیکن جب کبھی کبھی کسی معمولی بات پر یا بے خطا اسے کسی ٹیچر یا میڈم کی مار سہنی پڑتی تو اس کے اندر سے بڑے باغیانہ خیالات اٹھتے۔ اس کا جی چاہتا وہ ہوسٹل کی مضبوط دیواروں کو توڑ کے کہیں بھاگ جائے۔ اتنی دور کہ کوئی میڈم شجاع اس کا سراغ نہ پا سکے لیکن ایسا جانے کے جرم پر ملنے والی سزا کے تصور سے ہی فاطمی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

ان کی ٹیچرز اکثر ماضی میں کسی لڑکی کے بھاگ جانے کا قصہ سنایا کرتی تھیں جس کے پکڑے جانے کے بعد میڈم شجاع نے اسے کمرے کی چھت کے ساتھ الٹا لٹکا دیا تھا۔ سارے بدن کے بوجھ سے اس کی زبان حلق سے باہر نکل آئی تھی اور تکلیف کی شدت اور زبان کے کھنچاؤ سے اس کی ٹھوڑی لہولہان بھر گئی تھی۔ اس تصور کے ساتھ ہی لڑکیوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

مگر گلشن اور اس کی ساتھی لڑکیوں کا کہنا تھا کہ یہ سب انھیں دہشت زدہ کرنے کے لیے من گھڑت قصے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ کبھی دل میں بھاگ جانے کا خیال نہیں لائی تھی اور مار کھانے کے بعد اپنی چوٹوں کو آپ ہی سہلاتے ہوئے فاطمی بھی اپنے باغیانہ خیالات رد کرتی جاتی اسی لیے کہ وہ جانتی تھی آزادی ان کے نصیب میں ہوگی تو آپ ہی مل جائے گی۔

ساری لڑکیاں اسی آس پر زندہ تھیں کہ شاید کوئی بے اولاد جوڑا انھیں اپنے گھر کی روشنی بنا لے

یا پھر ان کے نصیب کا آدمی انھیں بیاہ کر لے جائے۔

الگزیمینیشن کے ہوسٹل میں بے اولاد جوڑے آیا کرتے تھے۔ اس وقت میڈم شجاع ساری کمسن لڑکیوں کی قطار بنا دیتی تھیں۔ جب وہ میاں بیوی ایک ایک کا چہرہ دیکھا کرتے تو ان کے دل اپنے سینوں میں بے طرح دھڑکا کرتے جب کوئی خوش نصیب لڑکی منتخب ہو جاتی تو اس کا چہرہ اندرونی خوشی سے کھل اٹھتا اور باقی لڑکیوں کے سرمایوسی اور دکھ سے جھک جاتے۔

اب کسی لڑکی کا بیاہ ہوتا تو وہ سب خوش ہونے کے باوجود اندر سے اداس ہو جاتیں کہ جانے ان کے نصیب میں یہ لمحہ کب آئے گا یا آئے گا بھی کہ نہیں لیکن یہ خوش گوار لمحے ہمیشہ انھی لڑکیوں کی زندگی میں آتے جو صورت شکل کے لحاظ سے بہتر یا حسین ہوتیں۔ ہر بے اولاد خوبصورت بچے کو گود لینا چاہتا اور بدصورت لڑکیوں کے رشتے مقررہ عمر گزر جانے کے بعد بھی دیر تک نہ آتے جب کہ اچھی صورت کی لڑکیاں شادی کی عمر ہونے سے پہلے منتخب کر لی جاتیں۔

فاطمی کے نصیب میں نہیں تھا کہ کوئی مہربان جوڑا اسے گود لیتا اس لیے وہ اس وقت کے تصور کے باوجود بھی رہی تھی جب اس کے نصیب کا آدمی اسے بیاہنے آئے گا مگر وہ ڈرتی تھی کہ ایک زنداں سے نکل کر وہ کہیں دوسرے زنداں میں قید نہ ہو جائے۔

اس نے مردوں کے ظلم و جبر کی داستانیں بھی سنی تھیں اور ساس نندوں کے قصے بھی' اسے کسی ایسے ہمدرد کی تلاش تھی جو اس کی زندگی کی تمام تر محرومی اور تشنگی کو سیراب کر دے مگر ایسا وجود اسے دور دور تک دکھائی نہیں دیتا تھا سوائے اپنے تصور اور اپنے اس خواب کے جب وہ اپنی چوٹوں کو سہلاتے ہوئے نیند کی آغوش میں گم ہو جاتی تو وہ مہربان سایہ اپنے مخصوص وجود کے ساتھ اسے اپنی جانب بڑھتا ہوا دیکھتا۔ اس کے بستر کے نزدیک بیٹھ جاتا پھر جھک کر اپنی نرم و گداز انگلیوں سے اس کی چوٹوں کو سہلاتا۔ دھیرے دھیرے بے حد نرمی اور ملائمت سے اس کا درد اپنے پوروں میں جذب کرتا رہتا اور فاطمی پرسکون اور سرشار سی خاموش لیٹی رہتی۔ اسے سکون بخش کے مہربان سایہ اٹھ جاتا اور اپنا چہرہ جھکا کے اس کی پیشانی پر اپنے ٹھنڈے ہونٹ رکھ دیتا۔ اس کے بعد وہ واپس لوٹ جاتا۔ فاطمی اسے پکارنا چاہتی مگر پکار نہ پاتی۔ اس کوشش میں فاطمی کی آنکھ کھل جاتی اور پھر اس کے گرد وہی مانوس خلا ہوتا' گہرا وسیع' سیاہ اور تاریک۔

ایک بے حد اجلی صبح جب نرم چمکیلی دھوپ چاروں طرف پھیل رہی تھی اور لڑکیاں قطار در قطار اسمبلی گراؤنڈ میں جمع تھیں' میڈم شجاع نے اپنی منحوس کھردری آواز میں انھیں ایک اطلاع دی۔

ایک نئے ٹیچر کے آنے کی۔ انھوں نے اپنی ضرورت سے زیادہ بڑی، خوفناک آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"آج سے تم لوگوں کو قرات سکھانے کے لیے ایک استاد آئے گا۔ خبردار اگر کوئی لڑکی ادھر سے ادھر ہوئی یا کسی نے نگاہ اٹھانے کی جرات کی۔ ایک ذرا سی غلطی پر میں کھال کھنچوانے سے بھی دریغ نہیں کروں گی۔"

سب کے چہرے خوف سے زرد پڑ گئے۔ کھال کھنچوانے کا تصور انھیں ہمیشہ خون آلود زبان کے ساتھ الٹا لٹکا ہوا دکھائی دیتا اور آج صبح ہی صبح اس تصور نے انھیں دہشت زدہ کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ عالیہ کلاس میں ضدی اور سرکش لڑکیوں کا وہ گروپ بھی دوپٹوں سے سر ڈھانکے اور نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔ میڈم شجاع کے حکم سے سرتابی جن کا شیوہ تھا مگر فاطی کی آنکھیں بار بار دروازے کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ بالکل غیر ارادی طور پر اور ہوسٹل میں آنے والے ہر فرد کے لیے ہمیشہ فاطی ایسی ہی بے چینی محسوس کرتی تھی۔ کسی بے اولاد جوڑے کے آنے کی اطلاع ہو یا کسی مہمان کی، فاطی ہمیشہ یہی سوچا کرتی کہ خبر اس کا کوئی نجات دہندہ آنے والا ہو۔

پہلی بار خواجہ غلام حسن خان کے آنے پر جب وہ بے تاب ہو کر دوسری منزل کی بالکونی والی پر چڑھ گئی تھی تو میڈم شجاع نے چھڑیوں سے اس کی سخت پٹائی کی تھی۔

لیکن آج وہ پھر اس کی دھمکی بھول رہی تھی۔

اس کی آنکھیں بدستور دروازے کی جانب اٹھی ہوئی تھیں کہ وہ سبک روی سے چلتا ہوا اندر آیا۔ ساری لڑکیوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتا وہ بلیک بورڈ کے نزدیک رکھے ڈیسک کے پاس ٹھہر گیا مگر فاطی کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ٹھہرا نہیں ہو، اپنی دلفریب چال کے ساتھ اس کی آنکھوں کے راستے دل میں اتر آیا ہو۔ وہ اپنے سینے میں اندر کہیں ایک عجیب سی کسک، ایک میٹھا سا درد محسوس کر رہی تھی۔ اس کے اجلے چہرے اور کالی آنکھوں میں مہربانی کا ایک نرم احساس تھا اور ہونٹوں پر بڑی دلفریب سی مسکان جو صرف فاطی کے لیے تھی اس لیے کہ فاطی کے سوا کسی کی آنکھیں اسے نہیں دیکھ رہی تھیں۔ وہ سب دوپٹوں سے سر ڈھانپے نظریں جھکائے چپ چاپ کھڑی تھیں۔

"بیٹھیے۔" اس کی دھیمی مگر گمبھیر آواز ابھری۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ بس ان کے بیٹھنے کی سرسراہٹ کمرے میں پھیل رہی تھی پھر وہ دوبارہ گویا ہوا۔

"میرا نام جنید انصر ہے۔" اس نے اپنا تعارف کرایا۔ "آج سے میں آپ کو قرات سکھاؤں گا۔"

لڑکیوں کی نظریں جھکی رہیں مگر فاطی اب بھی اس کے ہلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ رہی تھی۔

جنید انصر نے سب سے پہلے 'سورہ فاتحہ' کو قرات کے ساتھ پڑھایا۔ سب سے دہرانے کے لیے کہا۔ ایک بار، دو بار اور فاطی کا جی چاہا وہ ساری زندگی یونہی کھڑا پڑھاتا رہے اور وہ پڑھتی رہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو پالنے والا ہے تمام جہانوں کا۔

اسے خدا کے وجود کا احساس ہو رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار کسی کی آنکھوں سے اٹھتی ہوئی مہربانی کی نرم لو دل پر محسوس ہو رہی تھی۔ سفید شلوار اور کالی شیروانی میں جنید انصر کا سراپا اپنی خوبصورت گمبھیر آواز کے ساتھ اس کے حواس پر چھایا جا رہا تھا۔ کوئی نرم سا مہربان احساس اٹھ کے فاطی کے گرد احاطہ کر رہا تھا۔ جانے اسے کیوں لگا کہ جیسے اس کے خوابوں میں آنے والا وہ مہربان سایہ حقیقت بن کے جنید انصر کے وجود میں ڈھل گیا ہو۔

اور پھر وہ ہر روز آنے لگا۔ انتہائی توجہ اور نرمی سے وہ انھیں سمجھاتا، سیکھنے اور پڑھنے میں مدد دیتا اور کسی کی شکایت میڈم شجاع تک نہ پہنچاتا۔ لڑکیاں اس کے رویے اور سلوک سے بے حد متاثر تھیں اور اس کا احترام کرتی تھیں۔ انھیں قرات سکھانے کے ساتھ وہ ملک کے مشہور قاری عبید الطہر کا بیٹا بھی تھا۔ اس کے علاوہ وہ دوسرے اسکولوں اور کالجوں میں بھی لڑکیوں کو قرات سکھاتا تھا۔

لڑکیاں میڈم شجاع کی ہدایت کے مطابق دوپٹے سروں پر لیے نظریں جھکائے جنید انصر کی کلاس اٹینڈ کرتی لیکن فاطی باوجود کوشش کے اپنی نظریہ قابو نہ رکھ پاتی۔ وہ ہمیشہ دیوار کے ساتھ کونے والی میز پر بیٹھا کرتی، کسی کی خواہ نظر نہ پڑے مگر گفتگو سے اس کا کھویا کھویا انداز پوشیدہ نہ رہ سکا۔ ایک روز اس نے پیچھے فاطی کے کان میں سرگوشی کی۔

"فاطی! صبر، سے اگر میڈم شجاع نے تیری نظروں کو تاک لیا تو بس۔"

وہ ٹھٹک گئی پھر عجیب چھیلی چھیلی سی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھنے لگی۔

"...پسے مجھے خوشی ہے اگر تو۔" بغاوت۔" گفتگو آہستہ آہستہ ہنسنے لگی لیکن اس کے جملے کا آخری لفظ سن کے فاطی کانپ گئی۔

"تو خدا کے لیے ایسی خوفناک باتیں نہ کیا کر۔" اس نے بے بسی سے کہا۔ "ہمارے لیے ایسا سوچنا بھی جرم ہے۔"

مگر سوچوں پہ کس نے پابندی لگائی ہے۔ جنید کسی لمحے اس کے وجود سے الگ نہ ہوتا۔ اس کا مہربان سایہ جہاں اس کی ہر سانس میں بسنے لگا تھا مگر جانے کیوں پچھلے چند دنوں سے اس کے خواب والا مہربان سایہ

اس سے روٹھ گیا تھا۔ اسے یوں لگتا جیسے جنید انصر کے وجود نے اس کے دل میں آکر اسے ناراض کر دیا تھا۔ اس کا جی چاہتا وہ کوئی خطا کرے اور پھر سزا بھگتے تاکہ وہ مہربان خواب اسے پھر دکھائی دے۔ ایسا ہوتا تھا جب بھی اسے ٹیچرز کی مار سہنی پڑتی تھی' وہ مہربان سایہ اسے خواب میں دکھائی دیتا تھا۔

اور پھر خود بخود وہ غلطی اس سے ہو گئی۔ جنید انصر کی کلاس تھی۔ میڈم شجاع کی سختی سے ممانعت تھی کہ انصر سے کوئی ذاتی قسم کا سوال نہ کیا جائے اول تو ان سہمی ہوئی وحشت زدہ لڑکیوں سے انھیں امید نہ تھی مگر وہ ضدی اور سرکش لڑکیاں جو ہمیشہ ان کے حکم سے بغاوت کرتی تھیں ان سے یہ بعید نہ تھا۔ اس روز جنید انصر انھیں کچھ معلومات بہم پہنچا رہا تھا۔

"آپ کی ٹریننگ مکمل ہو جائے تو ملک میں ہونے والے قرات خوانی کے مقابلوں میں بھی آپ حصہ لے سکتی ہیں اس لیے توجہ اور لگن میں ڈوب کر سیکھیں۔"

اس کی مخصوص' مدھم اور گمبھیر آواز فاطمی کے حواس پر چھا رہی تھی کہ یکایک ٹھٹک کے اس نے سوچا۔ "تو کیا ایک روز اسے واپس لوٹنا ہے!" اس خیال کے ساتھ ہی اس کا دل ڈوبنے لگا۔

جنید کلاس لے کر واپس جا رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے جا رہا ہو۔ وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی۔

"سر۔ آپ جا رہے ہیں۔ ہمیشہ کے لیے۔" اس کا لہجہ عجیب کھویا کھویا سا تھا۔

جنید انصر نے چونک کر اسے دیکھا' بڑی حیرت سے' جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو کہ یہ الفاظ واقعی اس معصوم لڑکی کے خاموش ہونٹوں سے ادا ہوئے ہیں۔ چند لمحے وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر اس کے لبوں پہ بڑی دلفریب سے مسکراہٹ اتر آئی۔ فاطمی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اسے یہ الفاظ ادا نہیں کرنے چاہیے تھے۔

"سر! آپ ٹریننگ مکمل ہونے کے بعد چلے جائیں گے۔" اس نے سر جھکا کے رکتے ہوئے کہا۔

قدم آگے بڑھ آیا اور مسکراتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

"میں' آپ یا کوئی بھی' اگر آتا ہے تو اسے جانا بھی ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے بی بی دنیا کا نظام ایسا ہی قائم ہے۔ لوگ آتے ہیں اور آگے آنے والوں کے لیے جگہ چھوڑ جاتے ہیں۔"

ساری لڑکیاں چہرے اٹھائے فاطمی کو دیکھ رہی تھیں جیسے اس سے بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہو اور نہ جانے یہ خبر کیسے میڈم شجاع تک پہنچ گئی۔

رات کو جب وہ بستر پر لیٹی تو اس کے بدن کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ میڈم شجاع نے اسے بڑی مار ماری

تھی لیکن اپنے بستر پر اوندھی لیٹی وہ مسرور سی آنکھیں بند کیے نیند کی منتظر تھی۔ اسے یقین تھا آج وہ مہربان سایہ ضرور آئے گا اور پھر یہی ہوا۔ رات کو اس نے خواب میں دیکھا۔ وہ سایہ یکایک فضا میں نمودار ہوا اور اپنی مخصوص مدھم چال کے ساتھ بے آواز قدموں سے اس کے بستر کے نزدیک آرکا۔ اگلے ہی لمحے اسے اپنے بہت نزدیک اس کی موجودگی کا احساس ہوا پھر وہ جھکا اور اپنی نرم و گداز انگلیوں سے اس کی چوٹوں کو سہلانے گا۔ اس کے ہاتھوں' بازوؤں' رخساروں اور اس کی پشت کو' اس کے بعد اس نے فاطمی کی پیشانی کو الوداعی بوسہ دیا اور واپس لوٹ گیا۔ وہ اسے پکارنا چاہتی تھی لیکن اس کو ششش میں ہمیشہ کی طرح آنکھ کھل گئی۔ چاروں طرف تاریکی تھی لیکن آج وہ بڑی طمانیت سی محسوس کر رہی تھی۔ دیر تک وہ اپنی پیشانی اور بدن پر اس کے ہاتھوں کا نرم و گداز لمس محسوس کرتی رہی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی کچھ دیر پہلے اس کا مہربان خدا زمین پر اتر آیا ہو اس کی نامعلوم ماں نے اسے اپنی نرم گداز آغوش میں لے رکھا ہو اور اس کے ساتھ ہی اس کے تصور میں جنید انصر کا مہربان وجود اتر آیا ہو اپنی کالی روشن آنکھوں میں گہرا پیار لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ ہر روز ان کی کلاس لیتا رہا مگر فاطمی نے پھر اس سے کبھی سوال نہیں کیا۔ بس اس کی سوال کرتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں اس سے اپنا جواب چاہا کرتیں لیکن اس نے کبھی ان خاموش سوالوں کا فاطمی کو جواب نہیں دیا۔

ان دنوں ہوسٹل میں چار لڑکیوں کے ایک ساتھ بیاہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں سو ان کا لگا بندھا نظام بگڑ گیا تھا۔ کئی دن سے جنید انصر کی کلاس بھی نہیں ہوئی تھی۔ فاطمی کو سب کچھ سونا سونا سا دکھائی دیتا۔ خالی خالی آنکھوں اور اداس چہرے کے ساتھ وہ بیاہ کے کام کیا کرتی۔

ایک دفعہ جنید انصر اچانک ہی آگیا۔ شاید میڈم شجاع سے کوئی کام تھا۔ ڈارک براؤن پینٹ اور پوری آستین کی سفید قمیص میں وہ ہمیشہ سے زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ فاطمی کی آنکھوں میں روشنی اتر آئی۔ وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر تیز قدموں سے سیدھا میڈم شجاع کے آفس میں چلا گیا۔ فاطمی اس کے انتظار میں برآمدے کے ستون سے لگی کھڑی رہی' تھوڑی دیر بعد جب وہ نکلا تو اس کی نظر اب بھی سامنے کی طرف تھی اور قدموں میں ویسی ہی تیزی۔ فاطمی بڑی حسرت سے اس کی پشت دیکھتی رہی۔ یکایک وہ پلٹا' جیسے اسے کچھ یاد آیا ہو یا پھر کچھ بھول گیا ہو۔ اس بار اس کی نگاہ سیدھی فاطمی کے چہرے پر پڑی۔ اس کے قدم مدھم پڑ گئے۔ فاطمی نے چاہا وہاں سے بھاگ لے لیکن اس کے قدموں کو جیسے انصر کی نگاہ نے پکڑ لیا تھا۔ وہ ٹھہر گیا۔ کئی لمحے اپنی سیاہ نرم آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ گیا لیکن فاطمی سحر زدہ سی یونہی ستون

کے ساتھ لگی کھڑی رہی۔ گلشن نے گلا کھنکار کے اسے متوجہ کیا تب اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ گلشن اسے بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔

"وہ تجھے پسند کرتا ہے فاطی۔" وہ مسرور لہجے میں بولی۔ "ورنہ وہ کبھی تجھے دیکھ کر یوں نہ رکتا۔"

اور فاطی کھوئی کھوئی سی اپنی سہیلی کو دیکھتی رہی۔

بیاہ کا ہنگامہ ختم ہونے کے بعد پھر وہی لگے بندھے دن آگئے۔ جنید انصر کی کلاس بھی شروع ہو گئی اور قرات سکھانے کا سلسلہ پھر سے چل نکلا لیکن فاطی نے نظروں کی نرم آنچ پھر کبھی محسوس نہیں کی۔ وہ سوچتی بھلا انصر اسے کیوں پسند کرنے لگا۔ ایک یتیم اور لاوارث لڑکی کو' وہ جو ملک کے مشہور آدمی کا بیٹا ہے۔ وہ جانتی تھی اس کے علاوہ وہ شہر کے دوسرے کالجوں اور اسکولوں کی لڑکیوں کو بھی قرات سکھاتا ہے۔ بڑے گھرانوں کی خوبصورت اور الٹرا ماڈرن لڑکیاں اس کے سامنے آتی ہوں گی بھلا وہ اسے کیوں پسند کرنے لگا' اسے گلشن کی باتیں جھوٹ محسوس ہوتیں۔ کمتری کا احساس اس کی آنکھوں کو بھگونے لگتا۔ اس کا جی چاہتا کہ کسی دن وہ جنید انصر کا دامن تھام کے پوچھے۔

"خدا کے لیے مجھے اتنا بتا دو کہ گلشن جو کچھ کہتی ہے وہ سچ ہے؟" لیکن وہ جرات کبھی نہ کر سکی۔

ایک بار اس نے ایک بہت نفیس رومال بنایا آسمانی سلک کا جس کے کنارے کاسنی ریشم سے بنے ہوئے تھے۔ ایک ننھے سے سبز پتیوں والے زرد گلاب کے ساتھ اس نے جنید انصر کے نام کے پہلے حروف کاڑھے تھے مگر وہ کبھی یہ رومال اسے دینے کی جرات نہ کر سکی۔

پھر نہ جانے اس کا یہ رومال کہاں گم ہو گیا۔

ان دنوں ہوسٹل میں قرات خوانی کے مقابلے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ جنید انصر نے کچھ لڑکیوں کا انتخاب کیا تھا جن کی آواز اچھی تھی یا جن کو قرات پڑھنا آتی تھی مگر فاطی نہ تو کبھی قرات ہی اچھی کر سکی اور نہ اس کی آواز ہی کچھ خاص تھی لیکن وہ بھی منتخب لڑکیوں کی لسٹ میں شامل تھی۔ گلشن اسے چھیڑتی لیکن وہ اداس رہتی' اس لیے کہ جنید انصر کی نگاہوں میں اب بھی کوئی لگاوٹ یا ایسا کوئی جذبہ نہیں تھا۔

ان دنوں جنید انصر کلاس ختم ہونے کے بعد دیر تک انھیں مقابلے کی تیاری کراتا۔ کبھی کبھی وہ لڑکیاں باقی رہ جاتیں جن کی قرات بنانے میں جنید کو زیادہ محنت کرنا پڑتی انھی میں فاطی بھی تھی۔ وہ مقابلے کی تیاری کا فائنل دن تھا۔ انصر کے نام پکارنے پر سب لڑکیاں اپنی اپنی قرات سناتیں اور چلی جاتیں۔ سب سے آخر میں گلشن اور فاطی رہ گئیں۔ تب جنید انصر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے نزدیک آکر رک گیا۔

فاطی کا خیال تھا اب وہ اسے قرات سنانے کو کہے گا لیکن اس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ اس کی خاموشی پر فاطی نے حیرت سے چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔ انصر کے لبوں پر بڑی دلفریب مسکان تھی پھر یکایک اس نے فاطی کا بنایا ہوا وہ آسمانی سلک کا رومال جیب سے نکال کر چہرہ پونچھا اور اپنی مخصوص گمبھیر آواز میں آہستہ سے بولا۔

"فاطمہ آپ نے رومال خوبصورت بنایا ہے۔ شکریہ۔"

فاطی کے چہرے پر رنگ سے بکھرنے لگے۔ "یہ اس تک کیسے پہنچا۔" اس نے سوچا پھر کن انکھیوں سے گلشن کی طرف دیکھا۔ وہ منہ دبائے ہنس رہی تھی۔ کئی لمحے خاموشی رہی پھر رومال جیب میں ڈال کے جنید واپس اپنی جگہ پر چلا گیا۔

"قرات خوانی کے اس مقابلے کے بعد میں افریقہ جا رہا ہوں ایک مشن پر۔" وہ اب بھی فاطی سے مخاطب تھا۔ "تقریباً پانچ سال کے لیے۔" انصر نے گہری نظر سے اس کی پھیکی پڑتی رنگت کو دیکھا اور سنجیدگی سے بولا۔

"میں جانتا ہوں اتنے برس تک یہ لوگ میرا انتظار نہیں کریں گے۔ اس درمیان میں یہ کسی بھی آدمی سے جو انھیں تمہارے قابل نظر آئے گا تمہیں بیاہ دیں گے اگر میں ابھی یہ کوشش کرتا ہوں تو ان لوگوں کے پاس انکار کی ایک وجہ موجود ہے۔ ان کے قانون کے مطابق ابھی تمہیں شادی کے قابل ہونے میں دو برس باقی ہیں لیکن فاطی میں چاہتا ہوں کہ میڈم شجاع سے ذاتی طور پر بات کروں۔" انصر کے لہجے میں گہرائی تھی۔

فاطی جو اس کے لہجے میں ڈوبتی جا رہی تھی میڈم شجاع کے نام پر جھٹکا کھا کے رک گئی۔ "نہیں۔" "نہیں۔" اس کا لہجہ کانپ رہا تھا۔ "خدا کے لیے نہیں۔"

"لیکن کیوں۔؟" انصر کے چہرے پر سنجیدگی اتر آئی۔ "یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہ تمہارا حق ہے فاطی۔"

"نہیں سر نہیں۔" وہ منہ پھیر کر بولی۔ "آپ کو خدا کا واسطہ سر۔ آپ۔ آپ میڈم شجاع سے کچھ نہ کہیں۔"

"مگر تم خوف زدہ کیوں ہو۔" جنید کے لہجے میں نرمی سمٹ آئی۔ "دیکھو میں دو برس یہاں ٹھہر کر انتظار بھی کر سکتا تھا اگر ایسا ممکن نہیں ہے۔"

"لیکن۔ لیکن اگر وہ نہ مانیں تو اس کے بعد۔" اس نے لرز کے آنکھیں موند لیں۔

"اس کے بعد۔ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔" انصر نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ "حوصلہ رکھو' ہو سکتا ہے کل بہتر ہو گا' اور خدا کی مصلحت کے تحت ہو گا۔"

رات کو جب وہ اپنے بستروں پر پاس پاس لیٹیں تو گلشن نے آہستہ سے کہا۔

"سر کو یہی خدشہ تھا فاطی کہ تو عین وقت پر میڈم شجاع کے سامنے ان کو شرمندہ نہ کر دے اس لیے انہوں نے خود تجھ سے بات کی ہے۔ بے وقوف مت بن۔ جنید انصر کو کھو کے ہمیشہ بے قرار رہے گی۔ اسے آگے بڑھنے دے۔ میڈم شجاع سے اتنا خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آخر وہ تیری جان تو نہیں نکال لیں گی۔" گلشن برابر اسے قائل کرنے کی کوشش میں تھی لیکن فاطی کے لیے چھت سے الٹے لٹکنے کا تصور جان نکلنے سے زیادہ ہولناک تھا۔ وہ برابر انکار میں سر ہلاتی رہی۔

"تمہارا دماغ خراب ہے۔" گلشن کو اس کی بزدلی پر طیش آ رہا تھا۔ "اگر میں تمہاری جگہ ہوتی نا تو کب کی جنید انصر کے ساتھ ہوسٹل چھوڑ چکی ہوتی۔"

مگر فاطی جانتی تھی' وہ کبھی ایسا نہ کر سکتی۔

"ٹھیک ہے۔" گلشن نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ "تمہارا حق دلانے کے لیے مجھے خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔"

"کیا کرو گی تم؟" فاطی نے گھبرا کر کہا۔

"میں خود میڈم شجاع سے بات کروں گی۔"

"نہیں۔ گلشن۔ تجھے خدا کا واسطہ۔ ایسا مت کرنا گلشن۔" اس کے لہجے میں التجا بھری تھی مگر گلشن ایک ہی ضدی اور من مانی کرنے والی لڑکی تھی۔ اس نے فاطی کے آنسوؤں کی پروا نہ کی۔ اس پر تو اس فاطی کو خوشیاں دلانے کی دھن سوار تھی۔ یہی تھی جس نے فاطی کی چاہت کو کھولا۔ اور جس نے جنید انصر کے دل میں اس کے لیے ایک جذبہ بیدار کیا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ آج ان دونوں کو ملا کر ہی دے۔ فاطی جانتی تھی کہ اس کے لیے وہ میڈم شجاع کے سامنے جا کھڑی ہو گی اور یہی خیال تھا جو فاطی کی جان سلب کیے دے رہا تھا۔

اس نے آخر وقت تک گلشن کی منتیں کیں' واسطے دیے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور اس کے ہزار روکنے کے باوجود میڈم شجاع کے سامنے پہنچ گئی۔ ہر چند کہ اس کا بھاری بھرکم وجود اور تمتماتا چہرہ غصے کا سامنا کرتے ہوئے کانپ رہا تھا لیکن فاطی کی خاطر وہ خود بھی سزا بھگتنے کو تیار تھی کیونکہ ممکنات میں دونوں صورتیں تھیں۔ میڈم شجاع کا تحمل سے غور کرنا یا پھر طیش میں آ جانا۔

"کیا بات ہے۔؟" میڈم شجاع کے لہجے میں ترشی نہیں تھی۔ گلشن کا حوصلہ بڑھ گیا۔

"میڈم۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "میں جانتی ہوں ہمارے قانون کے مطابق لڑکی کی شادی اٹھارہ سال سے پہلے نہیں ہوتی لیکن میڈم اگر آپ چاہیں تو۔" اس کی بات ادھوری رہ گئی اور لہجہ کانپنے لگا۔ میڈم کا چہرہ تپنے لگا تھا اور آنکھیں قہر آلود سرخی لیے اسے گھور رہی تھیں۔

"کیا بک رہی ہو؟" انہوں نے پھولتے سانسوں کے ساتھ کہا۔

"وہ۔ وہ۔ میڈم جنید انصر۔ آف۔ ریقہ جانے سے پہلے چاہتے ہیں کہ فاطی سے بیاہ کر لیں۔" وہ ہکلاتے ہوئے آخر پوری بات کہہ گئی۔

"نہیں۔" وہ کانپتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ گئی' باوجود بے یقینی کے اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں پھر انہوں نے پوری قوت سے چلا کے چپراسن کو آواز دی۔

"کریمہ۔۔ فاطمہ کو بلاؤ۔" غصے کی شدت کے باعث وہ گھنٹی بجانا بھی بھول گئی تھی۔ گلشن کی رنگت زرد پڑ گئی۔ حالات کے اس حد تک بگڑ جانے کی امید نہیں تھی۔ میڈم شجاع کے غصے میں آنے کے بعد اس کا خیال تھا کہ اسے ڈانٹ کے بھگا دیں گی۔ جنید انصر تو مقابلے کے بعد ان کے ہوسٹل سے جا رہا تھا۔ وہ فاطی پر کون سے پابندی عائد کرتیں اور اسے تو فاطی کا یوں شدت سے خوف زدہ ہونا بھی بے معنی لگ رہا تھا۔ اسے ٹیچرز کے بیان کردہ اس ہولناک قصے پر بھی اعتبار نہیں تھا جس کے تصور سے فاطی کا خون خشک ہو رہا تھا لیکن اب میڈم شجاع کی حالت دیکھتے ہوئے ان کا فاطی کا بلوانا گلشن کو دہلائے دے رہا تھا۔ جب تک فاطی نہیں آئی میڈم شجاع غصے سے کھولتی ہوئی' مٹھیاں بھینچتی' بند کرتی رہیں۔ اس کا سانس بری طرح پھول رہا تھا جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے آ رہی ہو۔

جب ہی کریمہ کے ساتھ فاطی چلی آئی۔ زرد رنگت' لرزتے ہونٹوں اور خوف کی شدت سے پھیلتی آنکھوں کے ساتھ وہ میڈم شجاع کو دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میڈم سیدھی ہو گئی۔

"تمہیں یہ جرات کیسے ہوئی۔۔؟" وہ دانت بھینچے خونخوار انداز میں اس کی طرف جھپٹیں اور پوری قوت سے ایک تھپڑ اس کے رخسار پر مارا۔ گلشن کے دیکھتے دیکھتے فاطی کا اجلا سا رخسار نیلا پڑ گیا اور وہ چکرا کے سامنے دیوار سے جا لگی۔

"میں دیکھوں گی تمہیں۔۔" وہ کانپتی ہوئی واپس اپنی جگہ پر جا بیٹھی۔

گلشن میڈم کی پروا کیے بغیر اس کی طرف لپکی اور اسے سہارا دیا۔

"دفع ہو جاؤ' اسی وقت میری نظروں کے سامنے سے۔"

میڈم شجاع دھاڑی اور گلشن لڑکھڑاتی فاطمی کو سہارا دیے باہر نکل آئی۔ پشیمانی کی شدت سے اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"فاطمی مجھے معاف کر دینا۔ میں نے۔"

"نہیں گلشن۔" فاطمی نے اس کی بات کاٹ کر پھیکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "تمہارا کوئی قصور نہیں' میرا نصیب ہی برا ہے۔"

کریمہ کے ذریعے پل بھر میں یہ خبر سارے ہوسٹل میں پھیل گئی۔ لڑکیاں اسے یوں دیکھتیں جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔

اس رات دیر تک فاطمی کو نیند نہ آئی۔ تکیے میں منہ چھپائے وہ سسک سسک کر روتی رہی۔ وہ جانتی تھی خوشی اس کے مقدر میں نہیں۔ محبت کا نام اس کے نصیب میں نہیں لکھا گیا۔ وہ بھیگی بھیگی آنکھیں پھیلا کے سوچتی گئی۔ "پھر۔ پھر یہ سایہ اس پر کیوں مہربان تھا۔" جو ہر ایسی ہی رات اس کے دکھ بانٹنے اس کے خوابوں میں چلا آرہا تھا۔ اسے معلوم تھا وہ آج بھی آئے گا لیکن آج وہ اس کی مہربانی کی منتظر نہیں تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ مہربان سایہ جو محض اس کے خواب کا ایک حصہ تھا' اسے کچھ نہیں دے سکتا۔ وہ یتیم اور لاوارث ہے۔ اس کے مقدر میں سیاہی اور تاریکی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہ جان گئی تھی کہ اس کا کوئی نہیں ہے وہ ماں سے محروم ہے خدا بھی اس کا نہیں ہے۔ اور جنید انصر بھی اس کے نصیب میں نہیں ہے۔ وہ اکیلی ہے۔ بالکل تنہا اور بدنصیب۔

اس کے کمرے کی ساری لڑکیاں اپنے بستروں پر سو چکی تھیں۔ اس کے بالکل برابر اس کی سہیلی گلشن بھی کب سے نیند کی آغوش میں گم تھی لیکن وہ ابھی تک جاگ رہی تھی' بھیگی آنکھیں کھولے اپنے سیاہ مقدر کی طرح کالی' گھور اندھیری رات کو گھور رہی تھی۔ کمرے کی چھت سے الٹا لٹکنے کا ہولناک تصور اس کے بدن میں اندر کہیں ٹھنڈی سی لہر دوڑا رہا تھا۔ اسی تصور میں ڈوبے ہوئے رات کے جانے کون سے اس کی آنکھ لگ گئی اور اس نے خواب میں دیکھا وہ مہربان سایہ اپنی مخصوص مدھم چال کے ساتھ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ بے آواز قدموں کے ساتھ پھر اسے اپنے بستر پر بہت نزدیک اس کے وجود کا مانوس سا احساس ہوا۔ اگلے ہی لمحے اس کی نرم و گداز انگلیاں اس کے جلتے ہوئے رخسار پر پھرتی رہیں۔ وہ طمانیت سے آنکھیں موندے خواب دیکھتی رہی اور پھر اس نے اپنی پیشانی پر اس کے نرم ٹھنڈے ہونٹوں کا لمس محسوس کیا اور اس نے دیکھا وہ واپس جا رہا ہے لیکن آج فاطمی نے اسے پکارنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چپ چاپ اسے جاتے دیکھتی رہی جیسے اپنی بدنصیبی پر اسے صبر آگیا ہو' وہ جان گئی ہو کہ چاہے جانے پر

بھی کو روکا نہیں جا سکتا۔ وہ دیکھتی رہی اور مہربان سایہ دور ہوتا ہوا اندھیرے کا ایک حصہ بن گیا۔

اب وہ اپنے گرد وہی مانوس خلا محسوس کر رہی تھی۔ گہرا' وسیع' ہولناک اور تاریک۔

لیکن کیسی عجیب سی بات تھی۔ آج اس کی آنکھ نہیں کھلی تھی۔ یہ احساس کیسا حیران کن تھا کہ وہ جاگ رہی تھی۔ یعنی یہ سب کچھ خواب نہیں حقیقت تھا اور وہ سایہ۔ وہ مہربان سایہ محض اس کے خواب کا فریب نہیں۔ ایک زندہ حقیقت تھا

وہ اس کے خوابوں سے اتر کے واقعی اس کی زندگی میں آیا تھا۔ کاش کہ آج اس نے اسے پکار لیا ہوتا' اسے جانے نہ دیا ہوتا۔ افسوس اور دکھ سے اس کی حالت ابتر ہو گئی۔ بے بسی کی شدت سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ رات گزرتی رہی اور وہ روتی رہی۔ صبح کا تصور اس کے لیے بڑا اذیت ناک تھا۔

وہ جانتی تھی کہ میڈم شجاع اس کا قصور کبھی نہیں بخشنے گی۔ وہ اسے سزا ضرور دے گی اور جنید انصر اسے بچا نہیں سکے گا۔ جانے وہ زندہ رہے یا مر جائے۔ کاش کہ وہ مر ہی جائے۔ اس نے سسک کے دعا مانگی۔ "دکھوں اور اذیتوں سے آزادی تو نصیب ہو گی۔" موت اور آزادی کے احساس سے اس کی روح ہلکی ہو گئی۔

صبح وہ اپنی سزا کی منتظر تھی مگر سارا دن بیت گیا میڈم شجاع کی طرف سے اس کے لیے کوئی حکم صادر نہیں ہوا۔ رات پھر آگئی اور لڑکیاں اپنے بستروں پر چلی گئیں۔ اگلے دن قرات خوانی کا مقابلہ ہونے والا تھا کہ سزا کا حکم صرف مقابلے کی وجہ سے ملتوی ہوا تھا۔ وہ مقابلے کے بعد آنے والے دن کا انتظار کرنے لگی۔

ہوسٹل کے گراؤنڈ میں رنگین شامیانے قطار در قطار لگے تھے جن کے درمیان ایک خوبصورت اسٹیج بنا تھا۔ چاروں طرف سفید اجلی چاندنیاں بچھی تھیں۔ اسٹیج پر گاؤ تکیوں سے بزرگ شرکا جن میں ملک کے مشہور قاری عبید الطہر' ان کے دیرینہ کرم فرما خواجہ غلام حسن خان' مہمان خصوصی اور دیگر اساتذہ کے ساتھ بیٹھے تھے۔ مقابلے میں شامل ہر لڑکی اپنی باری سے اسٹیج پر آتی اور مائک کے سامنے بیٹھ کر قرات کرتی۔ سفید کپڑوں پر اجلے دوپٹوں سے سر ڈھانپے۔ وہ کتنی پاکیزہ اور مقدس دکھائی دے رہی تھیں۔ فضا نورانی سی ہو رہی تھی اور لڑکیوں کے عربی پڑھنے کی روح پرور آوازوں سے ایک سماں سا بندھ گیا تھا۔

کئی لڑکیوں کے بعد فاطمہ کا نام پکارا گیا۔ وہ مدھم رفتار سے چلتی ہوئی اسٹیج پر پہنچ گئی۔ چند لمحوں کے

توقف کے بعد بعد مائک پر اس کی آواز ابھری اور فضا میں پھیل گئی۔ جوں جوں وہ قرات کر رہی تھی لوگوں پر سکتہ طاری ہوتا جا رہا تھا اور کئی لوگوں کو حیرت تھی کہ فاطی کی آواز میں اس قدر سوز اور رقت کہاں سے سمٹ آئی تھی کہ ہر سننے والا مبہوت ہو کے رہ گیا تھا۔

انصر کے چہرے پر بھی حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ اسے اپنی تیاری پر بھروسا ضرور تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ وہ حیرت انگیز طور پر ساری محفل پر چھا جائے گی۔ اسے لگتا تھا جیسے فاطی آج کی بازی جیت جائے گی۔

اور یہی ہوا۔ مصنفین کے فیصلے کے بعد مقابلے کے جج نے اپنے اعلان کے ذریعے پہلے انعام کا مستحق فاطمہ کو قرار دیا۔

تقریب کے خاتمے کے بعد عصرانہ تھا۔ جس کا انتظام ہوسٹل کے بڑے ہال میں تھا۔

کھانے کے بعد سب لڑکیاں یکے بعد دیگرے ہال سے نکل کے اپنے کمروں کی طرف جاتی رہیں۔ گلشن اور فاطی ساتھ ہی باہر نکلی تھیں مگر اور لڑکیوں کی طرح اپنے کمرے میں جانے کے بجائے گلشن اسے لے کر باغ کی سمت آگئی۔ وہ جانتی تھی اتنی رات گئے اس طرف آنے کی ممانعت تھی مگر آج فاطی نے بھی اسے نہیں روکا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا آج جو کچھ گلشن کہتی جائے وہی کرے۔ جانے اسے کیوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آج وہ آخری بار یہ سب کچھ دیکھ رہی ہو۔ اسے ساری دنیا اجنبی سی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ دونوں خاموشی سے چلتی ہوئی باغ میں داخل ہو گئیں تب ہی فاطمہ نے دیکھا' سامنے ایک درخت کے ساتھ کوئی کھڑا تھا۔ اس کے قدم رکنے لگے۔

"بڑھتی رہو۔ جنید انصر ہے۔" گلشن نے سرگوشی کی۔ فاطی کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے چاہا وہ پلٹ کر بھاگ لے مگر گلشن نے اس کا ارادہ بھانپتے ہی اسے پکڑ لیا۔

"پاگل مت بنو۔ دیکھو وہ تم سے کیا کہنا چاہتا ہے۔"

فاطی کی قوت مدافعت دم توڑ گئی اور وہ گلشن کی گرفت میں خاموش کھڑی رہ گئی۔ جنید انصر آہستگی سے چلتا ہوا خود ہی اس کی طرف آگیا۔

"میں کل صبح کی پہلی فلائٹ سے افریقہ جا رہا ہوں۔" اس نے اپنی مخصوص مدھم اور گمبھیر آواز میں کہا۔ "اور۔ تم بھی میرے ساتھ چلو گی۔"

گلشن نے محسوس کیا فاطی پوری جان سے کانپ گئی تھی۔

"نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔" وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "مجھ میں اتنی جرات نہیں ہے۔"

قصۂ دل

مرسلہ
ثمرہ شہناز مقبول
کراچی

ڈوکس کے ایک اسکول کے باہر بڑی خاصی بھیڑ جمع ہو رہی تھی۔ ہر طرف گاڑیاں کھڑی ہو رہی تھیں۔ ہر گاڑی کے ساتھ ایک ٹرنچ کوٹ میں ملبوس شخص کھڑا تھا۔ ان سب کے چہرے پر ایک ہی تاثر تھا۔ ایک ہی کیفیت تھی۔ ایک ہی جذبہ تھا۔ ایک ہی احساس تھا۔ ایک ہی خیال تھا۔ ایک ہی سوچ تھی۔ ایک ہی فکر تھی۔ ایک ہی پریشانی تھی۔ ایک ہی الجھن تھی۔ ایک ہی بے چینی تھی۔ ایک ہی اضطراب تھا۔ ایک ہی بے قراری تھی۔ ایک ہی بے کلی تھی۔ ایک ہی بے تابی تھی۔ ایک ہی بے سکونی تھی۔ ایک ہی بے آرامی تھی۔ ایک ہی بے اطمینانی تھی۔ ایک ہی بے یقینی تھی۔ ایک ہی بے اعتباری تھی۔ ایک ہی بے اعتمادی تھی۔ ایک ہی بے وفائی تھی۔ ایک ہی بے رخی تھی۔ ایک ہی بے اعتنائی تھی۔ ایک ہی بے توجہی تھی۔ ایک ہی بے پروائی تھی۔ ایک ہی بے نیازی تھی۔ ایک ہی بے حسی تھی۔ ایک ہی بے رحمی تھی۔ ایک ہی بے مروتی تھی۔ ایک ہی بے ترسی تھی۔ ایک ہی بے خوفی تھی۔ ایک ہی بے ڈری تھی۔ ایک ہی بے خطری تھی۔ ایک ہی بے خطرہ تھی۔ ایک ہی بے خطرہ تھی۔

"میں جانتا ہوں۔" جنید انصر نے نرمی سے کہا۔ "لیکن تمہیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہاں کا کوئی آدمی ایسا ہے جو ہماری مدد کر رہا ہے۔ یہ اس کی مہربانی ہے ورنہ شاید میں بھی ایسی جرات نہ کر سکتا۔"

"کون ہے وہ آدمی۔؟" فاطی نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

"یہ مت پوچھو۔ وہ ابھی خود کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ جاؤ جلدی کرو جو تھوڑا بہت ضروری سامان لینا ہو' اس بیگ میں رکھ لینا اس نے ایک چھوٹا سا سیاہ رنگ کا چرمی بیگ اس کی طرف بڑھا دیا جسے اس کے بجائے گلشن نے پکڑ لیا۔

"وہ میری کھال کھنچوا دیں گی۔ میڈم شجاع۔" خوف سے اس کا لہجہ لرزنے لگا۔

"نہیں وہ ایسا نہیں کر سکیں گی۔" انصر نے وثوق سے کہا اس لیے کہ جب تمہارے ہوسٹل چھوڑنے کی خبر عام ہو گی' ہم لوگ گھانا میں بیٹھے ہوں گے۔ ہمارے مہربان نے کچھ ایسا ہی انتظام کیا ہے۔" انصر نے آستین ہٹا کے گھڑی دیکھی پھر بولا۔ "میں ٹھیک دو بجے تمہیں لینے آؤں گا۔ اس وقت ہوسٹل کے پچھلے گیٹ پر چوکیدار نہیں ہو گا۔ گلشن تمہیں دروازے تک چھوڑنے آئے گی اور پھر تمہیں میری گاڑی تک پہنچنے میں دشواری نہیں ہو گی۔ سفید رنگ کی ٹیوٹا کیرولا ہے۔ جاؤ اب تیاری شروع کر دو۔" پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

وقت کا ہر گزرتا لمحہ اس پر بھاری تھا۔

ذرا سی آہٹ پر یوں محسوس ہوتا جیسے میڈم شجاع کو ان کے منصوبے کا علم ہو گیا ہو۔ دل کانپنے لگتا اور وہ وحشت سے چاروں طرف دیکھنے لگتی۔

گلشن کو اونگھ آرہی تھی مگر وہ فاطی کا ساتھ دینے کو جاگ رہی تھی۔

فاطی کے ذہن پر میڈم شجاع کا خوف بری طرح مسلط تھا۔ اسے یوں لگتا جیسے وہ عین وقت پر اپنے

خوفناک وجود کے ساتھ کہیں سے نکل آئیں گی۔ اس تصور کے ساتھ ہی اسے جھرجھری سی آجاتی۔

بڑے جیولا انتظار کے بعد ہوسٹل کے بڑے وکلاک نے دو بجائے اور وہ دونوں بستر چھوڑ کے اٹھ گئیں۔ فاطمی نے جنید کا دیا ہوا چھوٹا سا سیاہ بیگ اٹھایا اور وہ گرم کشمیری شال جو پچھلے دنوں کسی بڑے آدمی کی بیگم نے ان کے ہوسٹل کی ہر لڑکی کو تحفتہ" بھجوائی تھی' اپنے گرد لپیٹ کے گلشن کے ساتھ باہر نکل آئی۔

نیم تاریک کوری ڈور سے گزرتے ہوئے فاطمی کا ہر قدم پر سانس رک رہا تھا۔ وہ دونوں بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی بخیر و خوبی ہوسٹل کے پچھلے دروازے پر پہنچ گئیں۔

دروازہ کھلا تھا اور چوکیدار موجود نہیں تھا۔ یقیناً ان کے مہربان نے اسے کسی بہانے سے ہٹایا ہوگا۔

گلشن نے اسے گلے سے لگا کے بھینچ لیا۔ اس کے رخساروں پر پیار کیا اور بہت سے آنسو اس کے چہرے پر چھوڑ کے تیزی سے واپس پلٹ گئی۔ فاطمی اپنے دل کی سسکیوں کو دباتی بیگ سینے سے لگائے دروازے سے باہر نکل آئی۔ دہشت سے پیچھے مڑ مڑ کے دیکھتی جیسے میڈم شجاع کا کوئی جاسوس اس کے پیچھے لگا ہو۔ سامنے ہی جنید انصر کی سفید کار کھڑی تھی۔ اس کے لیے کسی نجات کے فرشتے کی مانند۔ اور وہ گیٹ سے یوں نکل کے اس کی طرف لپکی تھی جیسے ڈر ہو کہ کوئی پیچھے سے کھینچ کر اسے پھر اس زنداں میں نہ ڈال دے۔

جنید کار کا اگلا دروازہ کھولے اس کا منتظر تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی اس نے کار اسٹارٹ کی اور تیزی سے سڑک پر بڑھا دی۔ فاطمی نے انصر کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا دیا مگر وہ باوجود کوشش کے ایسا نہ کر سکی۔

"کیا تم خوش نہیں ہو فاطمی؟" وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔

"مجھے پتا نہیں خوشی کیا ہوتی ہے۔" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "مگر مجھے امید ہے کہ بہت جلد مجھے اس کا احساس ہو جائے گا۔" جنید انصر محبت سے ہنس دیا اور بولا۔

"ہمیں اپنے مہربان کی یہ نوازش کبھی نہیں بھولنا چاہیے فاطمی۔" اس نے کہا۔

"ہاں۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "جانے وہ کون ہے اور اس نے مجھ پر یہ مہربانی کیوں کی ہے۔"

"کیا تم اب بھی خود کو بدنصیب سمجھتی ہو فاطمی؟" انصر نے ذرا ناراضی سے کہا۔

"نہیں۔" وہ اداسی سے ہنس دی۔ "آپ کا ساتھ تو میرے لیے عین خوش نصیبی کا باعث ہے لیکن دراصل مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔"

"یہ سب ہو چکا ہے فاطمی اور بس ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے۔" انصر کے لہجے میں اپنایت اور خلوص

افیون قتل اور گاندھی

مولانا ابوالکلام آزاد جب جیل میں تھے' انہیں زنانے کا ایک دلچسپ واقعہ لکھتے ہیں۔ "جیل میں میری کوٹھری کے عین سامنے ایک دوسری کوٹھری میں کوئی چینی قیدی رہتا تھا' مگر زبان کی بیگانگی کے باعث ہم دونوں آپس میں بات چیت نہیں کر سکتے تھے۔ جو ہم سے ایک دوسرے کا منہ تک کر رہ جاتے تھے۔ اس چینی کو یہ معلوم نہ تھا کہ میں کس جرم میں ماخوذ ہوں' اور ایک دن اس سے نہ رہا گیا۔ میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور اپنا ہاتھ دراز کرنے لگا' یعنی یہاں کیسے آئے ہو؟ میں کیا جواب دیتا' خاموش رہا۔ پھر وہی لولا۔ "اوپیم" یعنی کیا افیون کے معاملے میں پکڑے گئے ہو؟ میں نے نفی میں سر ہلا دیا تو اس نے اپنے ہاتھ کو اپنے گلے پر پھیرا کی طرح پھیرا۔ یعنی کس نے افیون کو قتل کیا ہے؟ میں نے پھر انکار میں سر ہلایا۔ تو انصر نے پوچھا۔ "گاندھی؟" اس پر میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بالکل مطمئن ہو گیا گویا اس کے نزدیک گاندھی بھی ناجائز افیون اور قتل کی طرح جرائم میں داخل تھا۔"

کی گمبھیرتا تھی۔

کچھ دیر بعد کار ایک نیم اندھیری گلی میں داخل ہو گئی اور ایک اونچے مکان کے سامنے جا رکی۔ وہاں دو خواتین اور کچھ مردوں کی موجودگی میں ان کا نکاح ہو گیا۔

صبح ہونے سے پہلے ان کا سفر پھر جاری ہو گیا۔

"اب ہم سیدھے ایئرپورٹ جا رہے ہیں۔" انصر نے اسے بتایا۔ "دو گھنٹے بعد ہماری فلائٹ گھانا کے لیے روانہ ہو جائے گی اور تم کتنی بھولی ہو کہ تم نے اپنے پاسپورٹ کے فارم پر دستخط بھی کیے اور تمہیں پتا بھی نہ چلا اور باغ کے ایک گوشے میں میں نے تمہاری تصویر بھی لے لی تھی۔"

"کیا ہمیں اور کوئی چھوڑنے کے لیے نہیں جائے گا؟" وہ کچھ بے چین سی تھی۔

"ہاں کیوں نہیں۔ باقی لوگ دوسری کار سے آرہے ہیں۔ بس یہی چند لوگ۔ جن سے تم مل چکی ہو۔" انصر نے بتایا۔

"اور۔ وہ۔ ہمارا مہربان۔" فاطمی کے لبوں سے آخر کار نکل ہی گیا۔ انصر آہستہ سے ہنس دیا۔

"نہیں۔ وہ نہیں۔ اس طرح تو وہ کھل کے سامنے آجائے گا اور تم جانتی ہو اس کا کیا مطلب ہے۔" وہ کچھ دیر رکا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہوسٹل کی لڑکی فرار کروانے کے جرم میں اسے ایک لمبی سزا ہو سکتی ہے۔ ہاں وہ ہمیں راستے میں ضرور ملے گا۔"

فاطمی کے دل میں عجیب سی بے چینی ہونے لگی۔ جانے کیوں اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے اس مہربان کو جنم جنم سے جانتی ہو مگر وہ اس سے پہلے اس کی زندگی میں کیوں نہیں آیا۔ وہ دکھ اٹھاتی رہی' خوشی کے لمحے لمحے کو ترستی رہی اور شاید اس کی خوشی کا یہی وقت مقرر ہو۔ فاطمی نے اپنی سوچ کو روک دیا مگر اس مہربان سے ملاقات کی بے تابی وقت کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی تھی۔

آخر انصر نے ایک جگہ کار کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ دیکھو۔ ہمارا مہربان" فاطمی نے بے

تابی سے اپنی نظر کو انھر کی نظروں کے تعاقب میں دوڑایا۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے مدھم بلبوں کی روشنی میں وہ ایک طرف فٹ پاتھ کے کنارے کھڑا تھا۔ سرتاپا سیاہ لبادے میں لپٹا ہوا۔ انھر نے عین اس کے نزدیک جاکر کار روک دی۔

پہلے انھر نیچے اترا پھر فاطمی اور فاطی کی بے چین کھلی ہوئی آنکھوں نے دیکھا۔ وہ مہربان وجود اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اس کے دل میں درد سا اٹھا۔ وہ پہچان گئی۔ یہ وہی مہربان سایہ تھا جو برسوں سے اس کے خوابوں میں آرہا تھا۔ اس وقت سے جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا اور دنیا کو پہچاننا سیکھا تھا۔ یہی وہ مہربان سایہ تھا جس نے اسے ہر دکھ اور ہر تکلیف پر قریب آکر دلاسے دیے تھے۔ جس کی گداز انگلیوں اور نرم ہونٹوں کا لمس اس کے درد اور اذیتوں کو چنتا رہا تھا اور پھر وہ اس کے خواب سے اتر کے اس کی زندگی میں بھی آیا تھا اور یہی تھا جو آج بھی اس کی نجات کا سبب بنا تھا۔ وہ بے اختیار ہو کے آگے بڑھی۔ سائے نے اپنے بازو پھیلا دیے اور فاطمہ آنکھیں موند کے ان پھیلے ہوئے بازوؤں میں سما گئی۔ وہی لذت، طمانیت اور سکون کا ایک گہرا احساس، وہی نرم و گداز لمس، وہی محبت اور شفقت ریز آغوش جسے اس نے بارہا خوابوں میں محسوس کیا تھا، آج مجسم ہو کر اس کے وجود میں سما رہا تھا۔ وقت لمحہ لمحہ کرکے سرک رہا تھا۔ آخر اس نے آہستگی سے اسے علیحدہ کیا اور جھک کر اپنے نرم ٹھنڈے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیے۔

"مہربان۔" وہ تڑپ اٹھی۔ "تم کون ہو؟ کون ہو؟" مگر آواز اس کے اندر سے باہر نہیں آئی۔ اس جبکہ وہ پکار رہا اس کے بہت نزدیک موجود تھا اور وہ جاگ رہی تھی مگر جانے کیوں اس کے حواس سلب ہو گئے تھے۔ جوں ہی مہربان نے اپنا چہرہ اونچا کیا، تب ہی ہوا کے زور سے اس کی سیاہ چادر پھڑپھڑانے لگی اور فاطی نے دیکھا وہ مہربان وجود میڈم شجاع کا تھا۔ "میڈم۔" اس نے چلانا چاہا مگر آنسوؤں سے اس کا حلق بند ہو گیا۔

"خدا حافظ فاطی۔" میڈم شجاع نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا اور بوجھل قدموں سے ایک طرف چل دی۔

فاطی یونہی بے جان سی ساکت کھڑی تھی اور میڈم شجاع کا مہربان سایہ ملگجے اندھیرے میں دور ہوتا ہوا تاریکی کا ایک حصہ بن گیا۔

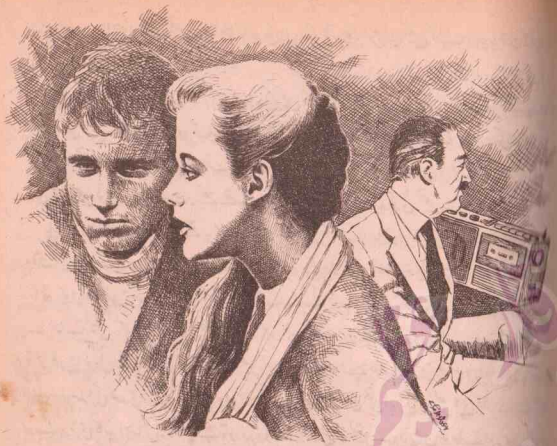

جب لاشعور میں دبی خواہشیں کسی آکٹوپس کی طرح آدمی کے وجود کو اپنے حصار میں لے لیتی ہیں تو زندگی کے خراب اور حقیقت میں دو لخت ہو جاتی ہیں۔ ایک ایسے شخص کی کہانی جو دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا

کورٹ مارشل

سیماں

جب سے پاپا ایب نارمل ہوئے تھے گھر کے ماحول میں سخت قسم کی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ ایک پتا بھی پاپا کی مرضی کے بغیر نہ ہلتا تھا۔ صرف محاورتاً" نہیں بلکہ یہ حقیقت تھی کہ کبھی جو پاپا کے ذہن میں سما جاتا تو ان میں جا کھڑے ہوتے اور کسی بھی پتے کو نہ ہلنے کا حکم دے کر، اس کے سر پہ مسلط ہو جاتے اب ظاہر ہے کہ پتا ان کی بیوی، اولاد یا ملازموں میں سے تو تھا نہیں کہ وہ اس پہ اپنی مرضی مسلط کر سکتے۔ ہوا چلتی اور پتا ہلنے لگتا، بس پھر کیا ہوتا، پاپا طیش میں آجاتے اور نافرمان پتے کو پورے سمیت جڑ سے اکھاڑ کے پھینک دیتے یہی حال بچوں کا تھا جو بھی ان کی مرضی کے بغیر چلتا اسے سزا دیے بغیر نہ مانتے اس کے

لیے مختلف سزائیں مقرر تھیں مرغا بننا' ہاتھ پیروں کے بل چلنا' دھوپ میں کھڑے رہنا یا لان میں دوڑ لگانا۔

پاپا ریٹائرڈ کرنل تھے۔ اپنی ساری فوجی زندگی میں کبھی انھوں نے حاکمانہ رویہ نہیں رکھا تھا۔ یہ ممی کی محبت تھی ان کے دل میں کہ وہ آرمی کے آفیسر تھے لیکن ان کے دل پر ہمیشہ ممانے حکومت کی۔ ممی پاپا کی خالہ زاد تھیں۔ انھیں ہمیشہ سے سخت قسم کے مردوں سے بیر تھا۔ خاندان میں کئی لوگ فوج میں تھے اور وہی مخصوص فوجی قسم کی عادت رکھتے تھے۔ ممی جی کھول کے ان پر تنقید کرتی تھیں۔

پاپا اندر سے پورے فوجی تھے۔ ممابہت کم عمری میں ان کے ساتھ بیاہی گئی تھیں۔ وہ خود بھی اس وقت ایسے بہت بڑے نہ تھے۔ ٹریننگ سے فارغ ہو کے لیفٹیننٹ کا عہدہ نیا نیا سنبھالا تھا۔ ممان کے ساتھ بچوں کی طرح ضد کرتیں۔ اپنی بات منوانے کے لیے خوب روتیں' کھانا چھوڑ دیتیں۔ پاپا انھیں پیار سے مناتے لیکن کبھی جو بھولے بھٹکے خود سے مجبور ہو کر ڈانٹ دیتے تو کئی روز وہ ان سے روٹھی رہتیں۔ آخر کار پاپا کو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر انھیں منانا پڑتا۔ ممانے اپنے سارے بہن بھائیوں اور ماں باپ کی لاڈلی اور سدا کی ضدی تھیں۔ ان کی کوئی بات کبھی کسی نے نہ ٹالی تھی اور پاپا جو کبھی اپنی فطرت سے مجبور ہو کے برتری کا یہ احساس جتانا چاہتے تو وہ رو رو کے برا حال کر لیتیں۔ وہ پریشان ہو جاتے اور یوں آہستہ آہستہ پاپا نے خاص مردوں والی بات منوانے کی عادت یکسر دل سے ڈالی۔ وہ فوجی طبیعت رکھتے تھے لیکن ممانے چاہت نے ان کی طبیعت کی یہ خصوصیت اندر ہی کہیں دبا دی۔ وہ ممانے کو شدت سے چاہتے تھے اور اس لیے کبھی جو ممانے کوئی بات بری لگتی تو بس خاموش ہو جاتے۔ ممانے جو خود بھی ان کو کم نہ چاہتی تھیں پاپا کی خاموشی سے ان کے اندر کا حال جان لیتیں اور پھر وہی اپنے مخصوص خوب صورت انداز میں پاپا کو منالیتیں۔ پاپا جب بھی موڈ میں ہوتے ممانے کے ہاتھ سے کھانا کھاتے تھے اور ممانجب بھی انہیں خاموش محسوس کرتیں کھانے کی میز کی بجائے ان کا کھانا ٹرے میں لگا کے ان کے کمرے میں پہنچ جاتیں' اور یہ ہوتا کہ پاپا ان کی ایک مانتے اور وہ دو پاپا کی مانتیں۔ ان کی زندگی بڑی مطمئن اور خوشگوار گزری تھی۔ برادری والے شادی شدہ جوڑوں کو ان کی مثالیں دیتے تھے لیکن فوج سے ریٹائرڈ ہوئے تو جانے پاپا کو کیا ہوا کھوئے کھوئے سے رہنے لگے۔ اکثر خاموش رہتے۔ ممانے اس خاموشی کو ریٹائرمنٹ کے احساس پر محمول کیا لیکن پھر یہ خاموشی بڑھنے لگی۔ ابتدا میں زمینوں پر بھی چلے جاتے تھے اور کبھی عزیز رشتے داروں کے ہاں بھی لیکن پھر گھر سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ بس بیٹھے یا تو اپنی رائفل صاف کرتے رہتے یا پھر باہر لان میں گھوما کرتے اور پھر گھومنے کا یہ چکر گھر کے اندر بھی شروع ہو گیا۔ رائفل کندھے

لٹائے ادھر سے ادھر چکر لگایا کرتے۔ ممان کی اس حالت سے بہت پریشان ہو گئیں۔ انھوں نے کئی بار ان سے اس خاموشی اور اضطراب کا سبب پوچھا لیکن وہ کبھی انھیں مطمئن نہ کر سکے بس ٹال جاتے۔ "کوئی بات نہیں قمری۔ کوئی بات نہیں۔" کبھی کبھی ممابہت ضد کر کے' بہت نرمی اور محبت سے ان کی پریشانی کا سبب پوچھتیں تو وہ خاموش رہتے یا پھر وہی مخصوص جملہ۔ "کچھ نہیں۔ کوئی بات نہیں۔" بھلا وہ ممانا کو کیا بتاتے۔ اپنے اضطراب اور پریشانی کا سبب تو وہ خود بھی نہ جانتے تھے اور جانے وہ کیا دن تھا۔

اس روز صبح ہی سے ممانی طبیعت پریشان تھی۔ کئی بار رو چکی تھیں۔ سوچ سوچ کے تھک گئی تھیں کہ آخر پاپا کو ہوا کیا ہے لیکن کوئی سبب ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ آخر انھوں نے خود ہی عہد کیا کہ آج خواہ کچھ بھی ہو جائے وہ پاپا کو کھول کے رہیں گی۔ جانے وہ کیسی فکر تھی جو اندر ہی اندر پاپا کو کھا رہی تھی۔ جب تک وہ جان نہ لیتیں کس طرح ان کی پریشانی مٹا سکتی تھیں۔

جس وقت پاپا کے کمرے میں داخل ہوئیں وہ اپنی رائفل صاف کر رہے تھے۔ ممانا خاموشی سے ان کے ایک جا کے بیٹھ گئیں۔

"ارجی۔ پلیز مجھے بتائیے کن سوچوں نے آپ کو پریشان کر رکھا ہے؟" پاپا کے زانو پر محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں اور پاپا جو ہمیشہ انھیں پیار اور نرمی سے ہنس کے ٹال جاتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ "نہیں قمری کوئی بات نہیں۔ سب تمھارا وہم ہے۔" آج یکایک کانپنے لگے غصے کی شدت سے چہرہ تپنے لگا۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں اور رائفل پر دونوں ہاتھوں کی گرفت اتنی سخت ہو گئی کہ انھوں کی سرخ و سپید پشت پر خون چھلک اٹھا۔

"خام۔ موش۔" وہ پوری قوت سے چلائے اور منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ ممی بھیگی پلکیں پھیلائے۔ روئے' لرزتے ہونٹوں سے انھیں دیکھ رہی تھیں اور ہم سارے بہن بھائی سہمے ہوئے دروازے کھڑکیوں سے جھانک رہے تھے۔

"کیا ہو گیا ارجی آپ کو۔؟" ممانا پھوٹ پھوٹ کے رو دیں اور پاپا طیش کے عالم میں ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔

"ارجی۔۔۔ خدا کے لیے۔۔۔۔" ممانا اپنی جگہ سے اٹھ کے ان کے سامنے آگئیں۔ تب وہ ایک بار پھر غصے سے دہاڑے۔

"چلی جاؤ۔۔۔ میرے سامنے سے۔" لیکن وہ ویسے ہی ان کے سامنے کھڑی روتی رہیں۔

"چلی جاؤ۔۔۔ قم۔۔۔ ری۔۔۔" انھوں نے رائفل سیدھی کی تو سر آپی دوڑتی ہوئی اندر آئیں اور مما کو پکڑ کے باہر لے گئیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ پاپا کو کیا ہوا۔ گھر آپی نے فون کر کے تایا کو بلوالیا وہ فوراً ہی آگئے۔ پاپا اپنے کمرے میں تھے۔ تایا ابو کتنی دیر ان کے پاس رہے پھر باہر نکلے تو چہرے پر عجیب دکھ اور پریشانی کے تاثرات تھے۔

"ارجمند ذہنی طور پر اپ سٹ ہے قمر۔۔۔" انھوں نے مدھم آواز میں کہا۔ "میں برین اسپیشلسٹ ڈاکٹر گردیزی کو فون کر کے اس سے ٹائم لیتا ہوں۔ تم گھبراؤ مت۔" اسی شام پاپا کو برین اسپیشلسٹ کو دکھایا گیا۔ بجلی کے کئی شاک لگے لیکن پاپا کی حالت نارمل نہ ہوئی بلکہ مستقل علاج کے باوجود ان کی حالت بگڑتی جارہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے فوجی میدان کا یہ افسر۔۔۔ جو گھر میں کبھی کسی سے اونچا بھی نہیں بولا تھا' ریٹائر ہو کر اب دل کی ساری حسرتیں نکال رہا تھا۔ بھلا اب وہ اپنے اندر کے فوجی کو کس طرح بہلاتے۔ اس کو مارتے مارتے تو یہ وقت آچکا تھا۔ اس کے علاوہ اٹھنا بیٹھنا' ہنسنا' رونا۔۔۔ ساری ہی باتوں پر ان کا کنٹرول تھا۔ ہر روز ساری اولاد کو جمع کر کے لائن لگوادیتے' باقاعدگی سے (marchpast) ہوتی۔ سب سے آگے سر آپی (یعنی سحر آپی) پھر گرایی (یعنی گھر آپی) اور ان کے بعد نمبروار ہم سارے بہن بھائی۔ سر آپی اور گھر آپی تو اکثر گول ہو جاتیں اور پاپا انھیں کونوں کھدروں سے ڈھونڈ کے لاتے' اتنی دیر میں جمع شدہ سارے بچے تتر بتر ہو جاتے۔ پاپا ان دونوں کو چھوڑ کے اوروں کو پکڑنے جاتے لیکن دو کو لے کر آتے تو باقی چار بھاگ لیتے اور یوں پکڑتے اور بھاگتے وہ تھک کے چور ہو جاتے مگر لائن مکمل نہ ہوتی۔ تب ممی ایک ایک کو سختی سے ڈانٹ پلاتیں اور پاپا ہمیشہ ان کا پروموشن کر دیتے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ بیوی سے اونچا کوئی عہدہ نہیں ہوتا۔ چونکہ پاپا کی حکم عدولی کرنے ہمیں ممی کا ڈر بھی ہوتا اس لیے پاپا کا اثر و رسوخ سارے گھر پر بڑی شدت سے قائم تھا۔ کسی کا فون آئے تو کیا مجال کہ پاپا سے پہلے کوئی اٹینڈ کرتے پھر فونجیوں کی سی جرح کرتے۔ "کون ہو؟ کیا کام ہے؟" وغیرہ وغیرہ۔ اگلا یا تو تنگ آکر فون رکھ دیتا یا پھر ان کی جرح پہ جرح کیے جاتا لیکن سر آپی اور گرایی کی سہیلیوں اور امو بھائی اور خالد کے دوستوں نے خوب طریقہ ایجاد کیا تھا۔ وہ پاپا کے فون ریسیو کرتے ہی بڑے احترام سے کہتے۔

"ہیلو کرنل۔ میں میجر آفتاب کی بیٹی منزہ بول رہی ہوں پلیز ذرا گھر کو تو بلا دیں۔" اور پاپا بڑی شائستگی سے کہتے۔

"اوکے۔ ہولڈ آن پلیز۔۔۔" امو بھائی یا خالد کا کوئی دوست ہوتا تو خوب بھاری آواز میں کہتا۔

"آئی ایم کیپٹن یاسر۔۔ کرنل۔۔ آئی وانٹ یور سن امجد۔۔" اور پاپا فوراً اسے انتظار کا کہہ کے امو

بھائی کو بلوا دیتے۔ کوئی ملنے آتا تو کال بیل کی آواز پر پہلے خود گیٹ پر جاتے۔ عام طور سے ملنے والے ان کی آمد کے پریشان ہو کر لوٹ جاتے تھے لیکن اب تقریباً سب ہی جان گئے تھے اور بس ایک فوجی سیلوٹ کر کے آرام سے اندر چلے آتے۔ پھر جانے پاپا کو اچانک کیا سوجھی۔۔ یا شاید انھیں احساس ہو گیا تھا کہ ہنسنے' بولنے اور لڑنے پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ سو ایک روز انھوں نے سارے بچوں کو جمع کر کے کونھی کے کئی خالی کمروں کی صفائی کروائی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ اب کیا کرنے والے ہیں لیکن کسی کی کیا مجال تھی جو پوچھ کرتا پھر انھوں نے امو بھائی کو حکم دیا کہ وہ کچھ کارڈ بورڈ کے ٹکڑے لے کر آئیں۔ امو بھائی نے حکم کی تعمیل کی خالد کو حکم ہوا کہ اپنا برش اور رنگ لائے وہ بھی گیا۔ سب حیران و پریشان تھے کہ کیا ہونے والا ہے لیکن جب پاپا نے پہلے سیاہ کارڈ بورڈ پر سفید روغن کے ساتھ خود اپنے ہاتھ سے انگلش ورڈز میں (Laughing Room) لکھا تو سب کے چہرے پر ہنسی آگئی۔ اب ہم کسی حد تک پاپا کا مقصد سمجھ گئے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے مختلف کمروں پر باری باری (Weeping Room) (Fighting room) اور (Talking Room) لکھا اور مختلف کمروں کے دروازوں پر ٹنگوا دیا۔ اب کوئی ہنسے' روئے یا کوئی لڑے فوراً اسی مخصوص کمرے میں جانے کا حکم ملتا۔ کئی بار لوگوں نے مشورہ دیا انھیں مینٹل ہسپتال میں داخل کرادیں لیکن ممانا مانیں۔ ساری زندگی ان کی محبت میں اپنی فطرت کرنے والے پاپا۔ اب تھک کے ہار گئے تھے تو مما کیسے ان کا ساتھ چھوڑ دیتیں۔ پاپا کے اندر یہ ابال کبھی ان کی اولاد کے لیے دلچسپی کا باعث ہوتا تو کبھی انتہائی تکلیف دہ بھی ہو جاتا لیکن مما سب کچھ برداشت کرنے کو تیار تھیں مگر پاپا کا ساتھ چھوڑنا انھیں گوارا نہ تھا۔ پاپا اکثر ہم بہن بھائیوں کو فوج کی ٹریننگ دیا کرتے۔ اکثر جنگ کا زمانہ گھر میں اتر آتا۔ کبھی بلیک آؤٹ ہو جاتا اور کبھی بمباری ہونے لگتی۔

ایک دفعہ جب گوگو بھائی کی شامت آئی تو ایک ایسی رات کو چلے آئے جب ہمارے گھر میں بلیک آؤٹ تھا۔ سارے گھر کے بلب کاغذوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ شیشوں پر الگ کاغذ چڑھائے گئے تھے گھر بھر کی روشنی دم گھر کی گوگو بھائی سمجھے وولٹیج کم ہو گئی ہے۔ انھوں نے پینٹ کی جیب سے ٹارچ نکالی اور اس کی روشنی کی مدد سے پھونک پھونک کے قدم رکھتے آگے بڑھنے لگے۔ یکایک پاپا کی گونج دار آواز سے ان کی حیت ہم سب بری طرح دہل اٹھے۔

"ہالٹ"۔ گوگو بھائی کے قدم بے ساختہ رک گئے۔

"ہینڈز اپ (Hands up)"۔ ٹارچ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور دونوں ہاتھ بے اختیار اٹھ

گئے۔ ایک لمحے کو تو ان کی سمجھ نہیں آیا یا پھر یہی سمجھے ہوں گے کہ ہمارے گھر پہ کسی دشمن نے قبضہ کر لیا ہے پھر بات سمجھ میں آئی تو بچاؤ کی کوئی صورت دکھائی نہ دی۔ پاپا کے ہاتھ میں رائفل تھی جو ان کی ہاتھ سے لگی ہوئی تھی۔ وہ ہاتھ اٹھائے چپ چاپ اندر آ گئے۔

"بن جا مرغا۔۔۔۔۔۔۔۔" پاپا گرجے۔۔۔ اور وہ بوکھلائے ہوئے اکڑوں بیٹھ گئے۔

"کان پکڑ۔۔" اور بے چارے "مرتا کیا نہ کرتا" کے مصداق پہلی کلاس کے بچے کی طرح مرغا بن گئے۔ سر آپی اور گھر آپی کی ہنسی نکل گئی۔ "کھک۔ کھک۔ کھک۔۔۔" ہنسی روکنے کی کوشش میں مضحکہ خیزی آوازیں حلق سے نکل رہی تھیں۔

"سحر۔ گھر۔۔" پاپا چیخے اور وہ دونوں بے اختیار لا فنگ روم کی طرف بھاگیں کہ مبادا سزا کے طور پر کا بھاری ہاتھ ان کی پشت پر پڑے اور انھیں د۔ینگ روم کی طرف دوڑنا پڑے۔

گوگو بھائی نے مرغا بنے بنے بڑی حیرت سے انہیں دیکھا۔ دراصل گوگو بھائی بے چارے ایک عرصہ انگلینڈ میں گزار کے حال ہی میں پاکستان آئے تھے۔ انھیں پاپا کی دماغی حالت کے بارے میں علم تو تھا جو کچھ ہمارے گھر میں ہوتا تھا اس سے بے چارے لاعلم تھے کیونکہ انگلینڈ سے آنے کے بعد جب ان کی دعوت کی تھی تو پاپا کی حالت کچھ بہتر تھی۔ پاپا نے نہ صرف ان کے ساتھ میز پر کھانا کھایا تھا اچھی معقول گفتگو بھی کی تھی۔ ہر چند کہ لہجہ تحکمانہ تھا' وہی فوجیوں کی شان جو پاپا کی ذہنی بیماری سے کسی نے ان کے اندر نہیں دیکھی تھی اور پانچ برس پہلے جب گوگو بھائی کوئٹہ سے گئے تھے پاپا مخصوص' خوش مزاج اور نرم گفتار آدمی تھے مگر آج وہ گوگو کو مرغا بنائے کھڑے تھے۔ گوگو بھائی کی درگت دیکھ کے ممانے کہا۔

"اب ہارون غریب اس گھر کا رخ نہیں کرے گا۔" لیکن ہم جانتے تھے کہ ہارون بھائی سر آپی کو پیار کرتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ہمارے گھر آنا چھوڑ دیتے۔ گوگو بھائی تایا ابو کے بڑے بیٹے تھے۔ آپی ان سے صرف دو برس ہی چھوٹی تھیں۔ تھے تو وہ ارشد بھائی کے ہم عمر لیکن کبھی ان سے بنی نہیں بچپن سے ہی ارشد بھائی اور گوگو بھائی کی لڑائی رہتی تھی مگر سر آپی سے ان کی خوب دوستی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ محبت کی شکل اختیار کر گئی۔ جس وقت گوگو بھائی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے' سر آپی کالج کے پہلے سال میں تھیں اور اب وہ پانچ برس بعد لوٹے تھے۔ ہمارے گھر کا ماحول اس عرصے میں بہت بدل گیا تھا۔ ہم اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ملنے جلنے والے آتے تو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس لیے سب ہی کی کوشش ہوتی کہ زیادہ سے زیادہ وقت گھر سے باہر گزاریں۔ ویسے بھی نصف دن

اور اسکولوں میں ہی گزر جاتا تھا اور ممی کیسی صابر ہو گئی تھیں۔ وہ کبھی پاپا اور ان کے مسلط کردہ سے نہ گھبراتی تھیں ہم سارے بہن بھائی اگر کہیں جانے کا پروگرام بھی بناتے تو وہ پاپا کے ساتھ گھر

پاپا نے اپنی ساری زندگی ممی کے لیے اور صرف ممی کے لیے گزاری تھی۔ اپنے قومی فرائض کی ادائیگی بعد بھی وقت پاپا کو ملتا وہ سارا ممی کے لیے وقف ہوتا۔

پاپا کو جیسے ہی چھٹی ملتی وہ گھر دوڑنے کی فکر کرتے۔ جس کے نتیجے میں ہم تینوں اولادیں ان کی محبت کے میں اوپر تلے موجود تھیں جس وقت پاپا ریٹائر ہوئے ہماری سب سے چھوٹی بہن امر پانچ برس کی سب سے بڑے بھائی ارشد فوج کی ٹریننگ کے آخری مراحل میں تھے اور نمبر دو اسد بھائی کی ابھی ۔ درمیان کے ہم دونوں بہن بھائی مختلف کالجوں اور اسکولوں میں پڑھ رہے تھے۔ پاپا کی صف کے بعد ممی نے یا تو اپنا علاج کروالیا تھا یا پھر خدا کی دین ہی روٹھ گئی تھی ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا تیرہ کے بجائے اٹھارہ ہیں بہن بھائی ہوتے۔

ارشد بھائی اور اسد بھائی سے چھوٹی سحر آپی اور گھر آپی تھیں اور ان کے بعد بالترتیب امجد بھائی' خالد' (یعنی میں) پھر امبر' ثمر' ساجد' اشہر' سمند' اور سب سے آخر میں امر تھی۔

گھر وہاں کے نزدیک ایک گاؤں میں ہماری زمینیں تھیں۔ اناج کی فصلیں اور پھلوں کے باغات تھے سے بڑی معقول آمدنی ہوتی تھی۔ ہم تینوں بہن بھائی اچھے اسکولوں اور کالجوں میں پڑھتے تھے اور اصل کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ سر آپی سائیکالوجی میں ایم اے کر رہی تھیں۔ انھوں نے پاپا کا نفسیاتی یوں کیا تھا کہ پاپا دراصل ساری زندگی اپنے اندر کے مرد اور فوجی آدمی کو ممی کی محبت میں دبائے اب وہ تھک کے ہار گئے تھے اور اندر کا وہ مخصوص مردان کے ذہن کو قابو میں کر کے باہر آ گیا تھا۔ ساری سر آپی دنیا بھر کے لوگوں کا نفسیاتی تجزیہ کرتی پھرتی تھیں مگر خود اپنے آپ کو نہ سمجھ پائی تھی۔ بھائی انھیں بچپن سے چاہتے تھے۔ گو یہ چاہت ہمیشہ ایک معصوم دوستی تک محدود رہی لیکن وقت ساتھ اس کی جڑیں ان کے دلوں میں پختہ ہوتی جا رہی تھیں۔ انگلینڈ جانے سے پہلے گوگو بھائی نے عمل کے ان پر اظہار نہیں کیا تھا لیکن پانچ برس مغرب کی بے باک فضاؤں میں رہ کے وہ بالکل ہی بدل گئے تھے۔ ہماری بھی پروا کیے بغیر۔ پیار بھری نظروں سے انھیں تکا کرتے اور وہ شرم سے گلابی پڑ جاتیں۔ لیکن جانے کیا بات تھی۔ سر آپی ان سے محبت کرنے کے باوجود ان سے دامن بچایا کرتیں۔ وہ محفل میں راستہ روکتے تو بس نکل جانے کی کرتیں۔ ایک روز ہمارے سامنے ہی گوگو بھائی نے ان سے

کہا۔

"سحر' بائی گاڈ! ان پانچ برسوں کے بے شمار دنوں میں کوئی ایسا لمحہ نہیں جو میں نے تجھے یاد نہ کیا ہو۔"

"جھوٹے۔" سر آپی نے منہ بنایا۔ "وہاں ایسی حسین میموں کو دیکھ کے جناب کو جیسے ہماری یاد آتی ہوگی۔"

"سحر' تیری قسم! ایمان سے کوئی چارم نہیں ہے۔ میموں ویموں میں اصل کشش تو سانولی رنگت ہی ہوتی ہے۔ میں تو تعلیم کے لیے اتنا عرصہ رکا بھی۔۔ ورنہ مجھے تو اپنا مشرق ہی پسند ہے جہاں میری روح بستی ہے۔ میرے خوابوں کی شہزادی۔" انھوں نے ایسی میٹھی اور والہانہ نظروں سے انھیں دیکھا کہ وہ اپنے آپ میں سمٹ گئیں۔ سر آپی کی عادت تھی' وہ پڑھتے وقت اکثر اپنی ٹانگیں میز پر رکھ لیتی تھیں۔ ایسے میں کبھی گوگو بھائی آجاتے۔ تو کرسی کھینچ کر ان کے سامنے بیٹھ جاتے۔ سر آپی میز پر سے ٹانگیں اتارنا چاہتیں مگر وہ پکڑ لیتے۔ ہم نے کئی بار دیکھا وہ سر آپی کے پاؤں کے تلوؤں پر اپنے ہونٹ رکھ دیتے۔ سر آپی کا سارا خون کھنچ کے چہرے پر آجاتا۔ وہ بے اختیار اپنے پاؤں کھینچ لیتیں۔

"گندے۔۔" وہ منہ بنا کر کہتیں۔

"اب میں زیادہ دن تم سے دور نہیں رہ سکتا سحری۔۔" ایک دن انھوں نے کہا تو سر آپی کے اندر ایک دم سے خاموشی طاری ہوگئی۔ کچھ دیر بعد ہی بولیں تو آواز بوجھل تھی۔

"میں کہہ چکی ہوں ہارون میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔"

"سحر تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ آخر میرا اپنا بھی تو دل ہے نا میرے اپنے جذبات ہیں۔ وہ کتنے دن دبے رہیں۔ ان کے کہنے سے کیا ہوتا ہے ساری بات تو میری ہے نا۔۔"

"میں ایسے لوگوں کے درمیان زندگی نہیں گزار سکتی ہارون جو مجھے ناپسند کرتے ہوں۔" ان کی آواز میں بلا کا اعتماد تھا۔

"سحر پلیز۔۔ میرے اوپر رحم کرو۔ آخر میرے جذبے کی بھی کوئی حیثیت ہے کہ نہیں۔" وہ بے بسی سے بولے۔

"مجھے تمہارے جذبے کا اعتبار ہے ہارون اور بس یہی میری لیے بہت ہے۔۔" ان کے لہجے میں کچھ ایسا اطمینان تھا کہ ان کی آواز بھرا سی گئی۔ "تم انہی کے بیٹے اور بھائی ہو جو مجھے ناپسند کرتے ہیں۔ میں کیسے تم سے شادی کرلوں۔۔۔؟"

"وہ تمہیں سمجھ نہیں سکے سحر۔ تم میری بن جاؤ پھر دیکھو میں تمہیں کیسے منواتا ہوں۔" وہ بے بسی سے

بولے۔

"زبردستی منوانے سے کیا ہوتا ہے۔" پھیکی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیل گئی۔ "ضد کر کے آپ مجھ سے رشتہ دلانے پر مجبور کرلیں گے۔۔ لیکن میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ میری طرف سے انکار ہی ہو اور پھر کیا مجھے خبر نہیں کہ انھیں ہمیشہ سے گھر پسند رہی ہے۔۔"

"مگر مجھے تم پسند ہو۔۔۔ شادی مجھے کرنا ہے نہ کہ ان لوگوں کو۔۔۔" وہ ہمیشہ انھیں سمجھاتے۔ مگر وہ ایک ہی بات پر اڑی رہتیں کہ ان سے شادی نہیں کریں گی۔ حالانکہ اور بھی اچھی جگہوں سے رشتے آتے تھے وہ کہیں بھی نہ مانتی تھیں۔

نائی اماں' عائشہ اور ملیحہ آپا کو ہمیشہ سے گھر آپا پسند تھیں اور وہ تھی بھی ایسی ہی حسین گلابی گلابی سی بڑی بڑی سیاہ روشن آنکھیں' ننھی سی خوبصورت ناک' چھوٹا سا نرم و نازک دہانہ اور ٹھوڑی کا چھوٹا سا خم مگر اسے کیا کہیے کہ گوگو بھائی کو سر آپی بھا گئی تھیں حالانکہ کوئی بھی تو خاص بات ان میں نہ تھی رنگت بھی سانولی تھی۔ آنکھیں بھی عام سی' نہ زیادہ بڑی نہ چھوٹی۔ ناک بھی معمولی ہونٹ بھی خوبصورت نہ تھے۔ ہاں بس اچھی لگتی تھیں۔ کپڑے ان پر بہت جچتے تھے۔ ان کا دل بھی بہت پیارا تھا۔ ہم سارے چھوٹے بہن بھائی گھر آپی کے مقابلے میں سر آپی کو ہی زیادہ چاہتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بھی ہمارے ساتھ گھر آپی سے زیادہ پیار کرتی تھیں اور ہم سوچتے تھے یقیناً گوگو بھائی کے ساتھ گھر آپی سے زیادہ۔ سر آپی ہی پیار کرتی ہوں گی۔ جب ہی تو وہ انھیں پسند کرتے تھے۔ ورنہ سارا زمانہ گھر آپی پر حسین کہتا تھا یہ عجیب بات تھی کہ سر آپی اور گوگو بھائی کی محبت کا علم ہم بچوں کے علاوہ کسی کو بھی نہ تھا یا پھر گوگو بھائی کی ماں بہنیں جانتی تھیں۔ تایا ابو کو بقول گوگو بھائی کے کچھ پتا نہیں تھا۔ ورنہ وہ ان نے پایا سے بات کر کے کب کی شادی بھی انجام دے لی ہوتی اور گوگو بھائی کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان کے سامنے اپنی محبت کا بھرم کھولتے۔ نائی اماں یقیناً ان کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا رہی تھیں باہر انھیں ان کے خیال سے ہٹانے کی کوشش میں تھیں۔ ادھر ہمارے گھر میں بھی بڑوں میں سے کسی کو علم نہیں تھا۔

گھر والی سوچ رہی تھیں کہ سر آپی کسی اچھے رشتے کو قبول کریں تو وہ گھر آپی کی بات بھی طے کردیں۔ ادھر وہ گوگو بھائی کے ساتھ گھر آپی کو بھی اصل بات کا علم نہ تھا اور ہم بچے جانتے بوجھتے ایک دوسرے سے بھی چھپاتے تھے۔ آخر ہماری بڑی بہن کی بات تھی پھر ایک روز ہمیں بڑی عجیب بات کا پتا چلا یہ کہ گھر والی گوگو بھائی کو اتنی ہی شدت سے چاہتی ہیں جتنا کہ سر آپی۔ ہوا یوں کہ سر آپی اپنے مخصوص انداز

میں ٹانگیں میز پر رکھے۔ اپنی کتاب کے مطالعے میں منہمک تھیں کہ گوگو بھائی دبے پاؤں اندر آ
تو رہتے ہی ان کی ٹوہ میں تھے اس روز پہلی بار گھر آپی نے گوگو بھائی کو سر آپی کے پاؤں چومتے دیکھا
گلابی رنگت زرد پڑ گئی اور وہ اپنے کمرے میں جا کے بہت روئیں۔ اشہد' منہد اور امری نے
روتے دیکھا تو چلا چلا کے آسمان سر پر اٹھالیا۔

"چلو د۔ پنگ روم میں۔ چلو۔ ورنہ ہم پاپا کو بتاتے ہیں۔ پا۔ پا۔ گھر آپی۔ اپنے کمرے میں۔
ہیں۔" منہد نے چلا کے کہا تو پاپا فوراً اپنی رائفل لے کر باہر نکل آئے۔

گھر آپی نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور جب پاپا کمرے میں آئے تو وہ بالکل نارمل تھیں

"پاپا کوئی بھی بات نہیں۔ میری آنکھوں میں درد تھا۔ یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں"

اور پاپا نے ایک لائن سے منہد اور اشہد اور امری کو مرغا بنا دیا۔ اب وہ بے چارے کیسے بتاتے
آپی کی آنکھوں میں نہیں۔۔۔ ان کے دل میں درد ہے۔

تائی اماں نے کئی بار دبے لفظوں میں ممی سے گھر آپی کے لیے کہا تھا اور یہ بات کسی سے چھپی
تھی۔ اب گھر آپی بھی کیا قصور کہ انھوں نے گوگو بھائی کو دل میں بسالیا تھا۔ یہ بات الگ تھی کہ
انھیں گوگو بھائی سے دور رکھتی تھی۔ وہ خود بھی ان سے ایسے بے تکلف نہ تھے بلکہ سر آپی کے
ان کی دانت کاٹی روٹی تھی۔

ادھر سر آپی تھیں کہ باوجود گوگو بھائی کو چاہنے کے' ان کی محبت سے برابر دامن چھڑا رہی تھیں
کہ تائی اماں' عائشہ آپا اور ملیحہ آپا انھیں پسند نہیں کرتی تھیں۔ وہ گھر آپی کو چاہتی تھیں۔

بھلا سر آپی اپنی توہین کیسی گوارا کر لیتیں وہ جانتی تھیں کہ گوگو بھائی انھیں شدت سے چاہتے
جانے کیوں وہ ان کی ماں بہنوں کا انتقام ان سے لے رہی تھیں۔ ہم گوگو بھائی کی محبت کو مانتے
آپی کے لاکھ انکار کے باوجود بھی وہ ہمت نہ ہارے تھے اور برابر آتے اور انھیں قائل کرنے کی
کرتے۔ اس روز بھی وہ ہمارے گھر آئے ہوئے تھے اور سر آپی کے کمرے میں حسب عادت اپنے
کی شدت کو منوا رہے تھے۔ ممی کی خرابی صحت کی وجہ سے خاندان کے اچھے خاصے لوگ ان کی
پرسی کو آئے ہوئے تھے۔ چچا چچی' چھوٹی' بڑی پھوپھو اور پھوپھا ابا بھی تھے۔ پاپا خلاف معمول ممی
سے لگے بیٹھے تھے۔ بچے ادھر ادھر اپنے اپنے کھیل میں مگن تھے۔ گھر آپی کچن میں تھیں اور گوگو
آپی کے کمرے میں موقع پا کر گھس گئے۔ وہ انہیں حسب معمول قائل کرنے پر تل گئے۔

"تم انہیں بھیج کر دیکھو۔ میری طرف سے انکار ہو گا تب پتا چلے گا۔۔۔" وہ بدستور اڑی ہوئی تھیں

"پتا نہیں تم ایک بات کو سمجھتے کیوں نہیں۔ خاموشی سے گھر کے ساتھ شادی کرلو۔ سب خوش ہو گے۔"

"مجھے نہیں ضرورت سب کو خوش کرنے کی۔"

وہ نرم لہجے میں بولی۔ "تو پھر انگلینڈ چلے جائیں اور وہاں سے لے آئیں کوئی حسن کی پری۔۔۔"

"دیکھو سحر۔" وہ سنجیدہ ہو کر بولے۔ "میں نے امی کو آخری فیصلہ دے دیا ہے۔ اچھی طرح لینا۔ تمہارا انکار مجھے ان کے سامنے شرمندہ کردے گا۔۔۔"

"اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم انہیں مت بھیجو۔۔۔" وہ بے حسی سے بولیں۔

"خدا کے لیے سحر مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔۔۔ زندگی ہم دونوں کو گزارنا ہے۔۔ یہ سب لوگ حیثیت رکھتے ہیں۔ اپنے آپ پر جبر مت کرو بے وقوف لڑکی۔ زندگی اتنی سستی نہیں ہے جتنی رہی ہو۔"

"میں جیسی بھی ہوں۔ ٹھیک ہوں۔ میری مرضی ہے میں اپنی زندگی کو جیسے بھی استعمال کروں۔"

"دیکھو سحر۔ اگر تم نے انکار کیا نا تو بائی گاڈ زندگی بھر شادی نہیں کروں گا اور چلا جاؤں گا کہیں صورت نہیں دکھاؤں گا۔ بیٹھی پچھتاتی رہنا۔" جذبات کی شدت سے گوگو بھائی کی آواز بھرا گئی۔ کی آنکھیں جل تھل ہو رہی تھیں لیکن گوگو بھائی کی طرف پشت کیے آنسوؤں کو حلق سے اتارتے وہ بڑے مضبوط لہجے میں بول رہی تھیں۔

یک لخت گوگو بھائی نے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر ان کا رخ اپنی طرف پھیر لیا۔ بھیگی پلکیں اور ہونٹ دل کا سارا راز کھول گئے۔۔۔ گوگو کا چہرہ تپنے لگا۔ جی چاہا انھیں اپنے سینے میں چھپا کے ایسا کردیں کہ وہ کہیں بھی نہ جاسکیں۔ گوگو بھائی جھکے اور عین اسی وقت پاپا کی بھاری گرج دار آواز گھر میں گونج گئی۔

"ہالٹ۔۔۔ اباؤٹ۔۔۔۔ ٹرن۔۔۔" دونوں کانپ گئے۔ بے ساختہ پلٹ کے دیکھا۔ پاپا اپنی لیے کھڑے تھے "ہینڈز اپ۔۔۔" پاپا پھر چلائے "کم آن۔۔ ہری اپ" وہ رائفل کی نال سے انھیں چلنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر پاپا کے حکم کی تعمیل نہ ہوئی تو وہ گھر بھر میں تماشا لگ گے۔ سو دونوں نے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے سر آپی نے چاہا کہ چپکے سے لیکن پاپا کی عقابی نظریں بڑی ہوشیاری سے ان کی نقل و حرکت کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"پاپا پلیز۔۔۔۔۔ مجھے معاف کردیجیے۔" سر آپی نے پاپا سے التجا کی مگر انھوں نے کوئی

سر آپی کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا وہ گھبرا رہی تھیں کہ لوگ دیکھ نہ لیں۔ وہ بے چین تھیں کہ پاپا سزا دینی ہے جلدی سے دیں تاکہ اس طرح وہ موقع پا کر نکل جائیں ورنہ اگر لان میں دوڑ لگانے کا ہوا جیسا کہ وہ عام طور سے کرتے تھے تب کیا ہوگا لیکن پاپا دونوں کو اپنی رائفل پر بدستور آگے لیے تھے۔ انھوں نے کوئی معمولی سزا انہیں نہیں دی۔ سر آپی انھیں جانتی تھی کہ آج پاپا نے ان کا مارشل کردیا ہے۔ پاپا کی گونج دار آوازیں سن کر ہال کمرے سے کئی لوگ باہر نکل آئے۔ جن میں بھی تھے اور عائشہ آپا، ملیحہ آپا اور چھوٹی پھوپھی بھی۔ ممی نے سوچا کہ شاید آج کوئی نئی بات ہے جو اور شور سے چلا رہے ہیں سو وہ بھی تائی اماں کا سہارا لیے باہر آگئیں۔ سر آپی یک لخت بوکھلا گئیں۔ بے اختیار اپنے کمرے کی طرف دوڑیں لیکن پاپا نے کسی بھی لمحے کی تاخیر کیے بغیر رائفل ان کے کر کے راستہ روک دیا۔ پھر بازو سے پکڑ کے انھیں گوگو بھائی پر دھکیل دیا۔ گوگو بھائی اگر انھیں سنبھال نہ لیتے تو یقیناً وہ گر جاتیں ان کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ دیکھ کر ہم اصل بات کی تہ تک پہنچ گئے اس عجیب سی صورت حال نے گوگو بھائی کو بوکھلا دیا تھا۔ سارے لوگوں میں ایک تایا اور ابو اور امی ہی معاملے کی گہرائی تک پہنچ کے حیرت زدہ کھڑے تھے شاید ممی سوچ رہی تھیں کہ ان جانے میں وہ تائی پر کیسا ظلم کرتی چلی تھیں اور تایا ابو یقیناً سوچ رہے تھے کہ گھر کو مانگ کر ان کی بیوی کیسا جرم کی جارہی تھی۔ یہ سب ہی انہیں دیکھ رہے تھے۔ سر آپی کا رنگ فق ہو گیا تھا اور ہونٹ سفید ہو رہے تھے گوگو بھائی جھینپے جھینپے ہنس رہے تھے اور پاپا رائفل تانے اٹینشن کھڑے تھے۔

ایک سر آپی کے نتھنے پھڑکے۔۔۔ اور وہ بے اختیار رو پڑیں۔ پاپا دم بخود ہو کر انھیں دیکھنے لگے۔ ان نے نہ تو گوگو بھائی کو لاڈ فنک روم میں جانے کو کہا اور نہ ہی سر آپی کو دینگ روم میں۔۔۔ سب ان احکامات کے منتظر تھے کہ یکایک انھوں نے رائفل پھینک کے بے اختیار دونوں کو بازوؤں میں لیا اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ ان دونوں کے چہرے اس قدر نزدیک تھے کہ سر آپی کا زرد چہرہ یک لخت گلابی ہو گیا اور گوگو بھائی شرارت سے مسکرا دیے۔

انہیں بھینچے بھینچے زور سے کہا۔

ری۔۔ کھانا لاؤ ہمارے کمرے میں۔۔۔" وہ قطعی نارمل نظر آنے لگے تھے۔ ممی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ انھوں نے مسکراتی ہوئی جھلملاتی آنکھوں سے پاپا کو دیکھا اور بے اختیار کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

ایک آبلہ پا کے طویل تر مسافت جسے کے لمبے میں رشتوں کا متدد جزیرہ پا تھا، اک جہد مسلسل کہ ناتمام رہی۔

بدن کا بوجھ لیے، رُوح کا عذاب لیے
کدھر کو جاؤں طبیعت کا اضطراب لیے

سیما غزل

کمند

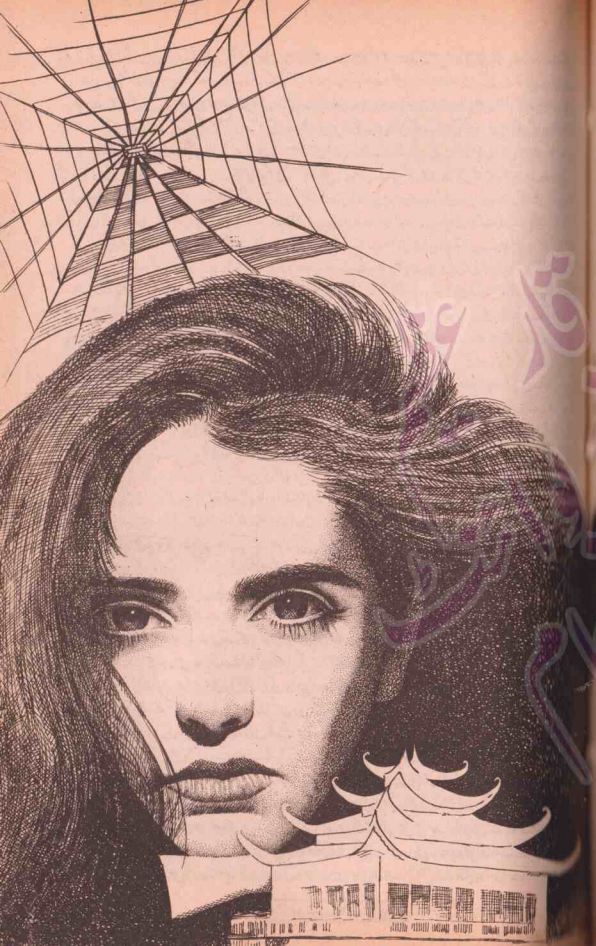

میرا نام تارا تھا۔ میری ماں جس کی کسی حادثے میں قوت گویائی ختم ہوگئی تھی مجھ سے بے پناہ پیار کرتی تھی اور کبھی کبھی اس سے دھتکار دیتی تھی۔ کبھی اس کا ذہنی توازن بگڑ جاتا۔ ابا کا رویہ مجھ سے سگے باپ جیسا نہ تھا۔ بھائی ماں باپ کی بے پروائی سے بگڑ چکا تھا۔ بڑی بہن کی شادی ہوگئی تھی ایک بہن مجھ سے چھوٹی تھی۔ بہن بھائی مجھ سے پیار کرتے تھے مگر میں ابا کی محروم تھی۔ جوان ہوگئی تو بھی ابا کے رویے میں کوئی فرق نہ آیا۔ ایک روز وہ ایک حادثے میں زخمی ہوگئے۔ میں نے ان کی تیمارداری کرنا چاہی تو انھوں نے اپنی نفرت کا اظہار برملا کردیا اور مجھے مرجانے کے لیے زہر کی شیشی دی جسے میں نے ان

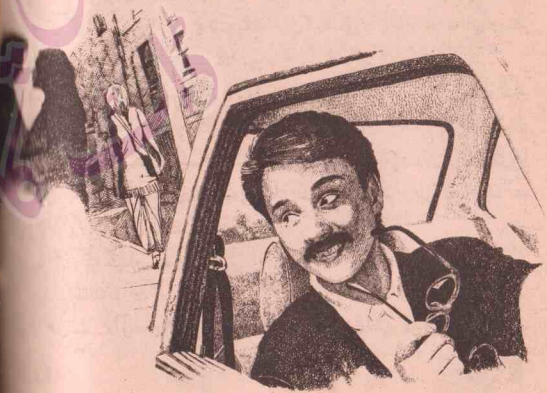

یہ دیکھ کر چیخ اٹھیں ان کی گویائی واپس آگئی انھوں نے زہر مجھ سے چھین لیا اور بتایا کہ میں ان کی بیٹی نہیں ہوں وہ ا
اپنی صفائی پیش کررہی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ مسلم کش فسادات میں جب انھیں سکھ اٹھا کر لے گئے تھے تو ان کی
اور عورت بھی تھی جس کا نام ثریا تھا اور میں اس کی بیٹی ہوں۔ میرے باپ کا نام سکندر تھا وہ انڈیا میں کسٹم آفیسر تھا
زاد ہونے کے علاوہ منگیتر بھی تھا مگر خاندانی دشمنی کی بنا پر شادی نہ ہوسکی۔ میں اسی سکندر کی بیٹی تھی۔ میری شکل کیوں کہ
اور میرے باپ سے ملتی ہوئی تھی اس لیے ابا میرے سلسلے میں اماں پر شک کرنے لگے تھے کیونکہ اماں سال بھر بعد گھر
تھیں اور میں ان کی گود میں تھی۔ اماں کی قوت گویائی ختم ہوچکی تھی اس لیے وہ کسی کو نہ بتا سکیں کہ میں کون ہوں۔
کہانی سن کر خوش ہوگئے مگر میں نے بھرے گھر میں خود کو تنہا محسوس کیا۔ یہ پھانس میرے دل میں ایسی چبھی کہ میں
تلاش میں بغیر سوچے سمجھے گھر سے نکل پڑی۔ گھر سے نکلتے ہی میری ملاقات طاہر سے ہوئی۔ طاہر ہمارے گھر کے پیچھے
کوٹھی میں رہتا تھا۔ مجھے تنہا دیکھ کر وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے اسے ساری بات بتائی تو اس نے میری مدد کا وعدہ
چار پانچ روز اس کے گھر میں رہی، وہاں عجیب پراسرار واقعات ہونے لگے۔ طاہر کا باپ بڑا بزنس مین تھا اور ملک سے
مجھے طاہر نے چھپا کر رکھا مگر میں نے اس کی غیر موجودگی میں کوٹھی کا جائزہ لیا تو مجھے وہاں کچھ ایسے لوگ نظر آئے جن کو
طاہر نے چھپایا تھا۔ پھر اس نے مجھے ایک فلیٹ میں منتقل کردیا۔ وہاں ایک لڑکی زینت کو میری ملازمہ کی حیثیت سے رکھا
اپنے بھائی کے گلے میں ایک سونے کا لاکٹ دیکھا تھا جو بعد میں طاہر کے گھر سے مجھے ملا۔ میں نے اسے چھپا لیا۔ بعد میں پتا
لاکٹ بہت اہم تھا اور اس کے لیے طاہر نے زاہد بھائی کو کئی روز قید میں رکھا اور ان پر تشدد بھی کیا۔ یہ دیکھ کر میں
حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کرنا شروع کردی۔ طاہر نے مجھے اپنے باپ سے ملایا اور انھوں نے مجھے اپنے دفتر میں نوکری
وہاں جا کر پتا چلا کہ وہ لوگ بہت بڑے اسمگلر ہیں اور مجھے بھی پوری طرح پھانس چکے ہیں۔ میں چاہوں بھی تو ان کے چنگل
نکل سکتی۔ طاہر مجھے پسند کرتا تھا اسی لیے وہ مجھ سے بے تکلف ہوگیا اور اس نے بتایا کہ وہ بھی دنیا میں تنہا ہے اور اشرف
جسے وہ باپ کہتا ہے دراصل اس کا باپ نہیں ہے بلکہ اس نے بمبئی میں اسے فٹ پاتھ سے اٹھا کر پالا پڑھایا لکھایا اور اب
بھی اپنے ناجائز کاروبار میں شریک کرلیا تھا۔ وہ بھی ان لوگوں سے الگ ہونا چاہتا تھا مگر یہ ممکن نہ تھا اس لاکٹ کے بارے
نے بتایا کہ اس میں اہم فلم ہے جو اشرف علی خان کے تمام مذموم کاروبار کو تہس نہس کرسکتی ہے۔ تب میں نے ا
لاکٹ میرے پاس ہے۔ اشرف علی خاں کا کاروباری حریف سیٹھ سلیمان میرے پیچھے پڑ گیا میری ملازمہ اسی کے گروہ
تھی جب یہ بات کھلی تو طاہر نے اسے ہمارے لیے کام کرنے پر مجبور کردیا۔ اسی رات سیٹھ سلیمان کے آدمیوں نے ا
اشرف علی خان سمجھ رہا تھا کہ لاکٹ سیٹھ سلیمان کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ اس کا ذمے دار وہ طاہر کو سمجھتا تھا۔ میں بھی
سلیمان کی نظروں میں آگئی تھی اس لیے اشرف علی خان نے مجھے بتایا کہ مجھے فوراً یہ ملک چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ سنتے ہی
گھومنے لگا۔ میرا وجود کسی ایسے پتھر سے کچھ زیادہ نہ تھا جو لوگوں کی ٹھوکروں میں پڑا ہو۔

مجھے بنکاک بھیجنے کا فیصلہ ہوگیا۔ باس نے بتایا کہ وہاں مس انجلا میری ٹریننگ کریں گی۔ میں طاہر کے لیے پریشان تھی
سے رابطہ نہیں ہورہا تھا۔ وصی صاحب نے کہا کہ مجھے اگلے ہفتے بنکاک کے لیے روانہ ہوجانا ہے۔ میں آفس سے گھر جا
لفٹ میں ادریس مل گیا۔ یہ میرا چپراسی رہا تھا اس کی حالت بہت خراب تھی۔ پتا چلا کہ اس کا بھائی بیمار تھا اور باس
لیے پیسے تو دے دیے تھے مگر گھر جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ وہ اسی وقت گھر جارہا تھا میں بھی اس کے ساتھ اس
گئی۔ جہاں پتا چلا کہ اس کی ماں اور بھائی دونوں مرچکے ہیں۔ ادریس پاگل ہورہا تھا مگر میں نے اسے قابو کیا اور کہا کہ اگر
اور طاہر کا ساتھ دے تو ہم ان لوگوں کے خلاف کچھ کرسکتے ہیں۔ وہ فوراً تیار ہوگیا بعد میں مجھے پتا چلا کہ اسے بھی بنکاک
ہے۔ یہ خبر میرے لیے اچھی تھی اس طرح میں خود کو تنہا محسوس نہیں کرتی۔ اسی نے بتایا کہ طاہر کو اشرف علی خان نے ا
آدمیوں کے ساتھ کہیں بھیج دیا ہے بعد میں یہ بھی پتا چلا کہ وہ ان لوگوں کی حراست میں ہے جس روز مجھے بنکاک جانا تھا
طاہر نے ڈاکٹر ذاکر کے ہاتھ مجھے خط بھیجا کہ میں پریشان نہ ہوں اور وہ مجھے بنکاک میں مل جائے گا۔ میں نے بنکاک جاتے
لاکٹ کو سنبھال کر رکھ لیا۔ اس فلائٹ سے ادریس بھی جارہا تھا گویا میں اکیلی نہ تھی۔ ایئرپورٹ پر وصی صاحب نے ایک
کا پیکٹ میرے حوالہ کیا کہ میں اسے انجلا تک پہنچادوں۔ فلائٹ میں میری ملاقات پرکاش سے ہوئی جو انڈیا سے کراچی آ

جارہا تھا۔ وہ سکھ تھا اور اس نے بتایا کہ اس کا باپ بنکاک میں کاروبار کرتا ہے وہ مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ سفید پیکٹ
رکھا تھا۔ اسے میں نے مضبوطی سے تھام لیا۔
ایئرپورٹ پر انجلا مجھے لینے آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پلے کارڈ تھا جس پر میرا نام لکھا تھا۔ پرکاش کے ڈیڈی بھی
تھے میں پرکاش کے ساتھ ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر آئی تو اس کے ڈیڈی مجھے دیکھ کر ساکت رہ گئے۔ پرکاش نے میرا
تعارف کرایا تو وہ بول اٹھے "یہ.... یہ ثریا کی بیٹی ہے۔" ان کا جملہ سن کر میں اچھل پڑی۔ وہ میری ماں کا نام لے رہے تھے
بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر وقت نہیں تھا۔ انجلا میری منتظر تھی اس لیے میں نہیں رکی اور میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں
میں پرکاش کے ڈیڈی سے ملوں گی۔ انجلا مجھے لے کر ایک بڑی عمارت میں داخل ہوگئی۔ یہیں ہماری رہائش تھی۔ اس
ایک تھائی لڑکی توک بھی تھی جب میں وہ سفید پیکٹ لیے باہر آرہی تھی اسی وقت کسی نے میری تصویر کھینچ لی۔ روشنی کے
مجھے احساس ہوا۔ پھر جب میں نے گھر آکر وہ پیکٹ مس انجلا کو دیا تو توک نے ہماری تصویر کھینچ لی۔ بعد میں مجھے معلوم
پیکٹ میں ہیروئن تھی۔ گویا میں پوری طرح ان لوگوں کے قابو میں تھی۔ انجلا نے مجھے بتایا کہ اب مجھے ان کی ہدایت پر
کرنا پڑے گا اور یہاں سے نکلنے کی ہر کوشش میرے لیے بے کار ہوگی۔
انجلا کو بھی سب کچھ بتا چکی تھی کہ میں اجنبی لوگوں میں ہوں اس لیے اس نے میرا تعاقب کر کے میری رہائش گاہ کا پتا
اس سے دوبارہ نہ مل سکی۔ انجلا نے مجھے بتایا کہ ہماری میٹنگ ہے جہاں پاکستان سے آئے ہوئے کچھ لوگ اور بھی
میں یہ سن کر خوش ہوگئی تھی کہ شاید ان میں طاہر بھی ہو یا شاید میری ملاقات وہاں ادریس سے ہو میں انجلا وہاں پہنچے تو
عالی عمارت تھی۔ ہم ایک کمرے کے دروازے تک پہنچ گئے۔ انجلا نے دروازے پر دستک دی۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ
دروازے میں کھڑے شخص کو دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گئی۔
شخص تھا جو میرے ایکسیڈنٹ پر ڈاکٹر ذاکر کے ساتھ آیا تھا۔ جسے میں طارق کے نام سے جانتی تھی۔ اسی نے زینت کو
تھی کہ وہ مجھے کھلادے اور رات کو مجھے بے ہوشی کی حالت میں اغوا کرلیا جائے۔ میں اسے دیکھ کر بھونچکی رہ گئی۔ وہ
کر خوفزدہ تھا مگر میں نے کسی پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔ اس میٹنگ میں طارق کے علاوہ گل بھی موجود تھی۔ یہ وہی
میں طاہر کی کوٹھی میں ملازمہ کی حیثیت سے دیکھ چکی تھی اور جس کے بارے میں طاہر نے بتایا تھا کہ وہ گونگی ہے یہ
کر طاہر یا ادریس مجھے کہیں نظر نہ آئے۔ باقی تمام لوگ میرے لیے اجنبی تھے مسٹر وقار سے میری ملاقات ہوئی جو یہاں
سربراہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ پارٹی میں طارق نے موقع ملتے ہی مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے اس کے بارے میں کسی کو کچھ
لیے بہتر نہ ہوگا۔ اس کی دھمکی نے مجھے خوفزدہ کردیا۔ انجلا نے میرے خوف کو محسوس کرلیا۔ بلکہ اس نے نوٹ کرلیا
طارق سے خوفزدہ ہوں۔ وہ جان چکی تھی اس لیے مجھے تمام بات اسے بتانا پڑی۔ اس نے یہ ذکر مسٹر وقار سے بھی کیا۔ مسٹر
ہوئے کچھ سوالات کے پھر مجھے اطمینان دلایا کہ میں بے فکر رہوں۔ میرے مشوروں سے خوش ہو کر مسٹر وقار نے مجھے
ادی اور اپنا پرسنل سیکریٹری بنالیا۔ میں اس عہدے پر خوش تھی کیونکہ اس طرح میرا کام آسان ہوگیا تھا۔ مجھے جو اعتماد
علاوہ میں کرچکی تھی۔ میں مسٹر وقار سے اجازت لے کر اپنی مرضی سے گھومتی پھرتی رہی۔ لاکٹ کو میں نے بڑی محفوظ
رکھا تھا۔ میری ٹریننگ بھی شروع ہوچکی تھی اور ایک تھائی ڈرائیور مجھے ڈرائیونگ سکھانے پر مامور کردیا گیا تھا مگر اسی رات
اطلاع ملی کہ ایک پاکستانی کو اس کام کے لیے چن لیا گیا ہے اور وہ ہمارے ہی ساتھ بہ حیثیت باورچی کے رہے گا۔ اس کا
حالت ہی ہوگا۔ جب میں اس پاکستانی سے ملی تو حیرت زدہ رہ گئی وہ ادریس تھا۔ ادریس کی وجہ سے میں خود کو اچانک بہت
محسوس کرنے لگی تھی۔ پھر ایک روز میں ادریس کے ساتھ پرکاش کے گھر پہنچ گئی میں ادریس کو تمام داستان سنا چکی تھی اور
بتایا تھا کہ پرکاش کے ڈیڈی میرے ماں باپ کے بارے میں جانتے ہیں اور مجھے ہر حال میں اپنے باپ کا پتا چاہیے۔ ہم
گھر پہنچے تو اس کے ڈیڈی سراسیمہ ہوگئے کیوں کہ ان کے پاس کچھ لوگ آئے ہوئے تھے اور یوں لگ رہا تھا کہ وہ ان
سامنے مجھے نہیں لانا چاہتے یا ان لوگوں سے خوفزدہ ہیں۔ مہمانوں کے جانے کے بعد پرکاش کے ڈیڈی نے بتایا کہ انھوں
اماں کی درخواست پر ہی انھیں قتل کردیا تھا تاکہ وہ سورج سنگھ سے محفوظ رہ سکیں۔ یہ بات سن کر پرکاش اپنے باپ سے
لگا مگر میں نے اسے سنبھالا اور بتایا کہ تمھارے ڈیڈی ہی کی وجہ سے میں زندہ بچ سکی تھی یہ وہی سورن سنگھ تھا جس نے مجھے

اماں کی گود میں دے کر سکھوں کی قید سے فرار کرایا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو آج میں اور اماں بھی دنیا میں نہ ہوتے۔ پھر پرکاش کے ڈیڈی سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھا۔ ابھی نہوں نے بتانا شروع کیا تھا کہ اچانک کال بیل بجی تو وہ اٹھ کر چلے گئے۔ میں جان چکی تھی کہ یہاں کچھ دیر پہلے سورج سنگھ تھا۔ وہی سورج سنگھ جس نے میری ماں کو اغوا کر کے اس پر اتنا تشدد کیا جان بار بیٹھی۔ پرکاش سے بتا چلا کہ آنے والا سورج سنگھ ہے۔ یہ سن کر میں اپنے حواس کھو بیٹھی اور پرکاش کے ڈیڈی کو کرنے اور پرکاش کے روکنے کے باوجود باہر کی جانب بھاگی۔ میں غصے اور صدمے سے اندھی ہو رہی تھی اور باہر کی جانب بڑھ رہی تھی کہ اچانک کسی نے مجھے جکڑ لیا۔

ہوش آیا تو میں پرکاش کے کمرے میں تھی میں سورج سنگھ کے بارے میں سن کر پاگل ہو گئی تھی اور اس تک پہنچنا چاہتی تھی مگر سورن سنگھ نے میری کنپٹی پر دباؤ ڈال کر بے ہوش کر دیا تھا۔ اس وقت مجھے بہت دیر ہو گئی تھی میں اپنے باپ کے بارے میں جاننا چاہتی تھی مگر بات ادھوری رہ گئی تھی۔ اس وقت میں زیادہ دیر رک نہیں سکتی تھی اس لیے میں ان سے آنے کا کہہ کر واپس چلی آئی۔ آنے کے بعد پتا چلا کہ طاہر کا کارڈ آیا ہے یہ کارڈ طاہر نے ڈاکیڈ اکر کے نام سے بھیجا تھا یہ سب جان کر خوش ہو گئی کہ طاہر نہ صرف یہ کہ زندہ ہے بلکہ میرے ٹھکانے سے بھی واقف ہے۔ اسی روز اسلام ایک آسیب زدہ عمارت میں لے گئی۔ یہ عمارت شہر سے بہت دور تھی وہاں پہنچ کر پتا چلا کہ اس عمارت میں طارق کو لایا گیا ہے اور اس پر بے پناہ تشدد کیا گیا ہے وہاں مسٹر وقار بھی موجود تھے میں یہ سب دیکھ کر خوفزدہ تھی اور جب طارق نے لائٹ کے بارے میں کہا کہ وہ اس کے پاس ہے اور وہ لوگ کسی حال میں بھی اسے حاصل نہیں کر سکتے تو میں حیران رہ گئی کیونکہ لائٹ میرے پاس تھا۔ طارق نے میرے بارے میں مسٹر وقار کو بتایا کہ میں دھوکا دے رہی ہوں مگر مسٹر وقار اس کی بات کا اعتبار نہ کیا حالانکہ میں اپنا پول کھل جانے پر خوف زدہ ہو گئی تھی۔ طارق کو مار دینے کا حکم دے کر وہ ہم لوگوں کو لے کر باہر آ گئے۔ وہیں مجھے اسنجا سے پتا چلا کہ ان لوگوں نے اسنجا کے محبوب اور منگیتر کو بھی قتل کر دیا تھا۔ مسٹر وقار مجھ سے بے حد متاثر تھے اور تنظیم میں اعلیٰ مقام دے رہے تھے مگر اسنجا یہ نہیں چاہتی تھی اس نے اکسایا کہ میں چند دن کی چھٹی لے کر بنکاک میں گھوموں پھروں۔ میں خود بھی یہی چاہتی تھی کیونکہ مجھے سورن سنگھ سے باپ کا پتا معلوم کرنا تھا میں اگلے روز ہی سورن سنگھ کے گھر پہنچ گئی۔ مسٹر وقار نے میری چھٹی منظور کر لی تھی وہاں پتا لگا کہ سورج سنگھ کالج کے زمانے سے میری ماں کو چاہتا تھا مگر میری ماں نے اسے بالکل لفٹ نہ دی اسی لیے وہ اس کے گیا تھا۔ مسٹر وقار میرے نانا وغیرہ کے محلہ چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے۔ سورج سنگھ نے میری ماں کو بہت تلاش کیا مگر نام رہا اسکا اسمگلنگ کرنے لگا ایک مرتبہ اس کا آدمی اور کافی مال ایک کسٹم آفیسر نے پکڑ لیا اور اس کی بھیجی ہوئی رشوت بھی قبول کی۔ سورج سنگھ اس کسٹم آفیسر کو قتل کرنے کی غرض سے اس کے گھر تک پہنچ گیا وہاں جا کر اسے پتا چلا کہ وہ کسٹم آفیسر یعنی میری ماں کا شوہر ہے اس نے قتل کا ارادہ ترک کر دیا اسے اپنی محبوبہ کو پانے کی خوشی تھی انھی دنوں میں میری پیدائش کے تیسرے مہینے ملک میں فسادات شروع ہو گئے اور اس نے میری ماں کو اغوا کیا مگر میری ماں ایک غیرت مند عورت تھی اس نے جان دے دی مگر اس کے ہاتھوں عزت بچالی۔ سورن سنگھ نے کہا کہ وہ خود سورج کو پسند نہیں کرتا فی الحال اس سے انتقام لینا ممکن نہیں ہے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ خود مجھے میرے باپ کے پاس لے چلے گا جو آخری اطلاع کے مطابق حیدر آباد میں تھا۔ بس انتقام لینے پر مصر تھی مگر سورن سنگھ مجھے روک رہا تھا اس کا خیال تھا کہ میں ابھی اس سے بہت ملتی ہوں اس لیے سورج سنگھ میرے ساتھ زیادتی کر سکتا ہے۔ میں نے اصرار کیا تو وہ خوف سے پاگل ہو گیا۔ پرکاش نے کہا کہ یہ آپ کی مرضی کے سوا کچھ نہیں کرے گی اس کی حالت ایسی تھی کہ مجھے بھی اقرار کرنا پڑا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر رو دی۔

اب آپ

ل جائے کب تک روتی رہی۔ سورن سنگھ بستر پر یوں لیٹے گہری سانس لے رہے تھے جیسے کڑی مسافت کے آئے ہوں۔ اور ایسں بھی بہت اداس تھا اور اس کی ماں بالکل سرخ ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ے ساتھ باپ کے لیے بے پناہ پیار بھی تھا۔ کمرے ب میری سسکیاں گونج رہی تھیں اور نہ معلوم کیوں رہا تھا جیسے یہ سسکیاں ختم ہوئیں تو گویا زندگی ہی جائے گی۔

ڈیڈی۔" پرکاش کی گھمبیر آواز نے پورے کمرے کے ر قرار کیا۔

سورن سنگھ نے بند پپوٹے کھول دیئے۔ ان کی آنکھوں ب کرب پھیلا ہوا تھا۔

ملیے ہو گیا؟" پرکاش نے جھک کر ان کی پیشانی پر دیئے۔ مجھے یوں لگا جیسے سورن سنگھ کی بے کو سکون آ گیا ہو۔ ان کی کیفیت بالکل اس مجرم کی سی جاسی کے شکنجے پر زندگی کی نوید دی گئی ہو۔

ں۔ ہاں۔ پتر پرکاش۔ اب تو تیرے دل میں میل

ڈیڈی۔ مجھے۔ مجھے کہہ کر میں تمہاری

ں نے دھیرے سے اسے خود سے قریب کرلیا۔ اب کلٹ چکا ہوں پتر۔ برسوں جلا ہوں نرکھ میں' رحل دکھاوں گا تو نرکھ کے شعلے میرے من کو ں گے پتر۔ ورنہ۔ ورنہ فضاؤں میں ڈولتی میری ہی گھٹی چکراتی رہے گی۔ شانتی نہ پا سکے گی اور میں ہوں پرکاش پتر۔ میں تجھے کہے دیتا ہوں' میرا بیٹا بنانے والا ہوں۔" وہ اتنا کہہ کر لمحہ بھر پھولی ہوئی سانس پر کچھ قابو پا کر پھر کچھ کہنے ہی کہ کمرے میں بول اٹھی۔

اب آپ خود کو کیوں تکلیف دے رہے ہیں۔ کوئی گناہ نہیں رہا۔ آپ نے جو کچھ کیا شاید ہو جاتا۔ میں بھی تو نہیں بھی کیا کرتی۔ اب آپ جلدی ہو جائیے۔ ہم پائے جائیں گے ڈیڈی۔ خوب پھریں گے' انوائے کریں گے' میں بنکاک کو دکھانا چاہتی ہوں۔ پتا نہیں پھر میں یہاں واپس آ ں یا نہیں اور۔ اور اب تو طاہر بھی آنے والا

ہے۔" آخری جملہ بے ساختہ میرے لبوں سے پھسل گیا۔

"طاہر!" یہ پرکاش کی آواز تھی گویا کانٹا سا چبھ گیا ہو۔ اس کے چہرے پر سایہ سا لہرایا تھا۔

"اوہ۔ وہ۔ پاکستان میں ہے۔" میں آگے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ میری نگاہ اوریں پر پڑی۔ اس نے آنکھ کے اشارے سے مجھے خاموش رہنے کو کہا میں جھجک کر خاموش ہو گئی مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ مجھے اس بات کا کوئی نہ کوئی جواب تو دینا ہی تھا۔

"آپ کچھ بتا رہی تھیں مس تارا۔" پرکاش آسانی سے جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔

"ہاں وہ۔" میں نے نگاہیں چرا کر کہا۔ "ہاں گھونے آرہا ہے۔ میرا کزن ہے۔ سیاحت کا بہت شوقین ہے۔ شاید وہ بھی میرے ساتھ انڈیا چلے اس کے آجانے کے بعد میں زیادہ یہاں نہیں رکوں گی۔" میں نے جلدی جلدی بات ختم کی' جھوٹ بولنا میرے لیے بہت مشکل اور تھکا دینے والا کام تھا جو میں مسلسل کر رہی تھی۔ کبھی کبھی ہمت جواب دے دیتی تھی۔ میں کھل کر سچ بولنا چاہتی تھی۔ ساری دنیا کو سچ سچ آگاہ کرنا چاہتی تھی مگر میرے گرد لوہے کی دیواریں کھڑی تھیں کہ جنہیں میں یا جوج ماجوج کی طرح ہر لحہ چاٹتی رہتی تھی اور ہر رات سوچتی تھی کہ صبح یہ دیواریں نہیں ہوں گی۔ میری ایک پکار پر' ایک لمس سے ٹوٹ کر گر جائیں گی مگر ہر صبح وہ اتنی ہی بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ موٹی اور مضبوط ہوتی تھیں اور جھوٹ سے لتھڑی ہوئی' میری زبان اسے پھر چاٹنا شروع کر دیتی تھی۔ اب تو یوں لگتا تھا جیسے سچ بولا تو کائنات ٹوٹ کر بکھر جائے گی' شاید صور بھی ایسا ہی کوئی سچ ہو گا جس کے پھونکتے ہی دنیا ایک دھماکے سے پھٹ جائے گی اور انسانوں کے جسم پر آبلے پڑ جائیں گے۔ پھاڑ روئی کے گالوں کی طرح فضاؤں میں اڑ جائیں گے اور پھر سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ میرے خاموش ہو جانے کے بعد سے کمرے میں گہرا سکوت چھایا رہا۔ بوجھل فضا نے مجھے خواہ مخواہ بے چین کر دیا۔

"کچھ بولیں ڈیڈی!" میں بے ساختہ پکار اٹھی۔

"پتر! بہت دیر ہو گئی۔ ان کے کھانے کا کوئی بندوبست کر۔" سورن سنگھ نے کہا تو پرکاش چونک اٹھا۔

"ہاں ڈیڈی! میں تو بھول ہی گیا۔ آج پہلی بار مس تارا

ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گی، پھر ہم گھومنے کا پروگرام بنائیں گے۔ میں۔ کھانے کے لیے بول کر آتا ہوں۔"

وہ جانے کے لیے مڑا مگر دوسرے ہی لمحے ٹھٹک گیا۔ "مس تارا! ہم تو بھاجی کھاتے ہیں۔ یا پھر دال میں تو چکن بھی کھالیتا ہوں پر ڈیڈی کو کراہیت آتی ہے۔ آپ۔"

"میں بھی بھاجی کھاؤں گی پر کاش، تم فکر نہ کرو۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

وہ مسکرا تا ہوا چلا گیا مگر اس کی مسکراہٹ میں کچھ ایسا کرب تھا کہ میرا دل ڈوبنے لگا۔ جانے کیوں وہ مجھے اداس اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ کیوں اداس تھا یہ شاید میں جانتی تھی مگر اسے شعور میں لانا میرے لیے بڑا مشکل ہو رہا تھا۔ شاید میں تاریخ کے دہرائے جانے سے خوفزدہ تھی۔ میں اس دھندلے دھبے سے لڑکے کو شعلہ بنانے پر تیار نہ تھی۔ طاہر کے ذکر نے اسے بجھا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے شاید میرے لہجے سے، میری آنکھ میں جل اٹھنے والے چراغ سے سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ ہم کسی سے جذباتی لگاؤ پیدا کر لیں تو اس کے سلسلے میں کس قدر حساس ہو جاتے ہیں اس کا مجھے خوب تجربہ تھا۔ مجھے اس لمحے شدت سے احساس ہوا کہ پر کاش کے جذبے کو جانتے بوجھتے بھی اگر میں نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی تو حوصلہ شکنی بھی نہیں کی اور میری انجانے میں کی گئی یہ حرکت میرے لیے سوہان روح بن سکتی تھی۔ میں ٹریا نہیں بننا چاہتی تھی اور پر کاش جیسے معصوم لڑکے کو سورج مکھی کے روپ میں دیکھنا میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔

"میڈم!" اور لیس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"ہوں۔ کیا!" میں نے اس کی جانب دیکھا۔

"میں۔ سلامو سے ملنا چاہتا ہوں۔ رات میری اس سے ملاقات نہ ہو سکی تھی، مجھے اس سے حالات معلوم کرنا ہیں۔"

"وہ ہاں۔ تم جاؤ۔ تمام بات تفصیل سے معلوم کرنا۔" مجھے یاد آگیا کہ اسے سلامو سے طاہر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہے۔ سلامو پاکستان میں تھا اور غالباً اسے اور لیس کو فون کرنا تھا میری بات سن کر اور لیس کھڑا ہو گیا۔ "سفر! کھانا نہیں کھاؤ گے؟" میں نے کہا۔

"نہیں میڈم! میں دوپہر میں کھانا نہیں کھاتا۔" پھر وہ مجھ سے اجازت لے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سورن سنگھ کی طرف دیکھا۔ وہ بے خبر تھے۔ ان کے چہرے پر بلا کا سکون تھا۔ میں بہت دیر اسے حیرت سے دیکھتی رہی، جو بھی کسی کے لیے خوفناک رہا ہو مگر اس وقت اس چہرے کی معصومیت میرے دل میں اترتی جا رہی تھی۔ مجھے پہلی بار محسوس ہوا تھا کہ ضمیر کی چبھن انسان کے اندر کیسے زخم ڈال دیتی ہے اسے کتنا بے سکون اور بے کل کر دیتی ہے اور پھر اعتراف کیسے انسان کو ہلکا کر دیتا ہے۔

جانے یونہی کتنی دیر گزر گئی مجھے پتا بھی نہ چلا کہ کب آگیا۔

"مجھے۔ سورج انکل۔ اچھے لگنے لگے ہیں۔" اس نگاہیں زمین پر گاڑتے ہوئے دھیرے سے کہا تھا اچھل کر حلق میں آگیا۔

"وہ۔ میرا خیال ہے پرکاش!۔ میری ماں کا لال اس سے نفرت نہ ہے خود کو قابو میں رکھ جواب دیا۔ میں پھر جھوٹ بول رہی تھی۔

"دشمن پیارے بھی ہو تو ہے ہیں نا مس تارا!" لہجے میں عجیب سی سنسناہٹ تھی جسے میں نے بدن میں محسوس کیا۔

میرا دل ایک بار پھر ڈوبنے لگا۔ "اس سے خوف نہیں کرسکتے پرکاش۔"

وہ کچھ دیر مجھے گہری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ اس وہ معصوم سا بچہ نہیں بلکہ پختہ عمر کا مرد تھا اور لگا۔ مجھ پر کپکپاہٹ طاری تھی پھر بھی میں اس کی میں آنکھیں ڈالے بیٹھی رہی۔ اچانک اس معصوم، شرارتی بچہ چھلانگ لگا کر باہر آگیا۔ آنکھوں میں روشنیاں سی بجھ گئیں۔ ہونٹوں نانچ اٹھی اور اس کا چہرہ دیکھتے ہی دیکھتے تبدیل ہو مضحکم ہو گیا۔" اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا۔ ساختہ ہنس پڑی۔ اس کا یہی مخصوص انداز تھا میں اسے ہمیشہ اسی انداز میں دیکھنا چاہتی تھی۔

"شش۔!" اس نے ایک دم انگلی ہونٹوں پر خاموش کرا دیا۔

"وہ سوری!" میں نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں ہیں۔"

ہم دونوں باہر آگئے۔ چاروں طرف ہنگامی

والی تھی۔ لان میں لگے اونچے درختوں کی چھاؤں دور ہی سے بہت گھنی اور میٹھی لگ رہی تھی۔ میں اس جانب بڑھ گئی۔ وہاں بید کی کرسیاں اور گول میز پڑی تھی۔ "آؤ۔" میں ان میں سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"آپ نے کہا کیوں بھری مس تارا!"

"دیکھو پرکاش! پلیز سنجیدگی کی نہیں ہو رہی۔ میں بہت تھک گئی تھی آج بڑا سکون ملا ہے مجھے اب اور نہ الجھاؤ۔ میں نے آہ نہیں بھری بلکہ ان آہوں کو آزاد کیا ہے جو میرے بدن میں۔ میری روح میں چکرا رہی تھیں۔ پر کاش تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ بے شناخت آدمی کو اگر قبول کل جائے تو وہ کیسا محسوس کرتا ہے۔ میں بہت اکیلی تھی۔ ایک بڑے ہجوم کے درمیان بھی بڑی تنہا اور ویران آج یوں لگ رہا ہے جیسے میرے اندر باہر ہر طرف پھول کھلنے لگے ہوں۔ یہ احساس کہ اب میں تنہا نہیں۔ کوئی نہ کوئی ہمارا ہے، کیسے نہ کہیں ایسا موجود ہے جو میرے وجود کا ایک حصہ ہے یا۔ جس کے وجود کا میں ایک حصہ ہوں۔ مجھ سے دور سہی مگر فاصلے تو کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ دیکھو اب ہم میں تم میں کتنے فاصلے تھے۔ وہ سورن سنگھ برسوں پہلے کسی تاریک کوٹھری میں میری ماں سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میرے لیے سب سے چھپا کر بسکٹ اور دودھ لاتے تھے۔ جنہوں نے مجھے اماں کے ساتھ اسی کال کوٹھری سے فرار کرایا تھا، وہ جانتے بھی نہ تھے کہ اس کے والے سے باہر جانے والی گود کی ننھی سی بچی بھی اپنے ہی پل کریوں ان کے روبرو آبیٹھے گی۔ وہ صدیوں اور فاصلے لمحوں میں گم ہو گئے۔ بالکل ایسی طرح، ہی روز میں اپنے باپ کے مضبوط بازوؤں کو دنیا کے سامنے اکڑ کر کھڑی ہوں گی پر کاش! ابا کو ہاں کی کہ دیکھو میں۔ میں کسی گناہ کی پوٹ نہیں ہوں، کہ کوتاہیوں کی کہ مجھے میرے باپ سے جدا کرنے کی ششیں کیے ناکام ہو گئی ہیں۔ سب کچھ ویسا ہی ہو کاش جیسا ہونا چاہئے تھا۔ سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔"

میں اس کا سب کچھ تو ٹھیک نہیں ہو گا کچھ نہ کچھ، کہیں کہیں ابھی ترتیب ہو جائے گا۔"

ایک سوئی سی تھی جو کہیں میرے دل میں ٹوٹ کر گوں میں اتر گئی۔ میں جس قدر اسے بھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اسی قدر اسی راستے پر بڑھتا چلا آرہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں بھاگ جاؤں۔ ایک گھٹن میرے پورے وجود میں بھر گئی۔ سانس لینا دو بھر ہو گیا۔ درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں تپش محسوس ہونے لگی۔ میں گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"تکبریت! کیا ہو گیا؟" اس نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں پرکاش! مجھے بہت پیاس لگی ہے۔" میں نے خود پر قابو پالیا۔

"میں پانی لاتا ہوں" وہ تیزی سے اٹھ کر اندر چلا گیا۔

اور لیس کو گئے آدھا گھنٹا ہو چکا تھا اب تک اسے واپس آجانا چاہئے تھا۔ میرا ذہن طاہر کے بارے میں پریشان ہونے لگا۔ میں اس کی خیریت کی دعائیں مانگنے لگی۔ مجھے اتنا یقین ہو چکا تھا کہ اب طاہر جلد ہی بنگاک پہنچ جائے گا۔ ادھر مجھے بھی اپنے پاپا کا پتا چل چکا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ طاہر کے آتے ہی میں اطلاع دوں گی۔ طاہر خود ان لوگوں سے فرار چاہتا تھا۔ وہ کہہ چکا تھا کہ ہم زیادہ دیر ان لوگوں کے درمیان نہیں رہیں گے۔ ہمارا سارا کام تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ میری کڑی مسافت کی طویل گھڑیاں ختم ہونے والی تھیں پھر طاہر اور میں ایک ہو کے تھے ہمیشہ کے لیے اور یہ میرے لیے کتنی بڑی خوش خبری تھی کہ میری خوشیوں میں شریک ہونے والی ایک شخصیت میری اپنی ہوگی۔ میرے اپنے پاپا۔ پھر یہاں زندگی میں کتنا سکون ہو گا! میں نے آنکھیں موند کر کرسی کی پشت سے سر ٹیک دیا اور اسی لمحے ایک چھناکا سا محسوس ہوا۔ اشرف علی خان کا کریہہ چہرہ میری نگاہوں میں گھوم گیا، اس آسیب زدہ عمارت میں گونجتے جملے کی بوچھاروں طرف پھیلنے لگی، مسٹر وقار، مسٹر لونگ اور اس آہنی بوڑھے کے چہرے آپس میں گڈمڈ ہونے لگے۔ طارق کی کرب ناک چیخوں نے مجھے دہلا کر رکھ دیا اور میں چیخ کر کھڑی ہو گئی۔ شکر ہے کہ دور دور تک کوئی نہیں تھا ورنہ میری حالت دیکھ کر جانے کیا سمجھتا۔ میں نڈھال سی کرسی پر گر گئی۔ جس سکون سے میں خواب دیکھ رہی تھی وہ تو ابھی مجھ سے بہت دور تھا۔ میری اور طاہر کی جان کو خطرہ تھا۔ ابھی تو ہمیں زندگی کو جیتنا تھا۔ ان وحشیوں کو کیفر کردار تک پہنچائے بغیر ہم اپنی منزل تک پہنچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اور ان کو کیفر کردار تک

پہنچایا بھی ہمارے لیے ذرا مشکل نہ تھا۔ لاکٹ ان سب کو آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل سکتا تھا۔ وہی لاکٹ جس کی حفاظت کے چکر میں میرا خون جل چکا تھا، وہی میری اور طاہر کی زندگیوں کی ضمانت تھا۔ لاکٹ کا خیال سانپ کی خوف ناک پھنکار کی طرح میرے ذہن میں آیا تھا۔ لاکٹ میرا اثاثہ کے فلیٹ میں ہی چھوڑ آئی تھی۔ کمرا لاک کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ اسے میں کسی حال میں وہاں نہیں چھوڑ سکتی تھی میں پتایا جانے کا پروگرام بنا رہی تھی مگر میں جانتی تھی کہ اس لاکٹ کو وہاں چھوڑ کر میں سکون سے نہیں گھوم پھر سکوں گی۔ میں اس آخری وقت میں ایسی کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتی تھی جو میرے یا طاہر کے لیے نقصان دہ ہو۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مجھے آج فلیٹ واپس جانا پڑتا ورنہ میں نے تو سوچا تھا کہ ہم آج ہی پتایا کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ لاکٹ کے خیال نے مجھے پھر بے چین کر دیا تھا۔ میں اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ پر کاش ابھی تک نہیں آیا تھا۔ مجھے حیرت ہونے لگی۔ وہ میرے لیے پانی لینے گیا تھا۔ میں برآمدے کی طرف بڑھنے لگی، اسی لمحے میں چونک اٹھی۔ وہ کسی کے گنگنانے کی مدھم سی آواز تھی۔

میں نے پلٹ کر آواز کی طرف دیکھا۔ پر کاش کرسیوں کے پیچھے گھاس پر لیٹا تھا۔ پاس ہی جگ اور گلاس رکھا تھا۔ مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر وہ اٹھ بیٹھا اور گلاس میں پانی انڈیلنے لگا۔ "تمہیں پانی لے کر آیا تو آپ کھوابوں میں گم، کہیں سمندر کی تلاش میں نکلی ہوئی تھیں۔ میں نے آپ کے کھوابوں کو توڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ سوچا پانی لوٹ آئیں تو پانی پلا دوں گا ورنہ سارا جگ اپنے سر پر انڈیل لوں گا۔"

"لیکن تم آئے کب اور کیسے، مجھے تو پتا بھی نہ چلا۔"

"لوگ ایسے ہی چپکے سے زندگی میں داخل ہو جاتے ہیں مس تارا اور ہم سوچتے رہ جاتے ہیں کہ وہ آئے کب اور کیسے؟"

"اچھا چلو۔ تمہیں تو پاکستان کے لوگوں سے شکایت تھی کہ ہر وقت سوچتے رہتے ہیں اور فلسفہ بولتے رہتے ہیں مگر۔ اب تم 'کھوا' یہی کام کر رہے ہو۔" میں نے اس کی نقل اتاری۔

"پیاس لگی ہے کہ۔ بجھ گئی؟" اس نے معنی خیز انداز سے پوچھا۔

"پر کاش! اب۔ میں ماروں گی تمہیں" میں نے اس کے ہاتھ سے گلاس چھینتے ہوئے کہا۔

"حکم حاضر ہے، جو حکم بار میں آئے۔"

اور اس کے "منہ چاٹ" کہنے پر میں بے ساختہ ہنس پڑی۔

"یا اللہ تمہارا تلفظ کب ٹھیک ہوگا؟"

"ہے بھگوان۔ میرا تلفظ ایسا ہی رہے۔ کوئی اس کو ٹھیک نہ کرے۔" اس نے بالکل میرے انداز میں کہا۔

گزشتہ لمحوں کا بوجھل پن ان چند جملوں سے دور ہو گیا تھا۔ ہم دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پر کاش میرے ساتھ جانے پر بڑا خوش تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ آج نہیں کل چلیں گے تو وہ منہ پھلا کر بیٹھ گیا۔

"کیوں بھئی کیوں؟"

"بابا میں گھر جا کر کپڑے لوں گی، ضروری سامان لوں گی جن لوگوں کے ساتھ میں رہتی ہوں انہیں بتاؤں گی کہ صبح کا پروگرام نہ رکھیں مجھے۔"

بات ایسی تھی کہ وہ خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر منٹ بعد ہی ادریس لوٹ آیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر دور ہی سے دیکھ لیا تھا۔ وہ وہاں دیکھ کر ہمارے پاس ہی چلا آیا۔ "سسٹر سوزان کیسے ہیں میڈم؟"

"وہ ٹھیک ہیں۔" پر کاش نے جواب دیا۔ "میں ان کے کھانے کا بتا کر کے آتا ہوں۔"

پر کاش نے میری مشکل آسان کر دی تھی۔ میں نے اس سے طاہر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں بے چین تھی مگر پر کاش کے سامنے بات کرنا مشکل ہوتا۔

"کیا رہا؟" میں نے پر کاش کے جاتے ہی بے قرار ہو کر پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے میڈم! مسٹر طاہر ہاس کا انتظام کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ مسٹر وقار نے اطلاع دی ہے کہ لاکٹ پاکستان میں نہیں بنکاک میں ہے۔ یہ سنتے ہی میرا دل دھڑک اٹھا۔ "کیا مطلب؟"

"غالباً طارق کا اعتراف ان تک پہنچ چکا ہے۔ کچھ ہی دیر پہلے ایک اطلاع بھی ہے کہ طارق کو زندہ رکھا گیا ہے اس لیے کہ اس سے لاکٹ حاصل کرنا ہے۔ طارق غائب ہو گیا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ طارق نے

کہیں چھپا دیا ہے یا کسی کے پاس رکھوا دیا ہے۔ اسے قتل کیے بغیر اسے مار دینا خود یتیم کی موت کو آواز دینا تھا۔ طاہر صاحب کا خیال ہے کہ لاکٹ حاصل کرنے کے بعد انہیں یہاں بھیجا جائے گا کیونکہ اشرف علی خان اس علاقے میں کسی اور پر اعتماد نہیں کر سکتا۔"

"وہ تھینک گاڈ۔" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ "تم مجھے دنیا کی سب سے بڑی خوش خبری سنائی ہے ادریس! تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتی مگر۔ تمہیں یہ کہنے کا حق نہیں، میرا مطلب ہے کہ سلام تو۔"

"سلام وان سے ملا تھا۔ وہ انہیں میرے اور آپ کے بارے میں تمام تفصیل بتا چکا ہے۔"

"وہ ادریس یہ سب۔ یہ سب محض تمہاری وجہ سے ہو سکا ہے۔"

"شرمندہ نہ کریں میڈم! یہ سب تو میں بہت خود غرضی کر رہا ہوں۔ مجھے۔ آج بھی، کبھی کبھی بنانے میں اپنی اور بھائی کی کرب ناک چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ انہیں تکلیف ہوئی ہوگی میڈم جب پوری زمین ان کے اوپر گری ہوگی، کیسی اذیت، کتنی تکلیف۔ وہ لوگ تو پہلے ہی تکلیف اٹھا رہے تھے، کچھ کمی تو نہیں تھی ان کی موت میں۔ پھر بھی۔"

"ادریس! ہم بھی بڑی اذیتیں سہہ رہے ہیں۔ اب تو دل عادی ہے۔ میں نے اپنے ارد گرد کوئی ایسا شخص اب تک نہیں دیکھا جو خوش ہو۔ بہت خوش، ہر وجہ اور ہر کرب سے آزاد۔ وہ لوگ بھی جو معصوم ہیں اور۔ وہ لوگ بھی جو شاید ساری دنیا میں یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ مگر ہمیں پڑھایا گیا ہے وہ۔ وہ ایسی تو نہ تھی، پتا ادریس کبھی بھی خیال آتا ہے کہ تاریخ جھوٹی ہے، سمجھانے کو گھڑی گئی ہے بلکہ یہ بھی انسان کی ظالم کی لگایا ہوا کوئی نشتر ہے کہ آنے والی نسلوں کو جھوٹوں کے جال میں جکڑ دیا گیا ہے کہ جس کا ہر تار مجھے ہوئے تیر کی طرح ہر لمحہ اس کی روح میں ہے۔ کہ۔ کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ ایسا ہوتا تھا فلاں یا فلاں جیسوں میں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا ہوگا اور کبھی بھی نہیں ہوگا۔ قیامت کے روز ہمارے جانے والے آبلے یہی کرب ہوں گے جنہیں ہم اب سے چھپائے اپنی روحوں میں پال رہے ہیں۔"

"نہیں میڈم! پلیز۔ یہ۔ یہ حقائق ہیں، یہ تاریخ سچ ہے۔ اور وہ مستقبل بھی سچ ہوگا۔"

"اور حال۔ بس جھوٹ ہی جھوٹ، دردِ ہی درد، زندگی کو وحشت ناک مظاہرے، دردِ کرب کے طمانچے مارتے، حد نگاہ تک پکارتے گہرے سمندر، ہم ان سے بچیں گے تو مستقبل میں جائیں نا ادریس۔ مگر ہمیں بچائے گا کون، اپنے اپنے وجود میں تو ہم خود جہنم بنا رہے ہیں اور وہی جہنم ہمارے جسم کو حرارت بخش رہے ہیں اور ہم۔ ہم اس حرارت کو زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ کون سی قیامت آئے گی ادریس جسے ہر دوسری آنکھ دیکھ سکے گی۔ اپنے اپنے اندر کی قیامت تو ہماری نگاہ میں ہے۔ اپنے وجود پر پڑے آبلے، روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پیمانوں جیسے مضبوط ارادے، یہ سب بھلا کیا ہے۔ تمہارے بھائی اور ماں کے لیے تو زمین کی چیک چیک ہی صور بن گئی تھی ادریس، اور۔ اور میرے لیے اماں کی وہ گرگڑاہٹ جو وہ اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لیے ابا کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی اور تب میں ایک دم ٹوٹ گئی تھی۔ ٹھہر گئی تھی۔ ساری دنیا میری آنکھوں کے سامنے چکرا گئی تھی۔ وہ انفسا نفسی کا عالم تھا ادریس کہ ماں، باپ، بہن بھائی سب اجنبی ہو گئے تھے۔ میں تنہا رہ گئی۔ میرے گلے میں برا اعمال نامہ تھا۔ سادہ تھا۔ بالکل کورا اور میں وہی لے اس گھر کی چوکھٹ چھوڑ آئی اور آج میرے اعمال نامے میں سوائے جھوٹ کے کچھ نہیں۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔" میں جانے کب رو دی۔ بھیگے رخسار کا احساس اس وقت ہوا جب کسی نے میری آنکھوں کے قریب رومال لہرایا۔ سفید براق معطر رومال، میں چونک اٹھی۔ میری پشت پر پر کاش کھڑا تھا۔ ادریس سامنے کسی مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔

"تارا جی! بڑے گہرے سمندر میں آپ کے اندر۔ کاش مجھے تیرنا آتا۔"

میں بری طرح جھینپ گئی۔ "وہ۔۔۔ سوری پر کاش۔۔۔ میں تم لوگوں کو کافی ڈسٹرب کر رہی ہوں۔"

"نہیں تارا جی! میں تو کبھی ڈسٹرب نہیں ہوا بلکہ یہ سوچ کر فریش ہوا ہوں کہ اس طرح بہت سی گرد بیٹھ جاتی ہے۔ سارے منظر صاف صاف اور روشن ہو جاتے ہیں۔"

"تم کبھی کبھی بہت بڑی بڑی باتیں کر جاتے ہو پر کاش،

تمہیں بالکل سوٹ نہیں کرتیں۔"

"میاں تو کوئی بھی چیز کسی کو سوٹ نہیں کرتی، سب ایسے ہی چل رہا ہے۔" وہ ہنس دیا۔ "جیسے آپ لوگ کھانا تیار ہے اور ڈیڈی بھی اٹھ گئے ہیں۔ وہ آپ کو نہ پا کر پریشان ہو گئے تھے حالانکہ۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا اور میں یوں نگاہیں چرا کر آگے بڑھ گئی جیسے وہ سب سن لیا ہو جو اس نے نہیں کہا تھا۔ ہم کمرے میں آئے تو وہ چوکی پر بیٹھے تھے۔ مجھے کھانے کا یہ مخصوص انداز بے حد بھایا۔ فرش پر بچھی سفید چادر پر دسترخوان بچھا ہوا تھا اور اس پر اسٹیل کی چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں مختلف سبزیاں، آلو کی بھجیا اور دالیں تھیں۔ کئی طرح کی چٹنیاں اور اچار کے علاوہ اسٹیل کے لمبے لمبے گلاسوں میں لسی بھی تھی۔ ایک چھابی میں کیلے بھی رکھے تھے۔ چاول کی بنی ہوئی روٹیاں تھیں جن میں آلو کی بھجیا بھری گئی تھی جو مجھے بے حد لذیز لگی۔

"آپ کو ڈوسا بہت پسند آیا تارا جی!؟"

"اسے ڈوسا کہتے ہیں؟" میں نے بھی سوال کر ڈالا۔

"جی۔ یہ ہماری مخصوص ڈش ہے۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"سبھی چیزیں لذیز تھیں۔ مجھے کھانے میں بڑا مزہ آیا۔۔۔ خاص طور پر ڈوسا مجھے بہت پسند آیا تھا۔"

"بڑی حیرت انگیز بات ہے چتر۔ ثریا کا ہر چھاوا تیرے اندر ہی رہ گیا ہے۔" سورن سنگھ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"جی! آیا؟"

"وہ بھی ڈوسا بہت پسند کرتی تھی۔ اکثر کینٹین میں جاتے ہی دورسا سے پکار کر کہتی تھی۔ "کرما پاپو ڈوسا؟" کرما پاپو کینٹین میں کام کرتا تھا اور سورج مجھے اکثر وہاں لے جاتا تھا تاکہ۔۔۔ تاکہ وہاں ثریا کو دیکھ سکے۔ وہ اس کی میز کے پاس والی ہی میز تلاش کرتا تھا۔ جب تک ثریا کو پا نہ لے تھا وہ وہیں بیٹھی رہتی اور جب۔۔۔ جب پتا چل گیا تو اکثر ہمیں دیکھتے ہی لوٹ جایا کرتی تھی ڈوسا کھائے بنا ہی' تب میں سورج سے ناراض ہو جاتا تھا۔ اس کی ہی وجہ سے تو وہ بھوکی رہ جاتی تھی۔"

"بس کرو ڈیڈی! تارا جی بہت رو چکی ہیں۔" پرکاش نے شاید میرے تھنے پھڑکتے ہوئے دیکھ لیے تھے۔

"وہ ہاں۔۔۔ پر رونے سے تو آدمی کے اندر کی نمی بڑھتی ہے پتر۔ وہ خشک اور بنجر نہیں ہوپاتا۔۔۔

"اتنی نمی کافی ہے ڈیڈی' تم تو دلدل ہی بنانے لگے ہو۔"

اس نے یہ جملہ اتنا برا منہ بنا کر کہا کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی ہنسی نہ روک سکی۔ اور اس بھی مسکرا اٹھا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں اب بھی کرب تھا' یوں لگتا تھا جیسے گھور گھٹا چھائی ہے اور کسی بھی وقت برس جائے گی۔

"اور ہاں ڈیڈی! اب تو تم ٹھیک ٹھاک ہو نا! کل پڑ جانا' کل ہم لوگ پٹایا جا رہے ہیں۔ تارا جی و گی ساتھ۔ آج تم رام لال انکل کو فون کر کے ہوٹل کو بک کرا لو' سیزن ہے نا' ورنہ ہمیں کسی ہوٹل میں کھولی کھالی نہیں ملے گا۔"

"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ یہ تو بہت اچھا ہو گا۔ تو کہتا ہے گھومنے کو نہیں ملتا۔" سورن سنگھ نے پیار سے بال خراب کر دیے تھے۔

کھانا بڑی خوشگوار فضا میں کھایا گیا۔ میں جیسے آزاد ہو چکی تھی۔ کوئی پریشانی' کوئی ٹینشن' کوئی تھا۔ کھانے کے فوراً بعد ہم نے بلیک ٹی پی اور ہم کھڑے ہو گئے۔ کل کا وعدہ کر کے ہم ان لوگوں رخصت ہوئے اور اپنے فلیٹ کی طرف چل پڑے۔

"میڈم۔۔۔ ایک اطلاع ہے سمجھ میں نہیں آ گاڑی میں بیٹھنے کے چند منٹ بعد اردیس نے لہجے میں کہا تو میں چونک اٹھی۔

"کیا۔۔۔ کیا بات ہے؟ اردیس سب خیریت ہے؟"

ایک دم سے بڑھتی محسوس ہوئی تھی۔

"ہاں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ وہ میں نے کی تصویر سورن سنگھ کے ساتھ دیکھی تھی نا!"

"۔۔۔ وہ لمحہ بھر کو رکا تو میرے سینے میں سانس پھندا سا پڑتا محسوس ہوا۔

"جلدی بولو!" میں چیخ اٹھی۔

"سورن سنگھ بتا رہے تھے کہ وہ سری لنکا کا ہوا ہے۔۔۔ کہیں نہیں گیا' یہیں ہے اور۔۔۔ میں نے' جب میں نے سنے جا رہا تھا تو ہوٹل رائل پلازہ میں ا سنجلا کو اندر جاتے دیکھا تھا۔"

"کیا؟!" میں اچھل پڑی۔ "مس ا سنجلا سورن ساتھ!"

"جی! میں خود بھی انھیں دیکھ کر بہت حیران ہوا

ہوں۔ خاص طور پر اس لیے کہ سورن سنگھ بتا رہے تھے کہ وہ ایک بینک کے لیے سری لنکا گیا ہوا ہے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آئی کہ اس نے سورن سنگھ سے جھوٹ کیوں بولا' کچھ آپ کی طرف سے پریشانی ہو رہی ہے میڈم۔ کوئی نیا عذاب نہ کھڑا ہو جائے۔"

"یہ بات تمہیں وہیں سورن سنگھ کے سامنے بتانا چاہئے تھی۔" میں نے بے چینی سے کہا۔

"ان کی طبیعت کی وجہ سے میں نے یہ بات وہاں نہیں۔۔۔ وہ یہ بات سن کر آپ کی وجہ سے خوف زدہ ہو جاتے۔"

"ہاں۔۔۔ یہ بھی ٹھیک ہے' پر کیا کریں۔۔۔! اس طرح تو پٹایا جانا بھی غلط ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ آج کل پہنچ جائے والا ہو۔"

"ہاں! ممکن تو ہے مگر پھر مس ا سنجلا سے ان کے روابط کہ آپ کس خانے میں فٹ کریں گی؟"

"ممکن ہے وہ اس کا دوست ہو۔"

"نہیں۔۔۔ ایسا ممکن نہیں ہے۔ وہ ہیروں کا سب سے بڑا کار ہے اور مسٹر وقار اس سے خوش نہیں ہیں۔ وہ اس کا ایک سیٹنگ میں کر بھی چکے ہیں۔ وہ ان لوگوں کے کاروبار سے ناخوش ہیں کیونکہ عموماً وہ لوگ ایسے ہی استعمال کرتے ہیں جو ہماری تنظیم کرتی ہے اور یہ معاملہ ہماری تنظیم کے لیے خطرناک ہے اگر کسی کو لوگ پاکستان میں سے ایک آدمی پکڑا گیا تو بات تک جائے گی اور پھر ہم لوگ یعنی ہمارے آدمی بھی نظر آئیں گے۔ میرا خیال ہے کہ مس ا سنجلا ڈبل کراس ہیں۔"

اس کے آخری جملے نے میرے اندر سنسناہٹ پھیلا دی تھی۔ ا سنجلا کا تنظیم کو نقصان پہنچانا یہ نہیں لگا تھا بلکہ ا سنجلا نے میرے لیے ہزاروں دروازے کھول میرے ذہن میں دور تک روشنی پھیلتی چلی گئی پھر ب ہم فلیٹ تک پہنچ گئے۔ مجھے کچھ پتا نہ چلا' میں سوچ میں غرق تھی اور لیں نے مجھے اس دوران بالکل پریشان نہیں کیا تھا۔

فلیٹ پہنچنے پر میں سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔ فلیٹ میں تک تھی اور کسی انگریزی میگزین کا مطالعہ کر رہی تھی دیکھتے ہی مسکرائی۔ "وہ آپ تو شاید پٹایا گئی

"نہیں تو۔۔۔ کس نے کہا؟"

"مس ا سنجلا بتا رہی تھیں۔"

"نہیں۔۔۔ آج تو نہیں گئی مگر کل ارادہ ہے۔ آج صبح میں مسٹر وقار کے پاس گئی تھی آفس میں کچھ کام تھا اس لیے۔"

"آپ کیا کھانا کھائیں گی؟"

"نہیں شکریہ میں کھا چکی ہوں۔" میں اتنا کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرا لاک نہیں تھا' میں نے اندر جا کر دروازہ لاک کر دیا پھر اس سمت نظر ڈالی جہاں ٹیبل لیمپ رکھا تھا اور جس میں' میں نے لاکٹ چھپایا تھا۔ اس سمت نگاہ اٹھتے ہی مجھے یوں لگا جیسے کمرے کی چھت اچانک مجھ پر آن گری ہو۔ اس چھوٹے سے لیمپ کی جگہ ایک مصنوعی پودے کا گملا رکھا تھا اور چھت سے ایک خوب صورت موتیوں والا فانوس لٹکا ہوا تھا جس سے روشنی کی کرنیں پھوٹ کر پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ میرا سر بری طرح چکرا گیا۔ میں دیوار کا سہارا نہ لیتی تو شاید کھڑے قدمے گر چکی ہوتی۔ چند ثانیوں بعد میرے ہوش ٹھکانے آئے تو میں نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی' کمرے کی سیٹنگ بدل گئی تھی۔ کونے میں رکھی چوکور میز کی جگہ ماربل کی چھوٹی سی گول میز رکھی تھی۔ بیڈ پر چادر نئی تھی اور اس پر رنگین مخمل کے کئی کشن بڑی خوب صورت ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ صوفے کی جگہ ایک اونچی مونگ چیئر رکھی تھی جس کے چاروں اطراف میں خوب صورت گملے رکھے تھے جن میں رنگ برنگے پھول مہک رہے تھے۔ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر ٹیلی فون رکھا تھا اور فریج دوسرے کونے میں پہنچ گیا تھا۔ پورا کمرا ہی بدلا ہوا تھا۔ مجھے شبہ ہونے لگا کہ میں کسی اور کمرے میں آ گئی ہوں۔ میں نے چاہا کہ' تک میں سوفے کروں' میں جونہی دروازے کی طرف بڑھی' تک مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ "مس تارا! کمرا کیسا لگا آپ کو؟"

"یہ۔۔۔ میرا کمرا ہے یا کسی اور کا؟"

"یہ آپ ہی کا کمرا ہے اور مسٹر وقار کی خواہش پر آپ کے کمرے کی سیٹنگ چینج کی گئی ہے۔ انھوں نے آج صبح ہی آپ کے کمرے کے لیے فرنیچر اور ڈیکوریشن کی چیزیں بھیج دی تھیں۔"

"اوہ۔۔۔ تھینک یو۔۔۔" میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا اور بیڈ پر بیٹھ گئی' نہ بیٹھتی تو شاید گر جاتی۔

"تھینکس تو آپ مسٹر وقار کا ادا کیجیے۔ انھوں نے کہا تھا کہ آپ جیسے ہی آئیں ان سے ان کا شیڈیک کرلیں۔"

"اوکے۔" میں نے مسکرا کر کہا اور جلدی سے فون کی جانب لپکی تبھی کمرے سے باہر جانے لگی' میں نے اسے چائے لانے کو کہا تو وہ سرہلا کر چلی گئی۔ میرے ہاتھ پیروں سے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ خوف کی لہریں پورے بدن میں ریگ رہی تھیں۔ "یہ کیا غضب ہوگیا؟" میں بڑبڑائی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ یہاں سے ہٹایا جانے والا سامان کہاں گیا۔ گھر کا جائزہ تھا بھی میرے سامنے آیا تھا وہاں تو نہیں تھا۔ اب مسٹر وقار سے کا شیڈیک ویسے بھی ضروری ہوگیا تھا۔ وفعتاً" میرے ذہن میں بجلی سی کوندی۔ اس لمحے میں بہت خود غرض ہوگئی اور میرے وجود کی' میری ذات کی تمام نرمی' تمام حساسیت کہیں ہواؤں میں تحلیل ہوگئی اور میں نے جٹرے بھینچ لیے۔ کارڈ پرس میں سے نکال کر مسٹر وقار کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف بیل بجنے لگی۔

"ہیلو!" چند ہی لمحوں بعد مسٹر وقار کی بھاری اور بھرائی ہوئی خوب صورت آواز سنائی دی۔

"مسٹر وقار!"

"اوہ مس تارا! کہاں سے بول رہی ہیں آپ؟"

"اپنے فلیٹ سے۔ اپنے کمرے سے۔"

"کیسا لگا آپ کو سب کچھ؟"

"بہت خوبصورت۔" میں نے آنکھوں کو سختی کے ساتھ بھینچ کر آنسوؤں کو آنکھوں ہی میں جذب کرتے ہوئے جواب دیا۔ "تھینک یو مسٹر وقار' میں ان عنایات کے قابل نہیں۔" میں نے شاید پہلی مرتبہ سچ بولا تھا۔

"یہ عنایت نہیں مس تارا! میری طرف سے بہت معمولی سا تحفہ ہے آپ نے قبول کیا' پسند کیا' یہ بڑی بات ہے؟"

اس لمحے میرا جی چاہا کہ میں اسے چیخ چیخ کر بتاؤں کہ تم نے مجھے تحفہ نہیں دیا بلکہ مجھ سے میری زندگی کا تحفہ زبردستی لے لیا ہے۔ صرف میری ہی نہیں ظاہر کی زندگی بھی تم نے چھین لی ہے مگر میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ خود پر قابو رکھنا مشکل ہو تا جارہا تھا' میں ہار چکی تھی مگر شکست تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی۔ میں بازی پلٹ دینا چاہتی تھی' کسی بھی قیمت پر' بڑے سے بڑا داؤ لگا کر بھی۔ جیت لینا چاہتی تھی اور سبھی میں نے داؤ لگا دیا۔ دو زندگیاں جیت لینے کے لیے ایک زندگی کا سودا کرلیا۔

"مسٹر وقار! میں ایک بہت اہم خبر دینا چاہتی ہوں۔" میرا لہجہ گھمبیر ہوگیا۔

"مگر آپ تو غالباً پیا جا رہی تھیں!" انھوں نے میری بات پر دھیان نہ دیا۔

"پوری تنظیم کو داؤ پر لگا کر پیا جانا میرے بس کی بات نہیں مسٹر وقار۔" میں نے سرگوشی کی۔

"جی!" وہ چونک اٹھے۔ انھیں فوراً ہی میرے جملے کی سنگینی کا احساس ہوگیا۔ "کیا کہہ رہی ہیں مس تارا! میں کچھ سمجھا نہیں' کچھ گڑبڑ ہے کیا؟"

"جی مسٹر وقار! سم تھنگ از رونگ۔ بلکہ' اوریل تھنگ از رونگ۔"

"آپ آرہی ہیں یا میں آؤں۔" انھوں نے غالباً میرے لہجے میں چھپے خطرے کو محسوس کرلیا تھا۔

"میں آرہی ہوں۔" اتنا کہہ کر میں تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ تبھی چائے لے کر میرے کمرے کی طرف آرہی تھی۔ "مس تک! سوری میں چائے نہیں پی سکوں گی۔ تم اوریل کو کال کرو' کہو کہ گاڑی نکالے فوراً۔"

تبھی چند ہی منٹ بعد میں اوریل کے ساتھ گاڑی میں دفتری طرف جارہی تھی۔ اوریل پوچھنے پر میں نے اسے بتا دیا کہ میں مسٹر وقار کو اسنیچ کے بارے میں بتانے جارہی ہوں۔ لاسٹ والی بات تو میں نے اسے بتائی ہی نہیں تھی اس لیے اس کا ذکر کرنا غلط تھا۔ ویسے بھی وہ بات صرف میرے اور طاہر کے درمیان تھی اور ہم دونوں کے درمیان کی دوسری باتوں کی طرح یہ بات بھی راز تھی۔ اوریل میرے منہ سے اتنے سنسنی خیز الفاظ سن کر دنگ رہ گیا تھا۔ اس نے مجھے حیرت سے دیکھا تھا وہ سمجھ کر رہ گیا۔ وہ مجھے منافق سمجھ رہا ہوگا۔ یہی سوچ رہا ہوگا کہ میں وہ نہیں ہوں جو کہتی ہوں یا نظر آتی ہوں مگر میں اس وقت اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا چاہتی تھی۔ میں اس سفاک فیصلے نے خود مجھ میں دراڑیں سی ڈال دی تھیں مگر میں طاہر کی اور خود اپنی زندگی ایسے وقت میں طوفانوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتی تھی جب کنارہ سامنے تھا۔

میں جانتی تھی کہ میرے اس اقدام کے بعد مس اسنیچ کے ساتھ کیا ہوگا' وہ اب تک میرے لیے اچھی ثابت ہوئی تھی۔ وہ میری دشمن نہیں دوست تھی مگر فی الوقت مسٹر وقار کو پوری طرح ہاتھ میں لینے اور بنکاک میں تنظیم کی بے تاج بادشاہ بن جانے کا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ لاسٹ کی خودکشی میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ میں اپنی اور طاہر کی زندگیوں کو بھربھری ریت کی طرح مٹھیوں میں سے پھسلتا دیکھنے کی ہمت ہی نہیں رکھتی تھی۔ میں نے دانت پر دانت جمالیے۔ مٹھیاں بھینچ لیں اور خود کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"یس مس تارا!" کوئی فیصلہ اگر خود پر گراں ہو تو وہ غلط ہو تا ہے۔" اوریل نے دھیرے سے کہا۔ غالباً وہ میری کیفیت سے واقف ہوگیا تھا۔

"اور اگر ایک غلط فیصلے سے دو تین زندگیاں بچائی جا سکتی ہوں تو۔ تو کیا کرنا چاہیے!" میں بے اختیار جھلا کر بولی۔

گہرے بھرکوہ ساکت رہ گیا' سہم کر پیچھے دھیرے سے بولا۔ "ایک زندگی سے تین زندگیاں خریدی جاسکتی ہوں تو۔ تب تو سودا برا نہیں۔ آپ خود کو نارمل سمجھیے۔"

"ہاں! میں کوشش کررہی ہوں۔"

تھوڑی ہی دیر بعد گاڑی آفس کی پیڑھیوں کے پاس ٹھہر گئی۔ میں اتری اور اوریل کو وہیں انتظار کرنے کا کہہ کر لفٹ کی جانب بڑھ گئی۔ میں جلد از جلد مسٹر وقار تک پہنچنا چاہتی تھی۔ لفٹ نیچے ہی تھی میں نے اندر داخل ہو کر فوراً ہی فلور کا بٹن دبا دیا۔ کچھ ہی دیر میں' میں مسٹر وقار کے آفس کے سامنے کھڑی تھی۔

"مس تارا!" مجھے دیکھتے ہی مسٹر وقار کھڑے ہوگئے۔ "یہ وقت ہے تو؟ آپ ٹھیک نہیں لگ رہیں۔"

گھمبیر سی دھیمی آواز میں انھیں سب کچھ بتا دیا۔ میں نے بتا دیا کہ مس اسنیچ ہمیں ڈبل کراس کررہی ہیں۔

"کیا کروں ایسا کیوں کریں گی؟ وہ تنظیم کی بہت پرانی رکن ہے۔" وہ محتاط لہجے میں بولے۔

"انا ہونے کا مطلب یہ نہیں مسٹر وقار کہ وہ وفادار بھی ہے۔"

"وفاداری! یہ تو ایک ایسی چیز ہے مس تارا کہ ہر دو سرا شخص ہر ایک پر شبہ کرسکتا ہے۔"

"میں شبہ نہیں کررہی مسٹر وقار' مجھے یقین ہے۔ ویسے بھی جسے خود تنظیم زخمی کرچکی ہو' مگر اداؤ لگایا ہو اسے اپنا وفادار سمجھنا تنظیم کی نادانی ہوگی۔"

"جی!" انھوں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"جوزف۔۔ اسنیچا کی محبت تھا مسٹر وقار جسے شدید اذیتیں دے کر مارا گیا تھا۔ اسی عمارت میں جہاں طارق کو"

"اوہ۔۔" وہ گھبرا کر کھڑے ہوگئے۔ "اوہ۔۔ ایسا تھا تو۔۔ اف ہم کتنے بے خبر ہے۔۔ اسے تو اسنیچا کے سامنے' آپ' آپ مس تارا آپ کمال کی خاتون ہیں۔ ہماری انٹیلیجنس میں کوڑہ مغز بھرے ہیں' بے خبر فضول لوگ۔ وہ یہ سب نہ جان پائے تھے اور۔۔ تھینک یو مس تارا' تھینک یو ویری مچ۔"

"سوٹ ویلم مسٹر وقار' مگر آپ اس وقت کوئی قدم نہ اٹھائیے گا۔ میں نے آج تقریباً بارہ ساڑھے بارہ بجے انھیں سورج سنگھ کے ساتھ رائل پلازہ ہوٹل میں دیکھا تھا۔ غالباً انہوں نے لنچ وہیں کیا ہے۔ آپ چاہیں تو اپنے طور پر پتا کرا سکتے ہیں۔ جب تک میں آپ کو مزید کوئی اطلاع نہ دوں آپ کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے پلیز۔"

"ٹھیک ہے مگر کوئی اور اطلاع سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"یہی کہ ان کا اب ارادہ کیا ہے۔ آئندہ کا پلان کیا ہے۔ وہ لوگ کیا کرنے والے ہیں۔ میری اطلاع کے مطابق سورج سنگھ کو اس وقت سری لنکا میں ہونا چاہئے تھا۔ اس کے آدمی یہی جانتے ہیں کہ وہ سری لنکا میں ہے مگر وہ یہاں کے ایک ہوٹل میں مس اسنیچا کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کا کوئی نہ کوئی تو مطلب ہوگا نا؟" میں نے بات ختم کی۔

وہ منہ کھولے حیرت سے مجھے تک رہے تھے۔ "اوہ' ٹھیک ہے میں تارا! میں انتظار کروں گا۔"

"تھینک یو۔ مجھے ذرا تھا کہ آپ جلد بازی میں وہی نہ کر بیٹھیں جو طارق کے ساتھ کیا تھا۔ ہاں اس لاسٹ کا کچھ پتا چلا جس کے بارے میں طارق نے کہا تھا؟" میں نے بڑی چالاکی سے گفتگو کا رخ بدل دیا۔

"نہیں۔ وہاں واقعی ہم سے غلطی ہوگئی بلکہ میرا خیال ہے کہ اسنیچا نے مجھے بھکایا تھا کہ میں اس پر تشدد کرکے اگلوا لوں۔"

"حالانکہ میں نے منع کیا تھا۔ خراب اس معاملے میں

جلد بازی نہ کیجئے گا اور ہاں مسٹر وقار آپ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟"

"ارے ضرور۔ اور آپ کیا ایں گی' عظمیٰ! یا گرم؟"

"نہیں شکریہ' میں پوچھنا یہ چاہتی تھی کہ میرے کمرے سے ہٹایا ہوا پرانا سامان کہاں ہے' چند چیزیں مجھے بے حد پسند تھیں۔"

"سوری یہ تو میں نہیں جانتا۔ غالباً مس انجلا کو معلوم ہوگا۔"

میرے بدن میں اچانک ہی تھکن بھر گئی۔ اتنا کچھ میں نے محض اپنی لیپ کی وجہ سے کیا تھا اور اس کو پانے میں ناکام ہو گئی تھی۔ میں فوراً ہی کھڑی ہو گئی۔ "میں چلوں گی۔"

"ارے چائے وغیرہ تو۔"

"نہیں شکریہ مسٹر وقار! میں پھر کبھی آ کر پی لوں گی۔"

"آپ کو تو کچھ منے جانا تھا مس نار ا؟"

"ہاں' مگر شاید فی الحال نہ جا سکوں۔" میں نے الجھتے ہوئے جواب دیا۔ میں جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔ ایک غلطی جو میں کر چکی تھی اسے درست کرنا بے حد ضروری ہو گیا تھا۔ میں ایک تیرے دو شکار کرنا چاہتی تھی۔ مسٹر وقار کو میں پوری طرح اپنے ہاتھ میں لے چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جو کچھ میں چاہتی تھی وہ ہو چکا ہے' گویا میرا ٹارگٹ پورا ہو چکا تھا مگر مس انجلا کو میں کسی نتیجے میں بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اب بھی سیدھی انگلیوں سے نکل سکتا تھا۔ میں انجلا کی جگہ لے سکتی تھی اور اسے بچا بھی سکتی تھی۔ مجھے جلد از جلد اس تک پہنچنا تھا۔ میں مسٹر وقار سے رخصت ہو کر نیچے آئی تو اریس میرا منتظر تھا۔

"اریس! ہمیں جلد از جلد انجلا تک پہنچنا ہے۔"

"خیریت!؟"

"نہیں۔ تم کسی بھی طرح اس کے بارے میں پتا کرو۔" میں نے بے چینی سے کہا۔

اریس نے گاڑی موڑی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ وہ انجلا کو کہاں تلاش کرے گا مگر میں ابھی اور اسی وقت اس تک پہنچنا چاہتی تھی۔ اریس نے گاڑی رائل پلازہ کے قریب روکی۔ "میڈم! آپ محاط رہیئے گا اس کے ساتھ سورج سنگھ تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ آپ کو دیکھ سکے۔"

"میں جانتی ہوں۔ مگر کیا وہ لوگ اب تک یہاں ہوں گے؟"

"شاید۔ دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ یہاں نہ ملے تو ہم سیدھے فلیٹ چلیں گے۔" اس نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

"اریس اگر وہ یہاں مل جائے تو اس سے کہنا کہ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں مگر اکیلے میں۔"

میں سر پر دوپٹا ڈال کر اس انداز سے بیٹھ گئی کہ ہوٹل سے نکلنے والے ہر شخص پر میری نگاہ رہتی مگر میں کسی کی نگاہ میں نہ آتی۔ مجھے واقعی فی الحال سورج سنگھ کی نگاہوں اور بھل رہنا تھا۔

اریس ہوٹل میں چلا گیا۔ میں سخت بے چین تھی۔ میرے منہ سے نکلے والے چند الفاظ نے انجلا کی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا تھا' وہ سنگھم سے غداری کر رہی تھی اور اپنی اس غلطی کی بنا پر کسی بھی لمحے خطرے میں پڑ سکتی تھی مگر یہ کام میرے ہاتھوں نہیں ہونا چاہئے تھا۔ خود مفاد میرے لیے دہلی جان بن گئی تھی۔ لاکھ کی گمشدگی نے میرے حواس گم کر دیئے تھے اور میں وہ کر گئی تھی جو ہرحال مجھے نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اب بھی آیا تو میں پہچانتا ہی تھی۔ اب میری ظاہر کی اور اریس کی زندگی کے ساتھ ساتھ انجلا کی زندگی بھی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ ہرحال ایک کارڈ اب بھی میرے پاس تھا۔ انجلا کی زندگی کا سودا اپنی تینوں کی زندگی سے کر سکتی تھی میں اس سے لیپ کے بارے میں معلوم کر سکتی تھی۔ میں خدا سے دعائیں کرنے لگی کہ وہ مجھے میری کوششوں میں کامیاب کرے۔

پیٹھے بیٹھے کافی وقت گزر گیا مجھے احساس بھی نہ ہوا خیال آیا تو میں پریشان ہو گئی اور اریس کو اندر گئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ اسے وہ دونوں ملتے یا نہ ملتے دونوں صورتوں میں اب تک واپس آ جانا چاہئے تھا۔ نہ معلوم کیوں مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ میرا جی چاہا تھا کہ میں اندر جا کر اسے تلاش کروں مگر میں نے خود پر قابو رکھا۔ میں کچھ دیر اور اس کا انتظار کرنا چاہتی تھی۔ وقت پھر دبے پاؤں گزرنے لگا مگر گزرتے وقت کے قدموں کی دھمک مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے مشکل سے پانچ منٹ انتظار کیا پھر میں خدا پر بھروسہ کر کے گاڑی سے اتری اور بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں خوف بھی محسوس کر رہی تھی مگر اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ میں جونہی بیڑھیوں کی طرف بڑھی میری نگاہ دور سے آتے ہوئے اریس پر پڑی۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک دم تیز قدموں سے میری جانب بڑھا۔ اس دوران میں اس نے پلٹ کر دیکھا اور میں سمجھ گئی کہ اس کے پیچھے کوئی ہے۔ میں تیزی سے گاڑی میں بیٹھ گئی اور بالکل کونے میں دبک گئی۔ بیٹھتے میں نے چڑھا لیے تھے جو ہلکے براؤن کلر کے تھے۔ میرا سر درست نکلا۔ اریس کے پیچھے ہی انجلا تھی۔ میں نے سانس بھر لیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اس کے پیچھے سورج سنگھ بھی ہو گا۔ چند ہی لمحوں میں اریس آ گیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور تیزی سے آگے بڑھا دی۔

"مس انجلا ہمارے پیچھے آ رہی ہیں" اس نے سرگوشی کی۔

"اس کے ساتھ۔"

"جی میڈم! سورج سنگھ ان کے ساتھ ہے مگر وہ ہمارے طالب میں تمام آئیں کی میں انھیں کہہ چکا ہوں کہ وہ تنہا ہی آئیں اور اس کا ذکر فی الحال کسی سے نہ کریں۔ وہ مجھے اپنے سامنے پا کر پریشان ہو گئی تھیں۔ شاید انھیں توقع نہ تھی۔"

"یہ تمہیں کہاں ملیں؟ اتنی دیر تک۔ کیا کر رہی تھیں؟"

"شاید کوئی میٹنگ تھی' کئی لوگ تھے۔ میں نے ریسپشن سے معلوم کر کے انھیں فون کیا تھا اور بتایا تھا کہ آپ یہیں ہے انھیں فوراً آپ سے ملنا ہے۔"

اریس کی بات ختم ہوئی تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔ انجلا خود گاڑی ڈرائیو کر رہی تھی اور ہمارے تعاقب میں تھی۔

"کہاں جانا ہے میڈم؟"

"ساحل پر چلو۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ میں ایسی جگہ نہیں جانا چاہتی تھی جہاں ہجوم ہو اور کوئی میرے یا انجلا کے اوپر نگاہ رکھے۔ میں اس کی تلاش بھی نہیں چھوڑنا چاہتی تھی' اسی لیے میں نے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا کہ دور دور تک کوئی نہ ہو۔ ہم تھوڑی دیر میں ساحل تک پہنچ گئے۔ اریس نے گاڑی ایک سائبان جگہ کھڑی کر دی۔ انجلا بھی وہیں رک گئی۔

"اریس یہاں اگر کوک وغیرہ مل سکے تو۔" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی میڈم! یہاں سے کچھ دور ایک ریسٹوران ہے' میں وہاں سے لاتا ہوں۔"

"پیسے میں تمہارے پاس؟" میں نے پرس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جی میڈم۔" اس نے جواب دیا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا اسی اثنا میں انجلا قریب آ چکی تھی۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خود اعتمادی کے علاوہ گہری الجھنیں بھی تھیں۔ وہ جیسے ہی قریب آئی میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے مس نارا؟"

"بات اچھی نہیں ہے مس انجلا! میں ابھی آفس سے آ رہی ہوں۔ میں نے وہاں آپ کے بارے میں۔ دراصل میں مسٹر وقار کے کمرے میں گئی تو وہ وہاں نہیں تھے۔ باتھ روم میں تھے۔ وہیں ٹیبل پر میں نے ایک خط دیکھا جو کھلا ہوا تھا۔ میں نہیں جانتی کہ وہ خط کس نے لکھا تھا مگر وہ آپ سے متعلق تھا۔ اس میں لکھا گیا تھا کہ آپ سنگھم کو ڈبل کراس کر رہی ہیں۔ آپ کسی سورج سنگھ کے ساتھ مل ہوئی ہیں جو یہاں کا بڑا اسمگلر ہے اور آپ کی وجہ سے سنگھم بہت بڑے خطرے کی زد پر ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ کے بارے میں بہت سی باتیں تھیں۔ میں پورا خط نہ پڑھ پائی کیونکہ آہٹ ہوئی تھی اور پھر مسٹر وقار آ گئے۔ ان کا انداز ہی کافی جارحانہ تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ لوگ۔ آپ کے ساتھ۔ مس انجلا آپ نے دوست بن کر میرا ساتھ دیا ہے' ویسے بھی میں دل کی بہت کمزور ہوں' پلیز کچھ کیجئے اس سے پہلے کہ۔ مسٹر وقار مجھے روک رہے تھے انھوں نے کسی اور شخص کو بھی بلوایا تھا جو کمرے سے باہر ان کا منتظر تھا۔ جب میں کمرے سے نکلی تو وہ اٹھ کر اندر گیا تھا۔ وہ کافی خوف ناک اور۔ سفاک لگ رہا تھا۔ میں وہاں سے سیدھی آپ کے پاس آئی ہوں۔ پتا نہیں یہ میں نے صحیح کیا ہے یا نہیں۔ مگر۔ طارق کا انجام میں۔ میں اب تک بھول نہیں سکی ہوں۔ میرے لیے یہ سب ناقابل برداشت ہے۔" میں بولتی چلی گئی اور خود پر حیران ہوتی رہی کہ میں کس قدر روانی سے جھوٹ بول رہی تھی۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ میں بہت بڑی اداکارہ بھی ہوں' اس لیے کہ میرے

ہونٹ کانپ رہے تھے' آواز بھرا رہی تھی' آنکھیں نم تھیں اور یوں محسوس ہو رہا تھا' جیسے جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہی سچ ہے۔ اس قدر ریئل ایکٹنگ تو کوئی بڑا اداکار ہی کر سکتا ہے کہ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا دے۔

یہ سب سن کر اسنجلا کا رنگ بالکل پیلا پڑ گیا وہ کافی دیر گم صم بیٹھی رہی پھر اچانک اس کی آنکھوں کے کونے بھی نم ہو گئے۔ "میں نے۔۔۔ ان لوگوں کے لیے بہت کچھ کیا ہے تارا مگر ان لوگوں نے۔۔۔ ان لوگوں نے مجھ سے میرا ارمان تک چھین لیا۔ میں انسان ہوں کوئی روبوٹ نہیں کہ جس کے بٹنے میں دل کی جگہ مشین فٹ ہو۔ کیا نہیں کیا میں نے۔۔۔ قتل تک کیا ہے میں نے تارا قتل۔۔۔ خون کیا ہے ان ہاتھوں نے جو صرف دعا دینا جانتے تھے۔ مجھ سے دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے کی ہمت تک نہیں ہے ان لوگوں نے' میرا دل اب نہیں دھڑکتا۔۔۔ میری سانسوں میں اب حرارت ہی نہیں رہی' میں زندہ نہیں ہوں مس تارا میں جانے کب کی مر چکی ہوں۔ میرے اندر صرف جوزف کے گوشت کے چلنے کی بو بس رہی ہے۔ میری تو روح تک نہیں میرے اندر ہے۔ ٹھیک ہے وہ لوگ کیا کریں گے؟ کیا کر لیں گے۔ کچھ بھی نہیں کر سکتے مس تارا! وہ لیکیہ پیٹنے رہ جائیں گے۔ میں تو آج چلی جاؤں گی۔۔۔ تم۔۔۔ تم میری دوست! میں تمہیں کبھی نہیں بھلوں گی۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ تھینک یو۔۔۔ تھینک یو ویری مچ مس تارا! مجھے افسوس ہے کہ میں اب تک تمہارے کسی کام نہ آسکی اگر کبھی' کہیں موقع ملا تو یہ ادھار چکا دوں گی' یہ قرض اتار دوں گی مس تارا! تھینک یو اب تم فوراً لوٹ جاؤ اور ہاں۔۔۔ آج تم پکایا جا رہی ہو نا؟"

"نہیں مس اسنجلا' آج میں پکایا نہیں جاؤں گی مگر یہاں سے میں سیدھی اس فیملی کے پاس جاؤں گی جن کے ساتھ مجھے پکایا جانا ہے۔ ہم کل صبح سویرے ہی نکل جائیں گے۔ میں مسٹر وقار سے اجازت لے چکی ہوں۔"

"انھوں نے اجازت دینا ہی تھی مس تارا! تم جیسی ذہین لڑکی کو وہ ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ریکیل یو آر ویری انٹیلیجنٹ۔"

"مس اسنجلا ایک چھوٹا سا کام کر دیں گی میرا؟" میں نے مجک کر کہا۔

"ارے بولیں نا' میں آپ کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔" "مس اسنجلا' میرے کمرے کی سیٹنگ بدل دی گئی ہے' غالباً آپ کی نگرانی میں۔ مجھے کچھ چیزیں پسند تھیں جو کمرے سے ہٹا دی گئی ہیں اگر وہ مجھے مل جائیں تو۔"

"وہ یہ تو کوئی کام نہ ہوا۔ وہ تمام چیزیں تک نے کہیں رکھوا دی ہیں۔ شاید اس عمارت کے نیچے بنے گودام میں۔"

اور یہ سن کر میری جان میں جان آگئی کہ وہ تمام چیزیں وہیں موجود ہوں گی۔ میں تک سے مل کر وہاں تک پہنچ سکتی تھی۔ میں نے اسنجلا کا شکریہ ادا کیا۔ اسنجلا نے میرے رخسار سے اپنا رخسار مس کیا' مجھے پیار کیا اور اور پھر "مس تارا! میں تمہیں پھر نہیں دیکھوں گی۔ کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کر دینا۔"

"ارے۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہوا مس اسنجلا۔ میں آپ کو یاد رکھوں گی' آپ کے لیے دعا کروں گی۔"

"اوکے بائی۔" وہ مسکرائی اور تیزی سے اتر کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ اس دوران میں چاروں طرف دیکھتی رہی تھی۔ بہت دور کچھ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ میں نے اسی جانب دیکھا' اس جانب اور اس گیا تھا۔ وہ ہاتھ میں ایک تھیلا اٹھائے بڑے قدموں سے میری جانب بڑھ رہا تھا۔

"مس اسنجلا چلی گئیں؟" اس نے تھیلا مجھے دیتے ہوئے کہا۔ تھیلے میں کوک کی بوتلیں اور اسٹرا تھے۔

"ہاں! ان کا زیادہ دور تک رکنا مناسب نہیں تھا۔" میں نے ایک بوتل اس کی جانب بڑھا دی "کوک پی لو پھر چلیں گے۔"

"میڈم! میں الجھن میں ہوں آپ یقیناً جو کچھ کر رہی ہیں' سوچ سمجھ کر ہی کر رہی ہوں گی۔ صرف اتنا کہوں گا' محتاط رہئے گا۔"

"اس اعتماد کا شکریہ اوریس! میں بہت سوچ سمجھ کر ہی کر رہی ہوں اب مجھ میں کافی خود اعتمادی آگئی ہے کچھ ایسی ہیں۔ جنہیں فی الوقت بتانا ممکن نہیں ہے۔ ظاہر ہے آنے تک تمہیں صبر کرنا پڑے گا۔"

"نہیں۔ یہ بات نہیں کہ میں ہر بات جاننا چاہتا ہوں مگر کبھی کبھی آپ کی طرف سے فکر مند ہو جاتا ہوں۔ آپ میرے پاس امانت ہیں۔"

اس کے آخری جملے نے مجھے چونکا دیا۔ ظاہری "او" ای

بازگشت مجھ میں دور تک گونج اٹھی۔ اس نے کہا تھا۔ "تارا! تم میری امانت ہو' خیانت نہ کرنا مجھے تارا تم سے ویسی ہی چاہئے ہے جیسی میں تمہیں دے رہا ہوں۔" مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"چلیں اوریس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"ہاں چلو! ہمیں پر کاش کے گھر جانا ہے۔"

میری بات سن کر اوریس نے لمحہ بھر مجھے دیکھا پھر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ میں خیالوں میں ڈوب گئی۔ میں اندازہ لگا رہی تھی کہ جو کچھ میں کر رہی ہوں اور جن نتائج کی مجھے توقع ہے کچھ اس کے خلاف تو نہیں ہو جائے گا۔ میں یہ بات سوچتی رہی اور پر کاش کا گھر آگیا۔ پر کاش باہر لان میں مل گیا۔ وہ پودوں کو پانی دے رہا تھا اور سورن سنگھ ایزی چیئر پر بیٹھے اس سے باتیں کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی دونوں خاموش ہو گئے۔ پر کاش پائپ پھینک کر گیٹ تک آیا۔ میں اندر داخل ہو گئی جبکہ اوریس گاڑی میں بیٹھا رہا۔

"ارے مسٹر اوریس آیئے نا آپ۔" پر کاش چکا پھر میری جانب پلٹ کر بولا۔ "آپ اپنا سامان لے آئیں؟"

"نہیں پر کاش' میں ابھی گھر گئی ہی نہیں۔ اب جاؤں گی تو واپس ہی آؤں گی۔"

"آپ بہانے پر بہانے بنا رہی ہیں میں بتا رہا ہوں کہ میں نے ساری تیاری کر لی ہے۔ ڈیڈی کی بھی سب چیزیں رکھ لی ہیں اور وہاں ہوٹل میں کمرا بھی بک کرا لیا ہے۔" وہ کسی طرح اس پنجے کی طرح پنڈ چھڑا رہا تھا۔

"ارے بابا کوئی بہانہ نہیں کر رہی۔ کل چلیں گے۔"

"پکا وعدہ؟"

"ہاں بالکل پکا۔" میں نے ہنس کر کہا اور سورن سنگھ کی طرف بڑھ گئی۔ "آچھا تم چائے بنواؤ۔" میں نے پلٹ کر پر کاش سے کہا جو اب بھی وہیں کھڑا کچھ سوچ رہا تھا چونکا اور اندر کی جانب چل دیا۔

اوریس بھی اندر آچکا تھا اتنی دیر میں ملازم دو کرسیاں لے آیا۔ ہم دونوں وہیں بیٹھ گئے۔ سورن سنگھ مجھے غور سے دیکھ رہے تھے۔

"بات ہے پتر؟"

"ڈیڈی' آپ نے کہا تھا کہ سورج سنگھ سری لنکا گیا ہوا ہے پھر وہ۔۔۔ وہ یہیں ہے۔"

میری بات سن کر وہ اچھل پڑے۔ "تو۔۔۔ تو بھی ہے اس سے۔۔۔ تو نے بات نہیں مانی تھی میری؟"

"نہیں ایسا نہیں۔۔۔ میں نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔۔۔ "میں اس سے نہیں ملی اسے اوریس نے کچھ ہی دیر پہلے رائل پلازہ ہوٹل میں دیکھا ہے۔"

"آج۔۔۔ کیا ڈیٹ ہے؟"

"سترہ۔" اوریس نے جواب دیا۔

"سترہ!۔۔۔ ہاں ٹھیک تو ہے' آج ہی تو جانا ہے اسے۔۔۔ آج گیارہ بجے رات کی فلائٹ ہے اس کی" وہ زیر لب بولے۔

"مس اسنجلا کو جانتے ہیں آپ؟" میں نے پھر سوال کیا۔

"اسنجلا۔۔۔ پتا نہیں۔۔۔ ویسے دو لڑکیاں ہیں تو اس کے ساتھ۔۔۔ کینی ہے' اسنجلا' میرا مطلب ہے اس کا طلبہ۔۔۔"

"اسمارٹ ہی ہے۔ تقریباً تمہیں بیس برس کی ہو گئے ہوئے بال ہیں۔ سانولا رنگ اور نقوش۔ نقوش والی لڑکی ہے۔"

"بڑی بڑی روشن آنکھوں والی نا! وہ۔۔۔ اس کا منگیتر تھا۔۔۔ کیا نام تھا اس کا؟" وہ ماتھے پر انگلی رکھ کر سوچنے لگے۔

"جوزف!" میں نے کہا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہی' ہاں وہ سورج کی دست راست ہے۔"

"وہ ڈیڈی آپ کو تو پرشین بھی آتی ہے۔" پر کاش جانے کب وہاں آچکا تھا۔

"تمہیں کیسے معلوم کہ یہ پرشین ہے۔" میں نے آنکھیں پھیلا کر مصنوعہ خیز انداز میں پوچھا تو وہ جھینپ گیا۔

"تو چپ کر پر کاش کام کی باتوں میں بول پڑتا ہے" وہ اسے ڈانٹ کر میری طرف متوجہ ہو گئے۔ "ہاں تو کیا کہہ رہی تو کیا کیا ہوا اسنجلا کو؟"

"کچھ نہیں ڈیڈی۔۔۔ میں نے اسے بھی سورج کے ساتھ دیکھا تھا' اس لیے پوچھ رہی تھی۔ میں اسے جانتی ہوں۔"

"اچھا اچھا۔۔۔ ہاں وہ اس کی ساتھی ہے' مددگار ہے' اس کی۔۔۔ بڑی ذہین لڑکی ہے۔ میں ایک بار اس سے ملا ہوں۔ وہ بھی شاید اس کے ساتھ ہی جائے گی۔"

میرا کام ہو چکا تھا میں بلی چھلکی ہو گئی۔ لاسٹ والا مسئلہ بھی حل ہو چکا تھا۔ تک سے لیپ حاصل کرنا بڑی بات نہ

تھی لہٰذا میں مطمئن ہو گئی۔ اب مجھے گیارہ بجنے کا انتظار تھا۔ میں نے وہیں سے مسٹر وقار کو فون کر کے ان سے موبائل فون کا نمبر لے لیا تھا انہوں نے وجہ پوچھی تو میں نے کہہ دیا کہ میں فی الحال نہیں بتا سکتی مگر میں چاہتی ہوں کہ آپ سے کسی بھی وقت کانٹیکٹ کر سکوں۔ یہ سن کر انہوں نے مجھے گھر کے بھی دو نمبرز دیئے اور دواؤں کی فیکٹری کا بھی نمبر دیا۔ انہوں نے بتایا کہ آج وہ رات گئے تک فیکٹری میں ہوں گے۔ آج پاکستان سے مال آنا تھا تو انھیں ریسو کرنا تھا۔ یہ سن کر مجھے اطمینان ہو گیا۔ میں فون کر کے باہر لان میں آئی تو چائے آچکی تھی اس وقت شام کے ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ گیارہ بجنے میں ابھی بہت وقت تھا اور میں اسنجلا کے چلے جانے کی منتظر تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اسنجلا کے نکل جانے کی اطلاع مسٹر وقار کو اس وقت دوں گی جب وہ جہاز میں بیٹھ چکی ہو گی۔ اتنا وقت مجھے بیس گزارنا تھا۔ میں کافی تھکن بھی محسوس کر رہی تھی۔ چائے پی کر اور ڈیڈی سے اجازت لے کر میں ڈریسنگ روم میں آگئی تاکہ کچھ دیر لیٹ سکوں۔ اور لیں پر کاش اور سورن سنگھ وہیں لان میں بیٹھے رہے۔ میں ڈریسنگ روم میں صوفے پر لیٹ گئی میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی تھی اسی لیے آنکھیں موند کر لیٹ گئی، پھر جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ مجھے جگانے والا پرکاش تھا۔

"اٹھیے رویٰ جی! آپ کا یہ بہانہ نہیں چلنے دوں گا کہ اب تو بہت رات ہو گئی کل سامان لے کر آؤں گی تو چلیں گے۔" اس نے میری نقل اتاری۔

میں ہنس پڑی "تم پاگل ہو۔ یہ بہانہ نہیں ہے، میں سونا نہیں چاہتی تھی مگر۔ خیر ٹائم کیا ہوا ہے؟"

"سوا نو بجے ہیں ناراجی؟" اس نے ریسٹ واچ میرے سامنے کر دی۔

میں اچھل کر اٹھ بیٹھی۔ "سوا نو! تم لوگوں نے اٹھایا کیوں نہیں؟"

"دو دفعہ کوشش کی تھی مگر آپ بے خبر سو رہی تھیں اب بھی نہ اٹھتیں تو میں پانی کی بالٹی انڈیل دیتا۔"

"اچھا کرتے۔ چلو تم میں منہ دھو کر آرہی ہوں۔" میں اٹھ کر اس راہداری میں چل دی جہاں کا من باتھ روم تھا۔ پانچ منٹ بعد میں لان میں آگئی جہاں اب تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ روشنی کے دونوں جانب لگے پول پر ڈے لائٹس لگی ہوئی تھیں خنکی بڑھ گئی تھی اور آسمان پر گہرے بادل چھا گئے تھے۔

"آپ کو ٹھنڈ تو نہیں لگ رہی ڈیڈی!" میں نے سورن سنگھ سے پوچھا۔

"بہت ہلکی ہلکی۔ پر کاش مجھے کھیس لا دو" آخری جملہ انھوں نے پر کاش سے کہا پھر میری جانب مڑے "پتر تم بھی تھکن اتر گئی نا؟"

"جی ڈیڈی مجھے تو پتا ہی نہیں چلا اور میں سوتی رہ گئی۔ اب فریش ہوں" میں نے اور لیں کی طرف دیکھا وہ سنجیدہ تھا مجھے شدت سے احساس ہوا کہ وہ بھی تھکا ہوا ہو گا۔

"اور لیں تم چاہو تو کچھ دیر لیٹ لو ہم یہاں سے گیارہ بجے چلیں گے۔"

"میں ٹھیک ہوں میڈم! آپ میری فکر نہ کریں۔"

"ہاں پتر! تکلف نہ کر" سورن سنگھ نے کہا۔

"نہیں مسٹر سورن سنگھ۔ میں تکلف نہیں کر رہا۔" پر کاش چادر لے کر آگیا اس نے اپنے ڈیڈی کو اچھی طرح اڑھا دی ہم بہت دیر تک وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پر کاش بالکل بچوں کی سی حرکتیں کر رہا تھا وہ پر کاش جو کہاں چلا گیا تھا دیکھ کر میں ـــــ خوفزدہ ہو گئی میں بہت گھبرا اور بڑی عمر کا پختہ آدمی لگ رہا تھا ہم اگلے دن کا پروگرام بناتے رہے۔ طے یہ ہوا تھا کہ صبح سویرے ہی چل جائیں گے۔ پر کاش رات کو میرے گھر جانے کا سن کر خاصا برہم ہوا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ میں گھر گئی تو سویرے ہی سویرے وہاں نہیں پہنچ سکوں گی میں نے بڑی مشکل سے اسے منایا دلایا تھا کہ میں سویرے ہی آجاؤں گی۔ وہ بضد تھا کہ ابھی چلا جاؤں اور سامان لے کر واپس آجاؤں سورن سنگھ کے ڈانٹنے پر اس نے منہ پھلا لیا تھا اور مجھے گھور رہا تھا۔

وقت گزرتی نہیں رہا تھا۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی تو صرف ساڑھے نو بجے تھے پھر جانے کب اور کیسے سورن سنگھ نے انڈیا کی باتیں شروع کر دیں جو میرے لیے طلسمی کہانی سے کم نہ تھیں وہ سادہ ہو ستھ کی باتیں کرنے لگے اور میرا تجسس ابھرتا چلا گیا میں یہ سن کر ہی حیران ہوئی تھی کہ وہاں جنگلوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو صرف ایک لنگوٹ میں زندگی بتا دیتے ہیں اور انہی کی قوتوں کو زیر کر لیتے ہیں جو حیرت انگیز ہوتی ہیں وہ کے بارے میں یوں بتا دینے میں جیسے اپنے سامنے

اپنے خدوخال کے بارے میں بتا رہے ہوں۔

"میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو تمہاری صورت دیکھ کر تمہارے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں بتا سکتا ہے بھوت پریت ان کے قابو میں ہیں اور وہ ایسی شکتی کا مالک ہے کہ دیا کی کوئی طاقت انھیں زیر نہیں کر سکتی" انھوں نے کہا۔

"ڈیڈی! جب ہم انڈیا جائیں گے تو۔ مجھے بھی ملائیے گا۔ ایسے لوگوں کو دیکھنے کا بڑا اشتیاق ہے"

"ہاں! میں لے چلوں گا پتہ۔ پر وہ" انھیں ان کے کنٹرول کرنا پڑا مشکل ہوتا ہے۔"

"کنٹرول کیا ڈیڈی؟" میں نے پوچھا۔

"یہی جھوٹ کو وہ اپنے گرد ایک لکیر کھینچ دیتے ہیں' کنٹرول کئے ہیں۔"

"اچھا حصار!"

"نا نہیں تم لوگ اسے کیا کہتے ہو' بہرحال میں نے ایسی کوئی شکتی والا اب تک نہیں دیکھا۔"

میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا مگر اسی وقت ملازم نے کھانے کی اطلاع دی۔ ہم لوگ اٹھ کر کھانے کے کمرے میں گئے۔ کھانے سے فارغ ہو گئے تو پونے گیارہ بج رہے تھے وقت کم رہ گیا تھا میں نے سورن سنگھ سے پوچھا کہ ہم نے اپنے وقت پر روانہ ہو گی؟ انھوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس دوران میں وہ مجھے گہری نگاہوں سے دیکھتے رہے گہری سوال نہ کیا۔ شاید وہ سمجھے ہوں کہ میں سورج نکلنے کے چلے جانے کا اطمینان چاہتی ہوں۔ ان کا یہ سمجھنا میرے لیے بہتر تھا۔

ٹھیک گیارہ بجے اٹھ گئی۔ میں فون کرنا چاہتی تھی اس لیے سورن سنگھ سے اجازت لے کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ فون وہیں تھا۔ میں نے پہلے ڈائریکٹری سے ایئرپورٹ کا نمبر نکالا اور وہاں انکوائری پر فون کیا۔ دوسری جانب کوئی مرد بول رہی تھی میں نے نوٹی پھوٹی انگریزی میں اس سے پوچھا کہ میں سری لنکا جانے والی مس اسنجلا سے بات کرنا چاہتی ہوں' اہم جنسی ہے مگر اس نے جواب دیا کہ مسافر اس وقت جہاز میں بیٹھ چکے ہیں' جہاز روانہ ہونے ہی والا ہے اور اس سے ان سے بات کرنا ممکن ہے۔ اس نے ایکسیوز کر کے فون بند کر دیا۔ میں خود بھی یہی چاہتی تھی۔ فون بند کر کے میں نے دواؤں کی

غزل

خاطر غزنوی

بستیاں ہو گئیں بے نام و نشاں راتوں رات
ایسے طوفان بھی آئے ہیں یہاں راتوں رات

صبح کے ساتھ ہی تعمیر نظر آنے لگی
ہو گیا خواب ترا جسم جواں راتوں رات

شام بنگار تھا خوشیاں تھیں جس چہرے تھے
کھو گئی محفلِ احباب کہاں راتوں رات

سرو نازاں تھی سحر شاخیں فسردہ گل تھے
کیا سے کیا کر گئی گلشن کو خزاں راتوں رات

حسن جلتا رہا خلوت میں ہی تنہا تنہا
ہو گئی مشعلِ مہتاب دھواں راتوں رات

اک جہانگیر محمر شی کی رجز خوانی ہے
ہو گیا کیا یہ مرے گھر کا سماں راتوں رات

کون ان کلیوں کی قسمت پہ نہ روئے خاطر
جن کو کر دیتی ہے تقدیر جواں راتوں رات

فیکٹری میں مسٹر وقار کو فون کیا۔ دوسری طرف پہلی بیل بجتے ہی فون اٹھا لیا گیا۔ "ہیلو!" مسٹر وقار کی آواز سنائی دی۔

"مسٹر وقار! میں آسٹیلا آج کسی وقت بھی لنکا فرار ہو رہی ہیں۔" میں نے آواز میں ٹھہراہٹ پیدا کرتے ہوئے انھیں اطلاع دی۔ "مجھے ابھی ابھی پتا چلا ہے۔"

"کیا۔۔۔ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" وہ تقریباً چیخ اٹھے۔ "غضب ہو جائے گا مس تارا! اگر ایسا ہوا تو آپ فون رکھیں میں کچھ کرتا ہوں۔ آپ مجھے دوبارہ فون کیجئے گا۔" انھوں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

"میں نے اطمینان بھری سانس لی اور باہر آگئی جہاں ادریس میرا منتظر تھا۔ پرکاش اور سورن سنگھ بھی روش پر ٹہل رہے تھے۔ میں ان لوگوں سے اگلی صبح آنے کا وعدہ کر کے فلیٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔ رات کے سوا کیارہ بج رہے تھے مگر سڑکوں پر وہی شام والی رونق تھی۔ میں نے ادریس سے کہا تھا کہ وہ آہستہ روی سے چلے۔ راستے میں ہلکی ہلکی بوندا باندی ہونے لگی۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ اتار دیا۔ پھوار میرے چہرے پر پڑی تو مجھے پھر وہی پہلی رات یاد آگئی جب پہلی بار طاہر کے ساتھ اپنے نئے فلیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ اس روز بھی ہلکی پھوار پڑتے پڑتے تیز بارش شروع ہو گئی تھی۔ اس روز میں نے دنیا بھر کا حسن رات کی گہری تاریکی کے باوجود اپنے چاروں طرف محسوس کیا تھا۔

وہ میری زندگی کی پہلی بارش تھی جسے میں نے انجوائے کیا تھا۔ اس روز طاہر نے پوچھا تھا کہ مجھے بارش کیسی لگتی ہے، تب میں ٹوٹ گئی تھی۔ مجھے اسی لمحے وہ بارشیں یاد آگئی تھیں جو میں نے اماں ابا کے گھر میں چھوٹے چھوٹے گھروں کی سلاخوں والی کھڑکی سے باہر برستی دیکھی تھیں۔ میں نے طاہر کو بتایا تھا کہ اب سے پہلے ساری بارشیں، کچے صحن سے پانی ڈبوں میں بھر بھر کر نکالتے گزر جاتی تھیں، پھوار میں بھیگنے کی خواہش تو صحن سے کپڑے بچانے یا دوسری چیزیں اٹھا کر اندر لے جاتے لے جاتے ہی دم توڑ دیا کرتی تھیں اور جب میں کھڑکی کھول کر، ٹھنڈی اور بھیگی ہوئی سلاخوں کو اپنی گرم ہتھیلی میں جکڑ کر ماتھے کو ان ٹھنڈی سلاخوں سے ٹکا کر باہر برستی بوندوں کو دیکھتی تو ایسے میں شادی اپنی آگ مجھے نوک دیا کرتی تھیں۔ "تمہیں تو تارا! ابا نے دیکھ لیا تو جوتے لگائیں گے۔"

اور میں ابا کے خوف سے سیلن زدہ کمرے کے کونے میں دبک جایا کرتی تھی۔ طاہر کے ساتھ پہلی بار ہلکی پھوار میں بھیگی تو انگ انگ میں سلگتی چنگاریاں چھاتیوں کی آواز بھی کر بجھ گئی تھیں مگر اندر ہی اندر یوں پھیلا گئی جیسے کوئی خوشبوؤں سے معطر آگر گزر گیا ہو اور ہلکی ہلکی خوشبو اب بھی کمرے میں پھیلی ہو، پھر ایسی کتنی ہی بارشیں میں نے فلیٹ کی بالکونی میں طاہر کی قربت سے معطر گزاری تھیں کہ بارشوں کا سارا حسن صرف اور صرف طاہر کی شخصیت میں سمٹ آیا تھا۔ آج کی یہ پہلی بارش جو مجھے ذرا نہ بھائی تھی۔ بارش کی ہر بوند اپنے اندر ہاہا کار کب سمیٹے تھی۔ ہلکی اور ٹھنڈی پھوار میرے اور چنگاریاں سی بھڑکی جا رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر کھڑکی کا پٹ بند کر دیا اور ونڈ اسکرین پر گرتی بوندوں کو دیکھنے لگی جو ہر پر ایک چمک دار سی لکیر بنا کر مٹتی چلی جا رہی تھیں۔ سیاہ اور ڈامر ٹل کی کالی سڑک بھیگتی جا رہی تھی۔ گاڑی کی رفتار نہیں تھی۔ میں خود کو بہت لطیف محسوس کر رہی تھی مشکل سے آدھے گھنٹے میں ہم لوگ فلیٹ کی عمارت تک پہنچ گئے۔ ادریس نے عمارت کے گیٹ کے پاس گاڑی روکی تاکہ میں اتر سکوں۔ میں اترنے ہی والی تھی کہ ایک بریک چیخنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ پیچھے آنے والی ہماری گاڑی کے پہیے تیز آواز کے ساتھ آچاک رکی۔ میں نے گھبرا کر دروازہ بند کر لیا۔ ادریس پھرتی کے ساتھ گیا۔ اسی لمحے وین کا ڈرائیور بھاگتا ہوا ادریس کے پاس آیا بالکل اسی لہجے میں جیسے شدت سے احساس ہو کہ اس کے پاس یعنی ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے، کوئی ایسی چیز جس سے ہم اپنا بچاؤ کر سکیں لیکن یہ خیال دوسرے لمحے اس وقت ذہن سے نکل گیا جب میں نے آسٹیلا کے منہ سے مسٹر وقار کا نام سنا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ مسٹر وقار نے مس تارا کو فوراً بلایا ہے۔ وہ فیکٹری سے نکل چکے اور یہ کہ ہم لوگ اس شخص کو فالو کریں۔ اس نے تیزی سے جملہ کہا اور بھاگتا ہوا وین میں جا بیٹھا۔ اس نے لمحہ بھر کو سوچا، مجھے دیکھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ادریس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ اس سے پہلے ہی وین کا ڈرائیور وین نکال کر سڑک پر ڈال چکا تھا۔ ادریس نے وین کے تعاقب میں گاڑی دوڑا دی۔ میں جانتی تھی کہ مسٹر وقار ایئرپورٹ کو اپروچ کریں گے۔ اسی لیے میں نے انھیں آسٹیلا کے بارے میں تین اس وقت اطلاع دی تھی جب ہمارا روانگی کے لیے تیار کھڑا تھا۔ میرے حساب سے مسٹر وقار کے اپروچ کرنے تک اسے روانہ ہو جانا چاہئے تھا۔ مجھے ڈر صرف یہ تھا کہ مسٹر وقار نے جہاز کو روانہ کیا ہے یا نہیں ایسا کرنا ان کے بس میں تھا یا نہیں۔

سڑک کافی حد تک سنسان ہو چکی تھی۔ وین اپنی پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی اور اسی رفتار سے ادریس اس کے تعاقب میں تھا۔

"ادریس۔" میں نے اچانک چونک کر ادریس کو پکارا۔

"جی میڈم!" اس نے مستعدی سے جواب دیا۔

"تمہیں یقین ہے کہ ہم ایئرپورٹ کی طرف جا رہے ہیں؟"

"جی میڈم! یہ سڑک سیدھی ایئرپورٹ جاتی ہے۔" اس کے جواب نے مجھے کچھ مطمئن کر دیا اور نہ میں نامعلوم کیوں یقین ہو گئی تھی۔

اور جوں ہم ایئرپورٹ سے قریب ہوتے جا رہے تھے ہماری تیزی سے دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ اسٹیلا کے یہاں سے چلے جانے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ اگر اسے روک لیا گیا تو میری غداری کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ مس اسٹیلا کے ساتھ ہی مسٹر وقار کی نگاہوں سے بھی گر سکتی تھی اور ایسا میں کسی حال میں نہیں چاہتی تھی۔ برا تو یہ ہوا تھا کہ وین کے ڈرائیور نے جس مقام پر پہنچایا تھا اس وقت میں گاڑی میں موجود تھی اور وہاں موجود نہ ہوتی تو لوئی بھی بہانہ کر سکتی تھی اور رک نہ جاتی اب میری نجات اسی میں تھی کہ جہاز جا

ہم دونی ایئرپورٹ کی عمارت کے اندر داخل ہوئے، وقار پگاہ پڑی جو بڑی بے قراری سے ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ہماری طرف لپکے۔ "غضب ہو گیا مس لوگوں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا۔۔۔ کیا ہو گیا؟"

"وہ نکل گئی اور۔۔۔ اور اس نے طارق کو موت کے منہ میں اتار دیا۔"

"خبر سے لیے ہم کا وحاشا تھی۔ "طارق کو! مگر بہرحال مجھے اس پر اطمینان ہوا کہ وہ نکل گئی۔"

"شاید وہ طارق سے ملی ہوئی تھی۔ یہی تھی جس کا اسے تحفظ حاصل تھا اور جبھی وہ اس دیدہ دلیری سے اس تنظیم میں شامل ہو گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ لاکٹ بھی ساتھ ہی لے گئی ہے۔"

مسٹر وقار کی بات سن کر میں سناٹے میں رہ گئی۔ خدا میری بھروسہ مند کر رہا تھا۔ یہ خیال تو مجھے آیا ہی نہیں تھا کہ میں لاکٹ کے خوف سے اس انداز سے بھی نجات پا سکتی ہوں۔ میں نے تو آسٹیلا کا مقام حاصل کرنے کے لیے یہ چکر چلایا تھا مگر اب پتا چلا کہ میں ایک تیر سے دو شکار کر چکی ہوں۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ طارق کو کیوں قتل کر گئی اور کیسے جبکہ وہ مسٹر ونگ جیسے شخص کی قید اور پہرے میں تھا۔

"سر یہاں یہ بات کرنا مناسب نہیں۔ اگر کہیں بیٹھ جاتے تو۔۔۔"

میری بات نے جیسے مسٹر وقار کو حواس دے دیئے جو اس سے قبل گم ہو چکے تھے۔ انھوں نے چونک کر پہلے گاڑی میں بیٹھے ادریس کو، پھر وین کے ڈرائیور کو دیکھا پھر میری جانب متوجہ ہو کر بولے۔ "او سوری مس تارا! آپ ذہین ہی نہیں بلکہ بڑے مضبوط اعصاب کی مالک بھی ہیں۔ ایسے حالات میں خود کو کنٹرول کرنا دل گردے کا کام ہے۔ میں تو کنفیوز ہو گیا ہوں۔"

انھوں نے میری بے حسی کو نیا رخ دے دیا تھا۔ انھیں کیا معلوم کہ میں نے خود کو تنظیم سے وابستہ کیا ہی نہیں پھر اس کے ضیاع نقصان کا بھلا مجھ پر کیا اثر ہونا تھا۔ "تھینک یو مسٹر وقار! ہمیں محتاط رہنا چاہئے۔ ان لوگوں کے درمیان بات کرنا۔" میں نے یوں سر گوشی کی جیسے اس پوری گینگ کی لیڈر میں ہی ہوں۔ میں نے جملہ بھی اسی لیے ادھورا چھوڑ دیا تھا کہ جو تاثر میں دینا چاہتی ہوں وہ بھرپور رہو۔

"جی۔۔۔ جی ہاں مس تارا۔ ہم کہیں بیٹھتے ہیں بلکہ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو فیکٹری چلیں۔ مجھے ذرا سے کام کے لیے گھر پر علی خان فون نہ کریں۔ میں نے بتایا تھا کہ آج پاکستان سے کھیپ آنا ہے میرا اس وقت وہاں ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ وہاں باتیں بھی ہو جائیں گی۔ میں آپ سے مشورہ چاہتا ہوں اس معاملے میں تمام کچھ بھی نہیں کہہ پاؤں گا۔"

"جی ہم وہیں چلتے ہیں۔" میں نے فوراً کہا اور ادریس نے مجھے گاڑی کی طرف بڑھتے دیکھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ مسٹر وقار اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے اس سے پہلے

انھوں نے وین کو روانہ کردیا۔ اور لیں نے میرے کہنے پر گاڑی مسٹر وقار کی گاڑی کے تعاقب میں دوڑا دی۔

میں فیکٹری جانا چاہتی تھی۔ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ پاکستان سے جو ہیروئن یہاں لائی جاتی ہے وہ کس طرح اور کس انداز میں یہاں پہنچتی ہے' یہ میرے پلان میں شامل تھا مگر اپنے باپ کی تلاش نے مجھے اس سلسلے میں کچھ ڈھیلا کردیا تھا۔ اب میں مطمئن تھی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ میرے پاپا نہ صرف زندہ ہیں بلکہ وہیں مراد آباد ہی میں موجود ہیں اور میں جب چاہوں ان تک پہنچ سکتی ہوں۔ چند دن تفریح کے لیے پتایا جانے کا مقصد بھی صرف یہی تھا کہ میں سورن سنگھ کے ساتھ رہ کر تمام تفصیلات معلوم کر سکوں۔ اب تفصیل تو مجھے معلوم ہو چکی تھی مگر محض پرکاش کی ضد کی وجہ سے اور کچھ اس سنگھم سے دور رہنے کی غرض سے میں پتایا جانا چاہتی تھی۔ اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے اور میں فلیٹ جانے کی بجائے فیکٹری جا رہی تھی۔ وہاں مجھے گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا تو لگنا ہی تھا کوئی مجھے ابھی نیند نہیں آئی تھی نہ میں تھکن محسوس کر رہی تھی شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں پرکاش کے گھر تین گھنٹے سو چکی تھی مگر بھرحال لیٹنے کے بعد صبح تک، تو نیند آ ہی جاتی اور پھر صبح سویرے اپنے دعوے پر پرکاش کے گھر پہنچنا مشکل ہی ہوتا۔ میں یہی سوچتی رہی اور سفر جاری رہا۔ فیکٹری شہر سے کافی دور تھی۔ بارش پہلے تو تھم گئی تھی مگر راستے میں ہی اچانک ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے اور تیز بارش شروع ہو گئی۔ میں پوں محسوس کر رہی تھی جیسے کھلے سمندر میں کسی لکڑی کے تختے پر بہے جا رہی ہوں جسے ہوائیں جس طرف چاہتی ہیں موڑ دیتی ہیں۔ میں سوچتی کچھ تھی اور ہو کچھ جاتا تھا۔ اور اب بھی آگے جانے کیا ہونے والا تھا۔ فیکٹری میں مجھے جانے کتنی دیر لگتی۔ وہاں میں کیا دیکھتی' اشرف علی خان کا اگلا حکم کیا ہوتا میں کچھ نہیں جانتی تھی۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد مسٹر وقار کی گاڑی ایک بہت بڑی عمارت کے گیٹ پر رک گئی۔ چند ہی لمحوں میں گیٹ کھول دیا گیا۔ ہم دونوں کی گاڑیاں آگے پیچھے اندر داخل ہوئیں۔ چوکیدار کو مسٹر وقار نے ہماری گاڑی کے بارے میں ہدایت کردی تھی اس لیے اس نے روکے بغیر ہمیں اندر جانے دیا۔

چند ہی لمحوں بعد ہم مسٹر وقار کے کمرے میں بیٹھے تھے۔

اور لیس وہیں گاڑی میں بیٹھا رہا۔ مسٹر وقار بہت پریشان تھے۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ اشرف علی خان کا فون آیا تھا۔ انھوں نے ہدایت کی ہے کہ مسٹر وقار جیسے ہی پہنچیں انھیں فون کرلیں۔ لہٰذا انہوں نے آتے ہی اشرف علی خان کا نمبر ملا لیا۔ جتنی دیر فون نہ آیا وہ مختلف فائلیں دیکھتے رہے۔ انھوں نے مجھ سے معذرت کرلی تھی کہ چند بے حد ضروری کام نمٹانا چاہتے ہیں۔ میں ان کی کیفیت سے واقف تھی' میں بہت غور سے انھیں دیکھ رہی تھی۔ کھیپ غالباً آنے کی اس لیے کہ فیکٹری میں اس وقت کافی چہل پہل تھی۔ ہاں تیزی تھی کئی فائلیں آرہی تھیں کئی جا رہی تھیں۔ مسٹر وقار خود بھی چند لمحوں کے لیے باہر گئے اور واپس آکر فون کا انتظار کرنے لگے۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ مسٹر وقار نے جھپٹ کر ریسیور اٹھا لیا۔ "ہیلو! سر! ہاؤ آر یو' جی سر۔۔۔ جی۔" وہ خاصا بوکھلائے ہوئے تھے پھر وہ اسنجلا کے بارے میں بتانے لگے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ اس وقت کس لیے فیکٹری میں موجود نہ تھے جب انھوں نے فون کیا تھا۔ انھوں نے فلائٹ کی ہلاکت کے بارے میں بھی بتایا اور لاکٹ کے بارے میں بھی۔ انھیں سو فی صد یقین تھا کہ طارق اسنجلا سے ملا ہوا تھا اور اسنجلا ہی لاکٹ لے کر کہیں گئی ہے۔ ساری باتیں سن کر انھوں نے آنکھ کے بارے میں ہدایت کی اور میری بے پناہ تعریف کی اور بتایا کہ اسنجلا والا معاملہ میری وجہ سے کھلا لیکن وقت کا چکر پڑ گیا ورنہ میں ایک بڑے خطرے سے بچا لیتی۔ اب بھی انھیں میرے پر بڑا اطمینان ہے اور یہ کہ وہ میرے سلسلے میں کافی حد تک فکل ہیں کیونکہ میری معیت میں کام کرنا ان کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔

میں یہ تمام باتیں سن رہی تھی اور دل ہی دل میں دعا ہو رہی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ اشرف علی خان سے کہوں' اس سے اپنی مدد کے لیے ظاہر کو مانگ لوں مگر میں جانتی تھی کہ اشرف علی خان میرے اور ظاہر کے تعلق سے واقف ہے' میں نے اشارے سے مسٹر وقار کو کہا کہ میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ مسٹر وقار نے اشرف علی خان کو کہا کہ میں اس وقت وہیں موجود ہوں اور بات کرنا چاہتی ہوں۔ پھر انھوں نے ریسیور میری جانب بڑھا دیا۔ دل بہت زور سے دھڑکا اور میں نے ریسیور لے کر کہا "ہیلو سر! آئی ایم

سو مس تارا" ان کی آواز نے میری وہی کیفیت کردی جو ان سے پہلی بار ملی کر ہوئی تھی۔ وہ ہاتھ جس میں فون تھا اور اتھاہ پانی سے بھیگ گیا۔

"یس سر! آپ کیسے ہیں؟"

"میں ہوں' مس تارا وہاں آپ کو کوئی دشواری تو نہیں سر' دشواری تو کوئی نہیں' مسٹر وقار ہمارا بہت خیال رکھ رہے ہیں پھر بھی مسز اسنجلا کے بعد میں تنہائی محسوس کر رہی ہوں' ذاتی معاملات کو تو میں خود ہی ڈیل کرسکتی ہوں مگر

"نہیں سر۔۔۔" انھوں نے میری بات کاٹ دی میں آپ کی تکلیف کو سمجھ رہا ہوں۔ مس تارا بنکاک کا پراجیکٹ بے حد اہم ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ کو بھیجنے کا کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا۔ میں یہاں سے کچھ قابل اعتماد لوگ بھیج رہا ہوں گا' اور کچھ۔۔۔؟" انھوں نے خاصے گہرے اور فکرانہ انداز میں کہا۔

"نہیں سر۔۔۔" میں ایک دم ہی بوکھلا گئی اور ریسیور پر مسٹر وقار کی طرف بڑھا دیا۔ مسٹر وقار نے انھیں کھیپ کے بارے میں کچھ بتایا اور پھر فون بند کر دیا جانا چاہتی تھی کہ پاکستان سے کون سے قابل اعتماد لوگ اس کے نگران کے اندازے ہمت ہی توڑ دی تھی۔ مجھے یہ چاہیل گیا تھا کہ اب پھر پاکستان سے کچھ لوگ آنے والے ہیں۔ گل کے بارے میں' میں آج تک نہیں سمجھ پائی تھی کہ وہ یہاں کیا کرتی ہے۔ وہ اس پہلی میٹنگ کے بعد مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ اب میں اس پوزیشن میں تھی کہ مسٹر وقار سے سب کے بارے میں پتا کرسکوں اور سوچ لیا کہ میں آج ہی تمام معلومات حاصل کرلوں گی۔ مسٹر وقار پھر معذرت کر کے کچھ فائلیں نمٹانے لگے مگر میں زیادہ دیر نہ تھی۔ فائلیں بھیج کر انھوں نے

"جی سر مس تارا' آج کا دن میرے لیے ویسے ہی بڑا خراب اور تھکا دینے والا تھا مگر اسنجلا والے معاملے نے مجھے بھیجے کر رکھ دیا۔ وہ ہمارے بڑے اعتماد اور اہم لوگوں میں سے تھی بہت حساس معاملے اس کے علم میں تھے۔ اس کی اس حرکت سے ہم ایک بہت بڑے خطرے کا شکار ہو جائیں گے۔ پاکستان سے آنے والی یہ کھیپ ہمیں انڈر گراؤنڈ کرنا پڑے گی۔ وہ ہمارے کلائنٹس کو جانتی ہے اور کسی بھی وقت ہمارے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ میں لاکٹ کی وجہ سے بھی بہت پریشان ہوں۔"

"میرا خیال ہے ایسی غلطی کرنے کی ہمت نہیں کرے گی۔ وہ جانتی ہے کہ ہمارا تال تک اس کا پیچھا کرسکتے ہیں۔ آپ ہمت کرکے کھیپ روانہ کردیں۔"

میری بات سن کر ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "یہ۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں' ہم نہ بازار سک لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ خاص طور پر امریکہ والے واقعے کے بعد۔"

"میں نہیں جانتی کہ امریکہ میں کیا ہوا تھا۔ نہ ہی میں جاننی ہوں کہ آپ کے کلائنٹ کہاں اور کون کون ہیں مگر اتنا اندازہ ضرور لگا سکتی ہوں کہ ابھی ہمارے پاس کچھ وقت ہے۔ اسنجلا فوری طور پر ہمارے خلاف کچھ بھی نہیں کرسکے گی بلکہ اگر اس وقت تو وہ خود انڈر گراؤنڈ ہو جائے گی ہاں کچھ عرصے کے بعد وہ ہمارے لیے خطرات پیدا کرسکتی ہے مگر اس وقت تک ہمیں اس کو تلاش کرلینا چاہئے۔"

"ہاں۔ ہاں مس تارا! آپ کی بات سمجھ میں آرہی ہے۔ میں نے یہ تو سوچا ہی نہیں۔ بہرحال اب مجھے قدم قدم پر آپ کے مشورے کی ضرورت پڑے گی۔"

ان کے اتنا کہہ دینے کے بعد ہی مجھے یقین ہو گیا کہ کم از کم یہاں کی کٹھ پتلی کی ڈور میری انگلیوں میں الجھ چکی ہے۔

"مسٹر وقار آپ مجھے بتائیں کہ پاکستان سے آنے والی کھیپ کب تک یہاں پہنچتی ہے اور پھر آگے کا سفر کس انداز میں طے کرتی ہے شاید میں کچھ اس معاملے میں بھی سوچ سکوں۔"

"جی ضرور۔" پھر جو کچھ انھوں نے مجھے بتایا وہ میرے لیے بہت حیرت انگیز تھا۔ انھوں نے بتایا کہ بنکاک میں قائم دواؤں کی یہ فیکٹری کچھ ٹیبلیٹس بنا کر پاکستان کی ایک کمپنی کو سپلائی کرتی ہے جسے اشرف علی خان ہی کے آدمی چلا رہے ہیں۔ وہ لوگ ان ٹیبلیٹس کی جگہ ہیروئن کے ٹیبلیٹس بنا کر کوالٹی کنٹرول کمپنی کے حوالے کرتے ہیں اور وہ لوگ "ریسیکٹیڈ" کا لیبل لگا کر بنکاک کی اسی کمپنی کو واپس بھیج دیتے ہیں۔ ٹیبلیٹس کیونکہ سیلڈ اور کوٹڈ ہوتی ہیں لہٰذا ان کے بارے میں اندازہ لگانا عام کسٹم والوں کے

بس کی بات ہی نہیں ہوتی اور پھر یہ سلسلہ کہ نکتہ کافی عرصے سے چل رہا ہے ان کی اپنی لائن بھی بنی ہوئی ہے اس لیے اور کچھ اس لیے کہ وہ لوگ ہمیشہ ہی ہیروئن کے کنسائنمنٹ نہیں بھیجتے بلکہ کبھی کبھی واقعی اصل دوائیں بھی "مسرّہ" کی جاتی ہیں' یہ معاملہ اب تک بہ خیر خوبی چل رہا ہے یہاں آنے والی کھیپ ایل سی کی شکل میں ہوتی ہے اور پھر یہاں سے مختلف طریقوں سے وہ مال یونان ٹرکی عرب اور دوسرے یورپی ممالک کو سپلائی کرتے ہیں۔ یہ طریقہ کار میرے لیے ایک اچنبھا تھا۔ مجھے دکھ ہوا کہ لوگ دواؤں کے کاروبار میں بھی اس زہر کا کاروبار کر رہے ہیں بہرحال جو کچھ میں جاننا چاہتی تھی' جان چکی تھی اب میری دلچسپی ختم ہوگئی تھی اور اچانک ہی تھکن نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی رات کے پونے دو بج رہے تھے۔

"اوہ سوری مس تارا! آپ کو بہت دیر ہو گئی۔ میرا خیال ہے آپ جائیں۔ ہم صبح بات کر لیں گے۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں' مسٹر وقار! میں مس گل کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں' وہ بھی پاکستان سے آئی تھیں۔ یہاں وہ کیا کر رہی ہیں؟ ویسے میں نے انھیں مسٹر طارق کے بہت قریب پایا تھا اور میں مس اسنجلا کو بتا چکی تھی کہ میرے پاس آنے والی ملازمہ زینت نے بعد میں قتل کر دیا گیا تھا وہ بھی گل کی دسائسٹ سے میرے فلیٹ تک آئی تھی۔ میں ان کے سلسلے میں بھی مشکوک ہوں۔ ان پر نگاہ رکھنا بے حد ضروری ہے آپ پتا کریں کہ وہ کہاں ہیں اور خاص طور پر اس وقت۔"

"مسٹر وقار نے لمحہ بھر کو مجھے حیرت سے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے ٹیلی فون اپنے قریب سرکا کر ایک نمبر ڈائل کرنے لگے۔ اس دوران میں وہ بار بار نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں گہری سوچ' پریشانی اور الجھن موجزن تھی۔

دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی۔ وہ کچھ لمحے ریسیور اٹھائے رہے پھر انھوں نے تھکے تھکے انداز سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ "وہ اس وقت فلیٹ میں نہیں ہے۔"

"رات کے دبے پاؤں والے ہیں۔ وہ گھر پر نہیں ہیں یہ عجیب بات نہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں' اسے اس وقت گھر پر ہونا چاہیے تھا۔" انھوں نے سر کرسی کی پشت سے ٹکاتے ہوئے جواب دیا۔

"مسٹر وقار! کیا آپ کو یقین ہے کہ طارق کو اسنجلا نے قتل کیا ہے؟ وہ جانے کتنی دیواروں کے پیچھے چھپا ہوا مسٹر وقار جیسے آدمی سے پنجہ کرانس تک پہنچا اور اسے زندہ نہ رہنے دینا ممکن تھا؟ اور میرے علم کے مطابق تو خود آپ ہی اس کی موت کا فیصلہ کر آئے تھے۔"

"مس تارا! میں نے ایسا محض اسے دھمکانے کے لیے کہا تھا۔ اسے جان سے مارنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لاکٹ حاصل کیے بغیر اسے مارنا ہماری اپنی ہلاکت کی طرف پہلا قدم ہوتا' پھر۔"

"پھر اسے کس نے مارا؟ میں اسنجلا تو ایسا نہیں کر سکتی تھیں۔ ایسا کرنے کا ان کے پاس کوئی جواز ہی نہ تھا۔ یہ رکھئے مسٹر وقار کہ اسنجلا سیٹھ سلطان کی نہیں بلکہ سیٹھ منگھ کی وفادار تھی۔ اس کا سیٹھ سلطان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ دوسری بات یہ کہ لاکٹ طارق کے پاس نہیں۔ میں نے بڑے ذرائع سے اندازہ لگایا ہے کہ لاکٹ طارق کے پاس نہیں۔"

"یہ۔۔۔ یہ آپ کس طرح کہہ سکتی ہیں؟"

"اس طرح کہ اگر لاکٹ اس کے پاس ہوتا تو اس کی تلاش کے بعد وہ اگلی دستک مگر لاکٹ اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ پکڑا گیا تھا۔ اس کے بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی ہی اور اسے بھی ہو گیا تھا کہ وہ محض سیٹھ سلطان کی پسارہ کا کام وہ بھی پیادہ۔ یہ احساس ہو جانے کے بعد ہی اسے اپنی ہلاکت کا یقین ہو گیا ہوگا اور اس لیے اس نے لاکٹ اسنجلا کے حوالے کر دینے کا اقرار کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اب اسے لاکٹ نہیں مل سکتا ہے جس کی تلاش میں تنظیم ساری حد دپار کر گئی ہے لاکٹ کی اہمیت کا احساس غالباً کسی کو بھی نہ تھا۔ نہ سیٹھ سلطان کو اور نہ ہی اس کے کسی آدمی کو مگر اس کی اہمیت کا احساس خود تنظیم نے سب کو دلایا ہے۔ اس اہمیت کا اس نے بھی فائدہ اٹھایا اور اعتراف کر لیا کہ لاکٹ اس کے پاس ہے وہ جان گیا تھا کہ جب تک لاکٹ اس کے پاس ہے اس کی زندگی بھی اس کے پاس رہے گی ورنہ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔" میں خاموش ہو گئی۔ مسٹر وقار ستائشی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

"مجھے حیرت ہے مس تارا کہ آپ کو اب تک اس کیوں کیا جاتا رہا۔ خیر۔ اگر ہم اسنجلا کو نکال دیں تو طارق کا قتل معمہ بن جائے گا۔"

"تو کیا آپ اسنجلا کو محض اس لیے الزام سے بچانا

معمہ بنے گا تو اسے سلجھانا بھی پڑے گا اور اگر ایسا ہوا تو ہم اب بھی خطرے میں ہیں۔ اصل آدمی اب بھی درمیان ہے' مسٹر وقار! طارق کے قاتل کو تلاش آپ کے تمام معمے حل ہو جائیں گے۔"

"اس عمارت کے بارے میں نہیں جانتی مس تارا' اسی لیے یہ خارج از امکان ہے کہ قاتل وہ ہوگی۔ میں اس کا طارق سے فری ہونا' پھنسے کی بات نہیں گل۔ مسٹر نوشے آج عمارت میں نہیں تھے۔ مزے کی بات ہے مس تارا کہ یہ قتل صبح میں ہوا ہے' اس وقت عمارت میں ہزاروں آدمی موجود تھے۔ آپ کو شاید علم ہے کہ وہ عمارت ایک عجائب گھر ہے جسے دن میں سیاحوں کے لیے کھول دیا جاتا ہے۔ آپ نے وہ حصہ نہیں دیکھا۔ اس عمارت کے بارے میں چند ہی لوگ جانتے ہیں وہ حصہ جہاں طارق کو رکھا گیا تھا صرف چند لوگوں کے علم میں ہے اور ان لوگوں میں سے ایک میں ہوں' دوسری آپ ہیں۔ اسنجلا ہی بنکاک میں تھے باقی لوگ ملک سے باہر

"اور وہ بوڑھا؟"

"وہ اس وقت سیاحوں کی وجہ سے گیٹ پر موجود تھا۔"

"لڑکا جو ہمارے لیے چائے لے کر آیا تھا!" میں نے یاد دلایا۔

"وہ۔ مسٹر نوشے" کا آدمی ہے جو اس وقت مسٹر نوشے کے ساتھ تھا۔"

"بہرحال مسٹر وقار یہ میں نہیں جانتی کہ اس عمارت کے اندر میں کون کون جاتا ہے اور کون اس وقت کہاں تھا اور کیا جانتی ہوں کہ طارق کے قتل میں اسنجلا کا ہاتھ نہیں' کس کا ہے یہ دیکھنا آپ کا کام ہے۔ اس کا قتل کے لیے مسائل پیدا کر سکتا ہے مسٹر وقار! جب تک ہاتھ نہ لگ جائے ہر ایک کو مشکوک سمجھیں۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں مس تارا! آپ کی نظر میں گل ہے' میں ایسا انتظام کر دوں گا کہ وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہو سکے۔"

"صرف گل نہیں مسٹر وقار! ہم سب مشکوک ہیں۔ ہم کو ایک دوسرے پر نگاہ رکھنا چاہئے' کسی کو کسی کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ مسٹر وقار کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ میں ان پر پوری

طرح اپنی دھاک بٹھانے میں کامیاب ہو گئی ہوں۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتے' ٹیلی فون کی بیل بجنے لگی۔ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔ "ہیلو!" انھوں نے کہا پھر کچھ دیر تک خاموش رہے۔ "جی سر!"

میں سمجھ گئی کہ دوسری جانب اشرف علی خان ہیں۔

"نہیں سر! میں معذرت خواہ ہوں میں اس کی حفاظت نہ کر سکا۔ جی۔ میں آج ہی کمیٹی تشکیل دوں گا۔ میرے پاس صرف دو آدمی ہیں جن میں ایک اغوا کیا ہوا ہے۔ سر! میں چاہتا ہوں کہ مس تارا کو اناجرج پناہ دوں۔ وہ ست ذہین ہیں۔ جی سر! ان کا خیال ہے کہ یہ قتل اسنجلا نے نہیں کیا۔ نہیں سر ہم نے لاش وہیں دفنا دی ہے اگر آپ بھیج سکیں تو بہتری نوازش' میں ڈس ہارٹینڈ ہو گیا ہوں سر! اعتبار کرتے ڈرتا ہوں۔"

پھر وہ چند لمحے خاموش رہ کر بولے۔ "جی سر! میں ریسیو کرلوں گا" پھر وہ کچھ دیر تک کچھ سنتے رہے اور خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

"خیریت؟"

"جی مس تارا! باس طارق کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔" انھوں نے کچھ ایسے انداز میں کہا ہے جیسے وہ کچھ چھپا رہے ہوں میں نے بھی کسی تجسس کا اظہار نہیں کیا۔ میں اناڑی گرٹ مکمل کر چکی تھی۔

"ٹھیک ہے مسٹر وقار! مجھے اجازت دیں"

"جی شکریہ مس تارا" آپ نے محض میری وجہ سے اپنا

کوئی دعوا نہ ہو گا
مرسلہ
نجمہ محمد یعقوب
پنڈ دادنہ
خان

ایک صاحب گھبرائے ہوئے پاگل خانے کے دروازے پر پہرہ دینے کے پاس آئے اور پوچھا۔
"پاگل خانے سے کوئی پاگل فرار نہیں ہوا؟"
سنتری نے جواب دیا۔ "نہیں صاحب!"
وہ صاحب پھر بولے۔ "اندر جائیے اور گنتی کر کے دیکھیے' یقیناً یہاں سے کوئی پاگل فرار ہوا ہے۔"
"جناب! آپ کو اتنا یقین کیوں ہے کہ کوئی پاگل یہاں سے بھاگا ہے؟" سنتری نے حیران ہو کر پوچھا۔
"کچھ دیر پہلے کوئی شخص میری بیوی کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔"

اتنا وقت برباد کیا۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

"آپ کی وجہ سے نہیں' اپنی وجہ سے۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ میں نے ان سے دوسری بار سچ بولا تھا۔

"جی!" وہ چونکے۔

"جی! میں تنظیم سے وابستہ ہوں' تنظیم کی سلامتی ہی میری سلامتی ہے۔" میں نے بات بنائی۔ میں بھول گئی تھی کہ مسٹر وقار بیگ کو میں تنظیم کے انچارج ہیں وہ کسی بھی طرح بے وقوف نہیں ہو سکتے۔ مجھے بہرحال محتاط رہنا چاہئے تھا۔ "او کے مسٹر وقار! رات کے دھائی بج رہے ہیں۔ میں کل صبح جلدی بھی جاؤں گی۔ شاید دو تین روز لگ جائیں۔"

"جی میں جانتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہاں بھی آپ غافل نہیں ہوں گی۔ ہم سے رابطہ رکھیں گی اور کسی بھی ایمرجنسی میں ہم آپ کو واپس بلا سکتے ہیں۔"

"میں جاتی ہوں۔ وہاں پہنچتے ہی اپنی قیام گاہ سے آگاہ کروں گی۔"

پھر میں اجازت لے کر چل آئی۔ ادریس پچھلی سیٹ پر لیٹا ہوا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ وہ بہت تھک گیا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ گیا۔ اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ "میڈم! کیا ہم صبح جا سکیں گے؟" یہ کہہ کر اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

"مجھ میں نہیں آرہا ادریس میں تو پروگرام بنا کر پچھتا رہی ہوں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ حالات یہ رخ اختیار کر لیں گے۔ اگر جاتے ہیں تو بھی صبح جانا بڑا مسئلہ ہو گا مگر میں یہ دن یہاں بھی نہیں گزارنا چاہتی۔ میں چاہتی ہوں کہ میں تنظیم کے کسی معاملے میں الجھا ہوا نہ ہوں۔ وہ طارق کے قتل کی تحقیقات کے لیے کمیٹی تشکیل دے رہے ہیں اور غالباً مجھے بھی اس میں شامل کرنا چاہتے ہیں مگر میں ایسا نہیں چاہتی۔ میں طاہر کے آنے تک ہر معاملے سے دور رہنا چاہتی ہوں ادریس۔"

"آپ کا یہ فیصلہ بہتر ہے میڈم۔ پتا نہیں ہم اس وقت پرکاش کے گھر جا سکتے ہیں یا نہیں؟"

"نہیں یہ وقت وہاں جانے کا نہیں ہے ہم سیدھے فلیٹ جائیں گے۔ صبح سویرے ہم نکلنے کی کوشش کریں گے۔" میں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔ ادریس درمیانی رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ تھکن سے چور ہے۔ ہم تقریباً تین بجے فلیٹ پر پہنچے۔ میں نے پرس میں سے وہ چابی نکالی جو ایمرجنسی کے لیے مجھے دی گئی تھی۔ تو گھر میں ہمیشہ تک ہوتی تھی مگر میں اتنی رات گئے اٹھانا نہیں چاہتی تھی اس لیے میں نے دروازہ آہستہ سے کھولا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ ادریس کے کمرے میں جاتے ہی میں نے پورے گھر کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس لیب کی تلاش تھی اسے میں ہر حال میں آج رات ہی کو تلاش کرنا چاہتی تھی کیونکہ صبح مجھے پتا ہلا جانا تھا اور لاکٹ کے بغیر تو لیس جانے کا تصور ہی نہیں کر سکتی تھی اسے یوں چھوڑ کر دو تین روز کے لیے چلا جانا ممکن نہیں تھا چند گھنٹوں کی غیر حاضری نے تو یہ قیامت ڈھائی تھی تو روز اسے چھوڑ گئی تو جانے کیا ہو جاتا۔ اب تک میں نے کے مطابق تو لیب اسی گھر کی اسی عمارت میں موجود ہے ڈرائنگ روم کو اچھی طرح کھنگالنے کے بعد اسٹڈی کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ کہیں ہو گا پھر بھی میں نے آہستگی سے دروازے پر دباؤ ڈالا دروازہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ اندر کا منظر دیکھ کر میں پڑی۔ یوں لگتا تھا جیسے کمرے میں زوردست زلزلہ آیا ہو چیز اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی تھی۔ الماریاں کھلی پڑی تھیں بیڈ کی دراز میں قالین پر رکھی تھی۔ پورے کمرے میں کپڑے، کاغذ اور جانے کیا کیا پھیلا ہوا تھا۔ میں دیکھ کر حیران ہوئی کیونکہ انجانا لاکھ جلدی میں بھی تو اسے نہیں کرنا چاہئے تھا۔ یہ اس کا کمرا تھا۔ اس تمام اہم چیزیں کی ایک جگہ سنبھال کر رکھی ہوں گی چوروں کی طرح پورے کمرے کی طلاشی لینا سمجھ میں آیا۔ میں نے ان بکھری ہوئی چیزوں میں لیب تلاش کرکے کمرے کا دروازہ پھر اسی طرح بند کر دیا۔ چیزیں سمیٹنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اب ادریس کمرا ہی رہ گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ لیب اور کمرے میں نہیں ہو گا البتہ تک کے پاس ہو سکتا تھا وہاں بھی نہ ہوتا تو پھر گودام میں ہونا لازمی تھا۔ وقت تک کرے میں جا کر اسے اپنے بارے میں کرنا چاہتی تھی اس لیے اپنے کمرے میں چل آئی۔ سونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میری نیند اڑ چکی تھی۔ مجھے نہ انجانا کے بھاگ جانے سے دلچسپی تھی طارق کے قتل سے طارق تو میرے حساب سے پہلے ہی

قطعہ

کتنی ہیبت میرے مکان پہ ہے
کس قدر بوجھ اس جہان پہ ہے
جس قدر سرد بالِ دشمن ہرا
اُس قدر بوجھ ہم دھان پہ ہے

شیراز جلال خان آفریدی
مردان

ہو گئے تھے تو صرف اور صرف لاکٹ چاہئے تھا۔ میری اور طاہر کی جانیں لاکٹ میں بند تھیں۔ ادریس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ گویا یہ جو الاکھی میرے ہی دل میں چھوٹ رہا تھا۔ تنہا اتنا بڑا عذاب میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ طاہر ہوتا تو وہ کچھ کر تا مگر صرف مجھے ہی سب کچھ کرنا تھا۔ پریشانی کی وجہ سے آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ میں کن عذابوں میں پڑ گئی۔ میں وہ رو رہی ہی نہیں تھی جو کبھی تھی۔ خوشیاں کے لیے کس قدر کم تھیں' لمحوں جتنی اور عذاب کی بھی حد ہوتی ہے جا رہے تھے۔ اب ان عذابوں کو سہارے بس میں نہ رہا تھا۔ میں روتی رہی' جانے کتنی دیر اور خدا سے دعائیں مانگتی رہی کہ کسٹمن لمحوں کو سہنے کی طاقت عطا کرے' کہ یہ خوبصورت سیشک سے نکلا ہوا جھاڑ فانوس اور ان سے منعکس ہونے والی دھیمی شعاعیں میرے اندر دور تک آگ سی دہکا رہی تھیں۔ مجھے ایک پل بھی سکون نہیں مل رہا تھا۔ وہ رہ رہ کر میں وہ ٹیپ گھوم جاتا۔ جی چاہ رہا تھا کہ دیوار سے سر ٹکرا دے' بس آج کے آج' اس وقت تک جب تک میں سے لاکٹ کو نہ نکال لوں گھر دو سرے ہی لمحے میں بے چارگی کا شدت سے احساس ہوا جس کی وجہ سے ایسی باتیں سوچنے لگی تھی۔ وقت میرے ہاتھ سے ریت کے ذرہ ذرہ کی طرح نکل پکا تھا جسے میں اس وقت اپنی مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی صرف پونے چار بجے تھے یوں جیسے وقت کو مجھ سے کوئی بیر ہو' جب میں نے چاہا کہ تھم جائے تو کمبخت چلنے پر تل گیا اور جب چاہا کہ گزر جائے تو گھنٹوں جلنے والے چوں کی طرح گھسٹنے لگا۔ میں اٹھ بیٹھی۔ دونوں کشن اٹھا کر میں نے سر کے نیچے رکھ لیے اور کھڑکی پر نگاہیں جما دیں۔ اب میں اپنی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھی تھی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ اب وہ کیا کرے گا۔

"ارے یہاں سے بھاگ جا۔" میرے اندر اچانک 'ہی' انجانا ایک تیز سرگوشی ابھری۔

میں چونک اٹھی۔ "ہاں میں بھاگ جاؤں تو اس بگولے کا کچھ پتا نہیں ہوں جو مجھے راہ میں اڑتے کسی کوڑے اور ہوئے کاغذ کی طرح اوپر ہی اوپر چکراتے جا رہا ہے۔ کے ہاتھوں میں ایک کھلونا بنی ہوئی ہوں۔ یہ غم' یہ

کرب' یہ الجھنیں' یہ مسائل سب میرے تو نہیں' سب کے کرب سمیٹے میں کب تک چل سکوں گی۔ انجانا' ادریس' اشرف علی خان' وقار' بگل' پرکاش۔ اور۔ اور طاہر۔ یہ سب میرے کون ہیں؟ پل بھر کے لیے خوشیاں دینے والے پھر جھولی بھر کر عذاب میں ڈالنے والے۔ سب کے اپنے اپنے سکھ ہیں' اپنے اپنے دکھ ہیں' اپنے مسائل ہیں۔ میں کیا کروں؟ انجانا بھاگ گئی' طارق قتل ہو گیا تو میں کیا کروں؟ ادریس کے گھر والے تو یہی کہا کرو گے؟ ظاہر اشرف علی خان کا بتایا نہیں تو پھر۔ مجھے کیا؟ ہاں اس نے مجھے کچھ سکون دیا تھا پھر عذاب بھی کیسے کیسے اٹھائے ہیں میں نے۔ دوا پکار کر چیخنی بھر لینا۔ یہ بھی کوئی جذبہ ہوا' کوئی تعلق۔ کوئی رشتہ۔ کیا ہے یہ' کیسے کیا ہے؟ میں تو اپنی شناخت ڈھونڈنے نکلی تھی اور ان پر پہنچ رہا ہوں میں خود کو بھی کھو بیٹھی۔ میرے باپ کا پتا تو مجھے مل گیا مگر۔ میرا پتا کون دے گا؟ کون سوزن سنگھ ہو گا جس کے دل میں بھی چبھ جانے والا کانٹا اسے رلائے گا اور تب وہ اچانک مجھے کھوج لے گا۔ کفارہ ادا کر کے مجھے میرے حوالے کر دے گا اور وہ کون طاہر ہو گا جو کسی اندھیری گلی کے کونے میں خوفزدہ سہمی ہوئی نارا کو سہارا دے کر اسے خوابوں کے حسین خطے میں لے جا کر ہزاروں جذبوں سے مالا مال کر دے گا پھر۔ پھر اسے بھی عذابوں میں نہ ڈالے گا۔ نہیں ایسا تو کبھی بھی نہیں ہو گا۔ مجھے واقعی جانا چاہئے۔ اپنے باب کے پاس۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔ مجھ پر یہ سب کچھ مسلط کیا گیا ہے' یہ سب کچھ میرا نہیں ہے۔ میرا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میرا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ لاکٹ بھی۔ ظاہر بھی اور یہ پرکاش بھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے دونوں کشن قالین پر پھینک دیئے۔ کھلے ہوئے بالوں کو ہاتھوں سمیٹ کر جوڑے کی شکل میں باندھا اور باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ ٹھنڈے پانی کی پھوار نے میرے اندر دہکتی آگ کو دھیما کر دیا۔ میں بڑی دیر تک بدن پر پانی ڈالتی رہی۔ باتھ

روم سے باہر آئی تو باہر ہلکی روشنی کا احساس ہوا۔ شاید سویرا ہونے لگا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا۔ آسمان کہرا سرمئی ہو رہا تھا اور آسمان کے ایک کنارے پر دودھیا سی لکیر پھیلی ہوئی تھی۔ دھند میں لپٹا سویا سویا یہ شہر بڑا پراسرار سا لگا۔ میں سیدھی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ آج بہت دنوں بعد میں اپنے ہاتھ سے چائے بنا رہی تھی۔

چائے تیار ہونے سے پہلے ہی میں نے اوریں کے کمرے کے دروازے پر ہلکی دستک دی مجھے امید نہیں تھی کہ اوریں اٹھ جائے گا۔ میں نے دوبارہ دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اچانک دروازہ کھل گیا۔ اوریں سرخ انگارہ سی آنکھیں لیے سامنے کھڑا تھا۔ میرے گیلے بالوں پر تولیہ لپٹا دیکھ کر اس نے مجھے حیرت سے دیکھا پھر سلام کیا اور بولا۔ "آپ شاید سوئیں نہیں!"

"نہیں سوئی تو تھی مگر نیند اچھی نہ آسکی۔" میں جھوٹ بولنے کی عادی ہو چکی تھی۔

"آپ چلیں میں آتا ہوں۔"

میں اس سے جلدی آنے کا کہہ کر واپس کچن میں آگئی۔ چائے دم پر آچکی تھی۔ میں چائے کے برتن اٹھائے ڈائننگ ٹیبل پر آگئی۔ اب کافی روشنی پھیل چکی تھی۔

میں تنگ کے خود ہی اٹھ جانے کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ اس سے لیپ کے بارے میں معلوم کرنا میرے لیے جانے سے پہلے ضروری تھا۔ میں چائے کا مگ ہاتھ میں لیے اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ عین اسی لمحے مجھے خیال آیا کہ میں تو یہ سب کچھ چھوڑ دینے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ اب مجھے لاکٹ کا کیا کرنا ہے۔ اب میں اس سلسلے میں فکر کیوں کروں۔ میں پلٹنے والی تھی کہ ظاہر کی مخصوص خوشبو میرے وجود میں پھیل گئی۔ "تم میری امانت ہو تارا، تمہیں یعنی میری امانت کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ مجھے ویسی ہی چاہیے جیسی میں تمہیں دے رہا ہوں۔"

یہ جملے یوں گونجے جیسے ظاہر میرے کانوں میں سرگوشی کر رہا ہو۔ میرے قریب ہی کہیں ہو۔ مجھ سے مجھے مانگ رہا ہو' مجھے میرا امین ٹھہرا رہا ہو' چائے کا مگ میرے ہاتھوں میں لرز گیا۔ "تارا اس لاکٹ میں میری جان ہے' یہ میری زندگی کا ضامن ہے' تارا' اس کی حفاظت کرنا میں اپنی موت سے اپنے لیے نہیں بلکہ اب تمہارے لیے ڈرنے لگا ہوں۔ میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔" اس جملے نے تو

میرے ارادے بھی متزلزل کر دیئے۔ مجھے لگا میں... بھٹک گئی تھی' نشہ کر لیا تھا میں نے' جانے کیا کیا سوچ رہی تھی' فضول فیصلے کر لیے تھے بے وقوفی خیال کے ساتھ ہی میں تنگ کے کمرے کی طرف... نے جونہی دروازے پر دستک دی یوں محسوس... دروازہ غیر محسوس انداز میں ہلا ہو' جیسے... نہ ہو۔

میں نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ وہ کھلتا... کمرے میں اندھیرا تھا۔ گھٹن کیوں پردے... تھے۔ نائٹ بلب بھی روشن نہ تھا۔ میں ٹٹولتی ہوئی... تک گئی۔ میں نے بٹن دبا دیا تو کمرے میں... پھیلی مگر بہت محدود حصے میں۔ میں نے پلٹ... سمت نگاہ کی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ... سے اس سمت بڑھی۔ قریب جا کر دیکھا تو ٹانگ... اٹھی وہ میرا ہی لیپ تھا' وہی لیپ جس میں... تھا۔۔۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے... کر آواز سننے کی کوشش کی۔ توقع کے عین... اس میں موجود تھا۔ یہ آواز میں قیامت کے... پہچان سکتی تھی کیونکہ اس طرح ہلا کر میں اسے... کرتی تھی اور اس کی موجودگی کا اطمینان ہی اسے... کرتی تھی۔ میں نے پلٹ کر بستر پر نگاہ ڈالی جو... میں ڈوبا ہوا تھا۔ روشنی صرف میرے اردگرد... تھی ورنہ پورا کمرا تاریک تھا۔ میں جلتا ہوا لیپ... بڑھی کہ اچانک کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور میں... سامنے رکھے صوفے پر گری' لیپ میرے ہاتھ... چائے کا مگ گر چکا تھا۔ ایک ہلکی سی چیخ... میں نے حلق میں ہی گھونٹ لیا تھا گردن سیدھی... سے یوں الٹی پڑی کہ خود مجھے بھی ہوش نہ رہا... رہ گیا کہ میں چیخ رہی ہوں۔ بے طرح' بے تحا...

کھیا تارا وہ لاکٹ ...
طارق کا قاتل ...
ایک اور ...
یہ جاننے کے لیے اگلے شمارے ...

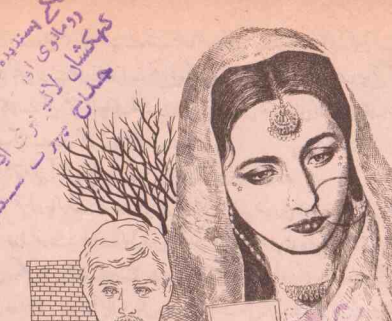

جو لڑکیاں اپنے جلوے دکھا فی پھرتی ہیں ان سے شادی کی جا سکتی ہے؟
ایک زہریلا سوال جس نے آٹھ سات پڑوسوں میں چھپا دیا
شرافت اور حیا کے گہنوں سے مالا مال لڑکی' حسن کی مکمل تصویر جسے ٹھکرا دیا گیا، مگر کیوں؟

ثمیم فضل خالق

دُھند لکے

سنی بھی آج کل اسی مسئلے سے دوچار تھا جس سے کراچی میں میری طرح ہر ایسا نووارد ہوتا ہوگا جس کا ٹھکانا نہ ہو۔ یہ مسئلہ مکان کی نایابی کا تھا۔ میں ایک اسکول ماسٹر ہوں اور حال ہی میں میرا تبادلہ کراچی ہوا تھا۔ ظاہر ہے ایک اسکول ماسٹر کی محدود تنخواہ میں اتنی گنجائش ہی نہیں ہوتی کہ اچھا کھایا پیا اچھے طریقے سے رہا جا سکے۔ بس گزر بسر کے لیے یہ تنخواہ کافی ہو سکتی ہے۔ میں آج کل اپنے دوست سعید کے ساتھ اس کے مختصر سے کمرے میں رہ رہا تھا اور کمرا اتنا چھوٹا تھا کہ اس میں میری چارپائی بھی نہ سما سکی تھی لیکن یہ سعید کا احسان تھا کہ تھوڑے وقت کے لیے سہی مگر اس نے مجھے رہنے کو

جگہ دے دی تھی اور تب سے اب تک ہم دونوں اتنے ہی بڑے ایک اور کمرے کی تلاش میں سرگ
تھے لیکن دو مہینے ہونے کو آئے ہم اپنی تگ ودو میں ابھی تک ناکام تھے۔ میری جستجو مایوسی کی آخری
کو چھونے لگی تھی۔ اچانک ایک دن سعید نے خوش خبری سنائی کہ میرا مطلوبہ مکان یا کمرا جو بھی کہ
ایک گندے سے محلے میں دستیاب ہے۔

"تو سعید! ابھی چلے جاتے ہیں۔" میں بے چینی سے بولا۔

"تم خود جا کر سارے معاملے طے کر لینا مجھے ایک ضروری کام ہے۔" سعید نے صاف دامن بچا

خدا جھوٹ نہ بلوائے کوئی دس بار سعید ایسے مرحلوں میں میرے ساتھ گیا لیکن ہر بار بات نہیں
تھی۔ کبھی میں مالک مکان کے مطالبوں کو ریجکٹ کر دیتا اور کبھی مالک مکان مجھے ریجکٹ کر دیتا
میں خدا کا نام لے کر اکیلا ہی چل دیا۔ ایک خستہ حال بس نے آخر کار مجھے میری منزل مقصود تک
دیا۔ کاغذ پر لکھا ہوا ایڈریس دیکھ کر میں ایک گندی سی گلی میں پہنچا۔ میرا مطلوبہ مکان گلی کے آ
سرے پر واقع تھا۔ بے کار سے دو دروازے تھے' ایک پر تالا لگا تھا اور دوسرا دروازہ بغیر تالے کے تھا
پر ایک نظر ڈال کر میں نے دوبارہ اپنا اطمینان کیا اور بغیر تالے والے دروازے پر دستک دی۔ کافی
اندر سے ایک بڑی بی برآمد ہوئیں۔

"کون ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"جی وہ۔" میں گڑبڑا کر بولا۔ "سنا ہے آپ نے مکان کرایے پر دینا ہے۔"

"ہاں دینا تو ہے۔" وہ سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لے کر بولیں۔

"وہ جی مجھے بھی چاہیے۔ میرا مطلب ہے مجھے ایک عدد مکان کی ضرورت ہے۔" میں نے گو
کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا! لیکن تمہارا نام کیا ہے؟ کام کیا کرتے ہو؟ شادی شدہ ہو کہ غیر شادی شدہ؟" بڑی بی
سانس میں کئی سوالات پوچھ ڈالے۔

"جی میرا نام بابر ہے' میں ایک اسکول ماسٹر ہوں اور میری ابھی شادی نہیں ہوئی۔" میں نے
ان کے تمام سوالات کے جواب دیے۔

"بیٹا بات یہ ہے کہ ان دونوں مکانوں کے بیچ میں ایک دیوار ہے' ایک میں ہم رہتے ہیں اور
کرایے پر دے دیتے ہیں لیکن بیٹا میری ایک جوان بیٹی ہے اور میری تو حتی الامکان کوشش یہی ہوتی
کہ مکان کسی کنوارے کو نہ دوں لیکن دو مہینے سے یہ خالی پڑا ہے اور اپنا تو روزی کا ذریعہ یہی

تم شکل سے شریف لگتے ہو اس لیے تمہیں مایوس کرنے کو دل نہیں چاہتا۔" بڑی بی نے نرم آواز
بات ختم کی تو میں خوشی سے اچھل پڑا اور جلدی سے بولا۔

"ہاں! انشاء اللہ آپ کو مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہ ہوگی' میں اپنی شرافت کا یقین دلاتا ہوں۔"

"شرافت کا علم تو تمہارے رہنے سہنے سے خود بخود ہو جائے گا بیٹا' ہاں میں چابی لاتی ہوں پہلے تم مکان
اگر پسند آجائے تو کرایے کی بات بھی طے کر لیں گے۔"

چابی لینے اندر چلی گئیں۔ میں اس دوسرے دروازے پر پڑے ہوئے تالے کو دیکھنے لگا اور سوچنے لگا
کہ یہ مکان بھی میری قسمت میں ہے یا نہیں۔ تھوڑی دیر بعد بڑی بی چابی لے کر آگئیں اور تالا
کھولتے ہوئے بولیں۔

"یہ مکان زہرہ کے ابا کو یہ مکان انھوں نے ترکے میں چھوڑا ہے اور یہی ہماری روٹیوں کا سہارا
ہے۔"

تالا کھول کر وہ اندر گھسیں تو میں بھی ان کے پیچھے چلا گیا۔ مکان میں ایک چھوٹا سا صاف ستھرا کمرا تھا۔
ساتھ ہی چھوٹا سا صحن بھی تھا ایک طرف غسل خانہ اور کچن بھی تھا۔ کمرے کے بیچ میں ایک دروازہ بھی
تھا جو اس کے کمرے میں کھلتا تھا۔ بڑی بی نے بتایا کہ پہلے یہ سارا ایک ہی مکان تھا لیکن بعد میں جب
ضرورت آئے تو ایک کمرے کو الگ کر کے کرایے پر دیا گیا۔ مجھے یہ پرسکون سا صاف ستھرا مکان بہت
پسند آیا۔ کرایے کا معاملہ بھی بخوبی طے پا گیا اور شام ہی کو میں اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ اس مکان
میں آگیا۔

بڑی بی نہایت شفیق خاتون تھیں۔ ان کا لہجہ بھی بہت نرم اور میٹھا تھا۔ انھوں نے اپنے بارے میں
بتایا کہ ان کا ایک جوان بیٹی کے سوا دنیا میں اور کوئی نہیں۔ محلے میں بھی کسی کے ہاں آنا جانا نہیں۔

"بیٹا دنیا میں دولت کی اہمیت ہوگی لیکن میرے نزدیک شرافت سے بڑا کوئی زیور نہیں اور میں اسی
کی حفاظت کر رہی ہوں۔ اللہ کا فضل ہے زہرہ' حیا اور شرافت کے گہنوں سے مالا مال ہے۔ آج تک
کسی نامحرم نے آنچل تک کسی غیر نے نہیں دیکھا۔" وہ بولیں۔

بڑی بی کو شاید مسلسل بولنے کا مرض لاحق تھا تبھی وہ بے تکان بولے جا رہی تھیں کرایہ دے کر میں
اپنا سامان منتقل کر دیا۔ جب مجھے سر چھپانے کی جگہ ملی تو اب پیٹ پوجا کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ میں
سوچ رہا تھا کہ اس مسئلے سے کیسے نمٹوں گا۔ یہ تو طے تھا کہ کسی گھٹیا سے گھٹیا ہوٹل کے خرچ کا بھی متحمل
نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہی گھر میں پکانے کا جھنجٹ پال سکتا تھا۔ خیر اللہ مالک ہے سر چھپانے کو ٹھکانا مل گیا

ہے تو یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ میں نے پریشان خیالات کو دماغ سے گرد کی طرح جھٹکتے ہوئے سوچا

پھر یہ مسئلہ اس طرح حل ہوا کہ اگلے دن میں نے صبح کا ناشتا بازار کے ایک گندے سے ہوٹل میں کیا۔ کالی سی چائے کے کپ کے ساتھ پچاس پیسے کا بن کھا کر پیٹ بھرا۔ دوپہر کو اسکول میں وقفے وقفے نان چھولے کھائے اور رات کے کھانے کے لیے ایک پاؤ دہی اور تنور کی دو روٹیاں لے گیا۔ اس سے زیادہ سستا کھانا ممکن نہ تھا۔ کھٹا دہی اور سوکھی روٹی کھاتے ہوئے میں نے سوچا یہ بھی شکر ہے ہماری فیملی اتنی لمبی چوڑی نہیں اور مجھے اپنی تنخواہ کا معمولی سا حصہ گاؤں بھیجنا پڑتا ہے۔ یہ بھی خدا کا شکر ہے کہ میرے والد صاحب حیات اور صحت مند ہیں اور کھیتی باڑی کر کے سارے کنبے کا پیٹ پال رہے ہیں ان کا بڑا بیٹا ہوں۔ میرے بعد ایک بہن اور ایک چھوٹا بھائی ہے۔ ماں بھی خدا کے فضل سے ہے۔ اگر ابا جان کی محنت شامل نہ ہوتی تو سارے کنبے کا بوجھ مجھے اٹھانا پڑتا اور پھر شاید یہ نوکری بھی نصیب نہ ہوتا لیکن آج کل مجھے ہر پانچویں دن ابا جان کا ایک خط ملتا جس میں ایک ہی خواہش ہوتی اب میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا ہوں لہٰذا وہ میرے سر پر ذمے داریوں کا بوجھ ڈال کر اپنی ذمے سے بری الذمہ ہونا چاہتے ہیں۔ والدین امیر ہوں یا غریب، جوان اولاد کے سر پر سہرا باندھنے کی خواہش دونوں میں مشترک ہوتی ہے۔ میرے والدین گاؤں کے سیدھے سادے لوگ تھے، سمجھتے تھے کہ ماسٹر ہو کر میں نے کوئی میدان مار لیا ہے۔ میں ایک بڑا آدمی بن گیا ہوں اور شادی کے بعد کی ذمے داریاں پوری کرنے کا اہل ہو گیا ہوں جب کہ میں خود ابھی گوناگوں مشکلات سے دوچار تھا اور اپنی ذمے داری اٹھانے کا اہل بھی نہیں تھا پھر کسی اور ہستی کو اپنے ساتھ کیوں خوار کرتا لیکن میرے والد ان تمام باتوں کو نہیں سمجھتے تھے۔ میں انھیں سمجھا سمجھا کر ہار چکا تھا اور اب اس مسئلے پر میں نے چپ سادھ لی تھی۔

شاید وہ میرا نیا مکان میں تیسرا دن تھا۔ میں اسکول سے آیا ہی تھا کہ بیچ کا دروازہ کھول کر اماں داخل ہوئیں۔ آنے جانے کے لیے وہ یہی دروازہ استعمال کرتی تھیں۔ انھیں دیکھ کر میں ان کی تعظیم کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور انھیں ادب سے سلام کیا۔

"جیتے رہو بیٹا! کیا حال ہے تمھارا! کوئی تکلیف یا کوئی پریشانی تو نہیں۔" وہ پیار آمیز لہجے میں بولیں۔

"جی نہیں بالکل نہیں۔ عنایت ہے آپ کی۔" میں سعادت مندی سے بولا۔

"ہاں بیٹا پوچھنا یہ تھا کہ تو نے اپنے کھانے پینے کا کیا انتظام کیا ہے۔ میری تو عقل ہی ماری گئی

دھیان ہی نہیں جاتا۔ وہ تو آج زہرہ بیٹی نے کہا کہ اماں! ماسٹر صاحب گھر میں تو کچھ پکاتے نہیں پھر کھانا کہاں سے ہیں۔"

"اماں! باہر ہی کچھ کھا لیتا ہوں۔" میں ذرا شرمندگی سے بولا۔ ظاہر ہے کہ باہر جو کچھ میں کھاتا تھا مجھے علم تھا، دوسروں کو کیا بتاتا۔

"ارے بیٹا! بازار کے کھانے بھی کوئی کھانے کے لائق ہوتے ہیں؟ نہ ڈائقہ نہ صفائی کا خیال، کھا کے بیمار ہی ہوتا ہے۔" اماں اپنائیت سے جھڑک کر بولیں۔

"جی۔۔۔ وہ۔۔۔ بس اتنے برے بھی نہیں ہوتے۔" میں نے کچھ رک رک کر کہا۔

"نہیں بیٹا! بہت برے ہوتے ہیں۔ تو ایسا کر کل سے ہمارے ہاں سے کھا لیا کرنا۔"

"اماں۔۔۔ نہیں نہیں آپ کو ناحق تکلیف ہوگی۔" میں بوکھلا کر بولا۔

"مجھے کیا تکلیف ہوگی بیٹا! زہرہ ہی کرتی ہے سب کچھ، ہاں تجھے احسان لینا گوارا نہیں تو کرایے کے چند روپے زیادہ دے دیا کر۔ جہاں دو کا پکتا ہے تین کا پک جائے گا۔"

میں احسان مندی کے جذبے سے مغلوب ہو کر بولا۔ "میں۔۔۔ میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا۔۔۔" مجھے الفاظ نہیں سوجھ رہے تھے۔ الفاظ میرے حلق میں گھٹ کر رہ گئے تھے۔

"میں تجھے بیٹا سمجھتی ہوں، تو ماں سمجھ مجھے۔۔۔ کسی شکریے کی ضرورت نہیں۔" اماں نے میٹھے لہجے میں کہا اور بیچ کا دروازہ کھول کر واپس چلی گئیں۔ وہ چلی گئیں تو میں اپنی قسمت پر رشک کرنے لگا کہ خدا مجھے کتنے اچھے مالک مکان دیے ہیں۔ اماں کا میٹھا لہجہ، بات کرنے کا انداز۔ بالکل سگی ماؤں جیسا رویہ میرے ساتھ! پھر انھی کی بدولت میرا دوسرا مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا۔ نان چھولے میں کب تک اور ہوٹل کی کڑوی کسیلی چائے کتنی دیر میرا ساتھ دیتی! میں جذبہ تشکر سے مغلوب ہو گیا۔ گھوم پھر کے میرے خیالات اماں کی بیٹی زہرہ کے گرد بھٹکنے لگے جس کا ذکر وہ ہر بات میں کرتی تھیں لیکن آج تک میں نے اس کی جھلک دیکھی تھی نہ ہی آواز سنی تھی حالانکہ جب میں کمرے میں ہوتا تو دوسرے کمرے سے اماں سے ان کی نقل و حرکت کی آواز سنی جا سکتی تھی۔ میں اکثر اماں کی کھانسی کی آواز ان کی باتوں کی آواز اور چلتے پھرنے کی آہٹ سنتا لیکن زہرہ کی آواز میں نے کبھی نہیں سنی یا شاید اپنی پریشانیوں میں، میں نے غور نہیں کیا تھا۔ میں نے سوچا اور بچوں کی اسکول کی کاپیاں چیک کرنے لگا۔

اس کے بعد گویا میری مشکلات کا خاتمہ ہو گیا اور زندگی بہت آسان ہو گئی۔ صبح کا ناشتا، دوپہر کا کھانا رات کا کھانا پکا پکایا مل جاتا۔ کھانا اتنا لذیذ ہوتا کہ میرا جی چاہتا کہ پکانے والی کی انگلیاں چوم لوں لیکن

جس کی صورت میں نے آج تک نہیں دیکھی تھی' آواز نہیں سنی تھی' اس کی انگلیاں میں مر... ہی میں چوم سکتا تھا' حقیقت میں یہ کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔

ایک دن میں اسکول سے آیا تو کمرے کی حالت بہت ابتر تھی۔ میں نے سوچا چھوٹا سا کمرا... سے صاف ہو سکتا ہے۔ اماں سے جھاڑو مانگ لوں لیکن پھر سوچا روزمرہ ضرورت کی چیز ہے بازار... آتا ہوں۔ اسی وقت بازار گیا اور ایک عدد جھاڑو لے آیا۔ پہلے بستر جھاڑا۔ جالے وغیرہ اتار... پر جھاڑو دینا شروع کیا۔ عین اسی وقت اماں بیچ کے دروازے کی کنڈی اتار کر اندر آگئیں۔

"اے ہے بڑا! کیا کرتا ہے' کہیں مرد بھی جھاڑو دیتے ہیں۔" وہ میرے ہاتھ میں جھاڑو دیکھ کر...

"جی وہ۔ یہ کمرا گندا ہو رہا تھا' صاف کر رہا ہوں۔" میں قدرے شرمندگی سے بولا۔

"مجھے خیال ہی نہیں آیا بیٹا اور زہرہ سارا دن کام میں لگی رہتی ہے۔ اس طرف ہمارا دھیان ... گیا لیکن تو چھوڑ جس ہاتھ میں قلم پکڑتا ہے اس میں جھاڑو زیب نہیں دیتی۔ اب روز ... جانے کے بعد زہرہ تیرے گھر کی صفائی کر دیا کرے گی۔"

"نہیں نہیں اماں۔" میں گھبرا کر بولا۔ "مجھ پر آپ کے پہلے ہی بہت زیادہ احسانات ہیں' ... لوگوں کو مزید تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ ویسے بھی اپنا کام خود کرنے میں میں کوئی عار نہیں سمجھتا... کر لیا کروں گا۔"

"بس بس۔ ماں سمجھتا ہے تو ہر بات بے چوں و چرا مان لیا کر۔" اماں نے پیار بھری ڈا... چپ کرا دیا لیکن احسانات کا یہ بوجھ میرے کاندھوں پر بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ میں نے اماں کے ... ذمے لے لیے مثلاً بازار سے سودا سلف اب اماں کی بجائے میں لانے لگا۔ گھر میں اگر بجلی خراب ... کوئی چیز ٹوٹ پھوٹ جاتی تو اسے ٹھیک کرنے کا ذمہ بھی میں نے لے لیا لیکن یہ چھوٹے موٹے ... کے ان احسانات کے بدلے میں کچھ بھی نہ تھے۔ صاف ستھرا گھر پکا پکایا لذیذ کھانا' آرام سکون ... کچھ اماں نے میری جھولی میں ڈال دیا تھا۔ ان کے احسانات کے آگے میں سر اٹھانے کے قابل ... تھا۔

میرے لیے اس گھر میں سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ تھی کہ میں نے زہرہ کی ایک جھلک ... کی بات ہے' میں نے اس کی آواز تک نہیں سنی تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ کیسی لڑکی ہے جو چوبیس گھنٹے تک چپ رہتی ہے۔ مانا کہ وہ ایک پردہ دار لڑکی ہے لیکن ایک ہی گھر میں کبھی کبھار بھول چوک ... جاتی ہے' اس سے ایسی بھول کبھی نہیں ہوئی اور پھر آواز کا پردہ تو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔

ہے کہ جو چیز ناقابل حصول ہو اس کے حصول کی خواہش دل میں بڑھ جاتی ہے' میرے دل میں بھی ... دیکھنے اور اس کی آواز سننے کا جذبہ شدید تر ہو تا گیا۔ اب ہر دم میں اس کوشش میں رہتا کہ کسی ... ہو کی ایک جھلک دیکھ لوں۔ مجھے کھانا شاید دینے کا کام اماں کے سر تھا جب اماں بیچ کے دروازے ... دینے میرے کمرے میں آتیں تو میں بے قراری سے ان کے پیچھے دیکھتا کہ شاید زہرہ کی ایک ... نظر آجائے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔ شاید وہ ایسے وقت کمرے سے باہر نکل جاتی ہو۔ میں نے ہر ... کوشش کی' اسکول سے وقت سے پہلے گھر آجاتا' چپکے سے تالا کھولتا اور اندر کمرے میں آتا کہ ... کم میری غیر موجودگی میں تو زہرہ بولتی ہو گی' میں اس کی آواز سن سکوں گا لیکن میں ہر بار اپنی ... میں ناکام ہوتا گیا۔ کمرے کے اندر اور باہر وہی پراسرار سناٹا ہوتا۔ میں دل پھینک قسم کا نوجوان ... نہیں تھا۔ غم دوراں نے لطیف جذبوں کو تقریباً ختم ہی کر دیا تھا لیکن زہرہ نے میرے دل میں کئی ... جذبے بیدار کر دیے تھے۔ میرے دل میں اسے دیکھنے کا اشتیاق روز بروز فزوں تر ہو تا گیا۔ ادھر ... والدین کا اصرار اب شدید صورت اختیار کرنے لگا تھا کہ میں شادی کے لیے ہاں جاؤں۔ انھوں ... اجازت بھی دے دی تھی کہ اگر میں نے کسی کو پسند کر لیا ہو تو بھی انھیں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔

اس رات سونے سے پہلے جب میں نے بتی بجھائی اور اپنے بستر میں گھسا تو جھماکے کی طرح یہ خیال ... ہن میں آکودا کہ اگر زہرہ میری بیوی بن جائے تو کیسا رہے؟ یہ خیال آتے ہی میرا دل زور زور ... مارنے لگا۔ میں اندھیرے میں اس بند دروازے کو دیکھنے لگا جو میرے اور زہرہ کے درمیان حائل ... ہر لحاظ سے سگھڑ اور سلیقہ شعار لڑکی تھی۔ اس کے ہاتھ کے پکوان انتہائی لذیذ ہوتے۔ صفائی ... کا تو یہ عالم تھا کہ جب میں اسکول سے واپس آتا تو گھر مجھے جنت لگتا۔ ہر چیز قرینے سے اپنی جگہ ... ہوتی۔ مجھے کوئی چیز ڈھونڈنے کے لیے تک و دو نہ کرنا پڑتی۔ ایسی لڑکی اگر معمولی شکل و صورت کی ... ہو گوارا کی جا سکتی ہے۔ ایسی ہی بیوی سے گھر جنت بنتا ہے لیکن کاش میں زہرہ کی ایک جھلک دیکھ ... زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ میں یوں اندھے پن سے کیسے کر سکتا تھا۔

... سوچتے سوچتے تھک گیا تھا کہ زہرہ مجھے کس طریقے سے نظر آسکے گی لیکن کوئی ایسا طریقہ نہ تھا۔ ... میں اماں کو اپنی شرافت کا یقین دلا چکا تھا کسی ایسی ویسی حرکت سے میں اپنا یہ نقش ان کے دل ... نہیں چاہتا تھا۔ میں زہرہ کے لیے پاگل ہونے لگا تھا۔ کوئی ایسی رات نہ ہوتی جب میں زہرہ کو ... انداز کے خوابوں میں نہ دیکھتا۔ فلمی رسالہ دیکھتا تو مجھے کبھی زہرہ کی صورت شبنم میں نظر آتی' کبھی ... اور کبھی ممتاز میں لیکن میرا دل کسی پر مطمئن نہ ہوتا اور جھنجلا کر میں رسالہ دور پھینک دیتا۔

میرا خیال تھا کہ زہرہ کے جملہ حقوق ابھی تک کسی کے نام محفوظ نہیں ہوئے تھے۔ ایسی کوئی بات ہوتی تو اماں ضرور ذکر کرتیں اور اس بات کا بھی مجھے سو فیصد یقین تھا کہ زہرہ یقیناً مجھے آسانی سے مل سکتی کیونکہ اماں کا پیار دن بہ دن مجھ پر بڑھتا جارہا تھا وہ میری چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا بھی خیال رکھتی تھیں۔ ایسی صورت میں یقیناً وہ میری درخواست کو در خور اعتنا سمجھیں گی لیکن خود زہرہ کی خواہش تھی' اس کا مجھے کوئی علم نہ تھا اور میں جذبات کی رو میں بہہ کر کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا جو ساری زندگی کے لیے میرے جی کا روگ بن جائے اگر کوئی اسے خود ستائی پر محمول نہ کرے تو میں اپنا شمار طور اور وجیہہ مردوں میں کرتا ہوں۔ اسکول ماسٹری نفع بخش نہ سہی لیکن ایک معزز پیشہ ضرور ہے اور اس گاؤں کی کئی مائیں اس بات کی شدید خواہش مند تھیں کہ میں ان کا داماد بنوں۔ ہر لڑکی بڑی آسانی سے میری طرف جھک سکتی تھی لیکن جانے یہ زہرہ کس مٹی سے بنی تھی جو میری وجاہت سے مرعوب اور میری شرافت نے اسے متاثر کیا' جس نے نہ کبھی مجھے اپنی جھلک دکھلائی' نہ آواز سنوائی۔ ظاہر ہے انجانے پن میں میں کب کوئی صحیح فیصلہ کر سکتا تھا۔

اس مکان میں آئے مجھے تین مہینے ہونے کو آئے تھے۔ بظاہر مجھے یہاں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ تھی لیکن میرا ذہنی سکون ختم ہو چکا تھا۔ میں دن رات زہرہ کے متعلق سوچا کرتا ادھر والدین کا اصرار بڑھتا جارہا تھا ادھر میں عجیب مشکل میں گرفتار تھا۔ آخر کار سوچوں کی یلغار سے گھبرا کر میں نے فیصلہ کیا کہ گاؤں جا کر اپنے والدین کو تمام صورتحال سے باخبر کردوں۔ میری ماں خود آکر زہرہ کو دیکھ لے اور بات آگے بڑھائی جاسکے۔ میں نے اسکول سے چار دن کی چھٹی لی اور گھر کی چابیاں اماں کو دے کر گاؤں آگیا۔

گاؤں پہنچا تو سب گھر والوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ابا جان نے سو شکوے کیے کہ میں نے ان کے خطوط کے جوابات نہیں دیے۔ ماں جی پیار کرتے نہیں تھک رہی تھیں۔ شانو میری بہن کبھی کھیس لاتی' کبھی دہی اور چھاچھ سے تواضع کرتی۔ چھوٹا بھائی دوڑ کر اپنے ہوم ورک کی کاپیاں اٹھا لایا اور اسے کہیں GOOD اور کہیں V.GOOD ملا تھا سب کے بیچ میں' میں انتہائی مسرور بیٹھا تھا۔

رات کو سب سو گئے تو ماں جی میری چارپائی پر آکر میرے پاس بیٹھ گئیں اور میری شادی کی بات شروع کی۔ ان کی خواہش تھی کہ ماموں کی بیٹی بانو سے میرے رشتے کی بات پکی کرلیں لیکن اس کے لیے وہ میری رائے معلوم کرنا چاہتی تھیں۔ میں نے بلا کم و کاست زہرہ کے بارے میں ہر بات انھیں بتادی اور ساتھ ہی کہہ دیا کہ میں چاہتا ہوں کہ زہرہ سے شادی کرلوں لیکن اچھا ہوگا کہ آپ لوگ خود جا کر اسے دیکھ لیں

کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ ماں جی کافی دیر تک سوچتی رہیں پھر بولیں۔

"بیٹا! ایک گھر میں رہتے ہوئے جس لڑکی کی تم نے جھلک تک نہیں دیکھی' اس میں ضرور کوئی جسمانی نقص ہوگا اور جس کی آواز تک تمہارے کان میں نہیں پڑی' اس کے لیے کیا کہا جاسکتا ہے۔ یقیناً وہ گونگی ہوگی۔"

میں بوکھلا کر رہ گیا۔ واقعی اس نکتے پر تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا جب کہ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی' اماں نے مجھے سوچتے دیکھا تو بولیں۔

"بیٹا! جو لڑکیاں صحت مند اور قبول صورت ہوں وہ اس طرح کبھی خود کو سات پردوں میں نہیں چھپاتیں۔ لڑکی میں یقیناً کوئی نقص ہے۔"

"لیکن ماں جی آپ جا کر دیکھ تو آئیں۔" میں نے کمزور سا اصرار کیا۔

"ارے بیٹا! کیوں اپنا ٹھکانا خراب کرتا ہے۔ سو تکلیفوں کے بعد تجھے رہنے کا ٹھکانا ملا ہے۔ اب ہم جائیں گے۔ لڑکی کا نقص دیکھ کر رشتہ طے نہیں کریں گے تو کیا اس کی ماں یہ سب گوارا کرے گی۔ بس بیٹا تو اسے دیکھا نہیں لیکن عقل سے بچا ہے۔ تو تو پڑھا لکھا ہے' اتنی سی بات نہیں سمجھتا کہ جو لڑکی اپنے عیب کیوں چھپا کر رکھتی ہے بھلا وہ کیسے کسی نقص سے مبرا ہو سکتی ہے۔"

ماں جی تو مجھے سوچوں کے الاؤ میں دھکیل کر خود سونے چلی گئیں اور میں ساری رات کروٹوں پر کروٹیں بدلتا رہا۔ میں نے بہت سوچا اور آخر کار یہ فیصلہ کیا کہ میں ماں جی کی بات مان کر بانو کے لیے ہامی بھرلوں۔ یہ فیصلہ کرتے ہوئے میں خوش نہ تھا جانے کیوں دل میں درد سا اٹھ رہا تھا اور میں زہرہ کے بارے میں فیصلہ کرنے کے بعد بھی اسی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ جب میں نے ماں جی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو گھر والوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ ماموں اور ممانی بھی شاید تیار بیٹھے تھے۔ طے پایا کہ میری چھٹیوں میں' مجھے منگنی اور نکاح کی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے۔ رخصتی گرمیوں کی چھٹیوں میں ہوگی۔ میں نے لاکھ احتجاج کیا کہ ابھی وقت کم ہے دوبارہ چھٹی لے کر آجاؤں گا لیکن کسی نے میری ایک نہ سنی۔ چار دن کی چھٹی کے لیے درخواست بھیج دی گئی اور ایک مختصر سی تقریب میں' میں اور بانو ایک نہ ٹوٹنے والی ڈور میں باندھ دیے گئے۔

چار دن کی مزید چھٹیاں گزار کر جب میں کراچی پہنچا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ میں کافی تھکا ہوا تھا۔ دستک پر باہر نکلیں۔ مجھے دیکھا تو خوشی سے نہال ہوگئیں۔ پے در پے میری بلائیں لے ڈالیں۔ جلدی سے دروازہ کھولا۔ میں اندر آیا تو میرے ساتھ ہی وہ بھی اندر آگئیں۔

"کیسے رہے بیٹا! گاؤں میں تو سب خیریت تھی نا؟"

"جی ہاں۔ شکر ہے خدا کا سب خیریت تھی۔ آپ کیسی رہیں؟" میں انکساری سے بولا۔

"بس بیٹا تمہیں بڑا یاد کیا۔ زہرہ تو ہر وقت کہتی تھی کہ ماسٹر صاحب کے جانے سے یہ گھر بہت سونا سا لگتا ہے۔" اماں بولیں تو میں کھو سا گیا۔

کیا زہرہ بول سکتی ہے؟ میرے دل نے مجھ سے سوال کیا لیکن اماں تو ہمیشہ بات زہرہ کے حوالے کرتیں جب کہ میں نے زہرہ کو کبھی بولتے نہیں سنا تھا۔ ماؤں کا کیا ہے۔ میں نے سوچا کسی ماں کو اپنی اولاد میں کسی قسم نقص نظر نہیں آتا اور ہر ماں اپنی اولاد کی بولی سمجھ سکتی ہے۔ چاہے اولاد گونگی ہی کیوں نہ ہو۔

"میں تیرے لیے چائے لاتی ہوں تو تھکا ہارا آیا ہے۔"

اماں نے مجھے سوچوں میں ڈوبے ہوئے دیکھا تو جاتے جاتے بولیں۔ "ہاں بیٹا! تو تو چار دن کی چاندنی کر گیا تھا' اتنے زیادہ دن گزارے کہاں؟ خیریت تو تھی؟"

"جی۔۔۔وہ۔۔۔۔وہ" میں کچھ جھجک رہا تھا بتانے سے۔ شاید میری فطری شرم مانع تھی۔

"ہاں بتاؤ نا۔۔۔ گھر میں تو سب ٹھیک تھے نا؟" اماں میری جھجک پر کچھ حیران سی ہو کر بولیں۔

"جی وہ میری منگنی اور نکاح کی تقریب تھی بس اس میں دن لگ گئے۔" میں نے بات پوری کی اور جھکا ہوا سر اٹھا کر اماں کی طرف دیکھا تو اچانک مجھے جھٹکا سا لگا کیونکہ اماں منہ کھولے شدید دکھ اور حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ان کے جھریوں بھرے چہرے پر اچانک ہلدی کھنڈ کر رہ گئی تھی۔ بوڑھے نحیف ہاتھ واضح طور پر لرز رہے تھے اور وہ ایک ٹک میرا منہ تک رہی تھیں۔

"اماں! اماں آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اماں کا سکتہ جیسے ٹوٹ گیا۔ وہ جیسے ہوش میں آگئیں۔ انھوں نے میری بات کا کوئی جواب دیا اور مایوسی میں ڈوبی ایک نظر مجھ پر ڈالی اور تیزی سے درمیانی دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں گھس گئیں۔ میں حیران و پریشان کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اماں کو اچانک کیا ہو گیا تھا۔ وہ میری منگنی کی خبر سے اتنی قدر ہراساں اور دکھی کیوں ہو گئی تھیں۔ کیا وہ مجھ پر محض اس لیے مہربان تھیں کہ زہرہ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینا چاہتی تھیں؟ ہزاروں سوالات میرے ذہن پر دستک دینے لگے اگر ایسا تھا تو انھوں نے اب تک سات پردوں میں کیوں چھپایا تھا اگر زہرہ میں کوئی خامی تھی تو انھیں چاہیے تھا کہ پوری سچائی سے خامی کے بارے میں بتا دیتیں۔ آخر وہ زہرہ کی جسمانی خامی کو کب تک چھپاتیں اور کوئی شخص اندھیرے

رشتے زہرہ سے شادی کیسے کر سکتا تھا؟ میرا ذہن سوچ سوچ کر پاگل ہونے لگا۔ میں دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میرا دل ڈوب کر رہ گیا تھا۔ آخر اماں میری محسن تھیں۔ ان کے مجھ پر لاتعداد احسانات تھے۔ ان کے رویے سے اکثر میرے دل میں یہ شک جنم لیتا کہ وہ مجھے دامادی کے لیے پسند کرتی ہیں لیکن زہرہ کی اس قدر پردہ داری سے میرا یہ شک مٹ جاتا اور میں اماں کے رویے کو ان کا حسن' اخلاق شرافت اور نیک دلی سمجھ لیتا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اماں میرے اور زہرہ کے رشتے کے لیے دل سے خواہش مند ہیں اور میری منگنی سے انھیں اتنا شدید صدمہ پہنچے گا۔ میرا دل اداس اور ذہن حد درجہ مضطرب تھا اور میں الجھا ہوا بیٹھا تھا کہ میرا دوست سعید آگیا۔ سعید اکثر و بیشتر میرے پاس آیا کرتا تھا۔ وہ آتے ہی بولا۔

"ارے یار کہاں تھا تو؟ میں نے کل بھی تیرے اسکول سے تیرا پتا کیا تھا تو اسکول میں بھی نہیں تھا۔"

"میں گاؤں چلا گیا تھا بس ابھی ابھی آیا ہوں۔" میں نے افسردگی سے کہا۔

"بات کیا ہے یار بابر! تو کچھ خوش نظر نہیں آتا' کیا گاؤں میں کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی؟" وہ مجھے ٹٹولتے ہوئے بولا۔

"گڑبڑ کیا ہونی تھی سعید! بس وہی ہوا جو ایک عرصے سے گھر والے چاہتے تھے۔"

"ارے تو کیا تیری منگنی ہو گئی ہے؟" وہ اچھل کر بولا۔

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ارے تو مٹھائی کھلا۔ یہ تو خوشی کی بات ہے اور تو منہ پھلائے بیٹھا ہے۔" وہ خوشی سے چیخ کر بولا۔ اس کی بات نظر انداز کر کے میں نے سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

"سعید تجھے یاد ہو گا کہ ایک بار میں نے تجھے اماں کی بیٹی زہرہ کے بارے میں بتایا تھا۔" جانے کیوں اس وقت مجھے کسی ایسے رازدار کی ضرورت تھی جسے میں اپنی الجھنیں بتا کر اس سے مشورہ کر سکوں اور میرا یہ رازدار سعید کے سوا اور کون ہو سکتا تھا؟ وہ ایک مخلص دوست تھا۔

"ہاں ہاں تو نے بتایا تھا۔ تو کیا تیری منگنی اسی سے ہو گئی ہے؟"

"نہیں یار۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "منگنی تو ماموں کی بیٹی سے ہوئی ہے۔"

"تو پھر اس لڑکی کے متعلق کچھ کہنے یا پوچھنے کی کیا تک ہے اس وقت؟" وہ حیرانی سے بولا۔

"تک ہے صحبی تو پوچھ رہا ہوں کہ تیرے دماغ میں کوئی بات محفوظ بھی رہتی ہے کہ نہیں۔" میں نے کچھ آواز میں کہا تو سعید جلدی سے بولا۔

"ارے میرا حافظہ اب اتنا بھی کمزور نہیں۔ تو نے اس لڑکی زہرہ کے بارے میں بتایا تھا کہ نہ کبھی تو نے اس کی جھلک دیکھی اور نہ کبھی آواز سنی ہے' یہی بتایا تھا نا تم نے مجھے؟"

"ہاں یار! پہلے میرا ارادہ تھا کہ میں شادی زہرہ ہی سے کروں گا۔ وہ ہر لحاظ سے ایک نفیس لڑکی ہے لیکن شروع سے آخر تک وہ میرے لیے ایک معمہ بنی رہی۔ میں نے ہر طرح سے کوشش کی کہ اس کی ایک جھلک دیکھ سکوں۔ آواز سے بھی شخصیت کا اندازلگایا جاسکتا ہے میں نے اس کی آواز سننے کی بھی کوشش کی لیکن تین مہینے مجھے اس گھر میں آئے ہوئے ہو گئے ہیں اور میں آج تک زہرہ کی حقیقت نہ جان سکا اگر میں اس کی ایک جھلک بھی دیکھ لیتا اور چاہے وہ بدصورت ہی ہوتی تب بھی میں اس کی باتی خوبیوں کو سامنے رکھ کر اسے اپنا لیتا لیکن اس طرح اندھیرے میں تو میں کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر سکتا تھا نا۔"

"تو اب تمہیں کیا دکھ ہے؟ کیا اب تم نے زہرہ کو دیکھ لیا ہے؟" سعید بولا۔

"سنو تو سہی۔" میں ناگواری سے بولا۔

"اچھا اچھا سناؤ' میں ہمہ تن گوش ہوں۔" سعید جلدی سے بولا۔

"جب میں نے ماں جی کو اپنی پسند کے بارے میں بتایا اور انھیں ساری روداد سنائی تو وہ بولیں کہ لڑکی اپنے آپ کو ساتھ پردوں میں چھپاتی ہے اس میں یقیناً کوئی جسمانی نقص ہو گا اور جس کی آواز تم نے آج تک نہیں سنی تو وہ گونگی ہی ہو گی ورنہ ایک نارمل لڑکی کی اتنی شدید خاموشی کا اور کیا سبب ہو سکتا ہے۔ جب میں نے اس نکتے پر سوچا تو مجھے بھی یہ بات حقیقت سے قریب تر نظر آئی اور میں بانو سے شادی پر رضامند ہو گیا۔"

"تو اب کیا کہتے ہو یار! اب زہرہ اندھی ہے یا گونگی' تمہیں کیا تمہاری تو منگنی ہو گئی نا۔"

میں نے سعید کی بات کا کوئی جواب نہ دیا کیونکہ میری توجہ اس درمیانی دروازے کی طرف ہو گئی جو اماں کے کمرے میں کھلتا تھا۔ ابھی ابھی میں نے وہاں موہوم سی آہٹ سنی تھی اور مجھے یوں لگا جیسے وہاں کافی دیر سے کوئی کھڑا ہماری باتیں سن رہا تھا۔ میں نے فوراً موضوع بدل دیا اگرچہ میں سعید کو ساری باتیں بتا کر کوئی مشورہ لینا' اپنی پریشاں خیالی سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا تھوڑی دیر بعد جب سعید جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تو میں بھی اس کے ساتھ باہر تک آگیا۔ اسے رخصت کرنے کے بعد میں کچھ دیر تک بے مقصد ہی ادھر ادھر گھومتا رہا۔ میرا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ میں جلدی ہی اپنے کمرے میں آگیا لیکن کمرے میں آکر اچانک ہی میرے کان کھڑے ہو گئے۔ اماں کے کمرے سے سسکیوں کی دھیمی دھیمی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں تجسس کے مارے اس بند دروازے

سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اچانک میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی کیونکہ جس آواز کو سننے کے لیے میں ترس گیا تھا جس کے سننے کے لیے میں نے سو سو حیلے بہانے کیے تھے وہی وہ صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ سریلی اور مترنم میٹھی آواز یقیناً زہرہ کی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ سسکیوں کے درمیان میں کہہ رہی تھی۔

"تجھے یاد ہے اماں! جب ماسٹر صاحب سے پہلے تو نے یہ کمرا کرایے پر ایک کنوارے کلرک کو دیا تھا۔ تو نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اسے بہانے بہانے سے اپنی جھلک دکھایا کروں اور وقت بے وقت اسے اپنی سریلی آواز سنوایا کروں تاکہ وہ مجھے پسند کر کے میرے ساتھ شادی کر لے اور تو اپنی ذمے داری سے بری الذمہ ہو جائے۔ لیکن اماں! چند ماہ تو اس نے میری وقت بے وقت کی جھلکیوں سے خوب لطف اٹھایا۔ کبھی میں اس بیچ کے دروازے سے اسے اپنا دیدار کرواتی' کبھی دیوار کے اس طرف جھانکتی اور کبھی جب وہ دفتر سے آتا تو مجھے داخلی دروازے میں کھڑا پاتا لیکن جب اس کی دلچسپی دیکھ کر تو نے اس سے میری شادی کی بات کی تو وہ بدک گیا۔ تجھے یاد ہے نا اماں جب اس نے کہا تھا کہ جو لڑکیاں اپنے جلوے دکھاتی پھرتی ہیں' وہ شریف نہیں ہوتیں۔ ایسی لڑکیوں کے ساتھ وقت تو گزارا جا سکتا ہے لیکن شادی نہیں کی جاسکتی۔ شریف اور باحیا لڑکیاں تو کسی غیر کو اپنی جھلک تو کیا اپنی آواز تک نہیں سنایا کرتیں اور مرد خود کتنا ہی برا کیوں نہ ہو لیکن شادی کے لیے وہ کسی شریف لڑکی ہی کا انتخاب کرتا ہے۔ تب اماں! تو نے اسے خوب برا بھلا کہا اور فوراً ہی اس سے کمرا خالی کروالیا اور جب تو نے یہ کمرا ماسٹر صاحب کو دیا تو صاف جھوٹ بولا کہ ہم یہ کمرا کبھی غیر شادی شدہ کو نہیں دیتے حالانکہ اماں! تو نے میرے بوجھ سے چھٹکارا پانے کے لیے یہ کمرا ہمیشہ غیر شادی شدہ کو ہی دیا ہے۔"

"چپ کر لڑکی!" اماں دبی آواز سے چیخ کر بولیں۔ "یہ سب کچھ دہرانے سے کیا مطلب ہے تیرا؟"

"اس لیے اماں کہ جو کچھ میں نے سنا ہے وہ تم نے نہیں سنا' میں وہی تمہیں سنانا چاہتی ہوں۔" زہرہ کی دکھ میں چور چور آواز میرے سن ہوتے ہوئے کانوں سے ٹکرائی۔

"کیا سنا ہے تو نے؟ کیا سنانا چاہتی ہے مجھے؟" اماں کی خوفزدہ آواز آئی۔

"ابھی ابھی ماسٹر صاحب اپنے دوست سے کہہ رہے تھے کہ اگر وہ میری ایک جھلک دیکھ لیتے یا میری آواز بھی سن لیتے تو مجھ سے شادی کر لیتے لیکن ان کے دل میں شک تھا کہ خود کو سات پردوں میں چھپانے والی زہرہ کو کوئی جسمانی نقص تو لازماً ہو گا ہی لیکن وہ گونگی بھی ضرور ہو گی۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

"کیا۔۔۔ کیا کہہ رہی ہے تو؟" اماں کی ڈوبتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ہاں اماں۔" زہرہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولی۔ "ماسٹر صاحب کو یہ نہیں پتا کہ تو نے جب اس کنوارے کلرک نذیر کی باتیں سنیں تو تیرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ چاہے لڑکی کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو لیکن جب تک مرد کے دل میں اس کی شرافت اور نیکی کی دھاک نہ بیٹھے وہ اس سے شادی نہیں کرتا۔ لہٰذا جب تو نے ماسٹر صاحب کو یہ کمرا کرایے پر دیا تو مجھے سختی سے تاکید کی کہ اگر میں چاہتی ہوں کہ میری ڈولی اٹھے اور اپنا گھر بار نصیب ہو تو مجھے ہر ممکن طریقے سے ماسٹر صاحب کے دل پر اپنی شرافت، اپنی پاکیزگی اور اپنی شرم و حیا کی دھاک بٹھانا ہوگی اور اس گھر میں اس طرح رہنا ہوگا کہ اسے پتا ہی نہ چلے کہ ساتھ والے مکان میں کسی نوجوان لڑکی کا وجود بھی ہے۔ اپنی آواز تک کا پردہ رکھنا ہوگا۔ میرے وجود کا احساس تو وقتاً فوقتاً اپنی باتوں میں میرا ذکر کر کے اسے دلا دیا کرتی تھی۔ سارا دن میں اس کے لیے کام میں لگی رہتی۔ اماں! چپ رہنا کتنا دشوار ہے اس کا علم مجھے ان تین مہینوں میں ہوا۔ یہ تین مہینے مجھ پر بہت بھاری گزرے۔ میں نے قدم قدم پر اپنے آپ پر پابندیاں لگائیں، اپنی پاکیزگی اور شرافت کے لیے ہر قربانی دی لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ یہی کہ وہ مجھے گونگی سمجھنے لگے۔ مجھ میں جسمانی نقص ڈھونڈنے لگے۔ انھوں نے تمہاری طرح بالکل نہیں سوچا اماں! ایک بار بھی ماسٹر صاحب کے دل میں یہ خیال نہ آیا کہ خود کو سات پردوں میں چھپانے والی زہرہ شریف بھی ہو سکتی ہے، شرم و حیا کی پتلی بھی ہو سکتی ہے اور پاکیزگی کا پیکر بھی ہو سکتی ہے۔ نہیں ماں ایک بار بھی کسی نے یہ نہیں سوچا، ایسا کیوں نہیں سوچا، بتاؤ اماں! جو تو نے سوچا دوسروں نے کیوں نہیں سوچا؟"

میرے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی زہریلے سانپ کا زہر میرے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہو۔ میرے جسم کے تمام مساموں سے پسینا پھوٹنے لگا۔ میری ٹانگیں لرزنے لگیں اور بے خیالی میں میرا ہاتھ دروازے پر لگا تو دروازے کے دونوں پٹ اچانک کھلتے ہی چلے گئے۔ شاید اماں دروازے کی کنڈی لگانا بھول گئی تھیں۔ بالکل سامنے ہی چولھے کے پاس ٹھنڈے فرش پر زہرہ اور اماں بیٹھی تھیں۔ اف! میں پاگل ہونے لگا۔ آج تک اتنا مکمل حسن میری نظروں سے نہیں گزرا تھا بتاؤ اماں! تھا۔ سنہری رنگت، فسوں ساز آنکھیں، خوبصورت خدوخال، شانے پر بکھرے کالی گھٹاؤں جیسے لمبے اور سیاہ بال، متناسب جسم۔ جب اس نے چونک کر مجھے دیکھا تو اس کی بھیگی بھیگی گلابی آنکھیں جیسے میرے دل میں گڑ کر رہ گئیں اور مجھے یوں لگا جیسے منزل مجھ سے بہت دور چلی گئی ہو اور میں سدا راستوں میں بھٹکتا رہوں گا۔

تین عورتیں تین کہانیاں

پارس

ایک تحریر، ایک زہریلا نشتر

فرح شاہانی

پہلی کہانی

"پارس مجھ جیسی لڑکی کو سمیٹتے سمیٹتے خود ہی بکھر گئی۔"

اکثر بیٹھے والی اُس لڑکی کی کہانی جو کینسر کے مرض میں مبتلا تھی

...ں نے پارس ہوسپٹل کا افتتاح پارس کی برسی کے ...ر کیا تھا۔ افتتاحی تقریب کا سرخ فیتہ کاٹتے ہوئے ...ں آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آنسو تو میری بھی آنکھوں ...ے تھے مگر میں نے جس انداز میں انھیں روک رکھا ...ہر دل ہی جانتا تھا۔ اس دن اے سارا دن اپنے ...میں رہی۔ میں نے اے کے کمرے میں جھانکا۔ وہ ...لی صلیب کے سامنے سر جھکائے رو رہی تھی۔ مجھ ...ل ہمت نہ تھی کہ میں اسے تسلی دے سکوں۔ میں آنسو سنبھالے اپنے کمرے میں آگئی مگر سامنے پارس کی مسکراتی تصویر دیکھتے ہی میرے آنسو بے اختیار ہو گئے۔ اس دن میں دیر تک روتی رہی۔

پارس میرے لیے دنیا کی سب سے اہم ہستی تھی۔ میں نے تو کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ پارس مجھ جیسی بکھری بکھری لڑکی کو سمیٹتے سمیٹتے ایک دن خود ہی بکھر جائے گی۔ دنیا کی اس پیچیدہ اور ہولناک زندگی میں اگر مجھے پارس کا ساتھ نہ ملتا تو شاید میں کب کی مر چکی ہوتی۔ مجھے

اور اسے کو تو اب تک یقین نہیں آتا کہ پارس اب ہم میں موجود نہیں۔ پارس کو ٹلنے سے قبل میں بالکل تنہا تھی۔ میں نے ہوش سنبھالتے ہی خود کو تنہا پایا تھا۔

مجھے جنم دیتے ہی میری ماں کا انتقال ہو گیا۔ مجھے میری خالہ نے گود لے لیا۔ میرے والد نے میری شکل تک نہ دیکھی۔ جب میں ایک سال کی ہوئی تو میرے والد نے دوسری شادی کر لی تھی۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ مجھے سال کی عمر میں خالہ نے مجھے سرکاری اسکول میں داخل کروا دیا۔ اس دوران میری سوتیلی بہن راحیلہ اور بھائی نبیل پیدا ہوئے۔ ابو اپنی بیوی بچوں کے ساتھ خوش تھے۔ مجھے تو وہ بالکل بھول چکے تھے ہاں البتہ سال میں ایک بار عید کے موقع پر وہ میرے لیے کچھ رقم اور کپڑے بھیج دیتے' بس یہ ایک ایسا دن ہوتا جب مجھے اپنے زندہ وجود کا احساس ہوتا۔ پڑھائی میں' میں خاصی ہوشیار تھی اور شروع سے مجھے ڈاکٹر بننے کا شوق بھی تھا۔ جب میں ساتویں جماعت میں آئی تو میری خالہ کا سایہ میرے سر سے اٹھ گیا۔ مجھے خالہ کی موت کا بہت صدمہ ہوا۔ سوئم کے بعد ابو مجھے اپنے گھر لے آئے۔ میں نے پہلی مرتبہ شیرازی ہاؤس میں قدم رکھا۔ مجھے دیکھتے ہی میری سوتیلی ماں کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ راحیلہ اور نبیل نے بھی مجھ سے بات نہ کی' تب مجھے معلوم ہوا کہ اس وسیع و عریض مکان میں رہنے والے مکینوں کے دل کتنے چھوٹے ہیں۔ مجھے رہنے کے لیے میری مرحومہ ماں کا کمرا دیا گیا۔ اس دن پہلی بار مجھے اپنی ماں کے کمس کا اس کی قربت کا' احساس ہوا۔

دوسری صبح میں ڈرتے ڈرتے ناشتے کی ٹیبل پر آئی تو سب کی قہر آلود نظروں نے میرا استقبال کیا۔ میں نے سلام کیا مگر کسی نے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ میرے بیٹھتے ہی ابو آفس چلے گئے۔ تب میں سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ ابو مجھے دنیا والوں کی باتوں کے ڈر سے اپنے ساتھ لائے ہیں ورنہ انھیں میری کوئی ضرورت نہیں۔ میں ابھی اسی سوچ میں تھی کہ امی کی تیز آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"سنو لڑکی! یہاں کوئی تمہاری ماں کی جاید اد نہیں ہے جو تم مفت کی روٹیاں توڑو گی' اگر تمہیں رہنا ہے تو آج سے سارے گھر کی ذمے داری تم پر ہو گی۔ سمجھیں۔"

"جی اچھا!" میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

اس دن کے بعد سارے گھر کی ذمے داری مجھ پر آ گئی۔

میں گھر کا کام خوشی خوشی کرتی' اگر امی کو کسی بات پر غصہ آ جاتا تو میں پہلے سے ہی ان کے کپڑے پریس کر دیتی۔ ان کے سینڈل چمکا دیتی' اس امید پر کہ وہ ایک پیار بھری نگاہ ڈال دیں۔ میں یہ تو نہیں جانتی تھی کہ بچے اپنے سوتیلے ماں سے محبت کرتے ہیں یا نہیں مگر مجھے اپنی سوتیلی ماں سے ڈر تھا' اور میری ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ میں اپنی امی کو ماں کے دل میں جگہ پیدا کر سکوں مگر میں ناکام رہی۔

ان دنوں میں انٹر کے امتحان میں مصروف تھی کہ ادھر ابو کی طرف سے مہمانوں کا تانتا بندھ گیا۔ ابو کے دوست ہی نہیں ان کے آفس والے مہمان کے لیے صاف کرنے کا حکم ملا۔ آنے والے مہمان امی کے بھانجے تھے۔ میں نے کسی سوال کے فوراً امی کے حکم کی تعمیل کی۔ پورے گھر میں کافی ہنگامہ تھا۔ میں سارے کام ختم کر کے پلٹی ہی تھی کہ راحیلہ نے کھانے کی ایک لسٹ تھما دی تھی۔ ایک خاص مہمان کے لیے انتظام؟ میں حیران تھی۔ رات کے کام سے فارغ ہو کر میں پلنگ کے نیچے بچھی ہی تھی کہ کمر درد سے ٹیک پڑی۔

"آپ کھانا لگانے کے لیے تمہاری اماں فریش ہو کر آئے گی؟"

راحیلہ کی بات پر مجھے غصہ تو بہت آیا کہ میں تھکن سے اٹھ کر کھانا لگانے لگی۔ کھانا لگانے کے دوران میری نظر شجاع پر پڑی۔ میں نے اخلاقاً سلام کیا' مگر وہ نبیل سے باتوں میں مصروف تھا۔

اس روز کالج کی چھٹی تھی۔ میرا ارادہ پڑھنے کا تھا' امی نے دوپہر کے کھانے کی لسٹ تھما دی۔ راحیلہ اور نبیل کے بھی آفس تھے۔ وہ کالج گئے تھے۔ ابو اور امی کے دوست کی تعزیت پر گئے تھے۔ میں کچن میں آ کر دال چاول کھانا بنانے لگی۔ اسی جلد بازی میں گرم گرم سالن پیروں پر گر گیا۔ تکلیف کی شدت سے میری چیخ نکل گئی۔ شجاع جو کہ شاید باہر سے آیا تھا میری چیخ سن کر کچن میں آ گیا۔

"کیا ہوا آپ کو؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا دیا۔ جلن ایسی شدید تھی کہ میرے آنسو بہ نکلے پڑے تھے۔

"ارے آپ تو بہت جل گئی ہیں اور آپ کہہ رہی ہیں کچھ نہیں ہوا۔ چلیں میں آپ کو دوا لگا دوں۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے تکلیف برداشت کرتے ہوئے کہا۔

"آپ چلیں تو۔" شجاع مجھے سہارا دے کر اپنے کمرے میں لے آیا۔ مجھے بیڈ کے کنارے بٹھا کر وہ اپنے بریف کیس سے ٹیوب نکالنے لگا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد وہ مرہم میرے پیروں پر ملنے لگا مجھے یہ سب کچھ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا مگر مجبوری تھی۔

"یہ خانساماں کا کام آپ نے کیوں سنبھال رکھا ہے؟"

"اس لیے کہ کھانا پکانا میرا شوق ہے۔" میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ "اب میں جاؤں؟" میں لڑکھڑاتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

"تھوڑی دیر بیٹھو۔" شجاع نے زبردستی مجھے کاندھے سے پکڑ کر بٹھا دیا۔ مجھے سخت گھبراہٹ ہو رہی تھی اور پھر تکلیف بھی بڑی شدید تھی۔

"ایک بات تو بتاؤ مومنہ' یہ تم ہر وقت خاموش اور اداس کیوں رہتی ہو۔" شجاع نے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بس یونہی۔" مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

"میں جانتا ہوں مومنہ! تمہارے ساتھ گھر والوں کا برتاؤ اچھا نہیں مگر اب تم بے فکر رہو۔ اب میں آ گیا ہوں نا!"

"یا مطلب؟" میں حیران رہ گئی۔

"مطلب سیدھا ہے۔ بات گھما پھرا کر کرنے کی میری عادت نہیں' بس یہ چاہتا ہوں کہ اگر تمہاری اجازت ہو تو میں تمہارے سارے دکھ اپنے دامن میں بھر لوں' اور تمہیں ساری دنیا کی نظروں سے بچا کر اپنے دل میں چھپا لوں۔" شجاع نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ میں جانے کیا لمحہ کھڑی ہوئی۔

"پلیز مومنہ! جانے سے پہلے میرے سوال کا جواب دیتی جاؤ۔"

"شجاع میرے سامنے آ گیا۔

"پلیز شجاع صاحب! میں نے ساری عمر دکھ اٹھائے ہیں۔ کوئی اور مذاق برداشت کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

دوسرے دن میں نے ابو سے ہوسٹل میں شفٹ ہونے کی اجازت طلب کی' ابو نے بغیر کچھ پوچھے اجازت دے دی۔

دوسرے ہفتے میں ایبٹ آباد کے پرسکون ہوسٹل میں آگئی۔ ہوسٹل کے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے میں بڑی پر اعتماد تھی۔ میں نے اطمینان سے کمرے کا جائزہ لیا۔ دائیں بائیں دو بیڈ تھے۔ فرش پر سرخ پھولوں والا قالین بچھا تھا۔ ایک طرف واشنگ ٹیبل رکھی تھی۔ باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ ان باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کمرے میں کوئی اعلیٰ ذوق رکھنے والی لڑکی قیام پذیر ہے۔ میں کپڑوں کا بیگ ایک طرف رکھ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد باتھ روم سے ایک خوبصورت اور اسمارٹ سی لڑکی باہر آئی۔ وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹکی' مسکرائی اور کچھ دیر مجھے دیکھنے کے بعد وہ میرے قریب آگئی۔ "مجھے پارس علی کہتے ہیں۔" اس نے میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ تھی۔

"مجھے مومنہ شیرازی کہتے ہیں۔" میں نے بھی مسکرا کر جواب میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"وہ تو آپ چہرے سے ہی لگ رہی ہیں۔" وہ ہنسی۔

"کیا مطلب؟" میں حیرت سے بولی۔

"میرا مطلب ہے کہ آپ چہرے سے ہی اس قدر مومن لگ رہی ہیں کہ بس۔" مجھے لگا جیسے اس نے مجھ پر طنز کیا ہو۔ میں ایک دم اداس ہوگئی۔

"آپ کو میری بات بری لگی؟"

"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔" میں جبراً مسکرا دی۔

"تو پھر آپ کوئی بات کریں' اپنے متعلق کچھ بتایئے' آپ کہاں سے آئی ہیں۔" اس نے ایک سانس میں ڈھیر سارے سوال کردیے۔

"اس وقت میرے سر میں درد ہے پھر کبھی سہی۔" میرا بات کرنے کا بالکل موڈ نہیں تھا۔

"اچھا تو پھر میں تمہارے لیے گرما گرم چائے لاتی ہوں۔" پارس آپ سے تم پر آگئی۔ یہ تھی میری پارس سے پہلی ملاقات۔

دوسرے دن پارس نے مجھے میڈیکل کالج اور ہوسٹل کے متعلق مختلف معلومات فراہم کیں۔ پارس بہت باتونی لڑکی تھی۔ اس کے خوبصورت ہونٹوں پر ہر وقت ایک مدھر سے مسکراہٹ رہتی۔ وہ خاصی ہنس مکھ بھی مگر نہ جانے کیوں ان تمام باتوں کے باوجود مجھے اکثر یوں محسوس ہوتا جیسے اس کی بڑی بڑی براؤن آنکھوں سے ہر وقت خاص قسم کی اداسی جھانکتی ہو یا پھر شاید میری اپنی ہی شخصیت کے پیش نظر یہ میرا وہم تھا۔

مجھے ہوسٹل میں آئے دو ماہ گزر گئے۔ اس دوران صرف ایک مرتبہ گھر سے منی آرڈر آیا۔ اس دوران نہ تو پارس کے گھر سے کوئی خط آیا اور نہ ہی کوئی آیا۔ ہاں البتہ ایک اچھی خاصی رقم اس کے نام آجاتی تھی۔ مجھے اس بات نے تجسس میں مبتلا کردیا۔ دن میں نے پارس سے پوچھ ہی لیا۔ میرے سوال پر ہوئی پارس کے چہرے پر ایک دم سنجیدگی چھا گئی۔ وہ سے بولی۔ "موسیٰ خدا تو ان کے گھر سے آتے ہیں والے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں حیران ہوگئی۔

"اگر تم سننا چاہتی ہو تو سنو' جو بات آج تک دل میں چھپا کر بیٹھی ہوں' آج تمہیں بتا رہی میرے پاس بے تحاشا دولت ہے' کیونکہ بہت دولت مند تھے اور میں ان کی اکلوتی اولاد ہر خوشی پوری کرکے وہ اپنا ایمان سمجھتے تھے۔ رہنے کے بعد اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "ایک حادثے میں میرے والدین کا انتقال ہوگیا اور میں اور چاچی کی سرپرستی میں آگئی۔ میری چاچی عورت تھی اس نے دولت کی خاطر میری شادی بوڑھے بھائی سے کرنا چاہی جو عمر میں میرے والد اور وہ بھی پہلے سے شادی شدہ' جب مجھے اس ہوئی تو میں اپنے وکیل کی مدد سے اس ہوسٹل میں بات ختم کرکے وہ روپڑی۔ میں نے بڑھ کر پارس لگایا۔

پارس کی کہانی سن کر میرے دل میں پارس ہمدردی پیدا ہوگئی۔ اب ہر وقت میں اور پارس اور ایک سال کے اندر میں اور پارس ایک لے لازم و ملزوم ہوگئے۔ ہم ساتھ کھانا پڑھنے' پڑھنے کے دوران میں پارس ادھار مانگتی' تبھی۔ میرے ڈانٹنے پر وہ بچوں کی طرح منہ لگتی۔

ہم دونوں صبح ایک گھنٹے تک ایکسرسائز کرتے

دوران پارس دیر تک سانس روکے رکھتی اور پارس کی سانس روکے رکھتی' اور جب میں روہانسی ہوجاتی تو وہ ہنس پڑتی۔ اس کی اس حرکت پر میں اس کی پیٹھ پر مکے برساتے کر دیتی اور وہ ڈھیٹ بنی رہتی۔ میں آپ کو پرانی چلوں کہ اچانک میرے گھر سے رقم آنا بند ہوگئی پھر میرے جو آخری منی آرڈر آیا اس میں منجھلے اور میرے کی شادی کی اطلاع درج تھی۔ مجھے ذرا بھی افسوس ہوا کیونکہ اب میں تنہا نہیں تھی میرے ساتھ پارس تھی میری زندگی اب حسین ہوگئی تھی۔ دنیا کی اس جھلسا دینے والی دھوپ میں پارس میرے لیے گھنیرا سایہ بن گئی

پارس کا وکیل پارس کے لیے ہر ماہ اچھی خاصی رقم بھیجتا جس سے پارس اپنی اور میری' ہوسٹل اور کالج کی فیس دینے کے بعد اپنے اور میرے لیے ڈھیر ساری شاپنگ بھی کرتی۔ میرے منع کرنے پر وہ یہ کہہ کر مجھے خاموش کرا دیتی کہ زندگی چار دن کی ہے اور اسے انجوائے کرنا ہر انسان کا حق ہے۔

اس طرح ہنستے مسکراتے پانچ سال بیت گئے اور ہم نے اپنی اپنی اس اچھے نمبروں سے پاس کرلیا۔ ہوسٹل چھوڑنے کے بعد چند دنوں میں اور پارس' پارس کی مری والے بنگلے پر آگئے۔ پارس نے وکیل سے اپنی جائیداد کے تمام کاغذات لے لیے' پھر ہم مزید تعلیم کے لیے لندن آگئے۔ ہوسٹل میں رہنے کے بجائے ہوسٹل میں رہنے کے ہم نے تین کمروں کا فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ تنہا رہنے کے ہم ویسے بھی عادی تھے اور ویسے بھی ہوسٹل کی زندگی کے ہم تنگ آچکے تھے۔ پارس کا خیال تھا کہ ہمیں ایک ملازمہ رکھ لینا چاہیے مگر میں نے منع کردیا۔ غیروں کا دیس تھا اور مجھے اپنوں کے لوگوں کا اعتبار نہ تھا۔

ہم نے اپنی زندگی کی ایک روٹین بنالی۔ فجر کی نماز پڑھ کر واک کرتے پھر میں ناشتا بناتی اور پارس کپڑے پریس کرتی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم یونیورسٹی چلے جاتے اور وہاں سے ہوسٹل۔ شام کو ہم قریبی پارک میں چہل قدمی کرتیں ڈوبی سڑکوں پر کافی آمد و رفت رہتی تھی اور ٹھنڈ بھی ہوتی تھی مگر میں اور پارس ان سخت ناگوار گزرتی۔ میرے منع کرنے کے باوجود ہنس روکے رکھتی' اور جب میں روہانسی ہوجاتی تو وہ ہنس پڑتی۔ اس کی اس حرکت پر میں اس کی پیٹھ پر مکے برساتے کر دیتی اور وہ ڈھیٹ بنی رہتی۔ میں آپ کو پرانی چلوں کہ اچانک میرے گھر سے رقم آنا بند ہوگئی پھر میرے جو آخری منی آرڈر آیا اس میں منجھلے اور میرے کی شادی کی اطلاع درج تھی۔ مجھے ذرا بھی افسوس ہوا کیونکہ اب میں تنہا نہیں تھی میرے ساتھ پارس تھی میری زندگی اب حسین ہوگئی تھی۔ دنیا کی اس جھلسا دینے والی دھوپ میں پارس میرے لیے گھنیرا سایہ بن گئی

ایک دن ہم ہوسپٹل میں ڈیوٹی پر تھے کہ ایک ایکسیڈنٹ کیس آیا۔ دونوں میاں بیوی کو پہچان تھے' میاں تو موقع پر ہی ہلاک ہوگیا تھا اور بیوی آپریشن تھیٹر میں خون زیادہ ضائع ہونے کی وجہ سے انتقال کرگئی۔ مجھے اور پارس کو آپریشن ناکام ہوجانے اور دو جوان اموات کا بہت افسوس ہوا۔ یہ تو شروع کے کمزور دل کی مالک تھی۔ فوراً آنسو آگئے۔ ڈاکٹر تک جو کہ ہمارے استاد تھے' انھوں نے ہمیں تسلی دی اور ساتھ ہی مرنے والی کی ماں کو بھی تسلی دینے کی ہدایت دی۔ ہم آپریشن تھیٹر سے باہر آگئے۔ سامنے ہی ایک ادھیڑ عمر دراز قد اور پروقار خاتون کھڑی تھیں۔ ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے اور ان کی آنکھوں میں لکھے سوال کو ہم نے پڑھ لیا۔ پارس نے آگے بڑھ کر ان کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"سوری میڈم جو ہنسا! ہم نے پوری کوشش کی مگر آپ کی بیٹی۔" "ابھی پارس کے جملے ادھورے تھے کہ وہ خاتون چیخ مار کر بے ہوش ہوگئیں۔ ہم ایک وارڈ بوائے کی مدد سے ان خاتون کو اپنے فلیٹ میں لے آئے۔

کافی دیر بعد انھیں ہوش آیا تو وہ روتے ہوئے میرے گلے سے لگ گئی۔ ہمارے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ مرنے والی اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ گزشتہ برس وہ اپنی بیٹی اور داماد کے ہمراہ لندن آئی تھیں۔ اب ان کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ یہ سن کر ہمیں بہت افسوس ہوا۔

میں نے اور پارس نے فیصلہ کرکے میڈم جونیسا کو اپنے ساتھ رہنے پر راضی کرلیا۔ چند دنوں میں وہ بیٹی کا غم بھول کر ہم میں گھل مل گئیں۔ اب وہ ہماری اے بن گئی تھیں۔ اے ہم دونوں کو اپنی اولاد کی طرح چاہنے لگیں اور ہم دونوں کو بھی اے سے دلی لگاؤ ہوگیا۔

دن تیزی سے گزرنے لگے' پڑھائی کے بعد ہم سارا دن اے کے ساتھ گزارتے' اے نے سارے گھر کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ سارے گھر کا کام وہ خود کرتیں' البتہ چھٹی والے روز ہم تینوں کل کر فلیٹ کی صفائی کرتے۔ اے شام کی چائے پر خاص اہتمام کرتی تھیں۔ ہم تینوں ہی اپنی خوشیوں میں مگن تھے' ہمارا چھوٹا سا فلیٹ جنت کا نمونہ بن گیا تھا۔ ہمارے لیے ہر روز روز عید کا اور ہر شب شب برات ہوتی۔ ہم ہر "تہوار" چاہے وہ عید ہو یا کرسمس' شب برات ہو یا کوئی اور خاص دن' خاص انداز میں مناتے

تھے۔

امتحان نزدیک تھے۔ اے ہمیں پڑھنے کے لیے خاص ہدایت دیتی رہتیں اور ساتھ ہی مختلف دیسی کھانے بناتیں۔ جب ہم پڑھنے بیٹھتے تو پڑھتے پڑھتے پارس کتاب بند کر کے بیٹھ جاتی۔

"کیا ہوا؟" میں گھبرا جاتی۔

"کچھ نہیں بس ذرا چکر آ رہے ہیں۔"

میں سمجھتی کہ شاید وہ پڑھنے سے اُکتانے کا بہانہ کر رہی ہے مگر اسے پریشان ہو جاتیں اور ڈھیر سارا تیل میرے اور پارس کے سر میں ڈالتیں۔ مجھے تو مزا آتا اور میں جانتی تھی کہ پارس تیل سے الرجک ہے لہٰذا میں اسے کو اکسانا کہ پارس کو چکر آ رہے ہیں اور اسے زیادہ تیل کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اسے ڈھیر سارا تیل پارس کے سر میں ڈال دیتیں' پارس قہر آلود نظروں سے مجھے گھورتی' ادھر اسے ہاتھ روکتیں اُدھر پارس مجھے مارنے کو دوڑتی۔

اس دن میں پریکٹیکل میں مصروف تھی کہ پارس میرے پاس آ کر کہنے لگی کہ میرے سر میں درد ہے میں گھر جا رہی ہوں۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ میں فارغ ہو کر آجاؤں گی۔" میں یہ کہہ کر دوبارہ مصروف ہو گئی۔

پریکٹیکل ختم ہوتے ہوتے تین بج گئے۔ میں گھر آئی تو اے بچن میں تھیں۔ میں آتے ہی حسب معمول اسے سے لپٹ گئی۔ اے نے مجھے پیار کیا اور کہا کہ جا کر ہاتھ منہ دھو لو میں کھانا لگاتی ہوں۔

"آپ لوگوں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا؟" میں نے کتابیں میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"تم لوگوں کے بغیر میں نے پہلے کبھی کھایا ہے؟ پارس بھی ابھی ابھی آئی ہے' مکھل کر رہی ہے۔"

"کیا پارس ابھی آئی ہے؟" اے کی بات سن کر میں حیران تھی کیونکہ پارس صبح نکلی تھی اور اب پہنچی ہے۔ بظاہر تو میں خاموش ہو گئی مگر ذہنی طور پر میں بہت اپ سیٹ ہو گئی تھی۔ میں اپنے کمرے میں آ گرلیٹ گئی اور یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ پارس اتنی دیر کہاں تھی کیونکہ اس سے پہلے دو مرتبہ وہ سردرد کا بہانہ کر کے یونیورسٹی سے آگئی تھی۔ میں سوچتے سوچتے سو گئی۔ اے سونے میں بھی کسی کو نہیں جگاتی تھیں اس لیے انھوں نے مجھے بھی نہیں جگایا۔

شام کو پارس اور اے نے مجھے اٹھایا۔ وہ دونوں بہت خوش تھیں۔

"یہ لو کپڑے' اور جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" پارس نے کپڑے مجھے دیتے ہوئے کہا۔ یہ نیا جوڑا تھا اور مجھے خوبصورت اور قیمتی تھا۔

"کیوں کوئی خاص بات ہے؟" میں حیران تھی۔

"سوال جواب کی کوئی ضرورت نہیں' چلو اٹھو۔" پارس اور اے زبردستی مجھے ہاتھ روم تک لے آئے۔ کچھ دیر بعد جب میں فریش ہو کر کمرے سے باہر آئی تو میز مختلف کھانوں سے سجی ہوئی تھی۔ اور درمیان میں ایک خوبصورت سا کیک رکھا تھا۔

پارس اور اے نے تالیاں بجا کر میرا استقبال کیا۔ مجھے یاد آیا کہ آج میری سالگرہ ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کیک کاٹا۔ پارس اور اے نے خوبصورت لفظوں کے ساتھ دعائیں دیں۔ ہم نے خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا۔ میں دن والی باتیں بالکل بھول چکی تھی۔ کافی پینے کے بعد ہم نے باہر جانے کا پروگرام بنایا۔ اے ناراض ہو گئیں۔

"نہیں بالکل نہیں' باہر بہت سردی ہے اور بارش بھی ہو رہی ہے۔" اے نے کھڑکی کے پردے اٹھاتے ہوئے کہا۔

گرم ہم دونوں اے کو اوور کوٹ پہنا کر اپنے ساتھ لے آئے۔ برف باری کافی تیز ہو گئی۔ اے کو تو ہوا کے جھونکوں نے خوفزدہ کیا تھا۔ میں نے سیاہ کوٹ کے کالر کھڑے کر کے گردن کو چھپایا اور اوور سے مظہر کو پہنا لیا۔ ہم لوگ ہائیڈ پارک کے کونے میں رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"نہیں نہ تم لوگوں سے کہا تھا کہ موسم خاصا سرد ہے تم لوگ کسی کی سنو تب نا۔" اے ہم دونوں پر خفا ہوتے ہوئے بولیں۔

پارس نے تھرماس سے کافی نکال کر اے کو دے کر خاموش کرا دیا۔

"میرے خیال میں ہمیں اسٹور چل کر کچھ شاپنگ کرنا چاہیے۔" پارس نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے خریداری کی بس اب گھر چلو۔" اے کے ڈانٹنے پر پارس خاموش ہو گئی۔

جیسے ہی کھڑے ہوئے' پارس چکرا کر گر گئی۔ میں اور اے گھبرا کر پارس پر جھک گئے۔ وہاں موجود کچھ لوگوں کی مدد سے ہم پارس کو ہوسپٹل لے گئے۔

ڈاکٹر نے پارس کو انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں داخل کر لیا۔ دو گھنٹے بعد پارس کو ہوش آیا تو میں نے بڑھ کر پارس کی پیشانی چوم لی۔

اے اور پارس کے پاس بٹھا کر میں ڈاکٹر کے کمرے میں گئی۔ ڈاکٹر جمیل الدین نے جن کا تعلق اٹلی سے تھا' مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"ڈاکٹر صاحب' کوئی پریشانی کی تو بات نہیں ہے؟" میں نے پہلا سوال کیا۔

"مومنہ شیرازی! پارس سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟" ڈاکٹر جمیل پارس کی رپورٹیں سامنے رکھتے ہوئے بولے۔

"ڈاکٹر! میرا پارس سے وہ رشتہ ہے جس کے سامنے کائنات کی ہر شے بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ میرے لیے پارس ہی سب کچھ ہے۔" اور اس کے لیے میں۔"

میری باتیں سن کر ڈاکٹر جمیل خاموش ہو گئے۔

"پلیز ڈاکٹر! میرے صبر کا مزید امتحان نہ لیں' اور سب کچھ کھل کر بتا دیں۔" میں پریشانی سے بولی۔

"مومنہ شیرازی مجھے افسوس ہے کہ آپ کی پارس سے جو رشتہ ہے وہ اور بھی آخری اسٹیج پر اور شاید ان دو تین دنوں میں پارس اس دنیا میں نہ رہے۔"

ڈاکٹر کے الفاظ میرے لیے بم کا دھماکا تھے۔ کاش یہ زمین پھٹ جاتی اور میں پارس سے قبل اس میں سما جاتی۔ میں کرسی پر گر گئی۔ کافی دیر تک میں خود کو یقین دلاتی رہی کہ ڈاکٹر نے مذاق کا کوئی رشتہ نہیں اور یہ سب حقیقت ہے۔ میں خاموشی سے وارڈ میں آ گئی۔ خود کو سنبھالنا میرے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا۔

"مومنہ! کیا کہا ڈاکٹر نے؟" اے نے پریشانی سے پوچھا۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ ہماری پارس چند دنوں میں بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔" میں نے ضبط سے جواب دیا۔ یہ بتاتے ہوئے میں نے اے کی کوشش بھی کی تھی۔ یہ سب مجھے کسی ظلم کا لگ رہا تھا اور یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب حقیقت ہو سکتا ہے۔

"مومی' تم جھوٹ بولتے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔" پارس نے شاکی نگاہوں سے مجھے دیکھ کر کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے گھبرا کر پارس کی جانب دیکھا۔

"مطلب یہ کہ میں تو بالکل ٹھیک ہوں' دو تین دن کیوں؟ چلو گھر چلو۔" پارس بیڈ سے اتر کر بولی۔

ڈاکٹر کے منع کرنے کے باوجود پارس گھر آ گئی۔ دوسرے دن میں نے پارس کی رپورٹیں مختلف ڈاکٹروں کو دکھائیں' مگر ہر طرف سے مایوسی ہوئی۔ میں نے گھر آ کر اے کو پارس کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ اے تو بالکل نوٹ پوٹ گئیں۔

میں ہر نماز میں پارس کے لیے دیر تک دعائیں مانگتی' اور اے روزانہ چرچ جا کر خدا اور یسوع مسیح سے پارس کی زندگی کی بھیک مانگتی تھیں۔ ہم روزانہ پارس کو پارک لے جاتے اور واپسی پر اے چرچ چلی جاتیں اور ہم چرچ کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے۔

اس دن بھی میں اور پارس چرچ کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے' سرد ہوائیں تیز چل رہی تھیں۔ میں خاموشی سے آنے جانے والے لوگوں کو دیکھ رہی تھی کہ اچانک پارس کی آواز سے میں چونک اٹھی۔

"مومی میں جانتی ہوں کہ مجھے کینسر ہے' اور میری زندگی کتنی بھی وقت میرا ساتھ چھوڑنے گی۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے بعد تم دوبارہ پہلے والی مومنہ بن جاؤ اگر تم نے ایسا کیا تو مومی میری روح ہمیشہ بے چین رہے گی۔"

"مگر تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟" میں آنکھیں پھاڑے پارس کو دیکھنے لگی۔ وہ ذرا بھی پریشان نہ تھی بلکہ عجیب طرح کا سکون تھا اس کے چہرے پر۔

"مجھے تو یہ سب کچھ پانچ سال قبل معلوم ہوا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر نے مجھے آپریشن کا مشورہ دیا تھا' مگر میرے دل میں اس وقت جینے کی کوئی آرزو نہیں تھی لیکن مومی تمہارے ملنے کے بعد میں زندہ رہنا چاہتی تھی اس لیے میں نے لندن آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہاں آ کر میں اپنا علاج کروانا چاہتی تھی' مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ تمہیں یاد ہے مامومی اس دن میں پریکٹیکل چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اس دن کی دماغ کے ڈاکٹر ڈیوڈ سے علاج کے سلسلے میں ملنے گئی تھی مگر انھوں نے بھی مایوسی ظاہر کی۔"

یہ کہہ کر پارس خاموش ہو گئی۔ میری آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔

اس رات ہم تینوں بے چین تھے، ہماری آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ اس رات بے قراری تیز تھی۔ پارس میرے پاس سے اٹھ کر اسے کے پہلو میں لیٹ گئی۔ میں بھی بیڈ سے اتر کر اسے کی دائیں جانب آگئی۔ اسے نے ہم دونوں کو بازوؤں میں چھپالیا۔ اسے کی آنکھوں سے آنسو گر کر میرے بالوں میں جذب ہوتے رہے۔ ہم تینوں پر گہری خاموشی طاری تھی۔ ایک ہولناک سکوت تھا جس نے ہمیں اپنے حصار میں قید کرلیا تھا پھر جانے کب ہم تینوں ہی سو گئے، نہ معلوم کیسے۔ حالانکہ موت کی چاپ بڑی گہری تھی پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ رات کے تین بج رہے تھے، کمرے میں اندھیرا تھا، میں نے پارس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا، پارس کی پیشانی گیلی تھی۔

اتنی سردی میں پسینہ؟ میں نے گھبرا کر بیڈ کے کنارے رکھے لیمپ کو آن کردیا۔ جس سے اسے کی آنکھ کھل گئی۔ پارس پر نظر پڑتے ہی میری چیخ نکل گئی۔ پارس کا چہرہ خون آلود تھا۔ منہ ٹیڑھا اور ہاتھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے شرائین پھٹ چکی تھیں۔ اسے نے فون کرکے ایمبولینس منگوالی۔ ابھی پارس میں کچھ سانسیں باقی تھیں۔ ڈاکٹرز اس کو آپریشن تھیٹر لے گئے۔ میں فوراً خدا کے حضور سربسجود ہوگئی۔ اے یسوع مسیح کے سامنے آنکھیں بند کرکے کھڑی ہوگئیں۔

جب میری پارس آپریشن تھیٹر سے باہر آئی تو وہ ہمیشہ کے لیے سوچکی تھی۔ اسے صدمے سے بے ہوش ہوگئیں، مجھے خود کو نہ ہوش تھا کہ میں اسے کو سنبھالتی۔ پارس کی موت میری موت تھی۔ میری کائنات مجھ سے روٹھ گئی تھی۔ میں پھر ادھوری ہوگئی تھی۔

پارس کی تدفین پر یونیورسٹی کے تمام ڈاکٹروں اور طالب علموں نے شرکت کی۔ اسے کو دو دن بعد ہوش آیا۔ ڈاکٹر کے مطابق اسے کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ آیندہ کے لیے احتیاط کی ضرورت تھی۔ مجھے اسے کی خاطر خود کو سنبھالنا پڑا۔

پورے گھر میں خاموشی چھاگئی۔ کوئی ایسا دن نہ گزرتا جب ہم دونوں پارس کی یاد میں اشکبار نہ ہوئے ہوں۔ وہ ہنسنے والی لڑکی ہمیں بری طرح رلا کر گئی تھی۔ پارس کی موت نے زندگی کی امنگ ہی چھین لی تھی۔ میں اس قدر نڈھال تھی کہ امتحان بھی نہ دے سکی، پھر میں نے اور اسے نے یہ جگہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا، جہاں ہر وقت پارس کی یاد ستاتی تھی۔ اس کی ہنسی ہمیں پل پل رلاتی تھی، جس کی یاد ہمیں پاگل کردیتی تھی۔ وہ گھر چھوڑ کر جانے سے قبل میں اور اسے ہائیڈ پارک کے بیچ پر بیٹھ گئے۔ برف باری ہونے لگی۔ ہم دونوں خاموش تھے پھر ہم آہستہ آہستہ چرچ کی جانب جانے والی سڑک پر لوگوں کی آمد و رفت بدستور جاری تھی۔ سردی سے بچنے کے لیے میں نے اپنے لیے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال دیے۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ وہی دنیا، وہی رنگینی مگر میری زندگی میں ہر شے بے معنی تھی۔ اسے اوپر چرچ چلی گئیں، میں اٹھی سڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ میں نے اپنے برابر والی خالی جگہ پر حسرت بھری نگاہ ڈالی۔ میری آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔ ابھی کچھ روز پہلے ہی تو پارس مجھ سے اسی جگہ پر باتیں کررہی تھی اور اب وہ مجھ سے اس قدر دور چلی گئی تھی میں چاہنے کے باوجود اس کے پاس نہیں جاسکتی تھی۔

"اف میرے خدا! دنیا میں کیوں کسی کو موت آتی ہے، مجھے پارس کی یاد نہ آئے۔" میں روتے روتے اٹھی۔ چرچ کی گھنٹی کی آواز سے میں چونک پڑی۔ میں چرچ سے باہر آرہے تھے۔ میں چرچ کی سیڑھیاں چڑھ کر اسے کو سہارا دے کر نیچے لے آئی، کیونکہ اب اسے بوڑھی ہوچلی تھیں۔ ان سے زیادہ چلا بھی نہ جاتا تھا۔ پارس انھیں ایک دم بوڑھا کرگئی تھی۔

دوسرے دن ہم پاکستان آگئے۔ یہاں میں نے اسے کے ساتھ پارس کے ایبٹ آباد والے بنگلے میں رہائش اختیار کرلی۔ پارس کے وکیل کو جب میری آمد کی اطلاع ملی تو پارس کی جایداد کے تمام کاغذات میرے پاس لے آئے۔ میں پارس کے دستخط تھے۔ اس نے وصیت لکھ دی تھی کہ اس کی تمام جایداد میرے نام کردی گئی۔ میں نے جایداد کا ایک حصہ یتیم خانے کے نام کردیا اور کچھ حصے سے پارس کی ہو بہو تصویر بنوائی۔ اس ہو بہو پینٹنگ کے لیے میں نے شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹر بلوائے۔ یہاں آئے ہوئے مجھے دو سال بیت گئے تھے۔ مجھے اپنی بوکی یاد ستانے لگی۔ میں اسے کے ساتھ کراچی آگئی۔

میں نے پورے دس سال بعد شیرازی ہاؤس میں قدم رکھا تھا۔ مالی بابا سے پتا چلا کہ ابو بہت بیمار ہیں۔ میں ان کے کمرے کی جانب جانے لگی۔ سایہ سے آنٹی آئی کو دیکھ کر میرے قدم رک گئے۔ میں نے آنٹی کو گلے لگا لیا۔

"خیر خیر! جو میرے قریب آئیں۔ اپنا منحوس سایہ لے کر یہاں کیوں آئی ہو۔ یادوں کے ساتھ گھوم پھر کر دل بھر گیا تمھارا۔" امی کی جلی کٹی باتیں سن کر میرے آنسو نکل آئے۔

"امی جان خدا کے لیے مجھے صرف ایک مرتبہ ابو جان کو دیکھ لینے دیں۔" میں نے گڑگڑا کر التجا کی۔

"میں کہتی ہوں، دفع ہوجاؤ یہاں سے، یہ شریفوں کا گھر ہے۔"

"کیا ہوا امی، کون ہے یہ؟" نبیل امی کی تیز آواز سن کر باہر آگیا۔ بھائی کو دیکھ کر میں مزید بے چین ہوگئی۔

"کچھ نہیں بیٹے، تمھاری جایداد کی ایک اور حصے دار آئی ہے۔" امی نے مجھے قہر آلود انداز میں گھورکر کہا۔

"کچھ خدا کا خوف کرو۔ بنی اتنے عرصے کے بعد ملنے آئی ہے، اور آپ لوگ اس طرح کا سلوک کررہے ہیں۔" اسے ہو کر کافی دیر سے خاموش کھڑی تھیں بول اٹھیں۔

"خاموش بوڑھیا! اس کو لے کر چلی جاؤ۔" نبیل غصے سے دھاڑا۔

میں اسے کا ہاتھ پکڑ کر ایبٹ آباد والٹ آئی۔ کئی راتیں میں روتے روتے گزارتا رہا۔ ایک صبح میری آنکھ دیر سے کھلی۔ میں جائے کے کمرے میں آگئی۔ خلاف توقع اسے کو سوتا دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ "اسے اٹھ کر چائے پی لیں۔" میں نے کل جاتا کہ کاش مجھ سے اسے کے گھر میں اسے ہمیشہ کے لیے خاموش ہوچکی تھیں۔ مجھے یقین نہ آیا، میں نے اسے کا چیک اپ کیا۔ وہ جانے رات کے کسی پہر دل کا دورہ پڑنے سے مرچکی تھیں۔

ایک مرتبہ پھر میری کائنات لٹ گئی۔ میں بھری دنیا میں بھرے تنہا ہوگئی۔

اسے کی تدفین پر میں بالکل پتھر ہوچکی تھی، چاہنے کے باوجود میرے آنسو نہ نکلے، یا پھر شاید میرے آنسو ختم ہوگئے تھے۔ میرے تنہا وجود شب جنہیں پہلے اسے کا کندھا سہارا دیا ہوتا تھا، بھی کم پڑگئے۔ مجھے میں پہلے والی موسنہ لوٹ آئی۔

میں نے خود کو بہت سمجھایا۔ ایک دن کسی جاننے والے سے ابو کی موت کی خبر ملی۔ میرا دل تڑپ کر رہ گیا۔ مالی بابا سے پتا چلا کہ ابو بہت بیمار ہیں۔ میں ان کے کمرے کی جانب جانے لگی۔ سایہ سے آنٹی آئی کو دیکھ کر میرے قدم رک گئے۔ میں نے آنٹی کو گلے لگا لیا۔

"خیر خیر! جو میرے قریب آئیں۔ اپنا منحوس سایہ لے کر یہاں کیوں آئی ہو۔ یادوں کے ساتھ گھوم پھر کر دل بھر گیا تمھارا۔" امی کی جلی کٹی باتیں سن کر میرے آنسو نکل آئے۔

"امی جان خدا کے لیے مجھے صرف ایک مرتبہ ابو جان کو دیکھ لینے دیں۔" میں نے گڑگڑا کر التجا کی۔

"میں کہتی ہوں، دفع ہوجاؤ یہاں سے، یہ شریفوں کا گھر ہے۔"

"کیا ہوا امی، کون ہے یہ؟" نبیل امی کی تیز آواز سن کر باہر آگیا۔ بھائی کو دیکھ کر میں مزید بے چین ہوگئی۔

"کچھ نہیں بیٹے، تمھاری جایداد کی ایک اور حصے دار آئی ہے۔" امی نے مجھے قہر آلود انداز میں گھورکر کہا۔

"کچھ خدا کا خوف کرو۔ بنی اتنے عرصے کے بعد ملنے آئی ہے، اور آپ لوگ اس طرح کا سلوک کررہے ہیں۔" اسے ہو کر کافی دیر سے خاموش کھڑی تھیں بول اٹھیں۔

"خاموش بوڑھیا! اس کو لے کر چلی جاؤ۔" نبیل غصے سے دھاڑا۔

میں اسے کا ہاتھ پکڑ کر ایبٹ آباد والٹ آئی۔ کئی راتیں میں روتے روتے گزارتا رہا۔ ایک صبح میری آنکھ دیر سے کھلی۔ میں جائے کے کمرے میں آگئی۔ خلاف توقع اسے کو سوتا دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ "اسے اٹھ کر چائے پی لیں۔" میں نے کل جاتا کہ کاش مجھ سے اسے کے گھر میں اسے ہمیشہ کے لیے خاموش ہوچکی تھیں۔ مجھے یقین نہ آیا، میں نے اسے کا چیک اپ کیا۔ وہ جانے رات کے کسی پہر دل کا دورہ پڑنے سے مرچکی تھیں۔

ایک مرتبہ پھر میری کائنات لٹ گئی۔ میں بھری دنیا میں بھرے تنہا ہوگئی۔

اسے کی تدفین پر میں بالکل پتھر ہوچکی تھی، چاہنے کے باوجود میرے آنسو نہ نکلے، یا پھر شاید میرے آنسو ختم ہوگئے تھے۔ میرے تنہا وجود شب جنہیں پہلے اسے کا کندھا سہارا دیا ہوتا تھا، بھی کم پڑگئے۔ مجھ میں پہلے والی موسنہ لوٹ آئی۔

میں نے خود کو بہت سمجھایا۔ ایک دن کسی جاننے والے سے ابو کی موت کی خبر ملی۔ میرا دل تڑپ کر رہ گیا۔ مالی بابا سے پتا چلا کہ ابو بہت بیمار ہیں۔ میں ان کے کمرے کی جانب جانے لگی۔ سایہ سے آنٹی آئی کو دیکھ کر میرے قدم رک گئے۔ میں نے آنٹی کو گلے لگا لیا۔

مگر پھر بھی وہ میرے باپ تھے۔ میرے لیے اتنا کافی تھا کہ مجھے دنیا میں رہنے کے لیے ان کی شناخت حاصل تھی۔

میں دل سے مجبور ہو کر ایک مرتبہ پھر شیرازی ہاؤس چلی گئی۔ مالی بابا نے مجھے دیکھتے ہی روتے ہوئے بتایا کہ ابو جان کے مرنے کے بعد نبیل نے بیوی کے کہنے پر امی کو گھر سے نکال دیا۔ صدمے سے امی پر فالج گر گیا ہے اور آبگل سروسٹ کوارٹرز میں مالی بابا کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ یہ سن کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں ان کے ساتھ سروسٹ کوارٹرز میں آگئی۔

امی چارپائی پر لیٹی تھیں۔ ان کے ہاتھ پیر مڑے ہوئے تھے۔ چہلا ہونٹ ٹیڑھا ہوگیا تھا اور آنکھ بھی خراب ہوگئی تھی۔ میں نے سلام کیا اور ان کے پاس بیٹھ گئی۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بس یہ ایک ایسا لمحہ تھا جس نے مجھے تڑپا دیا۔ میں بڑھ کر امی کے گلے لگ گئی۔ اسی دن میں امی کو لے کر ایبٹ آباد آگئی۔

ان کے لیے کمرا میں نے اپنے ہاتھوں سے سجایا۔ ان کا علاج فالج کے ایک اچھے ڈاکٹر سے کروایا۔ اسپتال سے فارغ ہو کر میں سارا وقت امی کے ساتھ گزارتی ہوں۔ اب وہ میرے ساتھ ہیں۔ مجھے ان کی خدمت سے سکون ملتا ہے۔ امی سے بولا نہیں جاتا مگر مجھے دیکھ کر ان کی آنکھیں تشکر کے جذبے سے بھر جاتی ہیں۔

لوگ مجھے تنہا سمجھ کر ہمدردی کرتے ہیں، مگر میں تنہا کب ہوں۔ امی سے فارغ ہو کر ہر رات کو میں اسے کے کمرے میں آکر یسوع مسیح کے سامنے رکھی ہوئی موم بتی روشن کرتی ہوں۔ یہاں اسے سے کچھ دیر باتیں کرکے میں اپنے کمرے میں آکر پارس کی تصویر کے سامنے بیٹھ جاتی ہوں، اور سارا دن ان کی باتیں پارس کو سناتی ہوں۔

میں تنہا نہیں ہوں۔ میرے پاس اسے اور میری پارس کی یادیں ہیں اور میں بے حد خوش ہوں اسے اور پارس کی خوشبو ہر لمحہ میرے اردگرد رہتی ہے۔ وہ وقت میرے لیے بڑا خوبصورت وقت ہوتا ہے جب ہم تینوں ہوتے ہیں اور میں اپنی سانگرہ کا ایک کاٹ کر پارس اور اسے کی دعائیں لیتی ہوں۔ پھر اسی روز ہم ہائیڈ پارک بہت یاد آتا ہے اور میں بے اختیار رونے لگتی ہوں۔

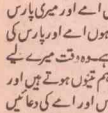

دوسری کہانی

وہ جھوٹ جس کا سہارا لے بنا جینا بہت دشوار ہو جاتا ہے

بیچ کڑوا تو ہوتا ہے مگر جب جذبوں کی بنیاد بیج پر رکھی جائے تو بیج میٹھا ہو جاتا ہے

ایک ایسا ہی بیج جو صرف ایک شخص کو میٹھا لگا، شاید آپ کو کڑوا لگے

فرحت صدیقی

میٹھا بیج

رابعہ آنٹی ہمارے محلے میں کیا آئیں، بہار سی آگئی۔ ہر دم ہنستی مسکراتی، دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونے والی، ہر خوشی میں خوش ہونے والی۔ سارے محلے کے دکھ سکھ میں شریک یقیناً پُرپروی گلی کی کایا پلٹ گئی۔ ہر گھر کے سامنے ڈسٹ بن والا کوڑا دان موجود۔ ہر دروازے کے سامنے سرسبز گملے۔ پوری گلی صاف ستھری۔ ہر بچہ جو گلی کا کاغذ اٹھا کر کوڑے دان میں ڈالتا تھا رابعہ آنٹی سے شاباش کا حق دار ہوتا تھا۔ گرمیوں کی دوپہر میں جو بچے گلی میں گلی ڈنڈا یا کرکٹ کھیل رہے ہوتے تھے وہ رابعہ آنٹی کے برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھے لڈو کھیلتے نظر آتے یا پھر ہوم ورک کرتے۔ شام کو صحن میں چھڑکاؤ کر کے چارپائیوں پر سفید چادروں پر محلے کی بچیاں دھاگہ فریم لے کر بیٹھی ان سے کڑھائی سلائی سیکھ رہی ہوتیں۔ ہر جمعرات کو محلے کے سارے بچے اور بچیاں ان کے صحن میں جمع ہوتے۔ ایک گھنٹہ بچے نعت خوانی کرتے۔ قل شریف کی تسبیح کرتے، جو بچے قرآن پاک کا ورس لے رہے ہوتے وہ سپارہ پڑھتے۔ مغرب کی نماز سب وہاں پڑھتے پھر رابعہ آنٹی کے ہاتھ کا بنایا ہوا مزے دار حلوہ نان کے ساتھ مزے مزے سے کھایا جاتا۔

خواتین فارغ وقت میں اچار، مربے، چٹنی اور مختلف پکوان کی ترکیبیں پوچھا کرتیں۔ ان کے گھر میں ایک دوکان اور میکہ تھا۔ میری امی جان سے رابعہ آنٹی کی خاص دوستی تھی۔ ہر بات ان سے کر لیا کرتی تھیں۔ کوئی عزیز رشتہ دار نہیں تھا۔ میاں سعودیہ میں ہوتے تھے۔ دو بیٹیاں تھیں ایک کالج میں پڑھ رہی تھی اور دوسری ابھی بہت چھوٹی تھی۔ آٹھ نو سال کی معصوم سی، بھولی بھالی۔ ہر دم امی والدہ کی طرح ہنستی مسکراتی رہتی، مگر بڑی بیٹی آمنہ اتنی ہی سنجیدہ اور خاموش طبع تھی۔ چپ چاپ گم سم، دو سال کے عرصے اسے کبھی بھی مسکراتے نہیں دیکھا تھا۔ گھر کے کام کاج میں مصروف رہتا یا پھر اپنی پڑھائی میں مشغول رہتا۔ اس کا کام تھا۔

رابعہ آنٹی کو جب کبھی باہر کے کام کی ضرورت پڑتی تو مجھے آواز دے لیتیں، ہمسائی تھیں، میں فوراً حاضر ہو جاتا۔ مجھے پتا نہیں کیوں ان کے کام کر کے خوشی محسوس ہوتی تھی۔ کچھ لوگ دنیا میں ایسے ہوتے ہیں جو صرف دوسروں کے لیے زندہ رہتے ہیں۔ ان کی ساری خوشیاں دوسرے لوگوں کی خوشیوں سے وابستہ ہوتی ہیں۔ رابعہ آنٹی بھی ان میں سے ایک تھیں۔ ہر ماہ بینک سے خرچ کی رقم لے

اس میں سے بھی ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرتی رہتیں۔ اکثر میرے ساتھ ہی بینک جایا کرتی تھیں۔

سکالرشپ مجھ ملا، اور خوشی رابعہ آنٹی کو ہو رہی تھی۔ وہاں میں اپنے ہاتھ سے پکا کر گاجر کا حلوہ بانٹیں انھیں اداسی اشیا بالکل اچھی نہیں لگتی تھیں۔ بچوں سے ان کو بے تحاشا ہی پیار تھا۔ ان کی گڑیا بھی سب کو پیاری تھی۔ اللہ خوبصورت آواز میں جب نعت پڑھتی تو اس کے گلے کی مدھر اور اونچی آواز ہمارے گھر تک آتی۔ میں نے اکثر ہی ان سے پوچھا کہ گڑیا کے ابو سعودیہ سے کیوں نہیں آتے؟ ان کا جواب مجھے کبھی مطمئن نہیں کرتا تھا کہ انھیں چھٹیاں نہیں ملتیں۔ ان کا کام ہی ایسا ہے۔

اب تو رابعہ آنٹی کو ہمارے محلے میں آئے ہوئے بھی چار سال ہو گئے تھے۔ وہی محلہ جو ان کی عظمت کے گن گایا کرتا تھا۔ اب وہاں چپکے چپکے سرگوشیوں میں باتیں ہونے لگیں۔ اس معاشرے میں جوان عورت کا بچیوں کے ساتھ اکیلا رہنا بھی بہت بڑی آزمائش ہے۔ سعودیہ سے انکوان کے میاں کے خط آتے رہتے، مگر خود وہ کبھی ایک چکر بھی نہیں آئے۔ سب کا خیال تھا کہ ان کے میاں نے وہاں دوسری شادی کر رکھی ہے۔ بچیوں کی وجہ سے خط وغیرہ لکھ دیتے ہیں ورنہ ضرور آتے۔ ابا جان نے رابعہ آنٹی کو اس بنا لیا تھا۔ ان کے رعب اور دبدبے سے کوئی کھل کر بات نہیں کرتا تھا۔ امی نے بھی اس بات کا یقین نہیں کیا، وہ لوگ کرتے تھے اور مجھے ہیشہ سمجھاتیں۔

"بیٹا دنیا ہمیشہ دکھ دے کر خوش ہوتی ہے۔ غلط اور ناجائز باتیں کرتی ہے۔ تو ہمیشہ آنٹی کا خیال رکھنا اور اگر کبھی کوئی بات بھی کرے تو منہ توڑ جواب دینا۔ سچ ہر حال میں سچ ہے۔"

"ایک دن کالج سے واپسی پر میں نے آمنہ کو دیکھا، جو ہاتھ میں لمبی بس سٹاپ پر کھڑی تھی۔ دو تین لوفر سے لڑکے اس کے ارد گرد کھڑے آوازیں کس رہے تھے۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے بائیک روک دی اور آمنہ کے پاس جا کھڑا ہوا۔ مجھے دیکھ کر وہ لڑکے کھسک گئے۔ میں نے کہا۔

"چلیے میں آپ کو چھوڑ دوں۔" مگر وہ نہ مانی۔ اتنے میں اس کا بھائی اور وہ بس میں سوار ہو گئی۔ گھر آکر میں نے امی جان سے اس بات کا ذکر کیا تو انھوں نے جواب دیا۔

"بیٹا اس نے اچھا کیا جو تمھارے ساتھ نہیں آئی۔ ورنہ محلے والے ہزاروں باتیں بنا لیتے۔ بہرحال آتے جاتے تم اس کا خیال رکھا کرو۔"

میں نے ایم اے فرسٹ ڈویژن میں کر لیا تو مجھے فوراً بینک میں جاب مل گئی۔ امی جان رابعہ آنٹی کے ساتھ ہی کر میرے لیے لڑکیاں دیکھ رہی تھیں۔ ان کا لڑکیاں دیکھنے کا انداز ہی الگ تھا۔ رابعہ آنٹی محفل میلاد کر کے لڑکیوں کو ان کی ماؤں سمیت بلا لیتیں اور امی جان دیکھ لیتیں۔ بات بڑھتی اور پھر کبھی حق مہر اور کبھی شرائط پر آکر ٹوٹ جاتی۔ آمنہ بی۔اے کر کے محلے ہی کے ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کر رہی تھی۔ رابعہ آنٹی امی کو حوصلہ دیتیں کہ آج کا زمانہ ہی ایسا ہے۔ لڑکی والے بھی اپنی پسند کی بہو اور حق مہر چاہتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ سادگی سے سارے کام کرنے چاہیں مگر رابعہ آنٹی کے کہنے سے کیا ہوتا تھا۔ امی جان اپنی کوشش سے آمنہ کا رشتہ بھی کروانا چاہ رہی تھیں مگر کہیں بھی بات نہیں بن رہی۔ رابعہ آنٹی اس بارے میں بہت پریشان تھیں۔ ان کے میاں کے خطوط بھی اب بہت کم آتے تھے۔ جب بھی خط آتا۔ ان کے چہرے پر ایک خوشی ہوتی۔ وہ فوراً "امی جان کو بتاتیں کہ آمنہ کے ابو کا خط آیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ تم آمنہ کا رشتہ طے کر دو۔ میں اس کی شادی پر اکٹھی چھٹی لے کر آؤں گا۔ بہت ساری حسرتیں دبیے بن کر ان کی آنکھوں میں جگمگاتی تھیں۔ شاید ایک آس تھی جس کے آسرے پر وہ زندہ تھیں۔

عید کی آمد آمد تھی۔ رمضان کے آخری دنوں میں پوری پوری رات بچیاں مل کر رابعہ آنٹی کے گھر عبادت کرتیں۔ طاق کی راتیں بہت مقدس اور چہکدار ہوتیں۔ ستائیسویں شب کو پوری رات مسجد میں ہم سب لوگ جاگ کر گزارتے اور روزہ رکھ کر فجر پڑھ کر گھر لوٹ آتے۔ اس رات سحری سب کے گھروں سے آتی تھی۔ میرے لیے سحری ہیشہ رابعہ آنٹی بھجوایا کرتی تھیں۔ اس روز سحری کے بعد کچھ دیر کو لیٹ گیا تو نیند سی آنے لگی۔ اپنے نام پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ ابا جان، امی جان سے کہہ رہے تھے۔ "ادھر ادھر بہت لڑکیاں دیکھ لیں تم نے اب آمنہ کا رشتہ جا کر مانگ لو۔ کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔"

امی جان کچھ لمحے چپ کی چپ رہ گئیں پھر کہنے لگیں۔

"کیا رابعہ رشتہ دے گی؟۔۔۔ ذات الگ ہے۔۔؟"

"یہ تم کیسی باتیں کرتی ہو؟ کیا کمی ہے ہمارے رضا میں؟ رابعہ مجھے بہن کی طرح عزیز ہے۔ اس کی یہ پریشانی میری ہے۔ تم بات کرو۔ مجھے یقین ہے کہ رابعہ انکار نہیں کرے گی۔" ابا جان نے کہا۔

"ٹھیک ہے عید کے دن بات کروں گی۔"

پتا نہیں مجھے کیوں خوشی ہوئی' اک انجانی سی راحت۔ شاید دل کے کسی کونے میں آمنہ تھی مگر اظہار نہیں تھا۔ اتنے سالوں میں کبھی اس سے زیادہ بات نہیں ہوئی۔ میرے خیال میں امی ابو کی سوچ میرے لیے بہتر تھی۔ میں نے دل ہی دل میں اپنی بہتری کے لیے ڈھیروں دعائیں مانگیں۔ حیرت اس بات پر تھی کہ الگ الگ ہم دونوں کے رشتوں کے لیے بھاگ دوڑ ہو رہی تھی مگر اس طرف کسی کا بھی دھیان نہیں گیا تھا۔

عید آئی' میرے لیے ڈھیروں خوشیاں لے کر' رابعہ آنٹی نے میرا پیام قبول کر لیا تھا۔ امی بہت خوش تھے۔ امی جان نے رابعہ آنٹی کی خواہش کے مطابق سادگی سے منگنی کی رسم ادا کر دی۔ پورے محلے نے شرکت کی' خاص طور پر بچوں کے' بقول رابعہ آنٹی کے یہ بچے فرشتے ہوتے ہیں' کسی کو دکھ نہیں دیتے۔ ہر خوشی میں خوش ہوتے ہیں۔ لوگوں نے ڈھیروں باتیں بھی بنائیں میری اور آمنہ کے بارے میں۔ ویسے بھی دنیا والوں کا طریقہ یہ ہے۔ کسی کو خوش نہیں دیکھ سکتے۔ فضول اور غلط باتیں' بےسُر غلط لوگ ہی پھیلاتے ہیں' جن کے اپنے دامن میں کیچڑ ہوتی ہے وہ دوسروں پر کیچڑ اچھالتے ہیں حالانکہ ہاتھ ان کے بھی گندے ہوتے ہیں۔ ابا جان بولتے کم تھے۔ "اگر انسان اپنے اور خدا کے سامنے سرخرو ہے تو اسے کبھی بھی دوسروں کی باتوں کا اثر نہیں لینا چاہیے۔"

وقت گزر گیا گیا۔ شادی کے لیے اکتوبر کا مہینہ رکھا گیا۔ ابھی کچھ ماہ باقی تھے۔ تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ملک کے حالات ٹھیک نہیں تھے۔ شریف امن کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ شہر میں بموں کے دھماکے قیامت ڈھا رہے تھے۔ جتنے کے دن معمول کے مطابق سارے ہفتے کی سبزیاں لینے میں صبح سویرے سبزی منڈی جا پہنچا۔ موٹر سائیکل کو کھڑا کیا تھا کہ اتنے زور کا دھماکا ہوا کہ میں اپنی جگہ سے کئی فٹ اوپر اچھل گیا۔ نجانے کہاں گرا' کوئی ہوش نہ تھا۔

ہوش آیا تو اسپتال میں تھا۔ قریب امی جان' ابا جان اور رابعہ آنٹی تھیں۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر انھوں نے خدا کا شکر کیا۔ کمر کی ہڈی اور ٹانگ پر زیادہ چوٹ آئی تھی۔ ٹانگ کا ٹانگ پر لگا تھا۔ آپریشن سے ٹکڑا نکال لیا گیا مگر ایک پاؤں ضائع ہو چکا تھا۔ یہ سب کچھ میرے آنسو بننے لگے۔ میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا تھا۔

"تم صبر ہو کر روتے ہو رضا! حوصلہ کرو۔ اللہ کی یہی مرضی تھی۔" ابا جان تسلی دے رہے تھے۔

رابعہ آنٹی چپ تھیں۔ دکھ کی وجہ سے ان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ باری باری بہت سارے لوگ مجھے ملنے آئے۔ میرا دل بے چین تھا۔ ایک خوف تھا کہ شاید اب رشتہ قائم نہ رہے۔ رابعہ آنٹی کی خاموشی سے مجھے ڈر لگ رہا تھا لیکن میرا اس میں کیا قصور تھا۔ رابعہ آنٹی نے آنا تھا کو بھی خبر کی اطلاع کر دی تھی۔ انھیں اکثر ہی آنا جانا تھا۔ ممکن ہے اس کے ابو۔۔۔؟ مجھے سوچنا نہیں جانا تھا۔ پتا نہیں آمنہ کی چاہت کا جذبہ کس طرح اور میرے دل میں پروان چڑھ گیا تھا کہ میں خود حیران تھا۔ اب نہ بھی مجھ سے بات نہیں کی تھی مگر ایک دیوار سا سامنا ہوا تو اس کی آنکھوں میں اتنا خوبصورت جذبہ میرے لیے تھا کہ میرے دل میں پھوار سی برسنے لگی تھی۔ محبت میں گہرائی ہو تو جذبے خود بخود عیاں ہو جاتے ہیں۔ وہ لفظوں کے محتاج نہیں ہوتے۔

مجھے اسپتال میں دو ماہ ہو گئے تھے۔ زیادہ کی ہڈی کی چوٹ کو ابھی آرام نہیں آیا تھا جس کی وجہ سے چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ رابعہ آنٹی امی جان کے ساتھ آتیں' انھوں سے سر پر ہاتھ پھیرتیں' حوصلہ دیتیں اور چلی جاتیں۔ ابا مسکراہٹ ان کے چہرے سے غائب ہو گئی تھی۔ ابا مجھے بہت حوصلہ دیتے تھے۔ ان کی باتوں سے مجھے بڑا سہارا ملتا تھا۔ شادی اب دسمبر میں رکھ دی تھی تاکہ میں مکمل صحت یاب ہو سکوں' مگر مجھے رابعہ آنٹی کی خاموشی سے ڈر سا لگتا تھا۔ وہ کھل کر کوئی بات نہیں کرتی تھیں۔

وہ شام بہت اداس تھی' میرا بہت دل چاہ رہا تھا کہ کسی طرح آمنہ کو ایک نظر دیکھ لوں' شاید اس کی نگاہوں میں کوئی جذبہ' کوئی خیال' کوئی امید نظر آجائے۔ اتوار کا اسپتال سے مجھے چھٹی ملنا تھی۔ ابا جان صبح مل کر گئے تھے۔ رابعہ آنٹی اور امی جان دوپہر کو کھانا لے کر آئی تھیں۔ شام

کو بھلا کے آنا تھا میں یہی سب سوچ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی پکار فوراً سن لیتا ہے۔ اسپتال کے اس کمرے کی سے باہر کا گیٹ صاف نظر آتا تھا میری نگاہ اس راہی تو میں نے آمنہ کو گیٹ سے اندر داخل ہوتے میرا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔ شام اک دم سہانی ہو گئی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آمنہ مجھ سے ملنے آسکتی ہے۔

وہ کمرے میں آگئی۔ جھکی جھکی نظروں سے اس نے سلام کیا۔ میرے سے بولی۔ "کیسے ہیں آپ؟" شکوہ زبان سے نہیں آپ کو بھی ہمارا خیال آیا۔" شکوہ زبان سے

"رضا! مجھے آپ غلط نہ سمجھیے گا۔ آپ کو تو پتا ہے کہ کے گھاؤ کہرے ہوتے ہیں بس میں ڈرتی ہوں۔" جان نے نگاہیں اٹھائیں۔ خوبصورت آنکھوں میں ڈھیر سی معصومیت تھی۔ سارے گلے شکوے دور ہو گئے۔ خاموشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا' جن میں کاجل کی چمک تھی۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں پھر اپنا پرس کھولا اور ایک خط نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

"اس کو پڑھ لیجیے گا۔ خدا حافظ۔" وہ جس تیزی۔ سے آئی تھی' اسی طرح چلی گئی۔ خط میرے ہاتھ میں تھا اور میں سوچ رہا تھا۔ فوراً ہی خط کھول لیا۔ خط آمنہ نے لکھا تھا۔

"رضا صاحب! آداب۔ کچھ باتیں انسان کہنا بھی چاہے کہہ نہیں سکتا' اس لیے آج آپ کو خط لکھ رہی ہوں اور جان کی اجازت سے لکھ رہی ہوں کیونکہ وہ خود بہت ہیں۔ وہ بھی چاہتی ہیں کہ آپ کو حقیقت سے اب کرنا چاہیے تاکہ اس رشتے کی مضبوطی میں کوئی کمی نہ ہمارے درمیان۔ بے۔ جب ہم نے آپ کے محلے میں کرایے پر لیا تھا تو میرے ابا جان کو وفات پائے صرف کا عرصہ گزرا تھا' لیکن وہ جتنے ماہ میرے اور امی جان لیے جتنے صدیوں پر محیط تھے۔ ہم وہ اذیت ناک بھی نہیں بھول سکتے۔ جو رشتے دار تھے انھوں نے منہ لیا۔ ابا جان جس فرم میں ملازم تھے وہ پرائیویٹ تھی۔ نے پچاس ہزار روپے دیئے تھے' گھر اپنا تھا۔ والدہ عدت کے بعد سروس کرلی۔ گڑیا بہت چھوٹی تھی۔ اس کو سری میں داخل کروایا تھا۔ میں نے دسویں کا امتحان دیا تھا' زلزلہ آنے والا تھا اس لیے سلائی کڑھائی کے ادارے میں داخلہ لے لیا تھا لیکن رضا صاحب! اس زمانے کے لوگوں نے میری پاک دامن ماں کے سوس کرنے پر وہ وہ باتیں بنائیں جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہودی کا دکھ اللہ نے دیا تھا اور جینے کی سزا زمانے نے دی۔ میں نے اور میری والدہ نے جتنے ماہ کے عرصے میں جتنے آنسو بہائے ہیں شاید ساری زندگی میں اتنا نہ روئے ہوں۔ ایک دن امی جان نے مجھے سمجھایا۔ "آمنہ۔ سماج کی چادر سر پر ہے تو لوگ عزت کرتے ہیں' باتیں نہیں بناتے۔ ورنہ اس معاشرے میں بغیر مرد کے گھر' بغیر چھت کے گھر جیسا ہوتا ہے۔ مرد بے شک پردیس میں ہو۔ عورت کی عزت کا محافظ ہوتا ہے۔ آج سے یہ بات ذہن میں بٹھا لو کہ تمھارے ابو سعودیہ میں ہیں اور گڑیا کو بھی سمجھا دو اگر عزت سے جینا ہے تو ہمیں یہ جھوٹ بولنا پڑے گا پھر اسی جان نے وہ گھر بیچ دیا' وہ شہر چھوڑ دیا اور آپ کے شہر کے چیک میں ماہوار انکم کے کھاتے میں رقم جمع کروا دی۔ کرایے کا گھر لے لیا۔ آپ کے محلے میں جو سکون ملا اس کا اجر اللہ تعالیٰ آپ کے ابو جان کو دے گا۔ انھوں نے اس خود غرض زمانے میں امی جان کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے گڑیا' وہ شہر چھوڑ دیا اور آپ کے شہر کی بہن بنا دیں۔ آپ کے دکھ میرے ہیں۔ جب آپ سے میرے رشتے کی بات چلی۔ تو امی جان نے آپ کے ابا جان کو ابو کی وفات کے بارے میں بتایا تھا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ آپ کا یہ راز میرے سینے میں دفن رہے گا مگر رضا صاحب! میں چاہتی تھی کہ شادی سے پہلے آپ کے بھی علم میں حقیقت ہو تاکہ بعد میں کوئی مسئلہ نہ ہو۔ میں اپنی زندگی کی بنیاد جھوٹ پر نہیں رکھنا چاہتی۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ سعودیہ سے میری امی جان کی ایک سہیلی کے خط آیا کرتے تھے جو ہمارے جھوٹ کا بھرم رکھے ہوئے تھے۔ اجازت چاہوں گی"۔ آمنہ

آمنہ کا خط میرے ہاتھ میں تھا اور دل میں رابعہ آنٹی کے لیے عقیدت کے ہزاروں چراغ روشن ہو رہے تھے جس کی روشنی میں آمنہ کا معصوم چہرہ کی چمک سے جگمگا رہا تھا۔

ان بستیوں کی کہانی جہاں زندگی کی سہولتیں نایاب ہیں
وہ لوگ جو قطرہ قطرہ زندگی کو ترستے ہیں
پہاڑوں سے اُترنے والے اُن انسانوں کا دُکھ جنہیں روٹی کا ایک ٹکڑا عذابوں سے حاصل ہوتا ہے

خالدہ اسد

تیسری کہانی

برف کے آنسو

خوبصورت شہروں کے باسی تو تصور بھی نہیں کرسکتے کہ جن پہاڑوں کی میں بات کر رہی ہوں وہ اونچے اونچے دیو ہیکل پہاڑ کتنی ثابت قدمی سے زمین کے سینے پر نہ جانے کب سے مضبوط قدم جمائے کھڑے ہیں' اور وقت بے آواز گزر رہا ہے۔ ان پہاڑوں کے پیچھے جو بستیاں آباد ہیں کون جانے کیسے اور کب آباد ہوئیں اور وہاں رہنے والے دنیاوی آرائشوں اور سہولت سے کس حد تک محروم ہیں۔ بل کھاتے راستے' اونچی نیچی پگڈنڈیاں' راستوں کی دشواریاں اور جب ان پہاڑوں پہ سردیوں کا ٹھنڈا عذاب نازل ہوتا ہے تو ان پہاڑوں کے پیچھے بسنے والوں کے لیے روزی روٹی پیدا کرنے کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں اور زندگی' آسمانی آفتیں نازل ہو کر ان کو موت کے منہ میں لے جاتی ہیں۔ برف باری کے شدید طوفان ان کو چاروں طرف سے بند مٹی کے گھروں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ جہاں گرمیوں میں جمع کی ہوئی ناکافی غذا سے وہ گزارا کرتے ہیں تب وہ مبارک عطیہ جسے زندگی کہتے ہیں انھیں کسی جنجال سے کم دکھائی نہیں دیتی۔

کس قدر دکھ دیتی ہے وہ زندگی ان ماں باپ کو جن کی اولاد تن کھانچے کو کپڑوں سے محروم ہوتی ہے اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کوئی ذریعہ معاش نہیں رہتا۔

اونچے اونچے پہاڑوں کے پیچھے سے پرپیچ راستوں پر آگے پیچھے دودھ کے گھڑے' بالٹیاں' ٹھار در ٹھار اٹھائے اترنے والے گوجر اور گجراں جب شہروں کا رخ کرتے ہیں اور دن بھر دو دو چار چار روپوں کی خاطر محنت مشقت کے بعد انھی پہاڑوں کے پیچھے غائب ہو جاتے ہیں تو سامنے زمین کے سینے سے اگے' آسمان کو چھوتے پہاڑوں کے سلسلے انھیں یوں سفو ہستی سے مٹا ڈالتے ہیں جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ ہو اور جن کا کوئی وجود ہی نہ ہو ان کے بارے میں کون سوچتا بھی کیا ہو گا۔ ہم بھی ہر سال یہاں آتے تھے لیکن کبھی نے بھی تو کبھی نہ سوچا تھا۔

لیکن بخت جمال انھی پہاڑوں کا باسی تھا۔

اس کی عمر بمشکل دس سال ہی ہو گی لیکن وہ اپنی عمر سے کہیں بڑا دکھائی دیتا تھا۔

وہ بہت خوبصورت تھا' سرخ و سفید رنگ' قد چنار کی طرح لال گال' بڑی بڑی روشن اور چمکتی آنکھیں۔ سنہرے بال۔

ملیشیا کی پھٹی ہوئی قمیص اور کالی شلوار میں ملبوس کا ایک پائنچہ آدھا غائب تھا۔ اس کے گورے گورے نوکیلے پتھر سے پھٹے ہوئے تھے' لیکن اس کی صحت مند بچوں کی طرح بہت محو نہ تھی۔ اس بستی کے لوگ کمو فن کے آشنا نہ تھے۔ سیدھے سادے اور فطرت پسند' بھولے بھالے غریب لوگ۔ جو صرف مشقت کرنا جانتے تھے۔

شارخ کمرے میں لیٹا تھا۔ نو دس برس کا میرا بھائی جو پہاڑ پر چڑھتے ہوئے اس کا پیر پھسل گیا تھا۔ ساری رات نے اس کے سرھانے رو رو کر گزاری تھی۔ درد کی شدت سے شارخ تڑپ رہا تھا۔ پتا نہیں یہ رات کتنی طویل تھی۔ ہمارا ارادہ صبح ہی شارخ کو لے کر شہر لوٹ جانے کا تھا لیکن رات کے آخری پہر اس کی آنکھ لگ چکی تھی اس لیے بغیر آہٹ کیے میں کمرے سے باہر چلی آئی۔

کوٹھی کے پھاٹک کے قریب وہ دونوں کھڑے تھے۔ رخسانہ اور بخت جمال' دونوں ماں بیٹا بہت اداس تھے۔ بخت جمال کے ہاتھوں میں نرگس کے پھول تھے۔ اس کی آنکھوں کی طرح خوبصورت اور چہرے کی طرح نازک۔

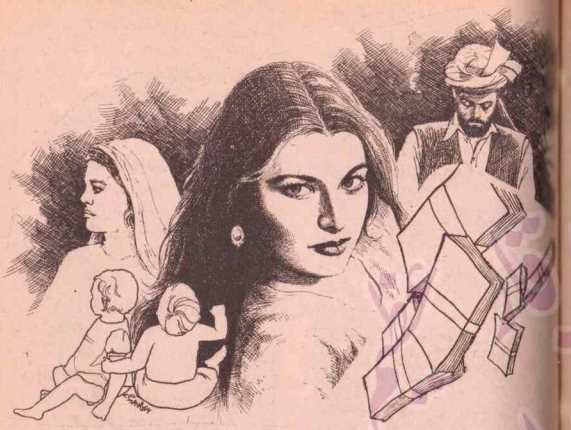

چپ چاپ کھڑی تھی بغل کے نیچے سے خنک دھان نکال کر بولی۔

"ہاں ہاں مجھے بھی بناؤ! اور سنو تم مجھے بہت سارے جوڑے بناؤ میں چھاتونی جا کر اپنی دوستوں کو دوں گی۔ وہ بہت خوش ہوں گی۔"

برآمدے کی آخری سیڑھی پر بیٹھ کر رخسانہ نے بڑی مہارت سے گونہ کر دو جوڑے تیار کر دیئے۔ اس کے چہرے پہ اک عجیب طرح کا سکون تھا۔ نامعلوم سا۔

رخسانہ بھی پہاڑوں کے پیچھے کسی بستی سے آئی تھی۔ اس کی آنکھیں ویران تھیں اور رنج والم کے گہرے سائے اس کے وجود کے ہر حصے پر چھائے ہوئے تھے۔ ایسے لگتا تھا زندگی کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے وہ تھک چکی ہے۔

میں نے ایک ہمدردانہ سی نظر اس پر ڈالی اور دس روپے کا نوٹ اس کی جانب بڑھایا جسے اس نے اپنی اوڑھنی کے پلو میں باندھ لیا۔

"اچھا رخسانہ! شاید تم سے اب ملاقات نہ ہو۔ تم نے ہماری بہت خدمت کی ہے۔ ہمارے بل اسٹیشن کے

قیام کو تم نے بہت خوشگوار بنادیا ورنہ سوئی کو اٹھا کر پہاڑوں پر چڑھنا بہت دشوار ہوتا۔" میں اندر جانے کو مڑی' بخت جمال کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے بوجھل تھیں تب میں رک کر بولی۔ "اوہو تم رو رہے ہو! سوئی تم کو بہت یاد کرے گا!" میں نے اس کے سنہرے ریشمی بالوں کو چھوا جو بہت خوبصورت تھے۔ اس. نرکف سے آنسو پونچھے۔

"چھوٹا بابا ہمارے کو بہت یاد آئے گا جی۔ آپ ہمارے کو اس کو اٹھانے کے لیے رکھ لو۔"

"اچھا تو تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے؟" میں نے یونہی اس کا دل رکھنے کو کہا۔

"سچ بی بی جی۔ ضرور چلوں گا!" وہ حیرت سے پھٹ پڑنے والے انداز میں بولا۔

"ہاں سچ چلو پھر۔" میں نے اس کی شدت کی خوشی کو زائل نہ کرنا چاہا۔

"بے بے میں چلا جاؤں؟" وہ رسماں کا دامن تھامے پوچھ رہا تھا۔

چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پسنے والے اناج کی طرح وہ بے بس عورت میری اس عنایت پر بھونچکی تھی۔ اسے یقین نہ آرہا تھا۔

"کیا خیال ہے رسماں لے چلوں تیرے بیٹے کو؟" میں نے پھر پوچھا۔

"ہم غریبوں کا ایسا مقدر کہاں جی! اگر آپ کہہ رہی ہیں مذاق نہیں کر رہیں تو لے چلیں' اس غریب کو دو وقت پیٹ بھر کے روٹی تو ملے گی۔ ان عذابوں سے تو بچ جائے گا جو ہم سہتے ہیں۔"

"ارے ہم اس کو اپنے بچوں جیسا رکھیں گے۔ ان جیسا پڑھائیں گے' پہنائیں گے اور تمہیں روپے بھی بھیجیں گے اس کی تنخواہ کے۔" لمحہ بھر کو رسماں کی آنکھوں میں چمک لہرائی اور پھر مانند پڑ گئی۔

"اچھا ایسا کرو تم اس کے باپ سے بات کرو۔ وہ مان جائے تو اسے لے جانا۔"

"اس کا باپ؟" اس کے چہرے پہ ایک تاریک سا سایہ پھیل گیا۔

"وہ' وہ کیا کہے گا جی۔ وہ تو بول بھی نہیں سکتا۔"

"کیوں؟ وہ بول کیوں نہیں سکتا۔ کیا تمہارا شوہر گونگا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"اس کو ادھ رنگ ہے جی! وہ تو برسوں سے [illegible] ہے۔"

"ادھ رنگ؟ وہ کیا ہوتا ہے۔"

"اس کا آدھا جسم کام نہیں کرتا بیگم صاحبہ! [illegible] بچوں کو محنت مشقت سے پالتی ہوں۔ میں کو ہسٹالی [illegible] سے آئی ہوں مگر میں مشقت کے لیے روز آہاں [illegible] لیکن سردیوں کا عذاب دہرا ہو جاتا ہے۔ سات [illegible] شوہر اور ضعیف ساس۔"

"مگر کراچی بہت دور ہے' اگر بچہ ضد کرے [illegible] میرا ذہن سچ مچ الجھا ہوا تھا۔

"نہیں جی! غریبوں کے بچوں کو ضد کے کیا [illegible] لے چلیں۔" وہ پوری طرح آمادہ تھی اور اس [illegible] جملے میں کتنی بڑی حقیقت تھی۔ میں نے رسماں [illegible] پر چند نوٹ رکھے اور بخت جمال کو لے کر اندر آگئی۔ یقین تھا کہ وہ اسے ہرگز نہ بھیجے گی۔ آخر وہ ماں اور میں جانتی تھی کہ ممتا کیا ہوتی ہے۔ وہ بھلا اتنی دور کیسے بھیجے گی' لیکن اس نے اپنے اور درمیان پہاڑوں ایسی جدائی کو قبول کر لیا۔

میرے شوہر کو بخت جمال بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ بے حد مانوس ہو گیا تھا اور شارخ سے اس کی [illegible] تھی۔ دوسری رات کے بعد شارخ کی طبیعت [illegible] سنبھل چکی تھی۔ ہم نے وہاں تین روز مزید قیام [illegible] اس دوران رسماں نہیں آئی۔ شاید ضرورت [illegible] رقم نے اس کی تھکاوٹوں کو اس کے وجود پر طاری [illegible] اور وہ آرام کر رہی تھی۔ ہم بخت جمال کو اپنے ساتھ [illegible] آئے لیکن اس خوبصورت بچے کی آہ ہماری [illegible] سکینہ کو بے حد ناگوار گزری۔ وہ ہر لمحہ اس کو [illegible] رہتی کہ بخت جمال کو ذلیل کرے۔ نوکر پر نوکر [illegible] سو کھلانے کے متراوف ہے۔ سکینہ کو بخت جمال [illegible] حرکت پر اعتراض تھا اور یہ میں اچھی طرح سمجھتی [illegible] اس روز قحط ہو گئی جب مہمانوں کے جانے کے [illegible] اسے کان سے کھینچتے ہوئے میرے سامنے پیش کر دیا۔

"بیگم صاحب جی! یہ جمالہ ساری چینی کھا گیا [illegible] اس روز میں نے اس کے بستر اپنے پھوٹے کو [illegible] کہ ہزاروں کیڑوں نے اس کا پیڈا ہی نوچ ڈالا تھا۔ اس [illegible] ہوا تھا جی کئی کیڑوں سے۔ چور نہ ہو تو۔" اس نے [illegible] دھموکا جڑ دیا۔

"آرام سے سکینہ آرام سے' بچہ ہے۔" میں نے اسے [illegible]

"یہ تو بچہ ہے لیکن چوریاں ہمارے ذمے لگ جاتی ہیں [illegible] کا کیا؟"

"کیوں بخت جمال سکینہ سچ کہتی ہے؟" میں نے اسے [illegible] کہا۔ "آپ نہ ڈرتے ہو۔ چلو سچ سچ بتاؤ گے تو کچھ [illegible] کیوں گی ورنہ مار پڑے گی۔"

"نہیں ہم چوری نہیں کرتا۔" وہ سہما ہوا تھا۔ "ہم کبھی چوری نہیں کرتا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" میں نے اسے بچا دیا۔

میں نے انگلش کیا کہ بخت کسی میٹھی چیز کی طلب میں [illegible] دار کچن کے ڈبے جھانکتا پھرا تھا۔ فرج کھول کر [illegible] ادھر ادھر انتہائی طلب سے دیکھتا۔ کہیں سے بھی [illegible] منہ میں ڈال کر منہ بند کر لیتا۔ ایک بار کہیں سے صفائی آئی تھی تو وہ اس نے پوری کھالی' اور ڈبا اس کے [illegible] پڑا رہ گیا اور وہ بے خود سویا پڑا تھا۔ سکینہ کے لیے [illegible] موقع تھا۔ وہ بھائی بھائی آئی۔

"دیکھا بیگم صاحب! وہ حرام خور چوہا اتی توڑ گیا کہ اپنی [illegible] بھی نہ رہی۔ بے سدھ پڑا ہے۔ لگتا ہے مر گیا۔" اس [illegible] دل ٹھنڈا ہو گیا۔

ہائے اللہ! میرے سینے پہ گھونسا سا پڑا۔ جاکر کوارٹر میں [illegible] اسے کچھ خبر ہی نہ تھی۔ بے سدھ پڑا تھا' آنکھیں بند [illegible] بلایا جلایا' آوازیں دیں مگر وہ تو دنیا و مافیہا سے بے خبر [illegible] میں نے فوراً ڈاکٹر کو بلایا۔

وہ کسی کا بچہ تھا۔ معصوم اور بے سہارا۔ میں اس کی [illegible] ذمے دار تھی۔ اتنی دور سے میں اسے اپنی ذمے داری پر [illegible] تھی۔ اسے کچھ ہو جاتا تو میں اس کے ماں باپ کو کیا [illegible] دیتی۔ خود کو کبھی معاف نہ کرتی۔ بخت جمال کا پورا [illegible] ہوا' لیکن ڈاکٹر نے اس کے خون کی رپورٹ کے [illegible] میں جو کچھ بتایا وہ میرے قدموں سے زمین کھینچ نکال [illegible] گیا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس ننھے فرشتے بخت [illegible] کو ایڈیٹس کی بیماری تھی' اور انتہائی شدید کہ کنٹرول میں [illegible] بے حد مشکل تھی۔ اس بیماری کی پیچیدگیاں علاج نہ [illegible] کی وجہ سے نہ جانے اس کے جسم میں کس حد تک

غزل

ڈاکٹر عطیہ خلیل

رویا ہو کوئی' آنکھ ہماری ہی نم ہوئی
ہم تو اسیرِ غم تھے' رہائی ستم ہوئی

ہم آپ اپنے قتل کے تنہا گواہ تھے
یہ ایک چشم دید گواہی بھی کم ہوئی

دل کی مسافتوں کا کوئی ذکر ہی نہ تھا
یوں داستانِ وصل و جدائی رقم ہوئی

یوں لب کشا ہوئے کہ زباں کاٹ دی گئی
ہم کشیدہ لوگ تھے' گردن نہ خم ہوئی

اپنے لیے نوشتۂ تقدیر بن گیا
لوحِ قلم کے ساتھ خدائی بہم ہوئی

ہم کشتگانِ خنجرِ تسلیم کے لیے
ظالم کی ہر نگاہ نگاہِ کرم ہوئی

پھیل چکی تھیں۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب خدا کے لیے روپے پیسے کی فکر نہ کیجئے گا لیکن اس بچے کو بچالیں۔" مجھے بخت جمال اپنی اولاد کی طرح عزیز ہو چکا تھا۔ اس کا دکھ' اس کا کرب' اس کی اذیت مجھے شارخ اور سوئی کے دکھ نظر آتے۔ اس کی دوا' غذا اور دیکھ بھال میں خود کرنے لگی تھی۔ علاج شروع ہوا۔ اس کو تین وقت انسولین لگتی لیکن شاید دوا کا وقت گزر چکا تھا۔ وہ علاج کے دور سے گزر چکا تھا۔ وہ دن بدن کمزور ہو رہا تھا۔ اس کی خوبصورت آنکھیں اندر کو دھنس رہی تھیں۔ اس کا بدن لاغر اور تھکا ہوا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے اسے کسی نے نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔ میرا دل اس کے لیے رو رہا تھا وہ کتنا پیارا تھا۔ وہ پیارا نہ بھی ہوتا تب بھی وہ ایک بچہ تھا' صرف پیار کرنے کے لیے۔ اس نے مجھ سے 'میرے بچوں سے میرے شوہر سے کتنی محبت کی تھی کہ وہ اپنے ماں باپ کو بھی چھوڑ آیا تھا۔ لیکن قدرت کو شاید منظور نہ تھا۔ 14 دسمبر کی سرد ترین رات وہ ہم سے تو کیا' پوری دنیا سے ناتا توڑ گیا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس کے بالوں کو' ماتھے کو گالوں' کو بے تابی سے چوما' لیکن موت اب ہم سے بہت دور نے جا چکی تھی۔ اس بچے کی موت انسانیت کی موت تھی۔ اس لیے جو کچھ جہاں ہوتا ہے اس کو بھی بنیادی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں اسے پورے خلوص سے بچانا چاہتی تھی لیکن قدرت کو شاید اس کی ضرورت نہ تھی۔ میرے شوہر نے پیسا پانی کی طرح بہایا لیکن ہوتی ہو کر رہی۔ یہ وہ وقت تھا جب پہاڑی علاقوں میں برف باری کا طوفان آیا ہوا تھا۔ اس دور افتادہ گاؤں میں بخت جمال کی لاش اس کے وارثوں تک پہنچانا بے حد ضروری تھا کیونکہ ان کے صبر کے لیے یہ ضروری تھا۔ کمال (میرے شوہر) اور ان کے آفس کے چار آدمی بخت جمال کو لے کر کراچی سے پنڈی تک ہوائی جہاز میں اور اس کے بعد جیپ تک جیپ یا اس میں جاسکتے تھے مگر لیکن کاغان کی سمت جانے والے راستے برف سے اٹے پڑے تھے۔ راستے کی دشواریاں' سردی کی شدت' برف باری کے طوفان' یہاں تک کہ دشوار گزار پر پیچ راستے اور اونچی نیچی پگڈنڈیاں ان کی راہ میں اس طرح حائل تھیں کہ اصل راستے کا گمان تک ممکن نہ تھا۔ سردی کی شدت میں اس کی لاش کو اٹھائے چلتے چلتے ان کے پیر شل ہو چکے تھے۔ شاید وہ ایک آدھ دن کا سفر ہو گا

لیکن سردی کی شدت اور اس قدر گھٹن اور پر خطر سفر ان کا دل دہلا دیا تھا۔ ادھر کار نہیں جاتی تھی۔ کچھ مقامی باشندوں نے اجرت پر جانا قبول کرلیا۔ کچھ پہاڑ کی رسی چٹانیں' کہیں کہیں سرنگا لے تنگ کاٹتے اور بھالیوں راستوں میں جمی ہوئی برف جو بے حد پھسلواں اور خطرناک تھی۔ ذرا سا پاؤں پھسل جاتا تو نیچے ہزاروں فٹ گہری گڑھوں میں جا گرتے۔ یہ برف سلوں کی طرح جمی ہوئی تھی۔ گہری خطرناک کھڈیں تھیں کئی مقامات پر تو پگھلتی ہوئی پانی برف کی طرح جما ہوا تھا اور اس پر آسمانی سے چھا رہا تھا لیکن یہ خطرناک کھڈ جان لیوا بھی ثابت ہو سکتے تھے۔ راستہ بے حد دشوار اور کٹھن تھا۔ اس پر مزید برف باری کا سلسلہ۔ جب شروع ہو جاتا تو وہ جو دو قدم آگے بڑھاتے تو چار قدم پیچھے کی طرف پڑتے۔

پورا ایک دن اور ایک رات چلنے کے بعد انھیں برف سے ڈھکی مٹی کے چند گھروندے نظر آئے۔ یہی وہ بستی تھی جہاں سے ایک گھر میں بخت جمال کی ماں رخسانہ اس کا راستہ تک رہی تھی۔ دنیا سے کٹے ہوئے اس تھوڑی سی زمین کے ہاں اور چوتی گھٹا اور ناکافی غذا کے بغیر پیٹ کے جہنم کو بھرنے والے 'سخت گیر زندگی گزارنے والے ان لوگوں کو لوگ نہ جانے کب سے ان پہاڑوں کے پیچھے بظاہر آباد لیکن یہ آبادی انسانوں کی آبادی تو نہ تھی خطرات ان کا مقدر تھے اور انھیں زندگی کی خاطر جھیلنا تھا۔ یہ کرتا تھی۔

تین روز مسلسل چلنے سے ان پانچوں مسافروں کی پیر شل ہو چکے تھے۔ ان کے پاس زندگی کی سہولیات تھیں وہ سردی سے بچنے کے لیے پوری تیاری کے ہراساں ہو چکے تھے۔ جب کہ بھوکے پیٹ وہ صابر زندہ تھے۔ جب وہ لوگ بخت جمال کی لاش وہاں تو انھیں بے حد حیرت ہوئی۔ ایک بارہ تیرہ برس کی لڑکی کے بالوں کے بے شمار منڈھیاں گوندھی ہوئی تھیں اور کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں ان کو دیکھ کر خوشی تھا۔ اس کا چاند کی طرح گول اور روشن چہرہ مسرت سے قطعی بے پروا تھا۔ نتھنے پر بھاگتی ہوئی مکھی اور اس کی چیخ نما آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

"ماں! مگھر میں لاش آئی ہے۔"

تب وہ چونکے ہو بہو بخت جمال کا تھا۔ ننھے پر

نے دبوچ لیا۔ اس کے ہاتھ غیر مرئی طور پر جیب کی طرف بڑھے اور ان میں جو کچھ تھا اس نے ان کے آگے دھیر کردیا لیکن یہ ان کی مشکلات کا حل نہ تھا۔ وہ پہاڑ' وہ دشوار گزار راستے' وہ زندگی کی کٹھنائیاں اپنی جگہ اٹل تھیں لیکن وہ ان کی بے رحمیوں سے توقع رکھتے تھے۔ کیا اتنی بڑی دنیا میں چند سوگز زمین ان کا نصیب نہ بن سکتی تھی؟ کیا اتنی بڑی بڑی حویلیوں میں پہاڑوں کے پیچھے بسنے والے ان معصوم لوگوں کے بارے میں کبھی نہیں سوچتیں کہ؟ جب کہ زمین کے سینے سے ابھر کر آسمان سے سرگوشیاں کرنے والے لمبے لمبے اونچے درخت پہاڑوں کے سلسلے ہماری دھرتی پہ ہر جگہ موجود ہیں اور پوری دنیا جانتی ہے کہ صبح کاذب کے ساتھ وہ اپنے پیٹ کے دوزخ کے لیے ایندھن جمع کرنے شہروں کا رخ کرتے ہیں اور غروب آفتاب کے ساتھ ان سلسلوں کے پیچھے ان کی زندگی ڈوب جاتی ہے۔ کاش پہاڑوں کے اس طرف بسنے والے لوگوں کے لیے انسانیت کے نام پر سوچا جاسکتا جہاں سینکڑوں بخت جمال مرجاتے ہیں جو کسی کے لخت جگر ہوتے لیکن بھوک کا عفریت' ان کی موت کا دکھ' ان کی معصوم راہ تکتی آنکھوں میں برف کے آنسو منجمد کردیتا ہے کیونکہ وہ ہیں تو ضرور مگر تسلیم کا درجہ نہیں رکھتے۔ ان کی کوئی شناخت نہیں ان کے زندہ وجود تسلیم نہیں کیے جاسکتے کیونکہ انھیں اپنا حق تسلیم کروانے کا شعور نہیں۔ وہ بے زبان جانوروں کی طرح اپنے بارے میں زبان رکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ صرف زندگی کی بدصورتی اور بے رحمی سے لڑتے لڑتے خالی ہاتھ لوٹ جاتے ہیں۔ شاید وہ یہ سوچتے ہوں کہ دنیا میں تگ و دو کرنے کے لیے ان کو زمین پر اتارا گیا ہے اس زمین پر جو حکومتوں کی دسترس میں نہیں لیکن میں سوچتی ہوں شاید کبھی کوئی بڑھیا۔ اس مخلوق میں بھی ایسی پیدا ہو جائے جیسی حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں پیدا ہوئی تھی جس نے ان کے دامن تھام کر بے جگری سے کہا تھا۔

"اتنا ہی علاقہ فتح کرتے جتنے پر آسانی سے نظر رکھ سکے!"

وہ دامن ہر ایک کی پہنچ سے قریب تر تھا۔ یہاں ایسا کوئی دامن نہیں جو ان غریبوں کی گرفت میں آسکے۔

سیّد پرویز احمد کے پورے وجود کو موت کے سناٹے

شمیم نوید

فرزند قوالہ

میں ایک ساحلی بستی قوالہ کا یتیم نوجوان تھا۔ ماں کے سوا دنیا میں میرا کوئی نہیں تھا۔ میرے والد میرے چچا طوسون کی سازش کا شکار ہو کر قتل کیے جا چکے تھے۔ میں نے چچا سے اپنے والد کا انتقام لیا۔ پھر حالات نے ایسی کروٹ لی کہ میں حاکم قوالہ کی نظروں میں چڑھ گیا۔ اس کا بیٹا سلیمان میرا دوست بن گیا اور مجھے دس سپاہیوں پر افسر مقرر کر دیا گیا۔ اس کے بعد قوالہ میں اپنی جلاوطنی وزیر خسرو پاشا، حاکم کا مسکن بنا۔ پھر میری ماں بھی چل بسی۔ میں یہ شکل اس صدمے سے سنبھل سکا۔ کچھ روز بعد ایک واقعہ پیش آیا۔ ایک قریبی بستی پر دستاوے محصول ادائیگی پر آمادہ نہ ہوئے اور انھوں نے حاکم کے خلاف بغاوت کر دی۔ حاکم سے درخواست کر کے یہ معاملہ میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں بڑی ہوشیاری سے بدستا کے شیخ اور قبیلوں کو کر قوالہ لے آیا اور وقت مقرر کر دیا کہ اگر محصول ادا نہ کیا گیا تو انھیں قتل کر دیا جائے گا۔ اسی دوران میں میری ملاقات شیخ کی بیٹی جوہرہ سے ہوئی اور میں اس کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ اب مجھے اپنے کیے پر ملال ہوا کہ اس کا باپ میری قید میں تھا۔ جوہرہ محبت کے باوجود میں اپنے عہد سے نہیں پھر سکتا تھا۔ اسی تگ و دو کے درمیان عیاش اور عیار خسرو پاشا کو موقع مل گیا اس جوہرہ کو زیر دام لانے کے لیے جال پھیلایا اور بدستا والوں پر جو واجبات تھے خود ادا کر کے قیدیوں کو رہا کرا دیا۔ میں اب بلک (بیجر) بنا دیا گیا تھا۔ خسرو پاشا جوہرہ کو اپنی کنیز بنانا چاہتا تھا مگر اس کی سازش کامیاب نہ ہوئی جوہرہ میری پناہ میں آگئی۔ میں نے اسے ایک غار میں چھپا دیا جو میری خلوت کے لیے مخصوص تھا۔ خسرو پاشا کسی زخمی سانپ کی طرح تڑپ اٹھا۔ اسی دوران میں خسرو پاشا کی بہ حالی کے احکام آچکے تھے اور ایک جہاز اسے لینے آیا تھا۔ خسرو پاشا نے جہاز کے کپتان سے رکنے اور انتظار کرنے کے لیے کہا اور اپنے خواجہ سراؤں کو تاکید کی وہ ایک بہتے کے اندر جوہرہ کو تلاش کریں ورنہ انھیں قتل کر دیا جائے گا۔ میرا دوست حاکم زادہ سلیمان میری محبت میں تمام حالات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔ اسی سے مجھے حالات کی سنگینی کا علم ہوا۔

اب میرا کھلا دشمن خسرو پاشا اختیار تھا وہ مجھے جو چاہے سزا دے سکتا تھا کیوں کہ ماضی میں کئی بار میرے اور اس کے درمیان کلامی ہو چکی تھی۔ اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے میرا دوست سلیمان اپنے والد کے ساتھ خسرو پاشا سے ملا اور اس سے میری جاں بخشی کا وعدہ لے لیا۔ پھر رات کے وقت میں جوہرہ سے ملنے غار میں گیا سلیمان نے کہا تھا کہ وہ خطرے کے وقت بندوق سے دو فائر کر کے مجھے آگاہ کرے گا۔ حویلی میں پھر غیر معمولی سرگرمیاں دیکھ کر سلیمان نے ایسا ہی کیا۔ میں خطرے کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے غار میں تنہا چھوڑ کر حویلی پہنچ گیا اور پھر وہاں سے لوٹ کر آیا تو میری دنیا اجڑ چکی تھی۔ غار خالی تھا خسرو پاشا کے آدمیوں نے مجھ پر بھی حملہ کیا۔ وہ پہلے سے میرے انتظار میں تھے مجھے باندھ لیا گیا اور پھر صبح دم اسی عالم میں میری آنکھوں نے خسرو پاشا کی سفاکی دیکھی۔ جوہرہ کو میری آنکھوں کے سامنے باندھ کر ایک بوری میں چھپکی رکھ دیے گئے۔ جوہرہ نے خسرو پاشا کے آگے گڑگڑا کر رحم کی بھیک مانگی اور اس کے انکار کر دینے پر اس نے جوہرہ کو سزائے موت دے دی۔ اس وقت جب جوہرہ کو سمندر برد کیا گیا میرے دل پر جیسے بجلی گر گئی۔ پھر خسرو پاشا اسی صبح قوالہ سے ترکی روانہ ہو گیا تاکہ وہاں سے مصر جا سکے۔ سلطان ترکی نے مصر میں اسے

نائب مقرر کیا تھا۔ میں جیسے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ پھر جانے کب حاکم قوالہ اور حاکم زادہ سلیمان مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچے اور حویلی لے گئے۔ شدید صدمے نے مجھے بیمار ڈال دیا۔ اتنا کہ میری زندگی کی امید نہ رہی۔ مجھے نہیں معلوم کتنے دن اور کتنی راتیں اسی کرب میں گزریں۔ اسی دوران میں ایک مہربان چہرے کو میں نے ہر وقت اپنے قریب پایا۔ یہ میرے دوست سلیمان کی چچا زاد بہن عابدہ تھی جو پہلے ہی میرے عشق میں گرفتار ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے آوارہ شوہر سے طلاق لے لی تھی اور اب سلیمان کے ساتھ پوری تن دہی سے میری تیمارداری کر رہی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ علاج سے زیادہ عابدہ کی رفاقت مجھ پر اثر کیا۔ اور میری طبیعت سنبھلنے لگی وہ میری غم گسار بن گئی۔ اس نے مجھے موت کے اندھیروں سے زندگی کے اجالوں کی طرف کھینچ لیا۔ محبت نے محبت کے زخم کو بھر دیا اسی لیے محبت یاب ہوتے ہی ہم دونوں ایک ہو گئے۔ اب عابدہ میری بیوی تھی میرے انکار کے باوجود عابدہ نے اپنا کل مال مجھے دے دیا اور میں تجارت کرنے لگا کچھ عرصے بعد ہی میرا شمار امیروں میں ہونے لگا خدا نے مجھے اس دوران میں تین لڑکے بھی عنایت کیے لیکن اب تک میرے سینے میں جو ہر وہ کا زخم تازہ تھا۔ میں خسرو پاشا کو بھولا نہ تھا۔ خسرو پاشا مصر کا والی بنا دیا گیا تھا مگر ''اس وقت مصر پر ممالک قابض تھے اس سے پہلے مصر پر سلطان ترکی کی گرفت اتنی مضبوط نہ تھی کہ فرانسیسیوں نے قبضہ کرنا چاہا تو مگر مویل جنگ کے بعد انھیں مصر سے نکلنا پڑا۔ فرانسیسی فوجوں کی مصر سے واپسی کی خاطر برطانوی حکومت نے ہی۔ اس کے تعلقات ممالک سے بہت اچھے تھے۔ سلطان ترکی کا ارادہ تھا کہ وہ ممالک پر غلبہ پا کر مصر کو اپنے زیر نگیں لے آئے۔ خسرو پاشا نے اس ذمے داری کو قبول کرتے ہی اطراف سلطنت میں لشکر اور سامان رسد مہیا کرنے کے لیے اپنے قاصد اور جہاز بھیجے۔ انھی میں سے ایک جہاز قوالہ آیا۔ خسرو پاشا نے حاکم قوالہ حسان کو پیغام بھیجا تھا۔ اس پیغام کی رو سے حاکم زادے سلیمان کو اس نے قوالہ سے روانہ ہونے والی سپاہ کا افسر اور مجھے اس کا نائب مقرر کیا گیا تھا۔ گویا وہ مجھے انھی معنوں میں تہ میرے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ میں خسرو پاشا سے ایسا انتقام لینا چاہتا تھا جو تاریخ میں مثال بن جائے کہ مار ڈالا آئی۔ اس نے مجھ پر دباؤ ڈالا کہ میں مصر نہ جاؤں کیوں کہ وہ تمام گزشتہ واقعات سے آگاہ تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ اس کی وعدہ نہیں کر سکتا پہلے سلیمان سے بات کروں کہ وہ بھی مصر نہ جائے۔

سلیمان سے گفتگو کرنے کے بعد میرا عزم اور پختہ ہو گیا میں نے عابدہ کو راضی کرنے کے لیے اپنی ماں کے خواب کا حوالہ دیا اسے میری بات ماننا پڑی کہ بہرحال وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ اس کے بعد میں نے قریبی بستیوں سے سپاہیوں کو بھرتی کیا اور تربیت دی پھر ایک دن قوالہ سے روانہ ہو گیا۔ مہروانگی سے پہلے میں نے وہاں کی تازہ صورت حال سے پوری آگہی حاصل کر لی تھی۔ ان معلومات کے مطابق خسرو پاشا کے مصر پہنچنے سے پہلے پورا مصر' ممالک کے قبضے میں تھا۔ ممالک کی فرانسیسیوں نے مصر کو فتح کرنا چاہا۔ پولین بن بے کامیاب تو نہ ہو سکا مگر اس سے ممالک کی قوت کو ضعف پہنچا۔ پولین کے واپس جانا پڑا۔ حالت کے فرائض برطانوی حکومت نے ادا کیے۔ پہلے کیوں کہ مصر' ترکی کے زیر نگیں تھا اس لیے ترکی سلطان موقع سے فائدہ اٹھایا اور خسرو پاشا کو وہاں بھیج دیا۔ برطانوی حکومت نے اس معاملے کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنے لارڈ بالان کے ذریعے ترکی کی خلافت اور ممالک کے درمیان صلح کی کوشش شروع کر دی۔ یوں رد و کد کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ممالک' تاہرہ چھوڑ کر مصر کے بالائی حصے میں چلے جائیں۔ ممالک نے برطانوی سفیر پر پورے اعتماد کا اظہار کیا اس وقت ممالک کا سردار مراد بے مارا گیا اور عثمان بک بردیکی سردار بنا۔ مذاکرات ابھی جاری تھے۔ برطانوی سفیر نے ممالک کے پاشا کے وفد کو اسکندریہ دعوت میں بلایا تھا تاکہ صلح کی شرائط طے کی جائیں۔ ممالک ابو قیر کے ساحل پر ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ اسی دوران میں مراد بک کی حسین و فتین بیوہ نفیسہ عثمان بک سے ملی اور اسے اسکندریہ جانے سے منع کیا۔ اس کی اطلاع کے مطابق ترکی سپہ سالار قبطان پاشا' ممالک کے خلاف کوئی سازش کر رہا تھا۔ نفیسہ کا خیال تھا کہ اس طرح قبطان پاشا ممالک کے سرداروں کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ عثمان نے اسے نفیسہ کا وہم سمجھا اور اسے سمجھا بجھا کر واپس کر دیا۔ اس عرصے میں جنگی جہاز ابو قیر پہنچ گیا۔ قبطان پاشا جہاز کا معائنہ کرنے آیا۔ اس کے ذہن میں واقعی ایک سازش کا منصوبہ تھا۔ اس نے اعتماد میں لے لیا۔ میرا دوست سلیمان ابو قیر ہی سے قوالہ واپس جانا چاہتا تھا۔ قبطان پاشا نے وعدہ کر لیا کہ اگر میں منصوبے کو کامیاب بنا دیا تو وہ سلیمان کی جگہ بے بک باشی مقرر کرے گا۔ پھر وہی ہوا جو قبطان پاشا چاہتا تھا جیسے ہی ممالک کشتیاں اسکندریہ کی طرف بڑھیں' میں نے ان پر اچانک حملہ کر دیا۔ ان کشتیوں پر ممالک کے منتخب سردار تھے جن میں

ہوئے اور جو زخمی ہو کر زندہ بچ گئے' انھیں گرفتار کر کے میں اپنے جہاز پر لے آیا۔ انھی مفسدوں میں عثمان بھی تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس سے میری ملاقات نوجوانی کے زمانے میں قوالہ میں ہوئی تھی۔ اب وہ ممالک کا سردار بن چکا تھا۔ اس نے مجھے اور میں نے اسے پہچان لیا تھا پھر ہم نے ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ اس خفی واقعے کی خبر برطانوی سفیر کو ہوئی تو وہ بڑا برہم ہوا کیوں کہ اس معاملے میں اس کا نام استعمال کیا گیا تھا۔ قبطان پاشا مطلقاً ''بروپوش ہو گیا۔ اس نے مجھے حالات سے مطلع کرایا پھر برطانوی سفیر جنرل بالان کی طلبی پر میں نے ان نازک حالات میں سوجھ بوجھ اور بردباری کا ثبوت دیا۔ برطانوی سفیر نے کہا کہ میں فوری طور پر تمام ممالک قیدیوں کو اس کے حوالے کر دوں میں نے سفیر کو حتمی الامکان یقین دلایا اس کا معاملہ تسلیم کر لیا۔ میں اسکندریہ سے لوٹا تو قبطان پاشا مجھ سے آگ بگولا۔ وہ بے حد خوش تھا کہ اس سازش کو میں نے کامیاب بنا دیا۔ اس نے قیدیوں کو اسکندریہ بھیجنے کی اجازت دے دی اب وہ مجھے قاہرہ بھیجنا چاہتا تھا۔ جہاں خسرو پاشا پہنچنے والا تھا۔ اس نے مجھے ملک باشی بنا دیا اور خسرو پاشا کے نام ایک۔ سفارشی خط بھی لکھا۔ میرا دل اندیشوں کا شکار ہو گیا۔ کیا میں اپنے خسرو پاشا کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاؤں گا؟ وہ مصر میں ایک مطلق العنان حکمران ایسی حیثیت رکھتا تھا اگر اسے میری اندرونی شورش کا پتہ چل جاتا تو یہ یک جنبش' ابد میری ہلاکت کا سامان کر سکتا تھا۔ میں عنقریب سخت آزمائش میں پڑنے والا تھا میری ذرا سی لغزش مجھے موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔

قبطان پاشا چلا گیا تو میں عثمان بک کو لے کر اسکندریہ روانہ ہو گیا۔ وہاں میں نے اسے برطانوی سفیر کے حوالے کیا اور لوٹ آیا اگلی صبح روز میں نے اپنے دوست سلیمان کو قوالہ روانہ کر دیا اور خود قاہرہ روانہ ہو گیا۔ وہاں میری ملاقات خسرو پاشا سے ہوئی۔ میں نے اپنے دل جذبات کو چھپا کر خود کو اس کا فرمان بردار ظاہر کیا۔ کچھ روز وقد کے بعد اسے غالباً میری بات پر یقین آ گیا۔ بہت جلد خسرو پاشا نے مجھ پر اعتبار کر کے مجھے البانی فوج کا سالار بنا دیا پھر اس نے ممالک کو ختم کرنے کے لیے ایک بڑے حملے کا منصوبہ بنایا۔ ممالک سے پہلا ٹکراؤ یوسف بک کا ہونا تھا۔ یہ سالار خسرو پاشا کا چہیتا تھا اگر یوسف بک کو ممالک کے مقابلے پر شکست دی جاتی تو مجھے اپنی فوج لے کر آگے بڑھنا تھا۔ پھر وہ مجھے اپنی حسین و جمیل بیٹی' بلیدہ کے سپرد کر کے میدان جنگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ شیخ البلد کی بیٹی بلیدہ بھی بہت پسند آئی۔ وہ واقعی انتہائی خوبصورت تھی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ اگر وہ میرے ہاتھ پاؤں کھول دے گی تو میں اس کے باپ کی واپسی تک ہرگز فرار ہونے کی کوشش نہیں کروں گا۔ اس نے اپنے تئیں میں لا کر مجھے آزاد کر دیا اور پھر کیا کہنا بھی میں نے اسی کے ساتھ کھایا جب آفتاب غروب ہو گیا تو اس نے خیمے میں چراغ جلا دیا اور پھر میری بے بسی کی خاطر اندر آ ہو گئی۔ اس کی آواز میں بھی بیزاری تھی۔ وہ گیت سنا چکی تو کسی شخص نے آکر اطلاع دی کہ شیخ حسان اپنے کسی مہمان کے ساتھ میدان جنگ سے لوٹ کر خیمے کی طرف آ رہا ہے۔ یقیناً جنگ کا فیصلہ ہو چکا تھا جنگ کے فیصلے ہی پر میری زندگی اور میرے مستقبل کا دارومدار تھا کیوں کہ میں بہرحال ممالک کا قیدی تھا وہ میرے ساتھ کچھ بھی سلوک کر سکتے تھے۔ ممکن ہے اپنی شکست کی وجہ سے ممالک مجھے بہ طور یرغمال استعمال کرتے اور اس طرح خسرو پاشا پر دباؤ ڈالتے۔ مجھے وسوسوں اور اندیشوں نے گھیر لیا۔ عقل غیر یقینی تھا۔

شیخ حسان کے ساتھ آنے والا عثمان بک تھا۔ اس سے مل کر میرے تمام خدشات دور ہو گئے۔ اس نے میری طرف تجدید دوستی کے لیے ہاتھ بڑھایا اور میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں ممالک کے ساتھ مل جاؤں۔ میں نے اس سے سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے مہلت لے لی اور اپنی فوج کے درمیان واپس آیا۔ یوسف بک کو ممالک کے مقابلے میں شکست ہو گئی تھی۔ پھر البانی سپاہ کے ساتھ قاہرہ پہنچ گیا۔ اب میں خسرو پاشا پر پہلی ضرب لگانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ میرے اشارے پر سپاہیوں نے خسرو پاشا کے محافظوں کا مقابلہ کر دیا۔ جواب طلبی کی صورتحال بدل گئی۔ خسرو پاشا نے ایک بیٹے کا وعدہ کیا اور سپاہی میرے کہنے پر

واپس چلے گئے۔ اب خسرو پاشا اور میرے درمیان طے ہو چکی تھی، مگر میرے سامنے وہ بے دست و پا تھا۔ اسی دوران میں طاہر پاشا کے آنے کی خبر ملی۔ میں نے اسے خفیہ پیغام بھیجا کہ جلد اپنے ساتھیوں کے ساتھ قاہرہ پہنچ جائے کیونکہ خسرو پاشا واجبات ادا کرنا نہیں چاہتا۔ خسرو پاشا نے طاہر پاشا کو کسی اور طرف نکل جانے اور قاہرہ نہ آنے کا حکم بھیجا، مگر اسے پہلے ہی میرا پیغام مل چکا تھا۔ وہ دوسرے راستے فوج کو لے کر قاہرہ پہنچ گیا۔ نتیجہ میری توقع کے مطابق نکلا۔ طاہر پاشا کی فوج نے بھی مطالبہ کر دیا اور پھر حالات سنگین ہوتے گئے۔ فوج نے عام بغاوت کر دی۔ اسی دوران میں خسرو پاشا نے مجھے بلوا کر اپنے حق میں کرنا چاہا اور میری خواہش ظاہر کی۔ اس کا بڑا حصہ میں نے اپنے سپاہیوں میں تقسیم کر دیا۔ اور ہر طاہر پاشا کی فوج نے میرٹھی کا گھیراؤ کر لیا۔ میر مٹھی نے خسرو پاشا کے اشارے پر سپاہیوں سے کہہ دیا کہ محمد علی کو تمہاری تنخواہیں ادا کی جا چکی ہیں، اس سے جا کر لے لو۔ سپاہیوں نے میرے گھر کا گھیراؤ کر لیا۔ میں نے جو قلعہ خسرو پاشا کے لیے کھڑا کیا تھا، وہ اب میرے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ میرے قصر میں کتنے کے لگ بھگ غلام اور خدام تھے۔ میں اسی لیے سخت پریشان تھا۔ یہ بھی ممکن نہیں رہا تھا کہ میں اپنے لشکر کو مدد کے لیے بلاتا۔ بالفرض میں ایسا کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو اس وقت تک مشتعل ہجوم مجھے اور میرے خادموں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر چکا ہوتا۔

اب آپ آگے پڑھیں

کچھ دیر میں اس حسین عورت کو دعا کرتے دیکھتا رہا۔ اس وقت اس کے چہرے پر بڑی پاکیزگی اور تقدس تھا اور یہ تقدس شاید محبت کا تھا۔ اب میرا وہاں رکنا بے معنی تھا مگر میں نے جیسے ہی واپسی کے لیے قدم اٹھایا، کمرے کی طرف سے کسی خادمہ کی آواز سنی جو نفیسہ سے مخاطب تھی۔

"بیگم صاحبہ! کچھ لوگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" خادمہ کی آواز میں اضطراب تھا۔

"کون مجھ سے ملنے آیا ہے؟ اور تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟" نفیسہ نے سوال کیا۔

میں جاتے جاتے رک گیا اور دوبارہ دروازے کی جھری سے آنکھ لگا دی۔

"حضور! وہ قاضی شہریں اور ان کے ساتھ سپاہی بھی ہیں۔" خادمہ نے جواب دیا اور میں چونک اٹھا۔

"کیا کہتی ہے تو۔" نفیسہ برافروختہ ہو گئی۔ "کیا سرکاری پیادے بے اجازت میرے گھر میں گھس آئیں گے کیا چاہتے ہیں وہ؟ تو نے ان سے آنے کی وجہ دریافت نہیں کی؟"

"قاضی نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ وہ پاشا کا پیغام لے کر آئے ہیں۔" خادمہ نے جواب دیا۔

"اگر وہ اس لیے آئے ہیں تو آنے دے۔" نفیسہ کا لہجہ نرم پڑ گیا۔

خادمہ الٹے قدموں واپس ہوئی اور میں خاموشی سے تماشا دیکھنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد قاضی اور اس کے ساتھ سپاہی اندر داخل ہوئے۔ قاضی نے نفیسہ کے سامنے جھک کر کہا۔ "حضور! پاشا نے ملاقات کے لیے اسی وقت آپ کو قلعے میں طلب کیا ہے آپ میرے ساتھ چلیے۔" اس کے لہجے میں ادب و احترام تھا۔

"اس نے مجھے کیوں بلایا ہے؟ مجھ سے بھلا اسے کیا غرض!" نفیسہ بولی۔

"مجھے اس کا علم نہیں۔" قاضی نے جواباً کہا۔ "اس نے مجھے یہ خط دیا ہے۔" یہ کہہ کر قاضی نے ایک سربمہر خط نکال کر نفیسہ کو پیش کیا۔

نفیسہ نے وہ خط لے لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "بے شک یہ پاشا کی مہر ہے، مگر مجھے یقین نہیں، میں اسی وقت چلتی ہوں میری سواری دروازے پر لگانے کا حکم دے دو۔" نفیسہ کے لہجے میں ابھی تک وہ شان تھی۔

اسی کو یہ جز تعمیل کے اور کچھ نہ بن پڑا۔ وہ خود ہی سے نکل گیا۔ پھر ذرا دیر بعد واپس آ کر بولا۔ لے یہ حکم بھی ہے کہ آپ کی غیر موجودگی میں آپ ان پر پہرا بٹھا دوں۔" قاضی نے کچھ جھجکتے ہوئے ہ ایسی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ "وجہ یہ کہ آپ کے پیچھے کوئی آ جانہ سکے۔"

تمہارا جو جی چاہے کرو۔ پاشا خود مختار ہے، جو کچھ اس میں آتا ہے کرتا ہے۔ اس کے لیے کوئی قاعدہ ہے، لیکن تم جو کتنے ہو کسی کو یہاں آنے جانے گے اس کی پروا نہیں۔ یہ اوروں سے جا کر کہو، میں سے نہیں ڈرتی۔ مجھے یقین ہے کہ پاشا نے ساتھ لینے سے منع کیا ہو گا کیوں کہ مراد بک کی لوگوں کے باہر نہیں نکل سکتی۔"

روکنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ آپ جسے چاہیں ساتھ لیں۔" قاضی نے کہا۔

ے ساتھ دو لونڈیاں جائیں گی۔" یہ کہہ کر نفیسہ وقار سے اٹھی اور پھر کمرے سے نکل گئی۔ قاضی ہی کے پیچھے تھے۔ میں نے کمرے کے باہر سے آواز آتے سنی۔ غالباً وہ اپنی خادماؤں سے مخاطب کسی سے نہ ڈرنا! قاضی تمہاری حفاظت کے لیے رہے گا۔"

پاشا کی عیاری کو میں کچھ کچھ سمجھ رہا تھا، لیکن وہ خود بھی اپنی قبر کھود رہا تھا۔ اس نے نفیسہ پر ہاتھ اور اپنی بدبختی کو آزمانا چاہا تھا۔

دیر بعد ہی خفیہ دروازے سے باہر آ گیا۔ اب چادر اوڑھ لی تھی اور چہرہ بڑی حد تک چھپا لیا بازار میں پہنچا تو نفیسہ کی سواری کو دیکھا۔ بازار تھا۔ نفیسہ کی گاڑی سے لوگوں کو ادھر ادھر منتشر پھر میں نے دیکھا کہ نفیسہ نے گاڑی کا پردہ ہٹا دیا چہرے سے نقاب بھی الگ کر دی۔ میں اس کا چاہتی تھی کہ لوگ اسے پہچان لیں اور بھی جان لیں کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے! کچھ ہی دیر میں حقیقت حال کا علم ہو گیا، پھر تو گاڑی کے پیچھے ہو لیے۔ قلعہ تک دروازے پر پہنچ گئی تو دروازہ کھولا۔ نفیسہ اور اس کی خادماؤں کے ساتھ، قاضی وغیرہ کے اندر جاتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔

لوگ چیخنے لگے۔ "پاشا نے ہماری سیدہ کو گرفتار کر لیا ہے۔ ہم اسے پاشا کی قید سے چھڑا لیں گے۔"

وہاں سے میں نے اپنے قصر کا رخ کیا۔ جاتے ہی مجھے معلوم ہوا کہ خسرو پاشا کا قاصد دو بار آ کے جا چکا ہے۔ خسرو پاشا نے مجھے بلایا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ خسرو پاشا میری موجودگی میں نفیسہ سے گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ میں فوراً ہی قلعے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب میرا چہرہ چادر میں چھپا ہوا نہیں تھا۔

ادھر قاضی، نفیسہ کو لیے خسرو پاشا کے محل تک پہنچا، ادھر میں تیز تیز قدم اٹھاتا وہاں پہنچ گیا۔ میں نے دانستہ مختصر راستہ اختیار کیا تھا۔ پھر نفیسہ کے اندر جانے سے پہلے میں، خسرو پاشا کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مسند پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے بڑی خوش دلی سے میرا استقبال کیا اور بولا۔ "اے محمد علی! تم بروقت پہنچے۔ ابھی خادم مجھ سے نفیسہ کو پیش کرنے کی اجازت لے کر گیا ہے۔"

اس کے الفاظ ختم ہوئے تھے کہ نشست گاہ کا پردہ اٹھا اور نفیسہ اندر آ گئی۔ وہ چند قدم آگے بڑھ کر خسرو پاشا کے سامنے کھڑی ہو گئی اور بڑے جاہ و جلال سے اس کی طرف دیکھا۔ خسرو پاشا نے اسے سلام کیا۔ میں خاموشی کے ساتھ نفیسہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھ پر ایک نظر ڈال کر خسرو پاشا کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

"میں تجھے سلام کا جواب نہیں دوں گی کیوں کہ تو نے مجھے اپنے سپاہی بھیج کر یہاں بلوایا ہے۔" نفیسہ کا لہجہ سخت اور گستاخانہ تھا۔ "کیا تو نے سلام و جواب کے لیے مجھے بلوایا ہے؟"

"میں نے آپ کو صرف سلام کرنے کے لیے نہیں بلوایا۔ مہربانی کر کے مسند پر بیٹھ جائیں تاکہ برابر بیٹھ کر گفتگو ہو۔" خسرو پاشا جواباً بولا۔

"برابر بیٹھ کر دوست اور مصاحب گفتگو کرتے ہیں اور میں نہ تمہاری دوست ہوں، نہ مصاحب! خیر۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی اور مسند پر بیٹھ گئی۔

نفیسہ بیٹھ گئی تو خسرو پاشا نے نرمی سے کہا۔ "آپ اس طرح یہاں بلائے جانے پر کبیدہ خاطر نہ ہوں۔ میں آپ سے ایک اہم معاملے پر گفتگو کرنے والا ہوں، جو بدقسمتی سے آپ کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔" اس کے لہجے میں

عیاری جھلکتے تھے۔ ”آپ جانتی ہیں کہ غلاموں کے افعال کے جواب وہ ان کے آقا ہوتے ہیں۔ میں نے اسی وجہ سے آپ کو بلایا ہے کہ آپ کے داروغہ یوسف کی حرکت کا آپ سے جواب طلب کروں۔“

”غلام اگر کوئی برا کام کرے اور آقا اسے اپنے پاس سے نکال دے، تب تو وہ جواب دہ ہو سکتا ہے۔ بتاؤ کہ میرے داروغہ نے کیا برا کام کیا ہے؟“ نفیسہ نے بہ ظاہر بے جھجک ہو کر کہا مگر مجھ سے اس کے لہجے کا اضطراب چھپا نہ رہ سکا۔ مجھے علم ہو چکا تھا کہ وہ اپنے داروغہ یوسف کو چاہتی ہے۔ اضطراب کی یہی وجہ ہو سکتی ہے۔

خسرو پاشا نے نفیسہ کی بات سن کر کہا۔ ”آپ کا داروغہ یوسف میری فوج کو نافرمانی پر ابھارتا ہے اور بغاوت کی ترغیب دیتا ہے۔“

”یہ بالکل جھوٹ ہے اور سراسر بہتان ہے!“ نفیسہ نے قریباً چیخ کر تردید کی۔ ”میرے داروغہ نے ہرگز ایسا نہیں کیا۔ وہ راست باز اور امانت دار ہے۔ تم اس بہتان کو سچ نہ جانو۔“

”اس کی تصدیق ہو چکی ہے۔“ خسرو پاشا مکاری سے مسکرایا۔ یوسف نے میرے ایک سپاہی کو ورغلایا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر عثمان بک بردبی کے لشکر میں مل جائے۔ اگرچہ یوسف نے اسے بہت لالچ دیا، لیکن خوش قسمتی سے سپاہی اس پر آمادہ نہ ہوا۔ وہ میرا وفادار تھا۔ اس نے مجھے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ اس کا ثبوت یہ ہے۔“ خسرو پاشا نے اپنی جیب سے ایک پرچہ نکالا اور اسے دور سے دکھا کر کہنے لگا۔ ”یہ خط یوسف نے صادق آغا کے پاس بھیجا تھا۔ خط میں اس نے وعدہ کیا ہے کہ اگر تم عثمان بک کے لشکر میں چلے جاؤ گے تو تمہاری منہ مانگی مراد پوری کر دی جائے گی۔ کیا آپ اس ثبوت پر اکتفا کریں گی کیوں کہ یہ اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور اس پر اسی کی مہر ہے۔“

”یقیناً یہ کوئی فریب ہے۔“ نفیسہ نے برجستہ کہا۔ ”یوسف! اس کمینہ تہمت سے بالکل بری ہے۔ مجھے یہ خط دو تاکہ میں اسے بہ غور دیکھوں۔ میں اپنے داروغہ کا خط اور مہر پہچانتی ہوں۔“

خسرو پاشا نے وہ خط نفیسہ کو دینے کی بجائے دوبارہ اسے اپنی جیب میں رکھ لیا اور بولا۔ ”میرے نزدیک خط دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے اس کے جرم کا یقین ہے۔ اس خیانت کی وجہ سے وہ سزا کا مستحق ہے۔ یہ میں کہہ چکا ہوں کہ غلاموں کے افعال کی ذمے داری ان آقاؤں پر ہوتی ہے، اس لیے آپ اس جرم کی ذمے داری سے بری ہیں۔“

”یہ درست نہیں کیوں کہ یوسف میرا خادم نہیں ہے۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ میری خدمت سے سبکدوش ہو چکا ہے۔ میں اس وجہ سے نہیں کہہ رہی کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے یا اس نے میری خدمت کوتاہی کی ہے جو میں نے اس کو سبکدوش کر دیا، حقیقت یہ ہے کہ میں اس کی خیانت دیکھ چکی ہوں۔ میں ہوں کہ وہ اس لیے پیدا نہیں ہوا کہ میری خدمت میں زندگی گزار دے اور اقبال مندی سے محروم رہے۔ میں نے اسی لیے اسے آزاد کر دیا تاکہ اسے اپنی شجاعت اور کامیاب ہونے کا موقع مل جائے۔ وہ تلوار چلانے بہادری ثابت کر دکھائے۔ وہ عثمان بک کے لشکر میں ہونے کے لیے گیا ہے۔“ نفیسہ نے بغیر کسی جھجک کر دیا۔

”آپ نے خود ہی اقرار کر لیا کہ مراد بک کی وہ اپنے گھر میں فوج مرتب کرتی اور ہمارے دشمنوں کو بھیجتی ہے!“ خسرو پاشا کے لہجے میں چبھن تھی۔

”کیا پھر تم امید رکھتے ہو کہ ممالیک کی سردار کی مرتب کر کے اپنے شوہر کے دشمنوں کے پاس نفیسہ نے بھی تیکھی بہ تیکی کا جواب دیا۔ ”تم نے بات سمجھنے میں غلطی کی۔ سنو! میں لشکر مرتب نہیں لگی رہتی۔ یوسف کو میرا خاوند کہہ سنی میں نے اس نے بیٹے کی طرح یوسف کی پرورش کی۔ جب شوہر کا انتقال ہو گیا تو وہ میرے ہی گھر میں رہا، دل گمنامی سے آشنا گیا۔ اس نے اسی لیے خواہش اسے اپنی خدمت سے آزاد کر دوں۔ میں نے ایسا یقین کو کہ وہ اس تہمت سے بری ہے۔ اس نے نہیں لکھا۔“

”لیکن آپ اتنے یقین سے یہ بات کس طرح کہہ ہیں کہ یہ خط اس کا لکھا ہوا نہیں؟“ میں نے پہلی بار مداخلت کی تاکہ خسرو پاشا کو یہ مایوسی نہ ہو کہ اس مجھے خواہ مخواہ بلوایا اور یہ کہ میں نے تحقیقات میں اس کی مدد نہیں کی۔

نفیسہ نے میری طرف نگاہ اٹھائی اور پھر جب مجھ سے مخاطب ہوئی تو اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ ”اگر میں تمہیں یقین میں غلطی نہیں کر رہی تو تم محمد علی ہو۔“ پھر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی دوبارہ بول اٹھی۔ ”یقیناً یہ اجازت خسرو پاشا ہی نے دی ہوگی کہ تم بھی مجھ سے سوال کر سکو اس وقت یہاں نہ ہوتے۔ بہرحال میں تمہارے سوال کا جواب پاشا کا سوال جان کر جواب دوں گی۔ پھر اس نے انکشاف کیا جس سے خسرو پاشا کی ساری عیاری دھری کی دھری رہ گئی۔ ”خسرو پاشا نے شاید اس لیے غور نہیں کیا نفیسہ نے بتایا۔ ”یوسف پڑھا لکھا نہیں۔ وہ لکھنا جانتا۔ پھر وہ یہ خط کس طرح لکھ سکتا ہے! ہاں وہ کاغذ پر ایسے نقوش ضرور بنا سکتا ہے جو بھی نہ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کا رخ خسرو پاشا طرف تھا اور اس کے لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔

”بہت بے باکی اور ڈھٹائی سے گفتگو کر رہی ہو!“ خسرو پاشا غالباً اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ”کیوں کہ نفیسہ بے باکی اور ڈھٹائی میں تم مجھ سے زیادہ ہو۔“ نفیسہ کے لہجے میں بولی۔ ”تمہیں اس کا بھی احساس نہیں کہ تم ایک دانش اور شریف عورت سے ہمکلام ہو اور اس بات کا عجیب لگا رہے ہو!“

”میں نے تمہاری ذرا بھی اہانت نہیں کی۔“ خسرو پاشا نے کہا۔ ”تم خود اقرار کر چکی ہو کہ غلاموں کے افعال کی ذمے داری ان کے آقاؤں پر ہوتی ہے۔ اس طرح تم نے اقرار جرم کر لیا ہے۔ تم پہ الزام ہے کہ تمہارے غلام نے فوج کو سرکشی پر ابھارا ہے۔ میں نے اس کے سوا اور کیا کہا ہے؟“

”بکواس!“ نفیسہ بلند آواز میں بولی۔ اس کی آواز میں غصہ تھا۔ ”تو نے میرے ساتھ بدسلوکی کی ہے۔ میری طرف سے مجھے رسوا کیا ہے۔ میں مراد بک کی بیوہ ہوں! تو نے میرے پیادوں سے پکڑوا کر بلایا۔ ہاں تو نے ایک شریف زادی عورت کی اہانت کی ہے۔ کیا تو اس ملک کے رسم و رواج سے آگاہ نہیں ہے؟ کیا تو نہیں جانتا کہ جب کسی عورت کو اپنے سپاہیوں سے پکڑوا کر بلوائے گا تو اس کی عزت پر داغ لگ جائے گا؟ ایسا داغ جو قیامت تک نہیں چھوٹ سکتا۔ وہ عورت ذلیل و خوار ہو جائے گی۔ لوگ اسے ہدف ملامت بنائیں گے!“

”تمہیں ہرگز برافروختہ نہیں ہونا چاہیے!“ خسرو پاشا اپنی بات پر اڑا رہا۔ ”تم جو کچھ بیان کر رہی ہو۔ میں نے ہرگز وہ نہیں کیا۔ میں نے تمہارے بلانے کے لیے قاضی کو روانہ کیا۔ تمہیں تو اس رعایت سے خوش ہونا چاہیے تھا کہ اس بحث سے حاصل کیا ہم تمہیں تمہارے غلام کے جرم کا ذمے دار قرار دیتے ہیں۔ تمہیں بہرحال اس کی سزا بھگتنا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے۔ تو پھر اس جرم میں تم میرے قتل کا حکم دے دو۔ اس کے بعد تم دیکھو گے کہ نہ صرف اہل مصر بلکہ ساری دنیا تمہیں قاتل کے نام سے پکارے گی۔“

”تم ناحق برہم غصے کو بھڑکا رہی ہو۔ تمہیں تو یہ چاہیے تھا کہ اپنے غلام کے لیے مجھ سے معافی کی درخواست کرتیں۔ مجھ سے التجا کرتیں کہ میں اس خط کو پھاڑ دوں جس سے اس کا جرم ثابت ہوتا اور فوج کو خوش کرنے کے لیے مجھے کچھ مال دیتیں۔“ خسرو پاشا کی زبان پر آخر حرف مدعا آ ہی گیا۔

”مراد بک کی بیوہ کے پاس مال کہاں! تم نے میرے گھر پر سپاہی مقرر کیے ہیں، انہیں حکم دے دو کہ مال تلاش کریں اور جو کچھ مل جائے لے لیں۔ یقیناً میں پہلے مال رد تھی، لیکن لڑائیوں اور فوج کے مصارف میں سب خرچ ہو گیا۔ پھر بھی فرض کیا، تمہارے خیال کے موافق میرے پاس مال ہے بھی تو میں اسے اپنے شوہر کے دشمنوں کو دینے کی بجائے دریائے نیل میں ڈال دینا بہتر سمجھوں گی۔“ نفیسہ کا لہجہ تند و تیز ہو گیا۔ ”اب مجھے تم سے مزید کچھ نہیں کہنا۔ ہاں میرا داروغہ اس تہمت سے بری ہے۔ جو اس پر تہمت لگائے وہ جھوٹا ہے! اگر تم اب بھی مجھے سزا دینے پر اڑے ہو تو جو کچھ کرنا ہے کر لو! خیانت اور غداری کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہے، لیکن میں تمہیں آگاہ کرتی ہوں کہ اگر تم نے مجھے قتل کیا تو آفتاب غروب ہونے سے پہلے تم ذلت و خواری، محتاجی و تنگ دستی کے ساتھ اس ملک سے نکال دیے جاؤ گے۔ پھر تم دور سے اس ملک کو بہ حسرت دیکھو گے جس میں اس وقت عیش کر رہے ہو اور اپنی قسمت کو روؤ گے!“

”اگر ہمارے اندر اتنی قوت ہے کہ مجرموں کو سزا دے

کیں تو تمھاری باتوں پر غور کرنے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔" خسرو پاشا نے گاگوا ری سے کہا۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف جا کر خواجہ سرا کو آواز دی۔ خواجہ سرا اندر آگیا تو اس سے خسرو پاشا نے کہا۔ "اس عورت کو پرانے قلعے میں شیخ حسنی کے یہاں لے جاؤ۔ ان سے کہہ دینا کہ وہ اس کی اچھی طرح حفاظت کریں اور کسی کو اس کے پاس نہ آنے دیں۔"

"نہیں یوں کہنا!" نفیسہ خواجہ سرا کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔ "کہنا کہ وہ مجھے حراست میں رکھے اور اس وحشت ناک قید خانے کی حفاظت کرے۔" یہ کہہ کر وہ خسرو پاشا کی طرف پلٹی۔ "اے خسرو! میں رخصت ہوتی ہوں اور قید خانے میں جاتی ہوں۔ میں دعا کروں گی کہ اگر خدا نے تمہیں دل دیا ہو تو اسے خوش رکھے۔" اس کے آخری جملے میں بڑا طنز تھا۔ پھر اس کے قدم دروازے کی طرف اٹھ گئے۔ خواجہ سرا اس کے پیچھے تھا۔

جب نفیسہ چلی گئی تو خسرو پاشا میری طرف متوجہ ہوا' "اے محمد علی! میں نے تمہیں یہاں اس لیے بلایا تھا کہ تمھاری رائے معلوم کر سکوں۔ میرے اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو تم نے سن لی اور یقیناً یہ اندازہ بھی تم نے کر لیا ہو گا کہ اسے بچانے کے لیے میں نے کیا جال بچھایا ہے! اب یہ بتاؤ کیا وہ مال دے دے گی؟"

"آسانی سے نہیں!" میں نے محتاط انداز میں کہا۔

"یعنی؟" اس نے وضاحت چاہی۔

"اس پر سختی کرنا پڑے گی۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا یہ کم سختی ہے کہ میں نے اسے گویا مال ادا نہ کرنے تک قید کر لیا؟" خسرو پاشا بولا۔

"وہ مراد یک کی بیوہ ہے' کوئی معمولی عورت نہیں۔ اسے اپنے اثر و رسوخ اور طاقت کا اندازہ ہے۔ وہ بہرحال آسانی سے نہیں جھکے گی۔ اس کے لیے یہ قید ہر چند کہ تو ہین ہے' مگر میرا اندازہ ہے کہ اسے وہ برداشت کرلے گی۔" میں نے کہا۔

"پھر۔ پھر کیا کیا جائے؟" وہ بڑے بھولپن سے بولا۔ "اس سے کس طرح مال نکلوایا جائے؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے جن سپاہیوں کو اس کے قصر کی نگرانی پر مامور کیا ہے' انھیں کوئی خاص حکم بھی دیا ہو گا!" میں مسکرایا۔

"محمد علی! تم واقعی بہت ذہین ہو۔" وہ بھی مسکرایا۔ "میں نے انھیں ایک خاص حکم دیا ہے۔"

"اور وہ یہ کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر قصر کی ا... لے لیں اور۔"

میری بات کاٹ کر وہ زور سے ہنس پڑا' پھر بولا۔ "... خوب!"

اسی وقت باہر سے تیز تیز نعروں اور شور کی آوا... آنے لگیں۔ خسرو پاشا نے ایک خادم کو طلب کر کے ا... وجہ دریافت کی۔

"قلعے کے دروازے پر بے شمار لوگ جمع ہیں ... نفیسہ کی رہائی کا مطالبہ کر رہے ہیں" خادم نے بتا... "انھیں بہ جبر پیچھے دھکیل دیا جائے!" خسرو پا... کہنے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ اس طرح میرا مقصد ... ہو گیا۔ اس اضافہ تھا۔ خادم حکم سن کر الٹے قدموں واپس ہو گیا۔

"کیا لوگ دیوانے ہو گئے ہیں؟" خسرو پاشا ... طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں۔" میں بولا۔ نفیسہ کے حسن نے انھیں ... دیا ہے۔" میں نے ایک اور چال چلی۔

خسرو پاشا پر میری بات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ ... میں کھو گیا۔

"عالیٰ" آپ' نفیسہ کو اپنے حرم کی زینت بنا... کر رہے ہیں۔" میں نے شہ دی۔

"کاش ایسا ہو سکتا!" اس کا لہو اس کے دل کی ... پر آگئی۔

"اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے قلعے سے ... دیں' کسی نہ کسی بہانے یہیں رکھیں۔" میں نے مشورہ ... "تم ٹھیک کہتے ہو۔" خسرو پاشا تائید میں بولا۔

پھر میں نے رخصت کی اجازت چاہی کیوں کہ ... چال چلنا تھی' چل چکا تھا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح پھر میری طلبی ہو گئی۔ دوران میں مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ لوگ رات بھر ... اطراف جمع ہوتے رہے ہیں اور نفیسہ کی رہائی ... نعرے لگاتے رہے ہیں۔ قلعے کے دروازے ... ہٹانے کے لیے جو تشدد کیا گیا تھا' اس سے وہ اور ... تھے۔ مجھے یہ اطلاع بھی ملی کہ شیخ حسنی بھی ان حالا... گھبرا گیا ہے' جس کی قید میں نفیسہ تھی۔ اس نے ا...

تھا کہ اگر مشتعل ہجوم اس کے گھر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ اپنی جان بچانے کی خاطر نفیسہ کو اس کے حوالے کر دے گا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا' خسرو پاشا کے لیے حالات سنگین ہوتے جا رہے تھے۔

میں تیار ہو کر خسرو پاشا کے پاس پہنچا تو وہ عالم اضطراب میں ٹہل رہا تھا۔ مجھے اندر آتے دیکھ کر وہ رک گیا' پھر میرے سلام کا جواب دے کر فکرمند اور مشتعل سے لہجے میں بولا۔ "نفیسہ کے قصر میں مال نہیں ملا۔ سپاہیوں نے رات کو اچھی طرح تلاشی لی ہے اور مجھے خبر دی ہے کہ وہاں کچھ نہیں۔ تم تو کہتے تھے کہ۔"

خسرو پاشا کی بات سن کر میں ہنس پڑا اور وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ میں نے کہا۔ "کیا میں نے کل نہ کہا تھا کہ مال اتنی آسانی سے نہیں ملے گا؟ وہ عورت اتنی بھولی نہیں کہ یوں مال کو کھلا چھوڑ دے۔ یقیناً" اس نے حفاظت کی خاطر کہیں نہ کہیں مال کو چھپا کر رکھا ہو گا تاکہ اسے بہ آسانی حاصل نہ کیا جا سکے۔"

"تو پھر اس کا سراغ کیسے لگے گا؟" خسرو پاشا نے سوال کیا۔

"اس کے متعلق نفیسہ ہی بتا سکتی ہے۔" میں نے جواب دیا' پھر بولا۔ "اور اس کے لیے اس پر سختی کی ضرورت ہے!"

"سختی۔ مگر حالات؟۔ لوگ تو اس کی رہائی کے لیے دیوانے ہوئے جا رہے ہیں۔ حالات بگڑتے ہی چلے جا رہے ہیں' کہیں عام بغاوت نہ ہو جائے!"

"کوئی قدم اٹھا کر ایک دم پیچھے ہٹا لینا مناسب نہیں ہوتا۔ اس سے لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حکومت کمزور ہے۔"

ابھی میری بات ختم ہوئی تھی کہ ایک خواجہ سرا اندر آگیا۔ خسرو پاشا نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے کہا کہ علما و مشائخ شہر ملنا چاہتے ہیں۔ خسرو پاشا نے اجازت دے دی۔ کچھ دیر بعد ہی شیخ الاسلام اور ان کے ہمراہ بہت سے علما وہاں آگئے۔ گفتگو میں پہل شیخ الاسلام نے کی۔ انھوں نے کہا۔ "ہم اپنی اور اہل شہر کی طرف سے نفیسہ کی رہائی کا مطالبہ کرنے حاضر ہوئے ہیں۔ نفیسہ کو چھوڑ دیجیے۔ جس مکان سے وہ ذلت و رسوائی کے ساتھ نکالی گئی ہے' اسے عزت کے ساتھ وہیں پہنچا دیجیے۔ جو سپاہی پہرا دینے کے لیے اس کے قصر پر مقرر کیے گئے تھے' انھوں نے بھیڑیوں کی طرح اس کے مکان کو تباہ کر ڈالا ہے۔ کل اسباب ادھر سے ادھر کر دیا گیا ہے۔ کوئی چیز اپنی جگہ نہیں رہی۔ عالیٰ" ان کا خیال تھا کہ انھیں وہاں کچھ اشیا اور مال ملے گا' لیکن کچھ ہاتھ نہ آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نفیسہ کو بہت مال دار خیال کرتے تھے اور اسے ناقابل عفو گناہ کا مجرم سمجھتے تھے اسی وجہ سے ان کی یہ جرات ہوئی۔"

"ہاں وہ مجرم ہے۔" خسرو پاشا نے جواب میں کہا۔ نفیسہ پر اس کے غلام یوسف کے ساتھ جرم میں شرکت ثابت ہوئی ہے۔ وہ جرم یہ ہے کہ یوسف نے میرے ایک وفادار سپاہی کو مجروح کیا۔ اسے نے اس پر زور دیا کہ وہ مجھے چھوڑ کر ممالیک کے ساتھ مل جائے۔ مجھے اس کا ثبوت یوسف کے خط سے ملا جو آپ کو دکھا سکتا ہوں۔ میں نے نفیسہ کو صرف اپنی فوج کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے یہاں بلایا ہے' کیوں کہ اگر وہ اسے باغیانہ طور پر پیش آتے۔ نفیسہ کی باتوں سے یہ معلوم ہو گیا کہ وہ اپنے داروغہ کے فعل کو تسلیم کرتی ہے اور وہ بھی اس خیانت میں شریک تھی۔ وہ اس وقت میرے اختیار میں ہے۔ اسے سزا دینا ضروری ہے' لیکن میں آپ لوگوں کی خاطر اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کروں گا۔"

"لیکن ہماری شریعت میں اس قصاص کا کہیں ذکر نہیں۔" شیخ الاسلام نے کہا۔ "اگر نفیسہ واقعی مجرم ہے تو مال اس کا معاوضہ نہیں ہو سکتا۔ خیر جو بھی ہو' ہم خود اس کی تحقیقات کرنا چاہتے ہیں تاکہ حکم لگا سکیں' نفیسہ مجرم ہے یا نہیں!"

"کیا آپ کو محترم پاشا کے بیان پر یقین نہیں ہے؟" میں نے مخفی میں اس لیے مداخلت کی کہ معاملے کو بگاڑ سکوں۔

"یہ بات نہیں۔" شیخ الاسلام نے نرمی سے کہا۔ "ہم ایک طرفہ بات سن کر کوئی فیصلہ کرنا نہیں چاہتے۔"

"اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ تمہیں میرے بیان پر یقین نہیں ہے!" خسرو پاشا برافروختہ ہو گیا' پھر اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے مزید بولا۔ "میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ مجرم ہے۔ اس کے ثبوت میں میرے پاس قوی دلائل ہیں۔ میرا بیان خود کافی شہادت ہے۔ نفیسہ کو مال دے کر اپنی زندگی کو بچانا چاہیے! اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں۔"

"ہم صرف آپ کے بیان پر اکتفا نہیں کر سکتے کیوں کہ

ہمیں لوگوں کے سامنے جواب دہ ہونا ہے جو اپنا گھر بار کام کاج چھوڑ کر قلعے کے سامنے جمع ہو گئے ہیں۔ وہ بہت مشتعل ہیں۔ ہمارے سمجھانے بجھانے اور درمیان میں پڑنے سے وقتی طور پر وہ خاموش ہو گئے ہیں لیکن یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ انھوں نے ہم پر اعتماد کر کے اور ہمیں اپنا نمائندہ بنا کر یہاں بھیجا ہے۔ ہم پر لازم ہے کہ ان کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائیں۔ ہم نغمہ نیسی کی زبانی اقرار جرم سننا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ شرع کے مطابق حکم دیں۔ ہمیں اجازت دی جائے کہ ہم خود یا کسی تحقیقات کریں۔ آیا نغمہ اقرار جرم کرتی ہے یا اپنی برات کا ثبوت پیش کرتی ہے!" شیخ اعظم نے تفصیل کے ساتھ اپنا مدعا بیان کیا۔

خسرو پاشا چند لمحے خاموش رہ کر غالباً "یہ فیصلہ کرتا رہا کہ کیا کرے؟ اگر علماء و مشائخ کو نغمہ سے ملنے نہ دیا جاتا تو بات بگڑ جاتی پھر اس سے پہلے کہ میں بولتا' خسرو پاشا بول اٹھا۔ "میں تم لوگوں کو اس سے ملنے سے روک بھی سکتا تھا کہ بالعموم حاکم ہوں' مگر میں ایسا نہیں کرتا۔ تم اس کے پاس جاؤ' مگر یاد رکھنا کہ اس کا زبانی اقرار معتبر نہیں۔ اسے چاہیے کہ جس طرح میں ثبوت اور دلائل سے اس کا جرم ثابت کر رہا ہوں' اسی طرح وہ بھی دلائل سے اپنی برات ثابت کرے۔ جاؤ شیخ سنبلی کی حویلی میں ہے۔"

علماء و مشائخ چلے گئے تو میں نے بھی رخصت کی اجازت چاہی' مگر خسرو پاشا نے مجھے روک لیا۔

"ابھی ٹھہرو اے محمد علی!" وہ فکر مند آواز میں بولا۔ "وہ لوگ نغمہ سے گفتگو کر کے ضرور پلٹیں گے اور پھر اس کی ہم نوائی کریں گے۔ بتاؤ' ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟"

"میں پھر یہی عرض کروں گا کہ نرمی نہ برتی جائے ورنہ حکومت اور آپ کا وقار خاک میں مل جائے گا۔" میں نے کہا۔

پھر جب تک علماء و مشائخ واپس نہ آ گئے' میں خسرو پاشا کو سختی کی تلقین کرتا رہا' مجھے یقین ہو گیا کہ خسرو پاشا ایسا ہی کرے گا تو میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ مجھے معلوم تھا کہ نغمہ کے معاملے میں خسرو پاشا کو ذلت اٹھانا پڑے گی اور حالات اتنی سنگین نوعیت اختیار کر جائیں گے کہ اسے نغمہ کو آزاد کرنا پڑے گا تو میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ جس قدر زیادہ ذلیل و رسوا ہو'

اتنا ہی اچھا ہے۔ اس کی صورت یہی تھی کہ وہ سختی سے کام لے اور میں نے اسی الحال ایسا کرنے پر آمادہ کرایا تھا۔

علماء و مشائخ لوٹ کر آئے تو میں نے ان کے چہروں کی سے اندازہ کر لیا کہ ان کا فیصلہ کیا ہے!

"ہم نغمہ سے مل آئے۔" شیخ اعظم نے بات شروع کی۔ "ہمارے نزدیک وہ بے گناہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ نغمہ کے پاس مال نہیں۔ تمہارا قیاس غلط ہے کہ وہ مال دار ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو تمہارے سپاہیوں کو اس کے گھر سے مال ضرور ملتا۔"

"آپ حضرات کے کلام سے اس کی بے گناہی ثابت نہیں ہوتی۔ میرے نزدیک اسے سزا دینا ضروری ہے۔" خسرو پاشا کے بولنے سے پہلے ہی میں نے شیخ اعظم سے کہہ دیا تاکہ خسرو پاشا زبردستی اختیار نہ کر سکے۔

"ہم انصاف کے طالب ہیں اور انصاف ہی کے تقاضے پورے کرنے آئے ہیں۔" شیخ اعظم نے میری بجائے خسرو پاشا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم خود مختاری کو پرداز نہیں کریں گے! تمہارا عدل سے منہ موڑنا ہماری یعنی سارے علماء و مشائخ کی اہانت ہے۔ ہم اب یہاں نہیں ٹھہریں گے۔" پھر انھوں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور بولے۔ "ہمارے یہاں ٹھہرنے میں کچھ فائدہ نہیں۔ چلو جانے اور چل کر مشورہ کریں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے!"

"تمہارا جو جی چاہے کرو!" خسرو پاشا سخت لہجے میں بولا۔ "یہ یاد رکھنا کہ اگر شورش پھیلائی یا امن کے خلاف کوئی کارروائی ہوئی تو میں سختی سے پیش آؤں گا۔ باغیوں کے لیے تم میرے دل میں رحم نہ پاؤ گے!"

شیخ اعظم نے خسرو پاشا کو کوئی جواب نہ دیا بلکہ بے پروائی اور غصے کی نگاہ سے اسے دیکھتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ ان کے ساتھی پیچھے پیچھے چل دیے۔

☆☆

فضا نعروں سے گونج رہی تھی اور میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ یہ نعرے نغمہ کی رہائی کی خوشی میں لگائے جا رہے تھے۔ قاہرہ والوں نے اس شخص کو جھکنے پر مجبور کر دیا تھا جو خود کو مست عیار و ہوشیار جانتا تھا۔ نوبت یہاں تک آ گئی تھی کہ لوگ قلعے پر ہلا بول دیتے۔ اس سے بچنے کے لیے خسرو پاشا نے ایک ایسی شرط عائد کی کہ یہ لشکر' میر منشی کے مکان پر پہنچا اور اسے گھیر لیا۔ میر منشی نے سپاہیوں سے ملنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے گھر سے باہر نہ آیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بپھرے ہوئے اور مشتعل سپاہی اس کے مکان میں بہ جبر گھس گئے۔ میر منشی کو جب حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوا اور اس نے دیکھا' نازک وقت آ گیا ہے تو کہا کہ تم لوگ محمد علی کے پاس جاؤ' وہ تمام فوج کی تنخواہ تقسیم کرنے کے لیے خزانے سے مال لے گیا ہے۔ یہ اطلاع پا کر مشتعل سپاہی وہاں سے پلٹے اور اب وہ میری طرف آ رہے تھے۔

یہ جان کر میں کچھ بدحواس سا ہو گیا۔ میرے غلام نے یہ بھی بتایا سپاہیوں نے عہد کر لیا ہے کہ وہ اب بغیر تنخواہ لیے کسی طرح نہیں ٹلیں گے۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ میر منشی نے خسرو پاشا ہی کے اشارے پر مشتعل لشکر کا رخ میری طرف کر دیا۔ میرے لیے یہ بڑے نازک اور سنگین لمحات تھے۔ ان غیر متوقع حالات نے جیسے میری عقل گم کر دی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ابھی میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ میرے ایک خادم نے آ کر خبر دی۔ "حضور مشتعل سپاہیوں نے قصر کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔"

ابھی خادم کی بات پوری ہوئی تھی کہ باہر سے نعرے اور شور سنائی دیا۔ پھر میری سماعت سے کسی کی بلند آواز ٹکرائی۔ "ہم خیرات مانگنے نہیں آئے' اپنی تنخواہ لینے آئے ہیں۔ اے محمد علی! ہماری تنخواہ دے' امیر منشی نے ہمیں بتا دیا ہے کہ تو خزانے سے ہماری تنخواہ لے آیا ہے۔ ہم بغیر تنخواہ لیے یہاں سے نہیں ٹلیں گے!"

میں نے جو نقشہ خسرو پاشا کے لیے کھڑا کیا تھا' وہ اب میرے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ خسرو پاشا نے بڑی عیاری سے اس قصے کا رخ میری طرف کر دیا تھا۔ میرے قصر میں کتنی کے چند غلام اور خدام تھے جو کسی طرح اس لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ میں اسی لیے حیران و پریشان تھا۔ اس گھبراہٹ کے سبب یہ بھی ممکن نہیں رہا تھا کہ میں اپنے لشکر کو مدد کے لیے بلا لاؤں۔ بالفرض میں ایسا کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو اس وقت تک مشتعل ہجوم مجھے اور میرے خادموں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر چکا ہوتا۔

صورت حال کتنی ہی خطرناک کیوں نہ ہو' آدمی اگر اپنے ذہن کو بیدار رکھے اور حوصلہ نہ ہارے تو کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آتی ہے۔ وہ چند لمحے فیصلہ کن تھے اور میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ میں نے جو فیصلہ کیا تھا' ہر چند کہ اس میں خطرہ تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ بزدلی کے ساتھ مرجانے سے یہ راہ بہرحال بہتر تھی۔ معاً میں تیزی کے ساتھ کھڑکی کی طرف بڑھا اور پھر اس کے دونوں پٹ کھول دیے۔ دور مشتعل سپاہیوں کا ہجوم نظر آرہا تھا۔ مجھے یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ ایک دم خاموش ہوگئے۔

"سنو!" میں نے انھیں دبنگ اور بلند آواز میں مخاطب کیا۔ "میر مشی نے تمہیں دم دیا ہے۔ میرے پاس تمہارا مال نہیں ہے۔ فھو' میں خود تمہارے پاس آتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں پلٹا اور پھر اپنے ہتھیار اتار کر ایک طرف رکھ دیئے۔ میرے ملازمین اور خدام بھی چیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میری کیفیت اس وقت عجیب سی تھی۔ سارا جسم سنسنا رہا تھا اور ہونٹ جیسے خود بہ خود حرکت کررہے تھے۔ "میں انھیں دکھاوں گا کہ ان سے نہیں ڈرتا اور اسی لیے بے ہتھیار لگائے آگیا ہوں۔" پھر جلدی میں کمرے سے نکل گیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ان کے درمیان پہنچ گیا۔ انھوں نے مجھے گھیر لیا۔ میں نے انھیں خود سے دور رکھنے کے لیے ہاتھ سے اشارہ کیا' پھر یہ آواز بلند کہا۔ "مجھ سے دور رہو' کیا تم نہیں جانتے کہ میں سالار ہوں۔ ہر چند کہ میرا منصب تم سے بلند ہے' مگر میں بھی تمھاری طرح خسرو پاشا کا ملازم ہوں۔"

"کیا اس نے آپ کو بھی ہماری طرح صرف وعدوں پر ٹال رکھا ہے؟"

"کیا اس وقت تمھاری عقلیں خبط ہوچکی ہیں جو تمہیں یہ خیال بھی نہیں کہ اس سے ہم کام لیں۔" میں نے بے تکلف سخت لہجے میں کہا۔ "تمہیں ایک افسر سے سوال کرنے کا کیا حق ہے؟" پھر چند لمحے توقف کے بعد میں نے اپنا لہجہ بدل لیا اور بولا۔ "ہر چند کہ تمہیں مجھ سے سوال کرنے کا کوئی حق نہیں' پھر بھی میں تمہیں جواب دینے میں ٹال نہیں کروں گا۔ سنو! کئی مہینوں کے بعد خسرو پاشا نے مجھے سونے کے دس توڑے دیے ہیں جو اشرفیوں کی دس تھیلیوں کے مساوی تھے۔ اس کے باوجود میری تنخواہ بانٹی رہ گئی۔ میرے سپاہیوں سے پوچھو کہ میں نے اس مال کا کیا کیا؟ میں نے وہی کیا جو ایسے وقت میں ہر افسر کو کرنا چاہیے۔ ہر اس افسر کو اپنے سپاہیوں کا بھی خواہ ہونا چاہیے۔ میں نے اس مال کا بانٹ لیا۔ پانچ تھیلیاں میں نے اپنی ضروریات اور قرض خواہوں کے لیے رکھ لیں' باقی پانچ تھیلیاں' سپاہیوں کو بانٹ دیں۔ میں ان کی خواہوں میں سے وضع نہیں کروں گا بلکہ یہ مال اپنی طرف سے بہ طور انعام میں نے انھیں دیا ہے۔ اس کے سوا میں نے ایک حبہ نہیں لیا۔ میرے سپاہیوں سے تمہیں ان باتوں کی تصدیق ہو جائے گی۔ تم ان سے پوچھ سکتے ہو۔"

"ہم کسی سے کچھ پوچھنا نہیں چاہتے!" ایک سپاہی میرے خاموش ہوتے ہی بولا۔ "ہم بہادر محمد علی کو جانتے ہیں' خدا اسے سلامت رکھے۔"

پھر تمام سپاہی اسی طرح کی باتیں کرنے لگے۔ سچ' بہرحال سچ ہوتا ہے اور اس کی اپنی ایک قوت ہوتی ہے۔ آدمی جب جھوٹ ہو تو خود اس کے لہجے اور آواز میں اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی سچ بولا تھا اور اس کا نتیجہ میرے سامنے تھا۔ زرا کی دیر میں حالات کا رخ بدل گیا تھا۔ انھیں یقیناً میری باتوں سے تسلی ہو گئی تھی۔ میری جرات مندی اور بے باکی نے ایک بڑے خطرے کو بڑی خوبصورتی سے ٹال دیا تھا۔

"آؤ ساتھیو! میر مشی کے پاس چلیں اور جزا" اس کا مال وصول کریں۔" کسی سپاہی نے بلند آواز میں اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیا۔

"ہاں چلو!" ہر طرف سے ہوا'ہا' صدائیں آئیں۔

پھر کچھ ہی دیر میں وہ ہجوم چھٹ گیا۔ میں فرماں وشاداں اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ طاہر پاشا کو جب یہ خبر ہوگی' میں اپنے سپاہیوں کو مال تقسیم کرتا ہوں تو وہ بہت سیخ پا اور تاب کھائے گا۔ شورش کا طوفان آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے اور میں اپنی منزل سے قریب ہو رہا جارہا ہوں۔ چند لمحے بعد میں نے اپنے ایک خادم کو حکم دیا کہ میرے ماتحت افسروں کو بلاؤ' خادم سن کر فوراً روانہ ہو گیا۔ اسی کے ساتھ میں نے کچھ خادموں کو مشتعل فوج کی خبر لینے روانہ کردیا۔

میرے ماتحت افسر آگئے تو میں نے انھیں صورت حال سے آگاہ کیا۔

"سنو! اس وقت اپنی جگہ موجود رہو' سپاہیوں کو باہر نکلنے

والوں کے ساتھ ہرگز نہ ملنے دو۔" میں نے انھیں حکم دیا۔ "کم از کم تین گھنٹے میرے اس حکم پر سختی سے عمل کیا جائے۔ اس کے بعد اگر میرا دوسرا حکم نہ پہنچے تو انھیں لے کر وہ باہر جاکر جو چاہیں کریں۔"

میری فوج کے افسر چلے گئے تو میں ان خادموں کا انتظار کرنے لگا جنھیں باغیوں کی خبر لانے بھیجا تھا۔ مجھے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ مجھے اپنے خادموں سے پل پل کی خبر ملنے لگی۔

باغی سپاہیوں نے میری حویلی سے لوٹ کر میر مشی کے گھر کو گھیر لیا اور کہنے لگے اگر مال نہ دے گا تو ہم تجھے قتل کردیں گے! میر مشی نے ہانپتے کانپتے کھڑکی میں کھڑے ہو کر کہا کہ میری بات سن لو! جب سپاہی خاموش ہو گئے تو اس نے کہا کہ اتنے دن اور ٹھہر جاؤ کہ میں مال فراہم کر لوں۔ انتظار کا نام سن کر سپاہی برہم ہو گئے اور برا بھلا کہنے لگے۔ بعض کہتے تھے کہ ہم بھوک سے مر رہے ہیں۔ ہم سے کھڑے بھی انتظار نہیں ہو سکتا۔ کچھ کا مشورہ یہ تھا کہ اس کا گھر جلا دیں تو یہ مال دے گا۔

میر مشی کو جب یہ خبر ملی تھی کہ باغی سپاہی میری حویلی سے اس کی طرف لوٹ رہے ہیں تو اس نے اپنے ایک مال کو خسرو پاشا کے پاس بھیج دیا تھا کہ بتائیے اب میں کیا کروں؟ میرے بچانے کی کوئی تدبیر نکالیے۔

اب میر مشی کا یہ پیغام خسرو پاشا کے پاس پہنچا تو وہ بولا کہ یہ بڑا ہی سخت دن ہے۔ ابھی اس عورت کے جھگڑے کی فرصت ملی تھی کہ فوج بگڑ گئی۔ خیر میں ان پر اپنی بہادری ثابت کروں گا اور جو میری طرف بری نیت سے بڑھے گا اسے قانی النار کردوں گا' پھر اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ مسلح ہو کر قلعے کی دیواروں پر کھڑے ہو جاؤ اور توپیں تیار رکھو! اس کے بعد وہ میر مشی کے قاصد کی طرف مڑا اور کہا کہ جاؤ! میر مشی سے کہہ دو' وہ باغیوں کو میرے پاس بھیج دے' میں ان سے نمٹ لوں گا۔

اس وقت میر مشی کے پاس قاصد لوٹا' مشتعل فوج کے ہاتھ پیغام لیز ہو چکا تھا۔ سپاہیوں نے باغ کی دیواروں پر چڑھنا شروع کردیا تھا۔ میر مشی نے قاصد کو اپنے ساتھ لیا اور میں کھڑا کر کے کہا کہ نائب سلطان کے پاس سے اس کا پیغام آیا ہے۔ وہ تمہیں اپنے پاس بلا رہے ہیں۔ انھوں نے تمہارا مطالبہ پورا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

میر مشی نے آخری الفاظ اپنی طرف سے جوڑ دیے تاکہ باغی سپاہی مطمئن ہو جائیں۔

باغی سپاہیوں نے اس بات کو سچ جانا اور قلعے کی طرف پلٹ گئے۔ وہ وہاں پہنچے تو انھوں نے قلعے کے دروازے بند پائے ان میں سے کچھ دربانوں کے پاس گئے اور کہا کہ ہمیں پاشا نے بلایا ہے ہم ان کے حکم سے یہاں آئے ہیں۔ دروازہ کھول دو۔

اس کا جواب اور سے توپوں اور بندوقوں نے دیا۔

اس پر سپاہی اور بھی مشتعل ہو گئے۔ وہ تلواریں کھینچ کر اور کمین چڑھا کر قلعے کے دروازے پر ٹوٹ پڑے۔

اسی دوران میں تین گھنٹے کا وقت گزر چکا تھا۔ یہ وقت خسرو پاشا پر بھرپور ضرب لگانے کا تھا۔ میں نے اسی لیے اپنے سپاہیوں کو مزید کوئی حکم نہیں بھیجا۔ حملے ختم ہو چکی تھی۔ وقت گزرنے کی ہی میری فوج کے سپاہی بھی قلعے کی طرف چھپٹے۔ حالات پر میری پوری نظر تھی اور مجھے ایک ایک لمحے کی خبر مل رہی تھی۔

پھر تو موت کا بازار خوب گرم ہوا اور بہت آدمی کام آئے۔ طاہر پاشا دور اندیش نہیں تھا' اس کا اندازہ مجھے پہلے سے تھا۔ میری توقع کے عین مطابق وہ اس شورش میں شریک ہونے کے لیے اپنی حویلی سے نکل آیا۔ جب وہ قلعے کے پاس پہنچا تو خسرو پاشا کو پیغام بھیجا کہ میں ملنا چاہتا ہوں تاکہ اس شورش کو ختم کیا جاسکے۔

تھوڑی دیر بعد طاہر پاشا کو خسرو پاشا کا جواب مل گیا۔ اس نے کہلوایا کہ صلح کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں باغیوں سے صلح کرنا نہیں چاہتا۔ تم اپنے گھر چلے جاؤ' میں کسی کی اعانت کے بغیر ان سرکشوں سے خود کو بچا سکتا ہوں۔

طاہر پاشا نے سر جھکایا اور کہا کہ اگر پاشا کی یہی مرضی ہے تو خیر میں اس کے حکم کے موافق واپس چلا جاتا ہوں۔ پھر وہ اپنے سپاہیوں کے درمیان پہنچا اور اپنے افسروں کو آواز دے کر کہنے لگا کہ میں پاشا کے پاس گیا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ معاملہ سلجھ جائے مگر وہ تشدد و جبر ہی کے ذریعے تم سے نمٹنا چاہتا ہے۔ وہ تمھاری تنخواہوں کے بدلے تمہیں خون میں نہلانا چاہتا ہے۔ سپاہیوں کا جوش بے حد بڑھ گیا۔ طاہر پاشا نے مزید کہا کہ نائب نے مجھ سے یہ بھی کہا ہے کہ تمہارا میر مشی تمھاری تنخواہ دے سکتا ہے۔ آؤ

میرے ساتھ! اس سے تحفّظ وصول کریں۔

پھر سب ایک بار اور مشی کے مکان پر پہنچ گئے۔ وہاں پہنچتے ہی انھوں نے تہوں سے میر مشی کے مکان کے دروازے اور کھڑکیاں چور ڈالیں اور پھر اندر گھس گئے۔ میر مشی خوف کے کانپتا ہوا سامنے آیا اور کہنے لگا کہ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو! میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ یہ کھاتے پڑے ہیں! انھیں دیکھ لو تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا۔

سپاہی بولے کہ ہم تجھے اور تیرے کھاتوں کو اپنے افسر کے پاس لے جائیں گے۔ وہ ان کی جانچ پڑتال کرے گا۔ اس کے بعد سپاہی حساب کتاب سے متعلق تمام کھاتوں اور میر مشی کو لے کر طاہر پاشا کے پاس پہنچے۔ طاہر پاشا اس وقت تک اپنے گھر جا چکا تھا۔

غرض کہ اس کا کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہوا اور رات ہو گئی' پھر رات بھر کشت وخون ہوتا رہا۔ باغی فوج نے قلعے کے اندر گھسنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ قلعے سے برابر ان پر گولہ باری کی جا رہی تھی۔ صبح ہوتے ہوتے شورش میں مزید اضافہ ہو گیا۔ جب طاہر پاشا نے سپاہیوں کو بتایا کہ میر مشی سچ کہتا ہے اور یہ کہ سارا مال خسرو پاشا کے پاس ہے۔ طاہر پاشا اب علی الاعلان باغیوں کی رہنمائی کے لیے میدان میں آگیا۔ اس سے سپاہیوں کا جوش بڑھ گیا۔ باغی سپاہی ایک دوسرے کی مدد سے قلعے کی دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہاں حفاظت کرنے والے تھوڑے تھے۔ قبل اس کے کہ وہ اپنی مدد کے لیے دوسروں کو بلا سکیں' باغیوں نے انھیں تہ تیغ کر دیا۔ پھر قلعے کا دروازہ کھول دیا۔

قلعے کا دروازہ کھلتے ہی باغی فوج بھرا مار کے اندر داخل ہو گئی۔ باغی سپاہی کچھ ہی آگے بڑھے تھے کہ خسرو پاشا کا خزانچی فوج کے آگے آگیا۔

طاہر پاشا نے اسے ڈپٹ کر مخاطب کیا۔ "اے بے عقل! ہتھیار ڈال دے۔"

خزانچی پر کچھ ایسا رعب چھا گیا کہ اس نے واقعی ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اس کا اتباع کیا۔

خسرو پاشا اس وقت تک اپنے قصر میں محصور بیٹھا تھا۔ جب اسے صورت حال کا اندازہ ہوا تو وہ تلوار کھینچ کر یہ کہتا ہوا آگے بڑھا کہ میں انھیں ابھی الٹے پیر بھگائے دیتا ہوں۔ جاؤ محمد علی کو خبر کرو کہ وہ اپنی فوج لے کر چلا آئے۔ نمک حرام طاہر پاشا سے وہ اچھی طرح بدلہ لے سکتا ہے۔

محمد علی خائن نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں اس کی قدر کرتا ہوں اور اسے جیتی ہدیے دیتا ہوں۔ میرے محافظ دستے بلاؤ اور اس سے کہو کہ وہ میرے قصر کی چھت پر چڑھ کر توپوں کا رخ باغیوں کی طرف کر دے۔

پھر ذرا دیر بعد ہی خسرو پاشا کے قصر کی چھت سے توپ گولہ باری ہونے لگی۔ ادھر میرے محبوں نے جو پیغام دی کہ خسرو پاشا کا قاصد میرے پاس آنے والا ہے۔ نے اپنے خادموں کو حکم دیا کہ کسی کو بھی مجھ تک جانے اور جو بھی آئے کہہ دو' میں سخت بیمار ہوں کسی سے نہیں سکتا۔

میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے! اس علاوہ میں نے متوقع آئندہ حالات کا اندازہ بھی کر لگا لیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ جب خسرو پاشا ہر طرف مایوس ہو جائے گا تو آخری قدم اٹھائے گا! میں اسی کے تماشا دور سے دیکھ رہا تھا۔

پھر دوسرے ہی دن میرے اندازے درست ثابت ہوئے خسرو پاشا اپنے حرم سمیت سارا خزانہ لے کر چند وفادار غلاموں کے ساتھ قصر کے خفیہ راستے سے ہو گیا۔ طاہر پاشا نے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اس نے خود مقام سلطان کے لقب سے نامزد کر دیا تھا۔ قلعدار اور شراس کے لیے خلعتیں لے گئے تھے اور انھوں نے اطاعت کا اظہار کر دیا تھا۔

یہ اطلاعات پا کر میں زور سے ہنس پڑا۔ میری سب یہ تھا کہ ہوا وہی تھا جو میں نے چاہا تھا۔ اب کے سلسلے میں دوسرا قدم اٹھانا تھا۔ میں نے اپنے ایک غلام کو طلب کیا اور جب وہ حاضر ہو گیا تو بولا۔ "تم مالکے کہ ممالک روپائے نیل کے کنارے بدر شین کے پاس ڈالے ہوئے ہیں۔ تم جلد وہاں پہنچو۔ وہاں کے ممالک کے سردار عثمان بک بردلی کو دریافت کرنا اور ان سے ملاقات ہو جائے تو کہنا کہ کام کا وقت قریب ہے۔ چند روز قبل جس نے بیڑہ کے بڑے اہرام کے تم سے ملاقات کی تھی وہ پھر تم سے وہیں ملنا چاہتا ہے۔ سے ملنے کے لیے تیار رہو' وہ اپنے لشکر کے ساتھ سمجھ گئے؟ میرے سامنے کے ہوئے الفاظ دوہرا کر یقین ہو جائے' تم لفظ بہ لفظ میرا پیغام پہنچا دو گے۔"

غلام ذہین تھا۔ اس نے پیغام کے الفاظ دوہرا دیے۔

ٹھیک ہے۔" میں نے اطمینان سے سر ہلایا۔ "تمہیں مقام جلد سے جلد پہنچانا ہے کیوں کہ وقت بہت کم اور ہے۔"

اسی میں نے غلام کو رخصت ہی کیا تھا کہ طاہر پاشا کا قاصد آگیا۔ اس نے مجھے پیغام دیا کہ طاہر پاشا مجھے اسی قلعے میں بلوا رہا ہے۔

"چلو' میں ابھی آتا ہوں۔" میں نے قاصد کو جواب دیا۔ قاصد چلا گیا تو میں نے اپنے خادموں کو طلب کیا۔ انھوں نے مجھے وردی پہننے میں مدد دی۔ پھر میں اپنی حویلی کے گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا۔ آٹھ سپاہی میرے ساتھ چلے اور میرا رخ قلعے کی طرف تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد میں اسی قصر میں داخل ہونے والا تھا جہاں ایک روز قبل خسرو پاشا رہتا تھا۔ میں اندر پہنچا تو طاہر پاشا نے خسرو پاشا کی مسند پر تکیے سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے دیکھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر اشارہ کیا' پھر کہا۔ "اے محمد علی! تم نے دیکھا کہ آدمی کیا کر سکتا ہے! زمانہ کس طرح کروٹ بدلتا ہے! دیکھو میں! خسرو پاشا کی مسند پر بیٹھا ہوں۔"

"میں آپ کو صمیم دل سے مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کی عزت ہمیشہ برقرار رکھے۔" میں نے ادب اور نرمی کے ساتھ کہا۔

"عزت تو خوش قسمتی اور جوان مردی کے ساتھ ہے۔" وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ "اگر تم میں میری ہی جرات ہوتی تو آج تم میری جگہ اس مسند پر بیٹھے ہوتے اور ہمارے ہی ہاتھ بازی رہتی کیوں کہ میری نسبت تم اس عہدہ مسندی اور اقبال کے زیادہ مستحق تھے' تمہیں اس کی بھی ضرورت نہ تھی' صرف ذرا سے حوصلے اور ہمت بڑھانے کی دیر تھی۔"

میں نے اس کی بات سن کر فارسی کا ایک مشہور شعر پڑھا۔

دولت بہ زور بازو نیست
نامہ بخشندہ خدائے

میں نے مزید کہا۔ "تقدیر نے آپ کی مساعدت کی۔ میں واقع ہی نہ کر سکا۔ یہ سعادت نہ صرف مجھ سے دور تھی اس کی اہل بھی نہ تھا۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ میں اس کو اٹھانے کی طاقت نہیں۔"؟

طاہر پاشا مسکرانے لگا' پھر بولا۔ "لیکن میں یہ بار اٹھا سکتا ہوں اور اس کی ذمے داری لے سکتا ہوں۔ تمام قاہرہ نے میری سرداری کا اقرار کر لیا ہے۔ صرف تم باقی رہ گئے ہو۔"

"میں سب سے پہلے آپ کا مطیع ہوں اور آپ کو قائم مقام تسلیم کرتا ہوں۔" میں نے اطمینان دلایا۔

وہ ہنسا۔ "دوست! میں تمہارا شکر گزار ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم مجھے احکام صادر کرنے کی اجازت دو اور اسی وقت ممالک کے سردار سے کھلا بھیجو کہ میں صلح کرنا چاہتا ہوں۔ میری آرزو ہے کہ اتفاق ہو جائے اور خون ریزی ختم ہو۔ تم جانتے ہو کہ جب ہم ممالیک سے اتفاق کر لیں گے تو ہماری حکومت مضبوط ہو جائے گی اور ہم ترکوں کی حکومت سے آزاد ہو جائیں گے۔"

میں اس کے ارادے بھانپ گیا کہ وہ کیا خواب دیکھ رہا ہے! وہ یقیناً تنہا مصر پر حکومت کرنا چاہتا تھا۔ میں نے مصلحتاً "عاجزی اختیار کی اور کہا۔ "میں آپ کی رائے سے متفق ہوں۔"

"اچھا تو پھر میرا پیغام اسی وقت ممالیک تک پہنچا دو۔" اس نے کہا۔

"آپ کا حکم واجب الاتباع ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اس سے اجازت لی اور باہر آگیا۔

مجھے طاہر پاشا کی نادانی اور حماقت پر ہنسی آرہی تھی۔ اس نے وہی کام میرے سپرد کیا تھا جس سے میری کوششوں پر پانی پھر جاتا اور ظاہر ہے کہ میں ایسا کیوں ہونے دیتا؟ وہ احمق قلعے کی دیواروں پر چڑھ جانے سے خود کو تخت وتاج کا اہل سمجھنے لگا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ یہ راہ ہے۔

خسرو پاشا کے عہد حکومت میں میرے جو مخبر اس کے قصر میں تھے' اب بھی وہیں تھے۔ انھیں علم تھا کہ میں کہاں ہوں! وہ مجھے برابر تمام اطلاعات پہنچا رہے تھے۔

صورت حال اب یہ تھی کہ قاہرہ سے بغاوت کے شعلے بھڑک رہے تھے اور احمق طاہر پاشا انھیں مزید ہوا دے رہا تھا' جس کے بارے میں ذرا بھی شبہ ہو تا کہ سابق حکمراں کا وفادار ہے' اسے بے عزت کر کے لوٹ لیا جاتا۔ وحشی سپاہ' طاہر پاشا کے قابو میں نہیں تھی اور اسے قابو میں لانا طاہر پاشا کی قوت سے باہر تھا۔ قاہرہ میں لوٹ مار اور قتل وغارت گری کا بازار گرم تھا۔ پھریوں ہوا کہ سپاہیوں کو اپنا

مطالبہ یاد آگیا اور کسی کو یہ خبر نہ ہو سکی کہ اس یاد دہانی کے پیچھے میرے آدمیوں کا ہاتھ ہے۔ سپاہیوں کے دستے اپنی تنخواہیں طلب کرنے کے لیے نئے قائم مقام کے قصر آئے اور پہلے سے زیادہ اڑے۔ خزانے میں کچھ بھی نہ تھا۔ خسرو پاشا سب کچھ جو بھی تھا اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ایسی صورت میں طاہر پاشا سپاہیوں کو لبیک دخل سے ٹالنے کی کوشش کے سوا اور کرتا بھی کیا؟ مگر سپاہی کب تک صبر کرتے! وہ بے قابو ہوتے آپے سے باہر ہونے لگے۔ ناچار طاہر پاشا نے بڑے بڑے دولت مندوں کو بلوایا اور ان سے سپاہیوں کی تنخواہوں کے واسطے قرض مانگا۔ انھوں نے دینے سے انکار کیا اور کہا کہ ہمارے پاس دولت نہیں ہے۔

سپاہی اس انتظار سے تھک گئے تو انھوں نے اپنے دو افسروں موئی آغا اور اسماعیل آغا کو آخری مرتبہ تنخواہ طلب کرنے بھیجا۔ طاہر پاشا نے انھیں اپنے قصر میں آنے کی اجازت دے دی، مگر نہایت روکھے پن اور کبیدگی سے ملا۔ پھر سخت لہجے میں ان سے آنے کا سبب دریافت کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ مہربانی کر کے سپاہ کی تنخواہ دے دیجئے کہ اسی سے مشکلات کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور فوج کے شور و شر سے نجات مل سکتی ہے۔ سپاہیوں میں اب انتظار کی طاقت نہیں رہی۔

اس پر طاہر پاشا برہم ہو گیا اور بولا کہ میرے سامنے تمھاری یہ جرات! کیا سپاہی یہ سمجھتے ہیں کہ میں ان کی دھمکیوں میں آجاؤں گا! جاؤ ان سے کہہ دو کہ میں نہ ان کی تنخواہیں دے سکتا ہوں اور نہ دینا چاہتا ہوں۔ باغیوں سے کہہ دو کہ جو بھی اب میرے پاس یہ درخواست لے کر آئے گا اسی کا سر کاٹ کر اس کے حوالے کر دوں گا۔

پھر کیا تھا اسماعیل آغا جو بہت گرم مزاج اور باغیوں کا سرخیل تھا، آپے سے باہر ہو گیا اور چیخ کر کہا کہ اگر تم ایسا ہی کرنے والے ہو تو تمہیں بھی اسی کی ضرورت ہے۔ یہ کہہ کر اس نے نیام سے اپنی تلوار کھینچی اور پھر طاہر پاشا پر اچانک حملہ کر دیا۔

چشم زدن میں وہ طاہر پاشا کا سر کاٹ کر باغی سپاہیوں کے درمیان پھینک گیا۔ موئی آغا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ کٹے ہوئے سر سے اب تک خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ سپاہیوں نے پرجوش نعروں سے ان دونوں کا استقبال کیا اور پھر قصر پر ٹوٹ پڑے۔ طاہر پاشا کے غلاموں اور خادموں نے انھیں روکنا چاہا، مگر ان کی گردنیں اڑا دی گئیں۔ پاشا کے حرم میں جو عورتیں تھیں، انھیں سپاہیوں نے سرعام بے عزت کیا اور قصر کو لوٹ لیا۔ طاہر پاشا کا مقام بنانے ابھی بیس روز نہیں گزرے تھے کہ اس کا نام و نشان مٹا دیا گیا۔ باغیوں نے اس کی اولاد سے بھی زندہ نہیں چھوڑا تھا اور اس کی حسین و نوجوان بیویوں کنیزوں کو فوج کے افسروں نے اپنے حرم میں ڈال لیا تھا اور عزیز عمر تھیں، انھیں قتل کر دیا گیا تھا۔

انتظام اندھا ہوتا ہے اور کسی کو نہیں دیکھتا۔ طاہر پاشا نے اپنی حمایت سے اس انتظام کا نشانہ بن گیا تھا۔ اطلاعات ملیں تو میں نے عثمان بک کو مخاطب کیا اور وقت میرے ہی خیمے میں تھا۔ "میں نے تم سے کہا تھا انتظار کرو، دیکھو کو کہ کیا نتیجہ ہوا! اب ہمیں جلد از جلد پہنچنا چاہیے!"

عثمان بک نے میری بات سے اتفاق کیا۔ سپاہ کی خبر ہوئی تو اس نے خوشی کے نعرے بلند کیے۔ پھر روانگی عمل میں آگئی۔ آگے آگے میرے اور عثمان گھوڑے تھے اور پیچھے ساری فوج۔ اسی دوران ملاقات شیخ خسان سے ہوئی۔ میں نے اس سے خیریت معلوم کی، وہ یہ خیریت تھی۔ شیخ نے اس عرصے میں کئی اوجھے رشتے آگئے، مگر حلیمہ نہ دیا۔ شیخ کا خیال تھا کہ شاید حلیمہ نے اپنے لیے کر لیا ہے اور وہ اسی سے شادی کرے گی۔ میں نے ذریعے حلیمہ کو سلام کہلوایا اور پھر آگے بڑھ وقت میری آنکھوں میں حلیمہ کی صورت گھوم جس نے مجھے میں بھلایا تھا اور خود میں بھی

جلد ہی ہم قاہرہ پہنچ گئے۔ اہل شہر نے مجھے میں دیکھ کر اظہار مسرت کیا۔ انھوں نے فوج اور مجھ سے امن و امان قائم کرنے کی درخواست نے ان سے امن و امان کی بحالی کا وعدہ کر ارضی سپاہ کے افسروں سے مشورہ کر کے ممالک بھیج دیا۔ ممالیک بے انتہا خوش تھے، مگر ان کل ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے! ابھی میری آئی تھی۔ میرے نزدیک منزل تک پہنچنے ایک پڑاؤ تھا۔ بہرحال میں اپنی حویلی میں آگیا۔

ی بار نکلنے کے بعد ممالیک آخر پھر قاہرہ میں واپس ہو گیا اور لوگ اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہو تجارت کو فروغ اور کاروبار کی گرم بازاری ہوئی۔ کہ یہ خیال تھا اور وہ برسر اپنے خیال کا اظہار بھی تھے کہ یہ امن انھیں میری بدولت نصیب ہوا ہے۔ خود بازاروں اور گلی کوچوں میں پھرتا اور بے سروپا فوج امن عامہ میں خلل اندازی سے روکتا۔ ممالیک کے ل بک کو اپنا سردار مقرر کر لیا تھا کیوں کہ وہ عمر اور میں عثمان بک سے زیادہ تھا اور تمام ممالیک سردار کی سرداری پر متفق تھے۔ اب اس کا قیام اسی قصر میں بھی خسرو پاشا رہتا تھا۔ عثمان بک اور میں اس کے رتھے۔ البانی اور ارضی سپاہ مجھ پر جان دیتی تھیں اور اشاروں پر چلتی تھیں۔ میں دانستہ ممالیک کے میں نہ پڑا ورنہ اسماعیل بک کی جگہ عثمان ان کا رہتا۔

خسرو پاشا کی طرف سے بھی میں بے خبر نہیں تھا۔ میں اور نزدیک کنیوں کا جال بچھا دیا تھا اور اپنے کینہ توز دشمن کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ مجھے اس کے بارے میں تمام ت مل رہی تھیں۔ جو لوگ ممالیک کے دشمن تھے ان کی پناہ گاہ کے خواہاں تھے وہ خسرو پاشا کے گرد جمع ہو تھے۔ خسرو پاشا نے بھی اس موقع کو غنیمت سمجھا اور بہت کچھ لے دے کر اپنا گرویدہ بنا لیا۔ وہ انھی کو ساتھ لے پھرتا۔ اس کے علاوہ اور لوگوں کو بھی کے خلاف ابھار ابھار کر اپنے ساتھ ملاتا جاتا۔ اس لیں نے بہت بڑی جمعیت فراہم کر لی تھی اور اب قلعے میں پناہ گزیں تھا۔

خسرو پاشا کے بارے میں مجھے تازہ ترین یہ اطلاع ملی تھی وہ اپنی سپاہ کے ساتھ قاہرہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ شا کے قتل کی خبر اسے مل چکی تھی۔ غالباً وہ اس میں تھا کہ اب زمانہ اس کے موافق ہو گیا ہے۔

اطلاع پاتے ہی میں عثمان بک اور اسماعیل بک سے مشورے کے بعد یہ طے ہوا کہ خسرو پاشا کو راستے ہی روک لیا جائے۔ پھر حسن بک کی سرداری میں اسی روز ایک دستہ فوج خبر گیری کے لیے روانہ کر دی گئی۔ اس کے بعد البانی، ارمنی، ترکی، مملوکی اور بدوی سپاہ چل۔

فرسکور کے مقام پر خسرو پاشا نے دفعتہً "حسن بک پر حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملے کے نتیجے میں حسن بک کو پسپا ہونا پڑا اور خسرو پاشا مظفر و منصور شہر میں داخل ہو گیا۔ اس کی فوج نے شہر میں بڑی لوٹ مار کی۔ جب سپاہ لوٹ مار اور قتل و غارت گری سے فارغ ہو گئی تو خسرو پاشا نے اسے آگے بڑھتے رہنے کا حکم دیا۔ پھر جب اسے قاہرہ کے لشکر کی خبر ملی تو وسط جانا مناسب سمجھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے قلعہ بندی کر لی۔

اسماعیل بک، قاہرہ ہی میں تھا۔ تمام افواج کی کمان میرے ہاتھ میں تھی اور میرا شریک کار عثمان بک تھا۔ ہم بہت جلد وسط پہنچے۔ خسرو پاشا کی بد قسمتی کہ اس نے قلعے سے باہر نکل کر لڑنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اور عثمان نے اس کا مقابلہ کیا۔ ہم دونوں سخت لڑائی کے معنوں سمجھتے اور جنھیں مدد کی ضرورت ہوتی ان کی مدد کرتے۔

اثنائے جنگ ہی میں عثمان کی مقابلہ دشمن فوج کے ہراول سے ہوا جس کے درمیان خسرو پاشا تھا۔ خسرو پاشا نہایت سرگرمی سے مصروف پیکار تھا۔ میں بھی تیزی سے اس کی طرف جھپٹا۔ معاً میں نے خسرو پاشا کے گھوڑے کو گرتے دیکھا۔ کسی بندوق کی گولی نے اسے نشانہ بنایا تھا۔ ابھی میں اس سے کچھ فاصلے پر تھا۔ میں نے دیکھا کہ خسرو پاشا گھوڑے سے گرتے ہی ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ عثمان بک کسی عقاب کی طرح اس پر جھپٹا۔ وہ چاہتا تھا کہ تلوار کے ایک ہی وار میں خسرو پاشا کا کام تمام کر دے کہ اسی وقت میں وہاں جا پہنچا اور عثمان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اے عثمان!" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "یہ قیدی مجھے دے دو!"

عثمان کے چہرے پر حیرت نظر آئی، پھر وہ مسکرایا اور بولا "اچھا بابا۔"

میں آگے بڑھا۔ خسرو پاشا کا سر جھکا ہوا تھا۔ ہر چند کہ ابھی اس کے ہاتھ میں تلوار تھی، مگر اسے مجھ پر تلوار بلند کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ میں نے تلوار اس کے ہاتھ سے چھین کر دور پھینک دی اور پھر اس کا شانہ پکڑ کر بولا۔ "خسرو! تم میرے قیدی ہو!"

اس نے تعجب سے انداز میں میری طرف نگاہ اٹھا کر

دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ بولا' پھر اس نے دوبارہ سر جھکا لیا۔

خسرو پاشا کے گرفتار ہوتے ہی جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ میں نے اسے ایک مکان میں قید کر دیا اور وہاں سخت پہرا بٹھا دیا۔ اس کے بعد میں اپنے سپاہیوں کے پاس واپس آ گیا۔ اپنے سپاہیوں کی ضروریات اور انتظام و انصرام سے فارغ ہو کر میں نے ایک بار پھر اسی مکان کا رخ کیا جہاں خسرو پاشا قید تھا۔

میں خسرو پاشا کے پاس پہنچا تو اس نے مجھے دیکھ کر ایک سرد آہ بھری۔ میں قدم قدم چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا اور بولا۔ "اے خسرو! نظریں کیوں چرا رہا ہے! میری طرف دیکھ! میں اب تک اس نقاب سے اپنے چہرے کو چھپائے ہوئے تھا جو تو نے میرے چہرے پر ڈال دی تھی' لیکن اب میں نے وہ نقاب اتار دی ہے۔ تجھے یقیناً اب میرا اصلی چہرہ نظر آ رہا ہو گا!"

خسرو پاشا کے چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے نظر اٹھائی اور کہا۔ "ہاں میں اب محمد علی کو دیکھ رہا ہوں' جس پر میں نے احسان کیا تھا اور سالار بنایا تھا۔ وہ اب اپنے چہرے سے شرم کی نقاب ہٹا کر مجسم بغض و حسد بن گیا ہے۔" اس کے لہجے میں بڑی تلخی تھی۔

"نہیں!" میں نے بلند آواز میں کہا۔ "بغض و حسد نہ کہہ! میں مجسم انتقام ہوں۔ اے خسرو! یقین کر کہ میں اپنی نوجوانی کے زمانے سے اس لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔ کیا تو گمان کرتا ہے کہ میں تمام دنیا کے بدلے میں اسے ہاتھ سے جانے دوں گا۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم اس کو تمام جہاں کے عوض بھی ہاتھ سے نہ دو گے۔" وہ بولا۔ "اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس لونڈی کو جسے میں نے تمہاری آنکھوں کے سامنے قتل کر ڈالا' اس کا ملنا اب محال ہے۔ تمہاری بھول ہے اے محمد علی کہ تم کامیاب ہوئے۔ کامیاب تو میں رہا۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے تمہارے دل پر جو زخم لگایا' وہ اب تک بھرا نہیں۔ تم انتقام نہیں بلکہ بد نصیبی اور ناکامی کی تصویر ہو۔ ہاں میں نے ہی تمہاری محبوبہ کو قتل کیا۔ مجھے اعتراف ہے۔ تم مجھے اس فعل کی پاداش میں قتل کر ڈالو' مگر مجھے مرتے دم تک سکون رہے گا کہ تم زندگی بھر تڑپتے رہو گے کہ تمہارے دل کا زخم ہرا ہی رہے گا۔"

وہ میرے زخموں پر نمک پاشی کرنے لگا اور میں غصے سے بے قابو ہو گیا۔ میں نے خنجر کھینچ لیا اور اس کے سر پر کھڑا ہو گیا۔ پھر جیسے مجھے ہوش آ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے! ان باتوں سے اس کا یہ مقصد ہے! وہ یقیناً اس طرح اپنی موت کو آسان بنانا چاہتا تھا۔ میں نے اسی لیے دانت پیستے ہوئے دانت پیس کر کہا۔ "میں سمجھ گیا کہ تو مجھے کس طرح فریب دینا چاہتا ہے۔ تو تنکے دو عارے بچنے کے لیے موت کی خواہش کر رہا ہے اور اپنے مرنے سے خوش ہے۔ تو چاہتا ہے کہ میرے زخم اب تک نہیں بھرے۔ تیرا یہ خیال غلط ہے۔ یقین کر اے خسرو کہ میرے زخم بھر چکے ہیں۔ تو قتل ہے اور قتل کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں' لیکن میں تیری طبیعت کو پہچانتا ہوں۔ سن کہ تیرے گناہ کے مقابلے میں قتل بہت ہی ہلکی سزا ہے اس لیے میں تجھے قتل نہیں کروں گا بلکہ ذلیل و خوار کر کے زندہ رکھنے کی کوشش کروں گا۔ میرے ہاتھوں سے توہین کے تلخ گھونٹ پیتا پڑیں گے۔ میں تجھے یہ قید حیات قاہرہ لے جاؤں گا تاکہ وہاں تجھے کسی طرح انتقام لے سکوں۔"

"مجھے ان دھمکیوں کی پروا نہیں۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "تم یہ خیال نہ کرو کہ مجھے وہاں لے جانے سے تمہاری عزت میں بٹا لگ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے اے خسرو!" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "تو زندہ رہ اور اپنے کرتوت کا مزہ چکھ! تو برسوں عذاب میں رکھا جائے۔ اب میرا عذاب ختم ہو گا اور تیری باری ہے۔ جب تک تجھ میں ذلت و خواری اٹھانے کی طاقت ہے' زندہ رہ اور رسوائی اور ذلت کا جام پیتا رہ۔ قاہرہ چل!"

قاہرہ میں مظفر و منصور فوج کا داخلہ نمایاں شان و شوکت سے ہوا۔ چار ہزار ممالیک کے آگے آگے میں بک بردبسی نمایت جاہ و جلال سے اپنے گھوڑے پر سوار جا رہا تھا۔ الہانی اور رمنی سپاہ کا پیش رو میں تھا۔ میرے ہر ہی ایک شخص سنہری وردی میں گھوڑے پر سوار تھا اور ہونٹوں کو چبا رہا تھا اس کی پیشانی پر بل پڑے ہوئے تھے زرد چہرے پر غیظ و غضب کے آثار ہویدا تھے' مگر وہ بے تھا۔ یہ وہی خسرو پاشا تھا جو کبھی کل مصر کا حکمراں تھا۔ خلقت کی کثرت کے سبب آمد و رفت کے راستے بند تھے۔ مرحبا اور مبارک باد کے نعروں سے آسمان گونج رہا تھا۔ مجھے اور میرے قیدی کو دیکھتے ہی شور و غل کی آواز

اسماعیل بک کے بعد عہدے اور اقتدار میں مجھے افضلیت حاصل تھی' گویا ان کے بعد میں ہی جو اب وہ تھا۔ عثمان بک کی حیثیت گویا میرے نائب کی تھی۔ میرے نزدیک حالات جو رخ اختیار کرنے والے تھے اسے مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ مناسب نہ تھا۔ اسماعیل بک کے دل میں میرے لیے پہلے ہی سے شکوک و شبہات تھے۔ میں ان سے پورا فائدہ اٹھایا اور اسماعیل بک سے ملا۔ میں نے جب یہ تجویز پیش کی کہ عثمان بک کو ترقی دے کر وہ اپنا نائب بنا لے تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔ اس طرح گویا عثمان بک عہدے میں مجھ سے بڑھ جاتا۔ اس نے فوراً میری تجویز قبول کر لی اسی کے ساتھ ساتھ میں نے ایک اور رائے بھی دی کہ تمام افواج سے متعلق مالی امور کی ذمے داری اور انتظام عثمان بک کے حوالے کر دیا جائے۔ اسماعیل بک اور بھی خوش ہو گیا۔ اس کے نزدیک میں اس طرح خود ہی اپنے اختیارات کم کر رہا تھا۔ گویا اب میں ایک سپہ سالار رہ گیا تھا جس کا کام صرف حکم کی بجا آوری ہے۔ امیر الممالیک نے یہ رائے بھی مان لی۔ اسے ذرا بھی گمان نہ ہوا کہ میں یہ سب کچھ کیوں کر رہا ہوں۔

عثمان بک کو جب ان باتوں کا علم ہوا تو وہ بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے اسماعیل بک کے شکوک و شبہات کا خوب مذاق اڑایا اور کہا کہ اگر محمد علی' ممالیک کا خیر خواہ نہ ہوتا تو خود ہی اپنے اختیارات میں تخفیف کیوں کرتا اور مجھے نائب سلطنت بنانے کی سفارش کس لیے کرتا جب کہ میں ایک طرح سے اس کی نیابت کر رہا تھا! بہرحال اس نے نئی عہدہ سنبھال لیا۔

عہدہ سنبھالتے ہی اسماعیل بک کے مشورے پر اس نے تاجروں پر محصول بڑھا دیے۔ افواج کو کیوں کہ واجبات کی پوری ادائیگی نہیں ہو رہی تھی اور اب وہ براہ راست میری کمان میں بھی نہیں رہی تھیں' تمام انتظامی امور عثمان بک کے ہاتھ میں تھے اس لیے ممالیک نے چاروں طرف پھیل کر لوگوں کے مال پر دست درازی شروع کر دی۔ اب وہ اس لیے بھی شیر ہو گئے تھے کہ ان کا سردار عثمان بک عہدے اور اختیار میں مجھ سے بڑھ گیا تھا اور وہ مجھے جواب دہ نہیں رہے تھے۔

لوگ ممالیک کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر چند ہی دن میں چیخ اٹھے' عثمان بک اس معاملے کو نازک سمجھ کر میرے پاس آیا۔ لوگوں نے میرے حق میں نعرے بلند کر کے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

میں اپنے خونخوار دشمن کی طرف جھک کر بولا۔ "اے خسرو! تو دیکھ رہا ہے لوگوں کو کیا کہی ان لوگوں نے تیرا اس طرح استقبال کیا؟ میں اس وقت تیرے ساتھ ہونے سے بہت خوش ہوں۔ تو رات کی تاریکی میں قلعے سے بھاگ نکلا اگر تجھے کوئی دیکھ نہ سکے' مگر اب تجھے دن کی روشنی میں اسی قلعے کی طرف لے جا رہا ہوں اور سب دیکھ رہے ہیں۔ وہاں افسوس یہ ہے کہ اب تو اس قصر میں نہ رہ سکے گا جس میں مسند پر بیٹھتا تھا اور نازک اندام حسینائیں تیری دلداریاں کرتی تھیں۔ اب اس قصر میں ممالیک کا سردار ایک بک رہتا ہے اور تو۔ تو وہاں رہے گا' اس تنگ ایک کوٹھری میں جو میں نے پہلے سے تیرے لیے مخصوص کر دی ہے۔ وہاں میں تیری خدمت کو صبح و شام حاضر ہوا کروں گا۔"

"اے محمد علی! میں تمہاری خدمت سے بہتر یہ سمجھتا ہوں کہ اپنی قبر میں سو رہوں۔"

میں ہنس پڑا پھر کہا۔ "اے خسرو! یہ اتنا آسان نہیں۔" میں نے ظریفہ لہجہ اختیار کر لیا۔ "آپ میری صورت میں کے روادار نہیں ہیں' تعجب ہے! میں تو حضور ہی کا خدمت پر مامور ہوں۔ میں خود حضور کی خدمت کروں گا۔ تو میرے آقا ہیں۔ آپ میرے سوا کسی کو اپنی خدمت کرنے دیکھیں گے۔ اچھا اب قلعے کا دروازہ آ گیا ہے۔ آپ کو شریف لے چلیے کیوں کہ سرداروں کو آگے چلنا ہی ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اپنے گھوڑے کی باگ کھینچی اور گدھے کو آگے کر کے تلوار کی نوک سے ٹھوکا دیا۔ گدھا چیخ کر اندر گھس گیا۔ سپاہی اس حرکت سے بہت خوش ہوئے اور زور سے قہقہے مارے۔

خسرو پاشا کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ پھر چند ممالیک نے آگے بڑھ کر میرے اشارے پر اسے گدھے سے اتار لیا۔

"اسے لے جاؤ۔" میں نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "اس کی بھی طرح گرفتاری کو کیوں کہ یہ میرا قیدی ہے۔ اس کی حفاظت میں کوئی غفلت نہ ہو! اور ہاں اسے کوئی تکلیف بھی نہ پہنچانا۔"

پاس مشورہ کرنے آیا۔ اس کے سامنے اب سب سے بڑا مسئلہ افواج کے داجبات کا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ کوئی مناسب طریقہ سوچوں گا اور جب کوئی راہ سوجھ جائے گی تو میں اسے آگاہ کردوں گا۔

فوج ہر طرف سے اپنے وظائف لینے پیہم چلی آرہی تھی۔ معاملات روز بہ روز بگڑتے جارہے تھے۔ مجھ سے دیرینہ تعلق ہونے کے سبب ان کے سالار میرے پاس آئے اور شکایات کیں۔ انھوں نے مجھ سے مدد اور تعاون کی درخواست کی۔ میں نے موجودہ صورت حال پر ان سے سخت افسوس کا اظہار کیا اور کہا۔ "تمھاری اس حالت سے میں بہت غمگین ہوں، لیکن بدقسمتی سے میرے پاس نہ مال ہے اور نہ اب اختیار! میری جو تنخواہ مقرر ہے وہ میرے ہی اخراجات کو بہ مشکل پورا کرپاتی ہے۔ پھر یہ کہ مجھے بھی وقت پر تنخواہ نہیں ملتی۔ تم لوگ اسماعیل بک اور عثمان بردبکی کے پاس جاؤ کہ وہی دونوں صاحب اختیار ہیں اور تمھارا معاملہ وہی پکا سکتے ہیں۔"

مشترکہ افواج کا وفد میرے پاس سے لوٹ گیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ اب وہ کیا قدم اٹھائیں گے! پھر وہی ہوا جس کا میں نے اندازہ کیا تھا۔ سپاہیوں نے عثمان بک کی حویلی کو گھیر لیا۔ عثمان بک نے دریچے سے نگاہ کی تو اردگرد کے گلی کوچے اور شاہراہیں سپاہیوں سے پٹی پڑی تھیں۔ اس نے سپاہیوں سے آنے کی وجہ دریافت کی۔

سپاہیوں نے چلا کر جواب دیا کہ ہم بھوکے ہیں اور اپنی تنخواہ لینے آئے ہیں۔

عثمان بک بولا کہ اس وقت اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے جاؤ! دو دن بعد تمھاری تنخواہیں تمھارے پاس پہنچ جائیں گی۔

"ہم ایک لمحہ انتظار نہیں کرسکتے!" ایک افسر نے چیخ کر کہا۔ "تنخواہ لیے بغیر ہم یہاں سے نہیں ہٹیں گے۔"

باقی لشکر نے انھی الفاظ کو دہرایا اور بھرا مار کر آگے بڑھے۔ وہ غالباً یہ چاہتے تھے کہ زبردستی عثمان بک کی حویلی میں گھس جائیں۔

میں وہیں ایک جگہ چھپا ہوا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ یہ صورتحال دیکھ کر میں تیزی کے ساتھ آگیا اور پھر ایک بلند مقام پر کھڑے ہو کر بلند اور سخت آواز میں سپاہیوں کو مخاطب کیا۔

"ٹھہر جاؤ! رک جاؤ! یہ کیا کررہے ہو تم! تم سردار کے گھر میں گھسنے کی جرات کررہے ہو!"

سپاہی رک گئے اور پھر میرے اشارے پر حویلی دروازے سے دور ہٹ گئے۔ پھر میں عثمان بک کی حویلی داخل ہوا تو اس نے مجھے سینے سے لگا لیا اور کہا۔ "میرے غیرخواہ دوست! سلامت رہو!"

"اے عثمان! میں معافی چاہتا ہوں۔" میں اس سے الگ ہو کر بولا۔ "مجھے گمان بھی نہ تھا کہ فوج تمھاری طرف آجائے گی اور تم سے مال طلب کرکے تمھیں پریشان میں ڈال دے گی۔ یہ لوگ میرے پاس آئے تھے۔ ظاہر ہے ان کے مطالبات کہاں سے پورے کرتا! مگر ان کی جرات حیرت انگیز ہے کہ وہ تم پر چڑھ آئے۔"

عثمان نے نیچی نظروں سے مجھے دیکھا، پھر بولا۔ "محمد علی! میں تمھارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خدا تم جیسا دوست کو سلامت رکھے۔"

میں نے دانستہ بلند آواز میں جواباً کہا۔ "اے عثمان بک! افسوس کے فرائض سپاہ کے ساتھ ساتھ ہیں۔ میں نے جو کچھ کیا، یہ مجبوری کیا۔" میرا مقصد یہ تھا کہ سپاہی میری بات سن لیں جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھے اور عثمان حویلی کے دروازے پر ہی تھے۔ میں نے کہا۔ "میں سپاہیوں کی طرف سے ان کی بے جا مالی طلب گار ہوں مجھے امید ہے کہ سپاہیوں کا جائز مطالبہ وقت پورا کردیا جائے گا۔ ہم نے انھیں رعایا کو ستانا اور لوٹ مار سے روک دیا ہے، اب اگر ہم ان کا مشاہرہ نہ کردیں تو یہ قطعی نامناسب ہوگا۔ تم جو کچھ دے سکتے ہو اسی وقت انھیں دے دو۔"

میری تدبیر کارگر ہوئی۔ سپاہی میرے حق میں نعرے لگانے لگے۔

"اے دوست! یقین کرو کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔" عثمان عاجزی سے بولا۔ پھر اس نے سپاہیوں کی طرف بلند آواز میں کہا۔ "سپاہیو! اپنی اپنی جگہوں پر چلے جاؤ۔ میرا وعدہ کرتا ہوں کہ کل تمھارا مطالبہ پورا کردوں گا۔"

سپاہیوں نے عثمان بک کی یہ بات درخور اعتنا نہ سمجھی اور وہیں اڑے کھڑے رہے۔

اب میں نے سپاہیوں کو مخاطب کیا۔ "اس وعدہ کے بعد بھی تم یہیں کھڑے ہو! کیا تم اپنے سردار اور اس کے وعدے کو بھی نہیں جانتے! اب جاؤ، کل کا انتظار کرو!"

سپاہی میرے کہنے پر واپس چلے گئے۔ عثمان بک نے میرا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگا۔ "تم نے مجھے بہت بڑی مصیبت سے بچالیا۔ میں نے ان سے کل کا وعدہ کیا ہے، اب مجھے کوئی ایسی تدبیر بتاؤ کہ اپنا وعدہ پورا کرسکوں۔"

"کل پھر کسی دن پر ٹال دینا۔" میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔ "اس وقت تک کہ مال کا بندوبست نہ ہو جائے، میں تمھاری مدد کرتا رہوں گا۔"

"مگر مال کی فراہمی کے لیے کوئی تدبیر تو ہو۔" وہ بولا۔ "آخر وہ کب تک ملتے رہیں گے۔"

میں نے کچھ دیر توقف کیا، پھر کہا۔ "ایک تدبیر تو ہے مگر خطرہ!"

"کہو اے دوست! جلدی کہو!" عثمان بے چین ہو گیا۔ "کچھ خوف نہ کرو! اگر مال ملنے کی کوئی صورت نکل آئے تو پھر بھی خطرے کی پروا نہیں۔"

"میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم نے اہل مصر پر تو بہت کچھ محصول وغیرہ لگا دیے، مگر اجنبیوں اور فرنگیوں کو نظرانداز کردیا گیا۔" میرا مقصد اس سے ایک نئے فتنے کو ہوا دینا تھا۔ عثمان کچھ کہہ سنا سکیا اور بولا۔ "مگر پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا کہ غیرملکیوں پر بھی محصول لگائے گئے ہوں۔"

"تو کیا ہوا، تم پہل کرسکتے ہو۔ تم انھیں مجبور کرو۔ وہ یہاں آکر بے انتہا دولت حاصل کرتے ہیں، مگر حکومت کو کچھ نہیں دیتے۔" میں نے اسے قائل کیا۔

"تم ٹھیک ہی کہتے ہو محمد علی!" وہ طویل سانس لے کر بولا۔ "میں ابھی محاسب کو بلاتا ہوں۔"

میرا کام ہو چکا تھا۔ ادھر عثمان نے محاسب کو طلب کیا، ادھر میں نے اس سے اجازت چاہی۔

میری تدبیر کارگر ہوئی۔ غیرملکیوں میں دیگر ممالک کے سفیر بھی تھے۔ انھیں یہ مطالبہ بہت گراں گزرا۔ بہ طور احتجاج انھوں نے عثمان بک سے ملنا چاہا، مگر وہ نہ ملا۔ اسے مال جمع کرنے کے سوا کچھ اور سوجھتا ہی نہیں تھا۔ سفراء نے یہ رنگ دیکھ کر قاہرہ چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ اپنے عملے سمیت اسکندریہ چلے گئے۔ ان سے یہ جبر محصول وصول کر لیا گیا جن کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ سفارتی تعلقات منقطع ہونے کے سبب اس طرح ممالک کا وقار ساری دنیا میں خاک میں مل گیا۔

فرانس کا سفیر، قاہرہ چھوڑنے سے پہلے بہت دیر تک میرے ساتھ رہا اور تفتگو کرتا رہا۔ اس گفتگو کا علم میرے سوا کسی کو نہ ہوا۔ چلتے وقت میں نے سفیر سے دبی زبان میں کہا کہ بس اب تھوڑے سے انتظار کی ضرورت ہے، پھل پک چکے ہیں۔ میری جانب سے آپ خورشید پاشا کو یہ پیغام پہنچادیں کہ میں ان کے لیے راستہ صاف کررہا ہوں۔ میں سلطان ترکی کا سچا خادم ہوں، اگرچہ بہ ظاہر حالات مختلف نظر آتے ہیں۔ وقت آنے پر مناسب کارروائی سے گریز نہیں کروں گا۔

اسی شب میں نے اپنے قصر میں کھڑے ہو کر کہا کہ آج کے دن سے ممالک کی دولت و حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ پھر میں نے قاضی اور علماء و فقہا کو بلانے کے لیے قاصد بھیجے تاکہ سلطانی حکم سے انھیں مطلع کروں جو آستانے سے آیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ سب میرے قصر میں جمع ہو گئے۔ میرے ساتھ خورشید پاشا کا وکیل بھی تھا جسے وہ پہچانتے تھے۔ میں نے کھڑے ہو کر سلطانی فرمان سنایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ سلطان نے اب خورشید پاشا کو اپنا نائب اور تمام قلمرو مصر کا حاکم مقرر کیا ہے۔ سب پر اس کی اطاعت و فرماں برداری لازم ہے۔ یہ تاحاکم کل تک قاہرہ پہنچ کر قلعے وغیرہ پر اپنا قبضہ کرلے گا اور تمام رعایا سے اطاعت کا عہد و پیمان لے گا۔

فرمان سلطنت سن کر سبھی نے اطاعت و فرماں برداری کا اظہار کیا اور کہا کہ اب ہمیں یقین ہے، اس نئے نائب کے آنے سے نیا دور شروع ہوگا۔ اس کا آنا امن و امان کا عنوان اور ظلم و جور کا بدل ہوگا۔ اس کے بعد حاضرین، عوام کو ان حکام سے مطلع کرنے اور اطاعت پر مستعد کرنے کے لیے مسجدوں کو روانہ ہو گئے۔

لوگ چلے گئے تو میں نے اپنے محافظ دستے کے افسر اور دو سپاہیوں کو ساتھ لیا میرا رخ اب قلعے کی طرف تھا۔ قلعے پہنچ کر میں نے اپنے ساتھیوں کو پیچھے چھوڑا اور خواص کو ٹھری کی طرف بڑھا جہاں خسرو پاشا قید تھا۔

خسرو پاشا اس وقت سو رہا تھا۔ چند لمحے میں اسے سوتے دیکھتا رہا، پھر آواز دی۔ "اے نائب مصر اٹھ!"

"کون ــــ مجھے کون پکارتا ہے؟" خسرو پاشا آنکھیں ملتا

ہوا اتھا۔

"آپ کا غلام محمد علی جسے آپ نے اس مرتبے پر پہنچایا' آپ کو پکار رہا ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔" اس کا جسم کانپنے لگا۔ "تو یقیناً میرا کام تمام کرنے آیا ہے!"

"نہیں۔" میں نے سمجھایا۔ "اگر میں تجھے قتل کرنا چاہتا تو کبھی کا ایسا کرچکا ہوتا۔ میں تو تجھے وہ فرمان سنانے آیا ہوں جو آستانے سے تیرے متعلق صادر ہوا ہے۔ سن! یہ ہے وہ فرمان جسے ہمارے آقا سلطان المعظم نے بھیجا ہے۔"

خسرو پاشا نے سر جھکا لیا اور بولا۔ "یہ میرے قتل کا حکم ہوگا۔ اگر یہ میری بحالی کا حکم ہوتا تو اسے سنانے تو میرے پاس نہ آتا۔ اچھا سنایا ہے!"

میں نے فرمان کھولا اور پڑھ کر سنایا جس کا ماحصل یہ تھا کہ خسرو پاشا نے اپنی خدمات کو اچھی طرح ادا نہیں کیا۔ دشمن کے سامنے بھاگ جانے' اپنے فرض کو پامردی سے ادا نہ کرنے اور اس شہر میں جس کا حاکم تھا' پایہ زنجیر آنے سے اس نے اپنی نااہلی کو پورے طور پر ثابت کردیا ہے۔ وہ اس منصب عظیم کا جو ہمسے اسے عطا کیا تھا' ہرگز اہل نہیں لہٰذا حکم ہے کہ آئندہ وہ روپوش ہوجائے اور دارالسلطنت یا کسی شہر میں جو ہمارے زیر حکومت ہے' اپنی صورت نہ دکھائے۔ اس حکم سے وہ جلاوطن کیا گیا۔ آئندہ کوئی اس امر کا ذکر ہمارے سامنے نہ کرے۔ اس کے لیے جزیرہ امبرو معین کیا جاتا ہے جہاں اسے تا بہ مرگ رہنا چاہیے!"

یہی وہ فرمان تھا جسے حاصل کرنے کے لیے میں نے خورشید پاشا کو چارے کے طور پر استعمال کیا تھا اور اس میں فرانسیسی سفیر کی کوششوں کا بھی دخل تھا ورنہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے سلطان ترکی یہ فرمان جاری نہ کرتا۔ میں نے اپنے دشمن کے بارے میں جو کچھ سوچا تھا اور جو حاصل کیا تھا' اس کی وقتی طور پر ہی سہی' بڑی قیمت ادا کی تھی۔

میں فرمان سنا چکا تو خسرو پاشا کو دم بہ خود کھڑے دیکھا۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ "امیرو! پہچانتے ہو اسے؟ امیرو قوالہ کے سامنے ایک پہاڑی جزیرہ ہے! اے خسرو! امیرو شکریہ ادا کر کہ میں نے ہی تیرے قیام کے لیے اسے پسند کیا ہے۔ تو جانتا ہے' میں نے اسے کیوں پسند کیا؟ اس لیے کہ وہاں قید کیے جانے سے قوالہ' اس کا سمندر اور بو سیفالوس کے پہاڑوں کی چوٹیاں دیکھ سکے گا۔ ہاں تو سمندر اور اس کا ساحل دیکھے گا۔ تو اس جگہ کو دیکھے گا جہاں میں نے اپنی زندگی کی سخت ترین رات گزاری تھی' اس جگہ کو دیکھے گا جہاں جوہرہ کو غرق کرایا۔ ان سب کو دیکھ دیکھ کر مجھے یاد کرنا اور باقی زندگی دردناک عذاب میں مبتلا رہ کر گزارنا! یاد کر' تو ہی قاتل ہے اور تو نے ہی ایک نیک سرشت نوجوان کو بدخلق و حشی درندہ بنایا۔ امیرو میں رہنے سے نہ ڈرا' تمنائی کی زندگی سے نہ گھبرا! وقتاً فوقتاً تو کو میری خبریں تیرے پاس پہنچتی رہیں گی۔ مجھے معلوم ہوتا رہے گا کہ میں نے کیسی عظمت حاصل کرلی ہے! تو بھی کرے گا کہ وہی لڑکا جسے تو نے شرم گستاخ یا حقیر غلام کہا کرتا تھا' کس مرتبے پر پہنچ گیا' تو عنقریب سن لے گا کہ تیرے پروردہ نے تیرا منصب لے لیا ہے۔ میری طرف سے قوالہ اس کے حوالے کردیا جائے گا۔ تو جوہرہ کی کمری نشانوں قبر پر سلام بھیجنا' پھول نہ جانا! تو مجھے کہتا تھا' کب چلا؟ میری طرف سے تجھے ایک افسر اسکندریہ لے جائے گا اور وہاں سے تیرے ساتھ جہاز پر سوار ہوکر تیری دائمی قیام گاہ تک پہنچائے گا۔ اچھا اے خسرو! خدا حافظ!" میں یہ کہہ کر اس کی کوٹھری سے نکل آیا۔

●

نیا نائب خورشید پاشا' قاہرہ پہنچ گیا اور قلعہ کی طرف روانہ ہوا' جہاں لوگوں نے اس کا استقبال کیا۔ ان میں پیش پیش میں تھا۔ اسی قصر میں جہاں کبھی حاکم بدل چکے تھا' خورشید پاشا مسند حکومت پر بیٹھا۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ مجھے اپنا وزیر بنایا اور پاشا کا خطاب دیا جس کی منظوری وہ پہلے ہی آستانے سے لے چکا تھا۔

قاہرہ میں امن و امان قائم ہوگیا' مگر یہ زمانہ بھی نہ پاشا بہت نہ ہوا کیوں کہ خورشید پاشا کو بھی پہلے حکام کی طرح مال کی ضرورت ہوئی۔ معمولی محاصل ضرورت پوری کرنے کے لیے ناکافی تھے۔ اس نے بھی اپنے پیش رو کی طرح نئے محاصل لگانے کا ارادہ کیا۔ عوام دل برداشتہ ہوکر میرے پاس وفد لے لے کر آنے لگے۔ سب اپنی ضرورتوں میں میری ہی طرف رجوع کرتے۔ میں ان کے معاملات طے کرتا اور ان سے اچھی طرح پیش آتا۔ اکثر میں ان لوگوں کی حمایت میں خورشید پاشا کی مخالفت کرتا۔ اس سے میں نے محسوس کیا کہ لوگوں کے دلوں میں میری تو قیر و عزت بڑھ رہی ہے۔ خورشید پاشا کے رویے نے مجھ پر ظاہر کیا کہ وہ حسد کرنے لگا ہے اور شاید میری برائی کے درپے ہے۔ مجھے اپنے محبوبوں سے بھی یہی اطلاعات ملیں۔

اسی دوران مجھے خبری منتشر ممالیک بھی پھر یک جا ہوگئے ہیں اور قوت پکڑتے جارہے ہیں۔ وہ اس موقع کی تاک میں تھے کہ کسی طرح قاہرہ پر دوبارہ ان کا قبضہ ہوجائے۔ اس کے علاوہ وہ مجھ سے انتقام بھی لینا چاہتے تھے کیوں کہ میں ہی ان کی تباہی کا سبب بنا تھا۔ جب انھیں میری اور خورشید کی چشمک کا علم ہوا تو وہ خورشید پاشا سے اطاعت و فرماں برداری کا اظہار کرنے لگے۔ اسی اثناء میں ترکی سے ایک بڑی بیڑا بھیجا گیا جو اسکندریہ پہنچ چکا تھا۔ سلطان' مصر میں امن و امان بحال کرنا چاہتا تھا اور اسی غرض سے یہ جنگی بیڑا روانہ کیا گیا تھا۔

حالات پر میری کڑی نگاہ تھی' ممالیک نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ ممالیک کے سرداروں نے امیرالبحر افواج ترکی اور خورشید پاشا سے نامہ و پیام شروع کیا۔ انھوں نے خورشید پاشا کو ایک خفیہ مکتوب بھیجا جو لفظ بہ لفظ مجھ تک منتقل ہوگیا۔ مکتوب یہ تھا۔ "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ دولت علیہ عثمانیہ کا مخالیہ ہے' ملک سے جنگ و جدال اور خوں ریزی کو ختم کرکے امن و امان قائم کردے۔ ہم لوگ اس لیے اپنے آپ کو اس خدمت کے انجام دینے کے لیے پیش کرتے ہیں تاکہ مجھ علی اور اس کے ساتھیوں کے شر سے ملک کو نجات دلائی جاسکے۔ فساد و جنگ و جدال کا موجب یہی گروہ ہے۔"

خورشید نے اس پیشکش کو بہت پسند کیا اور خوشی کا اظہار بھی کیا۔ اسے گویا مجھ سے اور میرے رفقا سے پیچھا چھڑانے کے لیے ایک مدد گار مل گیا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ خورشید پاشا نے میری شکایت سلطان کو بھی لکھ بھیجی ہے کہ یا تو محمد علی پاشا کو معزول کردیا جائے یا مع فوج اسے کسی دوسری جگہ بھیج دیا جائے۔

اب میرے اور خورشید کے درمیان کھلی دشمنی کا آغاز ہوچکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ فوج میرے ساتھ ہے اور مجھ سے محبت کرتی ہے۔ غالباً یہی سوچ کر اس نے نئی فوج بھرتی کی اور اسی کو اپنی پاسبانی پر مقرر کیا۔ یہ غیر منظم فوج تھی اور زیادہ تر شورشوں پر مشتمل تھی چور' اچکے' غنڈے اور لٹیرے! خورشید پاشا ان کی نامعقول حرکتوں اور لوٹ مار پر پشت پناہی کرتا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ فوج میں ایسے لوگوں کو بھرتی کیا گیا تھا۔ وہ ماہ بہ ماہ اس نئی فوج کی تنخواہیں ادا کرتا تھا اور سابق فوجیوں کو پھوٹی کوڑی نہ دیتا تھا۔ جب خورشید پاشا کو نئی فوج کی تنخواہیں ادا کرنے کی ضرورت پڑتی تو وہ اسے کسی قریبی قصبے یا شہر بھیج دیتا۔ وہ لوٹ مار کرکے وہاں سے مطلوبہ رقم اکٹھی کرلاتے۔ یہ آخری کارروائی اہل ملک کو بہت ناگوار ہوئی۔ اس ظلم کو برداشت کرنا ان کے امکان سے باہر تھا۔ آخر نوبت یہ آگئی کہ وہ اس ظلم کے خلاف آواز اٹھانے پر تیار ہوگئے۔ انھوں نے شہر کے قاضی اور بڑے بڑے علماء کی زبانی اپنا پیغام خورشید پاشا کے پاس کہلا بھیجا۔ خورشید پاشا علماء کے ساتھ سختی سے پیش آیا اور کہا کہ میں تمہا تمھاری قسمت کا مالک اور تمھارا حاکم ہوں۔ جو کچھ میں چاہتا ہوں وہی ہونا چاہیے۔ فرماں برداری اور اطاعت کے سوا تمھارا کوئی کام نہیں۔ اگر تم نے میرا کہنا نہ مانا تو تمہیں قتل کرادوں گا۔

اس پر قاضی نے سکون کے ساتھ کہا۔ "ہم نے جب تمہیں حاکم بنایا تھا تو عادل تھے۔ اب ہم نہیں چاہتے کہ ہمارا حاکم ایک خود سر ظالم ہو۔" یہ کہہ کر قاضی' علماء کے ساتھ وہاں سے چلا آیا۔

باہر آکر انھوں نے مختلف لوگوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہمیں یقین ہوچکا ہے کہ حاکم عدل کرنا نہیں چاہتا اور نہ وہ حق کی پیروی کرے گا۔ ہمارا فرض ہے کہ ایسے حاکم کو معزول کردیں۔ آؤ ہم اپنے عدل پرور محمد علی پاشا کے پاس چلیں اور اس معاملے میں اس سے مشورہ کریں۔

قاضی کی خورشید پاشا سے کیا گفتگو ہوئی اور پھر اس نے لوگوں کے مجمع میں کیا کہا' مجھے اس کی اطلاع فوراً ہی مل گئی تھی۔ میں ان کا انتظار کرنے لگا۔

ذرا دیر بعد ہی عوام کے ایک جم غفیر نے میری حویلی کو گھیر لیا اور پھر قاضی اپنے ساتھیوں کو لیے میری حویلی میں آگیا۔ میں نے خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا اور مخاطب ہوا۔

"ہم اپنی طرف سے اصالتاً" اور قوم کی طرف سے وکالتاً" یہ ظاہر کرنے آئے ہیں کہ آج سے خورشید پاشا کو حاکم نہیں مانتے اور نہ اب اس کی اطاعت کریں گے۔" قاضی نے گفتگو شروع کی۔ "اس کا ظلم ہمارے حمل سے بڑھ چکا ہے۔ ہم نے اسے معزول کرنے کا عہد کیا ہے"

"تم لوگوں نے اسے معزول کرنے پر اتفاق کرلیا، مگر اس کی جگہ کسی کو مقرر کرنا بھی تو ضروری ہے۔" میں نے جواباً کہا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ اب منزل قریب آچکی ہے۔

"ہاں ہمیں معلوم ہے اور ہم اسے جاننے بھی ہیں جسے حاکم بنانا چاہتے ہیں۔" قاضی پرجوش لہجے میں بولا۔ "ہم نے محمد علی پاشا کو اپنا حاکم پسند کیا ہے۔ ہم خورشید پاشا کو معزول کرکے تمہیں اس کی جگہ حاکم بنانا چاہتے ہیں۔ تبھی خوب جانتے ہیں کہ تمہیں قوم و ملک کا کتنا خیال ہے! تم ان کے راحت و آرام میں اپنی جان لڑا تے ہو۔"

"میں!۔۔۔ نہیں۔" میں نے حیرت اور انکار کا اظہار کیا۔ "میں اس منصب عظیم کے لائق نہیں۔"

"ہم جانتے ہیں کہ تم اس سے زیادہ کے اہل ہو!" قاضی زور دے کر بولا۔ "یہ قوم کی درخواست ہے، تمہیں اسے قبول کرنا پڑے گا۔ میں قوم کی طرف سے اور ملک کی فلاح کے لیے تمہیں والیٔ مصر بناتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے دریچے کی طرف گیا اور اسے کھول کر بلند آواز میں لوگوں کو مخاطب کیا۔ "لوگو! ہم نے خورشید پاشا کو معزول کرکے اس کی جگہ محمد علی پاشا کو تمہارا والی و حاکم مقرر کیا، کیا تم اس پر اتفاق کرتے ہو؟"

جواب میں عوام نے تائید کی اور میرے حق میں فلک شگاف نعرے لگائے۔

قاضی کمرے میں واپس آکر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اب تو آپ نے قوم کی آواز سن لی! تمہیں میرے ساتھ اور دریچے تک چلیں تاکہ لوگ اپنے ہردل عزیز حاکم کو دیکھ لیں اور مبارک باد دیں۔"

تھوڑی دیر تامل کے بعد میں نے کہا۔ "اگر یہ ہونا ضروری ہے تو میں تقاضائے الٰہی کو کیسے روک سکتا ہوں! قوم مجھے پکار رہی ہے۔ مجھے صرف منظوری کرنا ہے۔ خدا میری مدد کرے اور مجھے نیک عمل کی توفیق دے۔" یہ کہہ کر میں کھڑا ہوگیا۔

قاضی مجھے لے کر حویلی سے باہر آیا۔ مجھے دیکھتے ہی لوگ پھر پرجوش نعرے لگانے لگے۔ میں نے مختصر الفاظ میں ان کا شکریہ ادا کیا اور ان کے سامنے ان کی پیشکش قبول کرلی۔

خورشید پاشا بھی بے خبر نہیں بیٹھا تھا۔ ابھی لوگ وہاں موجود تھے کہ ایک سرکاری ڈھنڈورچی نے اعلان کیا۔ "حاکم و نائب سلطان خسرو پاشا نے آستانے سے محمد علی پاشا کی معزولی کے احکام منگوا لیے ہیں جو جلد پہنچنے والے ہیں۔ عوام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ مفسدوں کی باتوں میں نہ آئیں!"

اس وقت قاضی اور علماء کو رخصت کرکے میں میں پہنچ چکا تھا۔ میرے نزدیک یہ شکست کی آواز تھی۔ اس سے صرف کچھ موقع پرستوں پر اثر ہو سکتا تھا۔ فوج اور عوام کی اکثریت میرے ساتھ تھی۔ میں نے اسی لیے اس اعلان کو در خور اعتنا نہ سمجھا۔ میں نے فوراً ہی اپنی سپاہ کے افسروں کو بلوایا۔ پھر کچھ ہی دیر میں اپنی فوج کے ساتھ اسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

توقع کے مطابق مجھے قلعے کے دروازے بند ملے اور میں نے قلعے کا حصار کرلیا۔ پھر چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی۔

چار دن تک یہی حالت رہی اور جنگ ہوتی رہی۔ پانچویں دن شام کو ان شکایتوں کا جواب آگیا جو خورشید پاشا نے وہاں لکھی تھیں۔ بعد میں اس کی وجہ معلوم ہوئی کہ وہاں سے حکم آنے میں اتنی تاخیر کیسے ہوئی؟ دراصل خورشید پاشا کی شکایتی عرض داشت جب آستانے پہنچی، صدر اعظم نے ایک قبودیی باغی کے خفیہ طور پر مصر روانہ کیا۔ اسے فہمائش کردی گئی تھی کہ خود تمام واقعات کی تفتیش رازداری سے کرے اور جو حقیقت حال ہو، حضور میں پیش کرے، تاکہ اس کی صلاحیت کی بنا پر قبودیی باغی نے اپنی خدمت کو دیانت اور ہوشیاری سے پورا کیا اور آستانے پہنچ کر حقیقت حال صدر اعظم کو بیان کی۔ صدر اعظم نے مصر کے حالات سلطان کے سامنے بیان کیے کہ سلطانی فرمان جاری ہو۔ یوں صدور حکم میں تاخیر ہوئی تھی۔

جب ہر طرف امن و امان بحال ہوگیا تو میں نے قلعہ پر مرمت کرائی اور اسی کے ساتھ قصر کی بالائی منزل بھی تعمیر کی۔ میں نے ایک عالی شان قصر از کیہ میں بھی اپنا لیے خوب صورتی اور متانت میں اپنی مثال آپ تھا۔

وزیروں اور عمال سے بس یہ قدر ضرورت معاملات کے متعلق میری گفتگو ہوتی تھی۔ ہاں وزیر مال حسن سے قدرے بے تکلفی تھی۔ اب تک کسی کو میرے دلی ارادوں کا علم نہ تھا کہ یہ تعمیرات کس سلسلے میں ہیں! ایک دن میں نے وزیر مال حسن کے ساتھ تو قبر قلعے کی عمارتوں کا معائنہ کررہا تھا کہ اسے مخاطب کیا۔ "اے حسن! تمہیں خبر ہے کہ یہاں

کتان کے پردے تھے جن سے خیمے وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ دالان کے بیچ میں ایک خیمہ نصب تھا جسے کالا پوش حصہ سادہ کتان کا تھا اور مختلف رنگ کے کتان کے کپڑے لگے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی بدو کا خیمہ صحرا سے اکھاڑ کر یہاں نصب کردیا گیا ہے۔ اس خیمے کے اندر موٹے کمبل کا پردہ پڑا تھا جس نے خیمے کو دو حصوں میں تقسیم کردیا تھا۔ پہلے حصے میں لکڑی کی چھوٹی سے چوکی تھی جس پر کھانے کے برتن، پیالے، رکابیاں، ٹوٹرے اور لوٹا وغیرہ رکھے تھے اور اس کے گرد مسند لگی تھی جس پر ایک کمبل رکھی تھی، جسے عرب سوتے وقت اوڑھتے ہیں۔ غرض اس خیمے کی ظاہری حالت غربت کی تصویر تھی، لیکن دیکھنے والا پر دیکھنے والی آنکھ سے دیکھتا تو اسے معلوم ہوجاتا کہ لحاف کا استر حریر کا ہے اور چوکی جس کا رنگ لکڑی کا معلوم ہوتا ہے، وہ خالص چاندی کی اور بوجھ تن اس پر رکھے تھے، وہ کھرے سونے کے تھے۔ ان برتنوں پر ایسا رنگ کیا گیا تھا کہ وہ حقیر ٹھیکری معلوم ہوتے تھے۔ میں نے پورے دالان پر تحقیری نظر ڈالی اور خوش ہوگیا۔ میں نے دالان کوئی محسوس نہیں کی۔ میں نے جو سوچا تھا، اب کچھ اسی کے مطابق تھا۔ پھر میں کمبل اٹھا کر خیمے کے اندر ونی حصے میں پہنچا۔ ہاں یہ بالکل وہی، ویسا ہی خیمہ تھا جس میں۔ شیلمہ نے مجھے رکھا تھا اور وہاں ضروریات کا تمام سامان موجود تھا۔ وہاں بھی آرام کرنے کے لیے فرش پر بچھانے کا بستر، ایک اونی کمبل رکھا تھا جس پر سفید اور سیاہ دھاریاں ہیں۔ ایک طرف "معمولی" سی جوتیاں رکھی تھیں، لیکن درحقیقت یہ جوتیاں کا مدار عمل کی تھیں جن میں قیمتی جواہر لگے ہوئے تھے اور فرش و لحاف اطلس و حریر کا تھا۔ خیمے کے ایک گوشے میں چھوٹا سا صندوق بھی تھا جو۔ شیلمہ کے سنگار دان سے مشابہ تھا جس میں وہ اپنا زیور رکھتی تھی۔ اس صندوق میں بھی موتیوں کے ہار، سونے کے مرصع زیور اور جگمگا تا ہوا تاج رکھا تھا۔ ضرورت کے مطابق سب سامان تیار ہوگیا تھا۔ اب مکان میں کمین کے آنے کی دیر تھی۔

اسی دن شام کو میں نے اعیان مملکت سے کہا کہ مسلسل کام سے جو تھکن پیدا ہوگئی ہے، اسے دور کرنے کے لیے میں کچھ آرام کرلینا چاہتا ہوں۔

میں نے بہت پہلے دریائے نیل کے کنارے یو لاق کے محاذ پر ایک عمارت تعمیر کرائی تھی اس وقت جب میں خسرو

پاشا کی ماتحتی میں تھا۔ اب میں قلعہ چھوڑ کر وہیں آگیا۔ میرے ساتھ صرف ایک غلام سعید تھا۔ میں نے وہاں پہنچ کر سعید کو کچھ ہدایات دیں۔ اور روانہ کردیا۔ اس کے بعد میں سو گیا۔

ادھر میں روانہ ہوا ادھر ہریدلیوں کی اوٹ سے چاند نکل آیا۔ ہمارِ سفر تیزی سے جاری تھا۔ ابوالہول کے مجسمے کے قریب پہنچ کر میں نے اپنے قیدی کو مخاطب کیا۔ "ابوالہول کا مجسمہ سامنے نظر آرہا ہے۔ کیا تم اسے دیکھنا چاہتی ہو؟ میں تمہاری وجہ سے شرمندہ ہوں اور چاہتا ہوں کہ تمہارے منہ سے پردے کو ہٹا دوں، لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں انتقام لینے کی خاطر تم میرے بازوؤں میں کاٹ نہ کھاؤ! کیا تم وعدہ کرتی ہو کہ ایسا نہیں کروگی؟"

طبیلہ کا جسم حرکت کرنے لگا۔ اس نے اثبات میں گردہلایا۔ یہ بالکل وہی باتیں تھیں جو کبھی اس نے مجھ سے کی تھیں، مگر اس وقت ہم دونوں کی حیثیت بدل گئی تھی۔

"میں سمجھ گیا، تم نہیں کانوگی" میں نے خوشی مزاجی سے کہا "مجھے ذرا توقف سے بولا۔ "میں تم پر اعتبار کرکے تمہارا منہ کھولے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے رومال سر سے کھول دیا۔

طبیلہ نے نظر بھر کر مجھے دیکھا۔ پھر بولی۔ "تم یہ نہ بھولے ہوگے کہ میں نے کوئی عہد کیا تھا کہ میرے قریب وہی آسکے گا جو ہمیشہ کے لیے مجھے اپنا لے۔"

"تو کیا تم ابھی تک اپنے عہد پر قائم ہو؟"

"ہاں! اسی وجہ سے میں کہتی ہوں کہ حد میں رہنا اور اس سے نہ بڑھنا!" اس نے گویا مجھے تاکید کی۔ شاید وہ میرے تیور بھانپ گئی تھی۔ پھر اس نے مجھی ہوئی سی آواز میں کہا۔ "میں سمجھ گئی ہوں کہ تم مجھے اس طرح میرے باپ کے خیمے سے کیوں اٹھا کر لائے ہو! تم یقیناً مجھے اپنی لونڈی بنا کر رکھنا چاہتے ہو۔"

"ٹھیک کہتی ہو تم!" میری آواز میں شوخی آگئی "ہاں میں تمہیں اپنی لونڈی بنانا چاہتا ہوں، لیکن صرف اپنی محبت کی لونڈی! کیوں کہ مجھے علم ہے، تم مجھے چاہتی ہو۔"

"میں تجھے نہیں چاہتی!" وہ ایک دم پھر کربولی۔ "اور نہ ہی میں تیری لونڈی بننا چاہتی ہوں! میں صحرا کی شہزادی ہوں۔ قبیلے والے بھی مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں۔" پھر وہ کچھ دیر رکی اور غالباً اپنے حواس پر قابو پا کر نسبتاً پست آواز میں کہا۔ "میں تم سے پھر کہتی ہوں کہ عرب کے آزاد غلاموں کی طرح پیچے اور خریدے نہیں جاتے۔ میں لونڈی نہیں بنوں گی۔"

"تم عنقریب محبت کی لونڈی ہوجاؤ گی!" میں نے دستور شریر لہجے میں کہا۔

وہ یہ سن کر زار و قطار رونے لگی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میری بات کی گہرائی تک نہیں پہنچ رہی۔ پھر وہ ہچکیاں لیتے ہوئے رک رک کر بولی۔ "میں۔۔۔ میں اب تمہاری باتوں سے بیزار ہوں اور۔۔۔ اور تمہیں برا جانتی ہوں۔۔۔ اے۔۔۔ محمد علی! میں۔۔۔ تمہیں برا۔۔۔ برا سمجھتی ہوں۔۔۔ میں۔۔۔ تمہیں غاصب جانتی ہوں۔۔۔ ایسا شخص جو۔۔۔ اپنی لونڈی بنانے کے لیے۔ میرے باپ کے قبیلے کو اغوا کرایا ہے۔"

"طبیلہ!" میں نرمی سے بولا۔ "تم نے تو کہا تھا کہ تم نہیں ستاؤ گی، مگر تم سے رومال ہٹتے ہی تم اپنے وعدے پر قائم نہیں ہو۔ تم اپنی باتوں سے مجھے تکلیف پہنچا رہی ہو۔ تم اسی طرح کی باتیں کرتی رہیں تو میں پھر تمہارے منہ پر رومال کس دوں گا۔"

"ہاں کردو میرا منہ بند۔" وہ غصے سے بولی۔ "اور اپنی نگاہوں کو بھی اپنی صورت دیکھنے سے روک دو۔"

"بہتر ہے" میں ایسا ہی کرتا ہوں۔" میں نے یہ کہہ کر میں نے کہا۔ پھر واقعی مصلحتاً میں نے ایسا ہی کیا۔ اب وہ نہ دیکھ سکتی تھی نہ بول سکتی تھی۔ اس کے بعد میں نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔ "طبیلہ! میں نے تمہارے چہرے کو چھپا دیا ہے تاکہ ہوا تمہارے رخسار و لب کو نہ چومے اور ستارے تمہاری صورت نہ دیکھ سکیں۔ میں جانتا ہوں کہ چاند بھی تمہارے جمال کو نہ دیکھے۔ اے طبیلہ! کہو کہ میں اپنے سوا کسی کو یہ حق دینا نہیں چاہتا۔ ہاں صرف میرے لیے ہو، میری لونڈی ہو، بالکل اسی طرح جس طرح تم میرا غلام ہوں۔ تم میری ہو اور میں تمہارا ہوں۔"

پھر میں نے اس سے مزید کچھ نہ کہا اور خچر کی رفتار تیز کردی۔ صبح ہوتے ہوتے میں طبیلہ کو لے کر اس خیمے تک پہنچ چکا تھا۔ خچر دروازے پر کھڑا ہوگیا۔ میرے غلام سعید نے گھوڑے سے اتر کر قصر کا دروازہ کھولا۔ میں نے اتر کر طبیلہ کو دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور اسے نیچے میں جلا گیا۔

غلام اس وقت تک بیدار نہیں ہوئے تھے۔ میں، طبیلہ کو لیے چور دروازے سے قصر میں داخل ہوگیا۔ سعید میرے پیچھے پیچھے تھا۔ پھر میں قصر کے مخصوص حصے میں پہنچ گیا اور سعید کو رخصت کردیا۔ میں نے اسے لے جا کر ایک کمرے پر بٹھا دیا اور پھر دروازہ بند کردیا۔ پھر میں نے اس کے چہرے سے رومال کھول دیا۔ طبیلہ اب رسیوں کی گرفت سے بھی آزاد ہو چکی تھی۔ وہ خود کو آزاد دیکھ کر اٹھی اور کمرے ہی کو ہر چاروں طرف نگاہ دوڑانے لگی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔ پھر اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ وہ شاید سب کچھ سمجھ چکی تھی۔

میں اس کے قریب پہنچ کر آہستہ سے بولا۔ "طبیلہ! کیا اب تک اپنی قسم پر قائم ہو؟ کیا واقعی تم اس شخص کے سوا کسی کو اپنے قریب نہیں آنے دوگی۔ جو ہمیشہ کے لیے تمہارا ہاتھ تھام لے؟"

"ہاں میں اپنی قسم پر قائم ہوں۔" وہ پرعزم لہجے میں بولی۔ "خدا گواہ ہے جو میں اس کے خلاف کروں۔"

پھر میں اسے خیمے میں لے گیا اور کہا۔ "طبیلہ! یہ میرا خیمہ ہے اور میں تمہیں اس میں اپنی شریک حیات کی حیثیت سے خوش آمدید کہتا ہوں۔"

اس کے بعد بے خودی و سرشاری کی حدود شروع ہوگئیں۔

•

اس روز قاہرہ جیسے دلہن بنا ہوا تھا۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ کوچہ وبازار میں لوگوں کا ہجوم تھا اور ان کے ہاتھوں میں پھول تھے۔ میرا قصر بھی رنگ خلد بریں بنا ہوا تھا۔ آج قصر سے جانے آنے والے تھے۔ لوگ دریائے نیل کے کنارے آنے والوں کے انتظار میں کھڑے باتیں کررہے تھے۔ اب انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ ان کے آقا کی دو بیویاں ہیں۔ وہ جواز بیک کے قصر میں ہے، دوسری بیوی ہے، طبیلہ اور پہلی بیوی سے اولاد ہے جو قوافلہ سے اپنے بیٹوں کے ساتھ آنے والی ہے۔

میں بڑے حشم و حشم کے ساتھ قلعے سے نکلا۔ لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر میں محتاجوں کو خیرات دے رہا تھا کیوں کہ اپنی خوشی میں سب کو شریک دیکھنا چاہتا تھا۔ میں اپنے گھوڑے پر سوار منصب داران عظام کو جلو میں لیے لب دریا پہنچا۔ وہاں استقبال کے لیے دو جگہیں تیار تھیں۔ ایک جگہ میرے بیٹوں کے استقبال کے لیے اور دوسری بیوی عابدہ کے لیے! امراء وزراء دریا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میری متجسس نگاہیں بھی اسی طرف تھیں۔ پھر مجھے شفتی کا نشان نظر آگیا اور میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ وزیر مال حسن میرے قریب کھڑا تھا۔ وہ بولا۔ "وہ دیکھیے!"

"ہاں میں دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اب بہت جلدی میں اپنے بیٹوں کو بھی دیکھ لوں گا۔"

اس موقع پر لوگوں نے میرے اور میری اولاد کے حق میں نعرے لگائے۔

پھر کشتی ساحل سے آلگی۔ میرے تینوں بیٹے خشکی پر اتر آئے۔ ماشاء اللہ وہ جوان ہوگئے تھے۔ ان کے چہروں سے ذکاوت اور اولوالعزمی کے آثار نمایاں تھے۔ میرے دل میں شفقت پدری نے جوش مارا۔ میں اپنی شان و شوکت بھول کر گھوڑے سے کود پڑا اور قریب پہنچ کر انھیں سینے سے لگالیا۔ میں انھیں پیار کرتا جاتا تھا اور میری آنکھوں سے آنسو بہتے جاتے تھے۔ ہر طرف سے مبارک سلامت کی آوازیں آرہی تھیں اور لوگ میرے بیٹوں کو درازی عمر کی دعائیں دے رہے تھے۔

آنے والوں کے لیے پہلے ہی سے گھوڑے تیار تھے۔ وہ ان پر سوار ہوگئے اور پھر میرے ہمراہ روانہ ہوئے قلعہ سے سلامی سر ہوئی۔ ہمارے پیچھے فوج کا ایک دستہ تھا جس کے آگے فوجی باجا بج رہا تھا۔ پیچھے پیچھے خلقت کا ازدحام تھا۔

مجھے علم تھا کہ عابدہ اس شان و شوکت سے زیادہ مجھے دیکھنے کی مضطر ہوگی۔ قصر کے حرم میں اسے پہنچایا گیا تو مجھے اطلاع کی گئی اور میں تیزی سے اس طرف روانہ ہوگیا۔

حرم میں پہنچتے ہی جیسے میرے پاؤں میں زنجیر پڑ گئی اور میری حال عابدہ کا ہوا۔ جانے کب تک ہم دونوں ایک دوسرے کو کھوئی کھوئی سی نظروں سے دیکھتے رہے اور پھر یہ کیف ہمارے جسموں میں حرکت ہوئی اور ہم ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور جذباتی لہجے میں بولا۔ "اے عابدہ! میں تمہارا خیر مقدم کرتا ہوں۔ میرا دل ایک مدت سے تمہیں دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔"

جواب میں عابدہ نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبایا، پھر بولی۔ "ہاں بہت دن گزر گئے۔ کیا تمہیں یاد ہے کتنے سال

گزر گئے؟ کیا تمہیں بھی یہ مدت کٹھن محسوس ہوئی؟"

"ہاں اے عابدہ!" میں نے طویل سانس لیا۔ "پانچ سال گزرنے اور اس میں بہت کچھ بدل گیا۔"

"ہاں بہت کچھ بدل گیا۔" عابدہ نے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ "اور میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا۔"

"لیکن اے عابدہ! میرا دل اور تمہاری محبت نہیں بدلی۔ میں اب بھی اسی طرح تمہیں چاہتا ہوں اور ہمیشہ چاہتا رہوں گا اس لیے بھی کہ تم میری پہلی بیوی ہو اور میرے بیٹوں کی ماں ہو۔" میں نے دانستہ آخری الفاظ ادا کیے تھے۔ مجھے علم تھا کہ عابدہ میری دوسری بیوی۔ جیکب کے بارے میں جان چکی ہے۔ اسے قوالہ ہی میں یہ خبر مل چکی تھی۔ پھر بھی میں نے وضاحت ضروری سمجھی۔

جولیا" اس نے کچھ نہ کہا اور صرف ایک سرد آہ کھینچ کر رہ گئی۔ حالات سے سمجھوتا کرنے کے سوا اس کے پاس چارہ ہی کیا تھا! وہ یقیناً جانتی تھی کہ دوسری شادی کے باوجود میرے دل میں اس کی محبت اور احترام ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اسے بھلا چکا ہوتا اور آج بھی تجدید عہد نہ ہوتا۔

"اے عابدہ! تم ہمیشہ میرے نزدیک قابل محبت و احترام رہو گی اور تمہاری حیثیت کبھی کم نہ ہوگی!" میں نے اسے ایک بار پھر یقین دلایا۔

میں نے اسے آنکھیں بند کرتے دیکھا اور پھر مجھے اس کے جسم میں خفیف سا ارتعاش محسوس ہوا اور اس کے لب ہلے۔ "معترم سے اللہ محمد علی!" میں تمہاری فرماں برداری کروں گی۔ میں۔ تمہیں اپنا آقا سمجھتی ہوں۔" اس کی آواز کانپنے لگی۔ میں نے اسے خود سے قریب کرلیا۔ موضوع گفتگو بدلنے کی خاطر میں نے بچوں کا ذکر چھیڑ دیا اور کہا۔ "وہ بھی شاید اندر آنے کے منتظر ہوں گے۔"

"ہاں۔ ہاں شاید۔" یہ کہتے ہوئے اس نے آنسو پونچھ لیے۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ میرے بیٹے واقعی منتظر تھے۔ میں نے انھیں بھی اندر بلالیا۔ ان میں سے بڑے کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی۔

میں نے انھیں اپنے پاس بٹھالیا اور بولا۔ "یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟" میں بڑے بیٹے سے مخاطب تھا۔ "اس میں تم کیا لائے ہو! ابراہیم؟" میں نے اس کا نام اپنے باپ کے نام پر رکھا تھا۔

"میں قوالہ سے آپ کے لیے ایک تحفہ لایا ہوں۔" وہ بولا۔ "اگر اجازت ہو تو پیش کروں! میں آپ کے قدم چلنے کی کوشش کرتا تھا۔ تاجر قرالدین اکثر آپ کے حالات بیان کرتے تھے۔ انھی سے مجھے معلوم ہوا کہ آپ تیرنے اور کشتی چلانے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ میں بھی آپ کی طرح موجوں سے کھیلنا اور سمندر کے طوفان پر غالب آنے کی کوشش کرتا تاکہ جہاز رانی اور شناوری میں کامل ہوجاؤں۔"

میں اپنے بیٹے ابراہیم کی آنکھوں میں اقبال و فتح مندی کے آثار دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ "اے ابراہیم! تمہاری باتوں سے بہت خوشی ہوئی۔ اپنی بات پوری کرو۔"

"جی ہاں! میں نے اس کی مشق کی اور قوالہ میں سازگار ماحول سے بازی لے گیا۔" وہ بتانے لگا۔ "میں نے اپنی ذہنی میں ایسا کمال حاصل کیا کہ کوئی میری برابری نہیں کرسکتا تھا۔ میں اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے تحفہ لے کر آیا ہوں، جسے میں نے سمندر کی تہ سے نکالا ہے۔ یہ مجھے ایک قطیلے میں کھا ہوا ملا تھا۔ میں نے تیرا کی خنجلی پر لایا اور اسے کھول کر حیرت زدہ رہ گیا کیوں کہ اس میں ایک انسانی دماغ تھا۔ پھر بھی یہ غوطہ زنی کا بڑا انعام تھا۔ میں اسی لیے اسے ساتھ لے آیا۔"

ابراہیم کے الفاظ جیسے میرے دل میں اتر رہے تھے۔ سمجھ گیا کہ وہ دماغ کس کا ہوسکتا ہے! میرے لب جنبش خود حرکت کرنے لگے۔ "سمندر کی تہ سے! کیا یہ ابراہیم کیا تم اس وقت قوالہ کے ساحل پر موجود تھے؟"

"جی ہاں۔" اس نے فوراً جواب دیا۔ "آپ جانتے ہیں کہ وہ کنارہ بہت بلند ہے اور اس کے قریب بڑی گہرائی ہے۔ میں وہیں غوطہ زنی کی مشق کررہا تھا۔ مجھے وہیں دھاگا بندھا ہوا ملا اور میں اسے نکال لایا۔"

میرے ہونٹ کانپنے لگے۔ مجھ میں اتنی تاب نہ تھی کہ اس پوٹلی کو ابراہیم سے لیتا۔ عابدہ میرے متغیر چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ غالباً وہ بھی اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی جس پر میں پہنچا تھا۔ اس نے غالباً کچھ سوچ کر ابراہیم کو آواز دی اور اسے اپنے پاس بلالیا۔

اب میں نے اپنے دوسرے بیٹے کی طرف نگاہ اٹھائی اور کہا۔ "اسماعیل! کیا تم بھی کچھ لائے ہو؟"

"ہاں' میں بھی قوالہ سے ایک یادگار لایا ہوں۔" اسماعیل نے اقرار میں سرہلایا۔ "پھر مزید کہنے لگا۔ "میں نے سنا تھا کہ آپ دشوار گزار پہاڑوں پر چڑھنے میں بہت مشاق تھے۔ میں نے چاہا کہ میں بھی آپ کے نقش قدم پر چلوں۔ میں نے سنا کہ آپ کے سوا ساحل کے قریب کوئی آسانی سے چڑھ سکتا تھا۔ میں نے مشق کی اور اس میں خوب مہارت حاصل کرلی۔ ایک دن مجھے پہاڑی کی چوٹی پر عجیب و غریب غار ملا۔ میں اس کے تنگ اور لمبے راستے میں گھس گیا۔ پھر جو کچھ میں نے وہاں دیکھا' اس کا حال سن کر آپ کو یقیناً تعجب ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے غار میں بھی کوئی رہتا تھا۔ مجھے وہاں کپڑے اور برتن ملے۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ میں اکثر وہاں جاتا اور اپنا وقت گزارتا۔ جب میں آخری مرتبہ وہاں گیا تو سوچا کہ کوئی چیز بہ طور یادگار آپ کے لیے لیتا چلوں چنانچہ یہ خوب صورت کٹورا لایا ہوں جو مجھے وہاں دستیاب ہوا تھا۔" اسماعیل نے مجھے ایک کٹورا دیا اور میری آنکھوں میں ماضی گھومنے لگا۔

میری حالت اب غیر ہوچکی تھی۔ عابدہ نے شاید اس کا اندازہ کرلیا اور پھر وہ میرے بیٹوں کو لے کر وہاں سے چلی گئی۔

رفتہ رفتہ مجھ پر جنون کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ آج سے بہت دن بعد جو ہوا مجھے بہت یاد آرہی تھی کیوں کہ اس کی نشانیاں میرے سامنے تھیں۔ یہ وہی کٹورا تھا جس سے اس نے پانی پیا تھا۔ پھر میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اپنے ایک خادم کو طلب کرکے قصر کی ایک حفاظت میں سے جوہر کی ہڈیوں کو دفن کرادیا۔ بعد میں اس جگہ میں نے اس کاشانہ دار مقبرہ تعمیر کرایا' اپنی محبت کا مقبرہ!

کافی دیر خلوت میں گزارنے کے بعد میں باہر والے کمرے میں آیا جہاں عابدہ تھی اور میرے بیٹے۔ میں نے انھیں مسکرا کر مخاطب کیا۔ "آؤ اے میرے بیٹو! میں تمہیں اپنے ملک کا پایہ تخت' یعنی قاہرہ دکھاؤں! یہ دنیا کے خوب صورتوں سے خوب صورت ہے۔" پھر میں انھیں اپنے ساتھ لے کر چلا۔

میں انھیں لے کر اپنے قصر کی چھت پر گیا۔ وہاں سے قاہرہ کا منظر صاف نظر آتا تھا جس کے بیچوں بیچ دریائے نیل بھی کھا تا بہہ رہا تھا۔

"یہ منظر بہت ہی حسین اور دل کش ہے!" ابراہیم نے تبصرہ کیا اور پھر باری باری میرے بقیہ دونوں بیٹوں نے بھی ایسے ہی الفاظ کہے۔

"ہاں۔ یہ ملک بہت وسیع اور خوب صورت ہے۔" میں نے کہا۔ "جو کچھ تم دیکھ رہے ہو یہ میرے قبضے اور تصرف میں ہے۔ امید ہے کہ میرے بعد تم اس کے حاکم ہوگے اور میرا خاندان عظیم الشان اور بلند مرتبہ ہوگا۔ میرے بعد میری اولاد میں سے کوئی نہ کوئی یہ دیکھے گا کہ میرا ملک ہوا رہے گا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اپنے تخت کو اس طرح ہرگز نہ چھوڑوں گا جس طرح میرے پیش رو چھوڑ گئے۔ تاریخ میں میرا ذکر ان الفاظ کے ساتھ ہوگا کہ محمد علی پاشا خاندان خدیویہ کا بانی تھا جس نے اپنے بعد اپنی اولاد کے لیے حکومت ترکے میں چھوڑی۔ اے میرے بیٹو! مجھ سے وعدہ کرو کہ جب تک حاکم رہو گے عدل سے کام لوگے اور میری پیروی کروگے۔"

میرے تینوں بیٹوں نے وہی عہد کیا جو میں چاہتا تھا۔

میرا دل خوشی سے بھر گیا اور میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر کہا۔ "اے خدا! تو نے اس عہد کو سن لیا! تو نے ہی مجھے اپنے فضل سے اس قابل کیا اور اپنے خاندان کے لیے بزرگی کا دروازہ کھولنے کی توفیق دی۔ تو میری اولاد کو اپنا عہد پورا کرنے کی بھی توفیق عطا کر! اے مالک! تو مجھے کسی بادشاہ یا سلطان کا محتاج نہ کیجیو بلکہ میرے بعد میری اولاد کو آزاد اور خود مختار رکھیو! اے خدا! میرے بازوؤں کو قوی کر اور مجھے بہبودی کا راستہ دکھا!" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میری آواز بھرا گئی۔

پھر چند ہی دن گزرے تھے کہ مجھے سلطان کی ماتحتی سے بھی نجات مل گئی اور مصر کا مطلق العنان بادشاہ بن گیا۔ اسی دن جوہر کا مقبرہ تعمیر ہوگیا اور میں نے وہاں حاضری دی۔ میں نے فاتحہ پڑھ کر اپنے قریب کسی کی موجودگی کو محسوس کیا اور دیکھا کہ میری دائیں جانب عابدہ کھڑی تھی اور بائیں جانب۔ طیبہ! اب ان دونوں ہی کو معلوم ہوچکا تھا کہ وہ مقبرہ کس کا ہے جہاں میرا زیادہ تر وقت گزرتا ہے! اگر جوہر کی محبت کا زخم میرے سینے میں نہ ہوتا تو شاید میں کبھی مصر کا بادشاہ نہ بن سکتا۔

ختم شد

محبت کی خوشبو نے اُس کی تمام تر شخصیت کو نکھار دیا تھا
ایک خوب صورت کہانی، نرم جذبوں کی دھیمی، سلگتی آنچ جو آپ کو
بھی دھیرے دھیرے پگھلا دے گی

شیریں خان

خوشبو

اس کی ہنڈا راؤنڈ مار کر سیڑھیوں کے سامنے جا کر رکی۔ اس نے ہیلمٹ اتار کر گردن اٹھا کے اوپر نظر کی' وہ معمول کے مطابق نیلی جینز پر ہاف کوٹ پہنے' گلے میں امپورٹڈ اسکارف باندھے اپنے فل بوٹ کو زپ لگا رہی تھی' جھکے جھکے ہی ہنڈا کی آواز پر اس نے اپنی گردن موڑ کر اسے دیکھا اور دو دو سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتی ہوئی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"ہائے تم نے بڑی دیر کر دی۔"

"بھئی آج تمہارا لرننگ لیسن نہیں ہوگا۔"

"کیوں نہیں ہوگا؟" جواباً" وہ غرائی۔

"کیا یہ بہت ضروری ہے؟"

"میں کوئی چیز شروع کر دوں تو اسے انجام تک پہنچاتی ہوں۔"

"لیکن اس کا انجام ممکن نہیں۔"

"میری لغت میں ناممکن لفظ ہی نہیں۔ سیدھی طرح چلو ورنہ....."

"ورنہ کیا؟ اچھی زبردستی ہے۔"

"میں جمشید خالو سے کہہ دوں گی کہ کل تم پھر کلب گئے تھے۔" اس نے فوراً دھمکی دے دی۔

"کسی کی کمزوریوں کا یوں چرچا نہیں کرتے۔"

"اگر تمہاری یہ بات مجھے معلوم نہ ہوتی تو تم کب قابو میں آتے۔" وہ جینز کی دونوں جیبوں میں

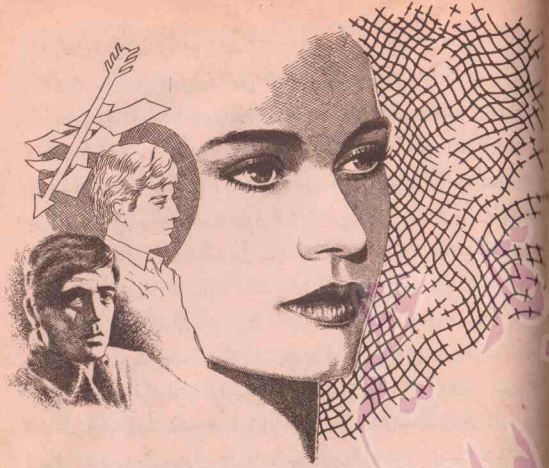

ہاتھ ٹھونسے بول رہی تھی۔

"تم جان کو آگئی ہو۔"

"وہاں تک کہاں ہے اپنی رسائی۔ چلو اسٹارٹ کرو۔"

"میری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ تمہارے شوق اتنے مردانہ کیوں ہیں؟"

"عورت کو مرد کا محتاج نہیں دیکھنا چاہتی اس لیے۔"

"تو اسکوٹر سیکھ کر آپ عالمی چیمپئن بننے سے رہیں۔"

"ارے کبھی موقع ملا تو قسمت آزمائیں گے۔" جواب میں اس نے ٹھٹھا لگا کر کہا۔

"تو چلو' لڑکی سمجھ کر لحاظ کر جاتا ہوں۔" وہ بغیر کچھ کہے اس کے پیچھے آ بیٹھی اور جلدی سے اس کی کمر کے گرد اپنا بازو حمائل کر دیا۔

"یہ کیا حرکت ہے۔" وہ جھنجلا گیا۔ "ٹھیک سے بیٹھو۔"

"حرکت و برکت کچھ نہیں۔ نیت صاف ہونی چاہیے۔"

"اور نیتوں کا حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔"

"تو پھر کبھی خدا سے ہی تمہاری نیت کا حال معلوم کرلیں گے' ہے دیر کتنی۔"

اور وہ چپ رہا۔ اپنی نیت کا حال تو اسے بھی معلوم نہیں تھا۔ اب اس بیوقوف لڑکی کو کون سمجھاتا۔ وہ اپنی تمام تر سادگی سمیت اس کے اتنے قریب بیٹھی تھی کہ اس کے وجود سے اٹھتی ہوئی خوشبو نے پتھریلے مزاج آدمی کو بھی موم بنانا شروع کردیا تھا۔ نجانے یہ عورتیں مہک سے اتنی انجان کیوں ہوتی ہیں۔ یہ انوکھی مہک جو مریم کی طرح پوتر اور پاکیزہ ہوتی ہے جو سحر بن کر چھا جاتی ہے۔ شاید ہر عورت ایک خوشبو کی مالک ہوتی ہے یا پھر خوشبو کسی احساس کا نام ہوتا ہے۔ پتا نہیں دل کے نرم نرم گوشوں میں اومیتہ کی خوشبو نے ہی کیوں اثر کرنا شروع کردیا تھا "اومیتہ" جس کا نام سن کر کانوں میں موسیقی کے مدھم مدھم سر مچلنے لگتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے چاروں طرف بانسری کی لے چھڑ گئی ہو۔ مدھم مدھم لے دھیمی دھیمی رو میں اتر جانے والی' بن پیئے ہی سرور آجاتا ہے۔ یہ نام "اومیتہ" اپنے اندر کس قدر اثر رکھتا ہے۔ جب پہلے پہلے انیل نے یہ نام سنا تھا تو جیسے اس کے کانوں میں جلترنگ بج اٹھے تھے۔ وہ جو ساری دنیا سے بیزار تھا اور جس کے لیے لڑکیاں کبھی بھی دلچسپی کا باعث نہ رہی تھیں۔ جو بہت تند خو اور اپنے اصولوں کا پابند تھا اور کسی نے کم ہی اسے مسکراتے دیکھا ہوگا۔ گھر والے بھی اس کے وجود سے خائف اور سہمے سہمے رہتے تھے۔ جب اس نے یہ نام سنا تو چونک گیا۔ اس نے تصور کی آنکھیں وا کرکے دیکھا۔ اسے جو اس کی امی کی گہری سہیلی کی بیٹی تھی۔ جو حسین نظاروں اور خوبصورت دریاؤں کے دیس بنگال سے آرہی تھی۔ کیسی ہوگی؟ نرم و نازک مزاج کی لڑکی دھیمے دھیمے مسکراتی۔ شرماتی خوبصورت ساری زیب تن کیے۔ ماتھے پر روایتی بندیا لگائے' آنکھوں میں کاجل کی دھار' مکمل مشرقی حسن اچھوتا دل لبھاتا ہوا' حسن بنگال جس کے صرف تذکرے سے ہی دل میں گدگدی ہونے لگتی ہے' وہ حسن اس کے گھر آنے والا تھا۔ سیاہ آنکھوں اور سیاہ بالوں میں چھپا ہوا' انیل نے نام کی مدھرتا سے سراپے کی سندرتا کو تول لی۔ اومیتہ نام کا مطلب ہی دوستی ہے۔ کیسا اچھوتا نام اور کیسا انوکھا دلفریب سا مطلب..... اور انیل کو ہمیشہ عورت کا شرمیلا اور دھیما حسن ہی متاثر کرتا ہے۔ عورتوں میں تیزی و تندی اسے کبھی نہ بھائی تھی۔ اس لیے بھی وہ لاشعوری طور پر اومیتہ کی آمد کا منتظر تھا' اور جس دن وہ آئی اس دن انیل کے تمام تصور دھڑام سے زمین بوس ہوگئے۔ وہ کہیں سے بھی بنگال کا جادو نہ تھی۔ کالے لمبے

بالوں کی جگہ جدید طرز میں تراشے ہوئے گیسو' براؤن آنکھیں' رنگ گندمی کھلتا ہوا تیکھے نقوش گلابی ہونٹ' سرو قد اور بے حد اسمارٹ جسم کی مالک لڑکی اس کے خیالات کی نفی کرتی ہوئی نکلی۔ پھر اس کی آنکھوں میں تیزی اور طبیعت میں پارا بھرا ہوا تھا۔ سرخ جینز پر سفید فل سوئیٹر پہنے وہ مسلسل باتیں کیے جارہی تھی' لگتا ہی نہیں تھا کہ اجنبی لوگوں میں آگئی ہے۔ کہاں کا دھیما پن اور کہاں کی شرم۔ انیل کی طبیعت اس سے مل کر بڑی بے مزہ ہوئی اس لیے نہیں کہ اسے دیکھ کر مایوسی ہوئی تھی۔ گو وہ انیل کے تصور سے مختلف ضرور تھی مگر اس کا شمار بھی حسینوں میں ہوتا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ اومیتہ نام کی شخصیت میں نام کو بھی دھیما پن نہ تھا۔ وہ سرتاپا سیماب تھی۔ یہ انیل کے شاعرانہ مزاج پر گہری چوٹ تھی' اور پھر ان دونوں کی دوستی بھی عجیب انداز میں ہوئی۔ جب وہ اسے گھر چھوڑ کر اپنے دماغ کی چولیں درست کرنے اپنے دوست کے پاس چلا گیا پھر کافی دیر بعد لوٹا تو اسے حیرت ہوئی۔ وہ بڑے ٹھاٹ سے سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ کیا بے تکلفانہ شان تھی۔ ہاتھوں میں چھڑی لیے مسلسل گھمائے جارہی تھی۔ نہا دھو کر سفید ہلکی سی میکسی اس نے پہن رکھی تھی جو اس پر بری طرح جچ رہی تھی۔ چہرے پر بڑا نکھار تھا۔ بال یونہی بکھرے ہوئے تھے۔ اسے آتے دیکھ کر وہ بولی۔

"مہمانوں کو گھر پہنچا تک کر کہیں اور چلے جانا ایٹی کیٹ کے خلاف ہے مسٹر....."

"جی....." انیل نے لاتعلقی سے بیٹھی اس لڑکی کو حیرت سے دیکھا' جو اپنا حق بھی جتانے لگی تھی۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ گھبرا گیا۔

"اگر ہے بھی تو کوئی حرج نہیں۔ میں بڑی صاف گو ہوں۔"

"میں بھی۔" اس کے لبوں پر نجانے کیوں مسکراہٹ آگئی۔

"رابعہ خالہ نے آپ کے بارے میں بتادیا تھا مگر دیکھنے میں تو آپ ٹھیک ٹھاک بندے ہیں۔"

"بندہ تو میں صحیح ہوں۔ لوگ سمجھیں جب نا۔" اس سے باتیں کرنے میں انیل کو لطف آنے لگا تھا۔

"لوگوں کی گارنٹی تو میں نہیں لے سکتی' لیکن میرے دوستوں کی فہرست میں ضرور اضافہ ہوا ہے' آپ کے نام کا۔" یہ کہہ کر چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر ایکدم بولی۔ "آپ کو کوئی اعتراض تو

نہیں؟"

"کس کافر کو ہے۔" انیل نے ہنس کر جواب دیا۔

"تو گویا ثابت ہو گیا کہ آپ مسلمان ہیں۔"

"الحمدللہ۔" انیل نے جھک کر کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ میں صحیح جگہ پہنچی ہوں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کا لہجہ اور ارادہ بے حد صاف تھی اور آواز میں لوچ بھرا ہوا تھا' ہریات نپے تلے لہجے میں کرتی۔ دلیل دے کر' ہر موضوع پر بے تکان بولتی۔ انیل تو بڑے جداگانہ مزاج کا بندہ تھا مگر وہ بھی غالباً ہر فن مولا تھی اسی لیے تو انیل کو بور نہ ہونے دیتی۔ اس کے نازک سے دماغ میں نجانے کہاں کا علم بھرا تھا اور اس کی ایک عادت بہت اچھی تھی کہ بعض اوقات دونوں کے خیالات بالکل مختلف ہو جاتے اور اس کے بارے میں دونوں علیحدہ نظریات رکھتے۔ وہ سمجھتی کہ وہ صحیح ہے تو ڈٹی رہتی اور اگر اسے احساس ہو جاتا کہ وہ غلط ہے تو فوراً پسپا ہو جاتی۔ گو وہ ضدی طبیعت کی تھی اور اس کی شوریدہ سری انیل کی سمجھ میں نہ آتی۔ وہ کیا چاہتی تھی اسے پتا ہی نہ چلتا۔ وہ تو کر گزرنے والوں میں سے تھی۔ ایک بار کسی زوردار بحث کے دوران انیل نے اس کی علمیت اور معلومات پر حیران ہو کر پوچھا۔

"تمہارے تو بڑے اوٹ پٹانگ سے شوق ہیں۔ پھر تم اتنی کتابیں کب پڑھتی ہو؟"

"ارے واہ۔ کیا علم کی پہچان صرف کتابوں سے ہی ہوتی ہے بھولے بادشاہ۔"

"نہیں تمہیں تو الہام ہو جاتا ہے۔" انیل فوراً چڑ گیا۔

"عملی طور پر تو بندی صرف گریجویٹ ہے۔ لیکن دنیا سب کچھ سکھا دیتی ہے۔"

"واہ بھئی بڑی بی۔" انیل کو ہنسی آ گئی۔ "یہ اتنی سی عمر میں اتنا بہت سا تجربہ کیسے ہو گیا۔"

"یہ اتنی سی عمر ہے۔" اومیتہ نے اسے دیکھ کر کہا۔ "بھلا بتاؤ تو کتنی؟"

"ہو گی یہی کوئی سولہ سترہ برس۔"

"جی نہیں پورے پچیس سال۔" اومیتہ نے اسٹائل سے شانے جھٹکتے ہوئے کہا۔

"سنا تھا کہ لڑکیاں اپنی عمر چھپاتی ہیں۔"

"میں حقیقت پسند ہوں۔"

"بھئی اس حقیقت کو تسلیم کیوں نہیں کر لیتیں کہ تم ایک لڑکی ہو۔"

"جس کا کام صرف گھر کا نظم و نسق چلانا ہے۔ یہی نا۔ چاہے وہ کتنی ہی عقلمند ہو۔ اس کا صرف ایک مقام ہے۔ لڑکی ہونے کے ناتے اسے سنگسار کیا جائے۔ وہ ساری عمر تحفظ کی تلاش میں بھٹکتی رہے اور گھر کے نام پر بے گھر ہوتی رہے۔ کیا اسے اتنا بھی حق نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے زندگی گزارے۔ آخر کیوں۔ آپ بتائیے؟" اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ اس سے پہلے وہ کبھی اتنے جوش میں نظر نہیں آئی تھی۔ اسے تو انیل نے ہمیشہ مسکراتے پایا تھا اس لیے وہ پریشان ہو گیا۔ آہستگی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا تو جیسے وہ چونک گئی۔ چند لمحے خاموش رہ کر بولی۔

"آئی ایم سوری' پتا نہیں کیا بکواس کر گئی۔ چلیے کولڈ کافی پینے چلتے ہیں۔" اور پھر معمول کے مطابق تیار ہونے چلی گئی۔ تیار ہو کر باہر آئی تو انتظار کرتے ہوئے انیل نے اسے دیکھ کر منہ بنا لیا۔ ایک ٹرؤزر اور بلیک شرٹ پر آف وائٹ جیکٹ اس نے پہن رکھی تھی۔ بالوں کو ہم رنگ اسکارف سے باندھا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے ہمیشہ جیسے شگفتہ موڈ میں بیٹھ کر اس نے سیٹی بجائی' تو انیل بیزاری سے بولا۔

"تم ایسے کپڑے کیوں پہنتی ہو؟"

"دراصل یہ لباس پہن کر میں مکمل طور پر خود مختار لگتی ہوں۔"

"یہ تم کو خود مختار بننے کا اتنا شوق کیوں ہے؟"

"ہر انسان کی مختلف فیلنگز ہوتی ہیں اور میں انھیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتی۔"

"تمہاری یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"سیدھی سی بات ہے۔ جیو اور جینے دو۔"

"لیکن لوگوں کی رائے تو خراب ہو جاتی ہے۔"

"ایک تو اس معاشرے میں آدھے سے زیادہ حصہ لوگوں کا ہوتا ہے۔ لوگ یہ نا کہیں وہ نا کہیں۔ پھر یہاں کے لوگ بھی میری سمجھ میں کبھی نہیں آئے۔ بڑا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں' آزادی نسواں اور تعلیم نسواں کا اور جب عورتیں سرگرم عمل ہو جائیں تو یہی لوگ ان پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ لباس پر' کیریئر پر۔ انھیں خود بھی نہیں معلوم کہ وہ چاہتے کیا ہیں۔ کوئی ایک راہ جو نہیں ہے۔ اس چکر میں تو جنریشن کا بیڑا غرق ہے اس کو یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ وہ کون سی راہ اپنائیں۔ پرانی اور نئی تہذیب کے سنگم پر کھڑی بیچاری نئی جنریشن۔"

"پھر کوئی حل ہے اس مسئلے کا تمہاری نظر میں؟"

"نہیں کوئی حل نہیں' لیکن بعد میں آنے والی نسلیں یقیناً اس الجھن پر قابو پالیں گی۔"

"اور ہمارا کیا ہوگا۔"

"بس یونہی آدھے تیتر آدھے بٹیر بنے رہیں گے۔" وہ ہنسی۔ "واہ استاد باتوں میں لگا کر الو بنا رہے ہو۔"

"کیا مطلب؟" اس نے سڑک کے کنارے ہنڈا روک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں۔

"اب یہاں سے میں چلاؤں گی۔"

"ہوش میں ہو' رات کا وقت ہے۔"

"اچھا ہے ذرا پریکٹس ہو جائے گی۔" اور پھر اس نے بحث کو بیکار سمجھ کر اسکوٹر اس کے سپرد کر دیا۔ لمحوں میں اسکوٹر اسٹارٹ ہو گیا اور اس کے پیچھے بیٹھ جانے کے بعد حسب عادت اس نے ایک بنگالی گیت شروع کر دیا۔ جوانیل کی سمجھ میں کبھی نہ آیا تھا لیکن اس کی میٹھی آواز اور نمکی ہیشہ کی طرح پھر اسے گرفت میں لینے کو تیار بیٹھی تھی۔

دو ہفتے پہلے انیل کو آفس کے کام سے اسلام آباد جانا پڑ گیا تو وہ بڑا بور ہوا اور اس دن اسے پہلی بار احساس ہوا کہ او بینہ اس کی زندگی میں کتنا اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ اس کی اونگی بونگی باتوں نے ہی زندگی کا لطف کس قدر بڑھا دیا تھا۔ اس نے پہلے کے انیل اور اب کے انیل کا موازنہ کیا تو اسے بہت ساری تبدیلیوں کا احساس ہوا۔ وہ اس کے ہر معاملے میں دلچسپی جو لیتی تھی۔ تلخ تر لیکن لہجے میں کسی ناصح کی طرح اس کی بے راہ روی پر ٹوکتی' ورنہ وہ کچھ بھی کرتا پھرے کسی کو کب پروا تھی۔ ابھی چند دنوں پہلے کا واقعہ اس کی نظروں میں تصویر بن کر لہرا گیا جب ایک دن اس کا موڈ بہت آف تھا اور وہ کمرے میں بند تھا۔ ایسے میں کسی کی مجال کہ اس کی مزاج پرسی کو آتا۔ تاریک کمرے میں آنکھوں پر ہاتھ دھرے وہ گم صم تھا جبھی ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا' اور چہکتی ہوئی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

"ارے میاں مجنوں کس کا جوگ لے لیا۔"

اس نے آنکھوں سے ہاتھ اٹھا کر اسے دیکھا۔ تو چند لمحے رشک کے جذبات نے اسے گھیرے رکھا۔ اف فوہ کیسا شگفتہ اور مسکراتا چہرہ تھا۔ صاف ستھرا' وہ شرمندگی سے اٹھ بیٹھا۔ میلے کپڑے

اس اور بڑھی ہوئی شیو۔

"کیا تکلیف ہے جناب کو۔" اس نے جھک کر پوچھا۔

"میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں اور تم کسی کے دکھ کو کیا سمجھو گی؟"

"دکھ سمجھانے کا یہ طریقہ دقیانوسی اور بالکل فضول ہے۔ جاؤ اپنا حلیہ ٹھیک کرو۔"

"کسے دکھانا ہے۔"

"انیل صاحب دنیا ہمیشہ اجلے لباس کو پسند کرتی ہے۔"

"مجھے دنیا سے کیا غرض۔"

"تم سمجھتے ہو کہ درد کی شدت یوں انوائی کٹنوائی ڈال دینے سے ختم ہو جائے گی۔ نہیں وہ بدستور رہے گا' لیکن اپنے درد کی تشہیر کیوں کرتے ہو' لوگوں کو ہمدردی کا موقع کیوں دیتے ہو؟ اپنا درد تو صرف وہی ہوتا ہے' اسے اپنی ذات تک محدود رکھو' بہادر بنو' حالات کا مقابلہ کرو' کیوں اپنے آپ کو پایا ہے' اس طرح کچھ بھی ٹھیک نہ ہوگا۔ دل میں کتنا ہی غم کیوں نہ ہو' مسکراؤ' یوں ظاہر کرو جیسے کچھ نہیں ہوا۔" او بینہ کے لہجے میں نجانے کیا جادو تھا کہ انیل کی آنکھیں بھر آئیں۔

"آنسو دوست زندگی کا ساتھ دو۔ لوگوں سے ہنس کر ملو' کیونکہ دنیا بھی ہنستے چہروں کی ساتھی ہے۔ میں ابھی دنیا میں رہنا ہے' اپنے چہرے پر مصلحت کی نقابیں ڈال کر جینے والے یوں بھی جیتے ہیں۔" ماحول سوگوار سا ہو گیا تھا جسے بدلنے کے لیے انیل نے اس پر چوٹ کی۔

"بھئی غریب آدمی ہیں کپڑے بھی تو نہیں۔"

"جتنے ہیں ان سے کام چلاؤ۔ صفائی نصف ایمان ہے۔"

"تم نصف ایمان کی مالک ہو ئیں پھر۔"

"اعتراض ہے کیا؟ تم سے ایک بات بھی کہنی ہے۔" "یہ داڑھی بڑھا کر تم بالکل جنگلی بکرے لگ رہے ہو اور کچھ نہیں۔"

"تو کمرے سے یہ کہہ کر چلی گئی مگر انیل دیر تک آئینے میں اپنی شکل دیکھ دیکھ کر ہنستا رہا۔ پھر اس پر کبھی ایسے موڈ کا شکار نہ ہوا۔

ایسے چھوٹے چھوٹے کئی واقعات تھے جنھوں نے اس کی زندگی کے اداس بھیگے رنگوں کو امنگوں اور قہقہوں کا روپ دینا شروع کر دیا تھا۔ جب کام ختم کر کے وہ گھر واپس آیا تو پہلی بار

اسے گھر آنے کی بے حد خوشی تھی۔ آتے ہی اماں کے گلے سے لگ کر ڈھیروں باتیں کر ڈالیں۔ اب زیادہ وقت ان لوگوں کے ساتھ گزارتا تھا پھر چائے پیتے اور گپ شپ لڑاتے کافی دیر گزری کہ باہر راہداری میں مخصوص کھٹ کھٹ اور شوخ سیٹی کی دھن سن کر پہلی بار اس کی نظریں بے قابو اور بے قرار ہو کر دروازے سے جا لگیں۔ وہ اپنے ہمیشہ والے حلیے میں اندر داخل ہوئی اور اسے دیکھ کر بے ساختہ چیخی۔

"ارے پارنٹر! تم آ گئے۔" پھر اماں کے سامنے ہی اس کا ہاتھ تھام لیا جس کی وجہ سے وہ جھک کر پیچھے ہٹ گیا۔

"کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں تم سناؤ کہاں غائب تھیں۔"

"ارے کام کے چکر میں جو پڑ گئے ہیں۔" وہ کرسی پر تقریباً گرنے کے سے انداز میں بیٹھ کر بولی۔ اماں نے اس کے الجھے بالوں کو پیار سے سنوارتے ہوئے کہا۔ "تجھے کام کی کیا ضرورت تھی۔ کون سی کمی ہے یہاں، ہمیں غیر سمجھتی ہے نا۔"

"نہیں تو خالہ جان۔ ایسی بات تو میں سوچ بھی نہیں سکتی بس مصروفیت چاہتی ہوں۔ پھر ذرا دل بھی بہلا رہتا ہے۔" اس نے پیار سے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"محترمہ آپ ایسا کون سا کار خیر انجام دے رہی ہیں۔"

"بیوٹی پارلر چلا رہی ہوں۔"

"اوئے ہوئے..... کیسا جا رہا ہے پھر آپ کا بیوٹی پارلر۔"

"شاندار، مزے میں ہے بندی، اسکوٹر بھی لے لی ہے میں نے۔"

"کیا بچ، راستے میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوتی؟"

"کس کی مجال ہے، پھر ان کپڑوں اور ہیلمٹ کی وجہ سے رہی سہی کسر بھی پوری ہو جاتی ہے۔"

"بڑی تیز ہو۔"

"ارے دنیا ہمیشہ تیز اور بھاگتے دوڑتے لوگوں کا ساتھ دیتی ہے۔"

"کیا فلسفہ ہے۔"

"فلسفہ پر پھر کبھی بحث ہو گی۔ تم سے تو مجھے بہت سارے دنوں کا کوٹہ پورا کرنا ہے۔ فی الحال

پیٹ پوجا کا ارادہ ہے چلو جلدی چلو۔" اس نے انیل کا بازو تھام لیا۔ تیز تیز اسے اپنے ساتھ گھسیٹ کر لے گئی تو اس کا ذہن بالکل ہشاش بشاش ہو چکا تھا۔

....☆☆....

"یار تم نے بور کر دیا ہے۔"

"کیوں بھئی؟" وہ آفس میں داخل ہو کر گیلے ہاتھوں کو رومال سے صاف کرتے ہوئے بولی۔

"گھنٹہ بھر سے یہاں بیٹھا جھک مار رہا ہوں۔" انیل نے منہ پھلا لیا۔

"اوہو، مجھے افسوس ہے۔"

"کر کیا رہی تھیں؟"

"فیشل۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"تمہیں نہیں معلوم؟"

"کچھ کچھ۔ یہ بتاؤ اتنا رش کیوں رہتا ہے۔ آخر ایسی کیا مصیبت آئی ہوئی ہے؟"

"عورت ہمیشہ خوبصورت رہنا پسند کرتی ہے اور اس کے لیے بڑے پاپڑ بیلتی ہے۔"

"حالانکہ عورت کی خوبصورتی اس کی سادگی میں مضمر ہے۔"

"اب کہاں رہا وہ زمانہ اب تو شوخ رنگ، گہرے میک اپ اور نت نئے لباس زندگی کی علامت ہیں۔"

"تمہاری اس ہیئر کٹنگ، فیشل، تھریڈنگ وغیرہ سے چہرے پر فطری حسن تو پیدا نہیں ہو سکتا۔"

"پھر بھی کچھ سلیقہ تو سکھا دیتے ہیں۔ ایک ہی طرز عمل سے انسان یکسانیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ تھوڑا سا Change دے کر خوشگوار نتائج سامنے لاتے ہیں اور تم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ پہلے زمانے میں عورت کو سنگار کی ضرورت نہیں تھی۔ تب اور اب میں اتنا ہی فرق ہے کہ جدت آ گئی ہے، مقصد تو وہی ہے اعتدال کی حد تک فیشن بھی اچھا لگتا ہے۔ ہاں اوور ہو جانے کو میں برا سمجھتی ہوں۔"

"بعض اوقات تو تم قائل کر دیتی ہو۔"

"مانتے ہو نا؟ اب بتاؤ کہ کیا پروگرام ہے آج کا؟"

ایک پسندیدہ رسالہ۔ ڈائجسٹوں۔ تاریخی رومانوی اور جاسوسی ناولوں کا مرکز
کہکشاں لائبریری اینڈ جنرل اسٹور
صبح چھ بجے سے رات دس بجے تک

"پروگرام کیا۔ وہی آوارہ گردی کا۔ خاک چھاننے اور رفتار زمانہ دیکھنے کا۔"

"یہ ہوئی نا بات سلیقے کی۔" وہ بیگ کندھے پر ڈال کر اس کے ساتھ باہر نکل آئی۔

"اے۔ تم نے کبھی محبت کی ہے؟" "ہارس شو" کے رنگین و دلفریب ماحول میں بیٹھے بیٹھے انیل کے سوال نے او بیتہ کو چونکا دیا۔ چند لمحے وہ اسے خالی نظروں سے تکتی رہی۔

"یہ محبت وحبت سب بکواس ہے۔" اس نے گرین ٹی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو پتھروں میں دراڑیں پیدا کردیتا ہے۔"

"پھر اس پتھر میں جونک لگی کبھی۔" اس نے جھک کر پوچھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے۔" وہ خاموش سا ہوگیا۔

"لگتا تو ایسا ہے' جیسے دل میں طوفان چھپائے بیٹھے ہو۔"

"قیافہ شناس بھی ہو۔"

"ہاں ہوں تو۔"

"مگر تم محبت پر یقین کیوں نہیں رکھتیں۔"

"شاید اس لیے کہ اپنے ہی جذبوں میں گھری ہوئی ہوں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔"

"ہے ایک بات۔ تم اپنی سناؤ کہ آئے دن جو دورے پر چلے جاتے ہو اس کی کیا وجہ ہے؟"

"کیا بتانا ضروری بھی ہے؟"

"نہیں ایسا ضروری بھی نہیں' پھر تمہاری پرسنل بات ہے۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تم سے قر
ہوں چاہے کسی ناتے بھی تو چھوٹے چھوٹے دکھ بانٹ لینے میں کیا حرج ہے۔ پھر بہت سی با
ایک کو تو نہیں سنائی جاتیں۔"

"میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ کسی اور سے کہوں یا نہ کہوں مگر تم سے کچھ نہ چھپاؤں۔"

"اس ذرہ نوازی کے لیے بندی ممنون ہے۔"

"یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نیا نیا کالج گیا تھا۔" انیل نے کرسی کی پشت سے سر ٹ
"وہاں مجھے راحت ملی تھی۔ اس نے مجھ سے خود دوستی کی' بقول اس کے میں اس کا آئیڈ
میں ٹھہرا ایک متوسط طبقے کا فرد' اور وہ نہ صرف امیر و کبیر خاندان سے تعلق رکھتی تھی بلکہ
الگ فرقے کی ماننے والی بھی تھی۔ خیر رنگ و نسل کا تو میں قائل نہیں مگر اس کی بے

اور حیثیت سے خائف ضرور تھا اور عموماً مختلف سماجی و معاشرتی مثالیں دے کر اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا مگر وہ ثابت قدمی سے جمی ہوئی تھی۔ یوں سمجھو کہ کالج لائف کے چار سالوں میں اپنی سی ہر کوشش کر ڈالی اس سے بچنے کی' کترانے کی مگر یہ دل' ہم بخت دل' جو اپنی من مانی کرتا ہے مجبور کر گیا اور میں ہار گیا' پھر اس کو یقین دلایا کہ اسے حاصل کرنے کے لیے میں اپنی پوزیشن ضرور بناؤں گا' جب انگلیں جوان ہوں تو راستے خود بخود بن جاتے ہیں۔ باہر کی جاب کے لیے کوشش کر رہا تھا اور ایک دن میں اس میں کامیاب بھی ہوگیا۔ ان دنوں میں یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ تھا۔ میں اور راحت عموماً وہیں ملا بھی کرتے تھے' جب اتنی بڑی کامیابی ملی تو خوشی سے دیوانہ ہی ہوگیا۔ اس کے گھر ٹیلیفون کیا تو پتا چلا کہ دو دن پہلے ہی وہ شادی کر کے کینیڈا چلی گئی ہے۔ میں تو سکتے میں رہ گیا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے اس سے ملاقات ہو چکی تھی۔ اس نے تو کوئی ذکر تک نہ کیا تھا۔ بعد میں اس کی سہیلیوں کے ذریعے پتا چلا کہ یہ شادی تو اس کی مرضی اور پسند سے ہوئی تھی۔ اور ان کے یہاں خاندان سے باہر شادی کا تصور تک بھی نہیں کیا جاتا۔ وقت گزاری اور شغل کے طور پر مجھے نشانہ بنایا گیا تھا۔ تم نے گویا ہم لوگوں کی دل لگی کا سامان تھے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ سچے جذبے بھی اپنی قدر کھو چکے ہیں اور دنیا کی سب سے بڑی سچائی پیار بھی ریا اور کھوٹ کی نذر ہوگئی۔ اس وقت جو میری کیفیت تھی اور جو دل پر گزری تھی اسے بیان کرنے کے لیے طاقت گفتار کہاں سے لاؤں۔ اپنا اپا سٹمنٹ لیٹر اسی وقت ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔ چوٹ بہت شدید تھی میں زندگی سے بیزار اور دور ہوتا چلا گیا پھر یمیں پر سروس کرلی۔ اب تو اپنے آپ سے ایسی چڑ ہوگئی ہے کہ کوئی آرزو کرنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔" وہ چپ ہوا تو او بیتہ نے اس کے ہاتھ پر اپنا ملائم ہاتھ رکھ دیا۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولی تھی لیکن انیل نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ہمدردی اور خلوص کے کئی دیپ جلتے پائے اور تسلی کے اس انوکھے انداز نے اس کے اندر کے کرب کو ایکدم مٹا ڈالا۔ اس کا وہی ہاتھ تھام کر وہ باہر نکل آیا تو رات بہت بھیگ چلی تھی۔

جب سے انیل نے اپنی کہانی اسے سنائی تھی وہ اس کے بے حد قریب ہوگئی تھی اور انیل تو جیسے شاداں و فرحاں ہو اٹھا تھا۔ اس کی زندگی سے دکھ بیزاری اور اکتاہٹ سب کچھ ختم ہوگیا تھا۔ او بیتہ جو ساتھ ساتھ تھی۔ ہر قدم پر' ہر مقام پر' وہ چاہتا تھا کہ یہ رنگین حکایت اسے بھی سنائے جو اس کے بے حد قریب تھی لیکن جب وہ قریب ہوتی تو ایک انجانا سا خوف دامن گیر ہوتا کہ کہیں "اظہار" اس کی راہوں میں کانٹے نہ بودے۔ کیا اتنا کافی نہ تھا کہ وہ ساتھ تھی۔ وہ کیا چاہتی ہے

انیل کو پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ اس کا بے پایاں خلوص بھی کسی غلط فہمی کا شکار ہونے سے روکتا تھا۔ اسے ہمیشہ اپنی قسمت سے ڈر لگتا تھا جب بھی اس نے بہاروں کی تمنا کی' خزاؤں نے آگھیرا تھا' اور اب جبکہ وہ ایک میچور Age میں تھا جہاں اگر منزل ساتھ چھوڑ جائے تو بنیادیں تک ہل جاتی ہیں۔ پھر اویتہ ایک ایسی خواہش بن چکی تھی جس سے دستبردار ہونا اس کے بس میں نہ تھا۔

ہنڈا سیڑھیوں کے قریب روک کر ہیلمٹ اس نے اتار کر اپنے بکھرے بال ہاتھوں سے سنوارنے کی کوشش کی پھر ہمیشہ کی طرح سیٹی پر کوئی شوخ دھن بجاتی سیڑھیاں پھلانگتی جیسے ہی دروازے تک پہنچی۔ انیل کو راستہ روکے پایا۔

"ہیلو!" بڑی تھکی تھکی مسکراہٹ تھی۔

"وعلیکم ہیلو۔ یہ اتنی دیر کہاں لگادی؟"

"کیوں انتظار کیا جارہا تھا؟"

"نہیں میں تو باہر کے نظارے دیکھنے چلا آیا تھا۔"

"پھر کیسے رہے نظارے؟"

"کچھ کچھ بدل گیا ہے موسم تمہارے آنے سے۔"

"یہ مطلع ہے یا مقطع۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔

"کچھ بھی سمجھ لو۔"

"ارے اتنی سمجھ کہاں ہے۔ بھئی اندر چلو۔ آخر ارادے کیا ہیں؟"

"ٹھیک' بہت ساری باتیں کرنے والے۔" انیل کے چہرے پر ناقابل فہم تاثر تھا۔

"بہت مناسب' تو شروع ہوجاؤ۔" کمرے میں داخل ہوکر اس نے اپنے فل بوٹ اتارے سلیپر گھسیٹتی ہوئی باتھ روم میں جاگھسی۔ منہ ہاتھ دھوکر تولیہ سے خشک کرتی ہوئی اس کے قریب آبیٹھی۔

"یہ چہرہ اتنا عجیب کیوں ہورہا ہے۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"خاص الخاص' ہوسکتا ہے ہم دونوں کے درمیان یہ آخری بات ہو لیکن کہے بنا کوئی چارہ بھی نہیں۔"

"ایسا سنجیدہ مسئلہ ہے۔"

"ارے زندگی کا سوال ہے۔"

"پھر تو غور و خوض بھی کرنا پڑے گا۔"

"بہت زیادہ۔ چائے پی لوں اگر اجازت دو۔"

"رحیمو بابا لارہا ہے۔"

"یہ ہوئی نا بات۔"

رحیمو بابا نے چائے کے ساتھ اچھا خاصا اہتمام کیا تھا وہ جلدی جلدی چائے بنانے لگی۔ اور اصرار کرکے پیش بھی اس کی طرف بڑھاتی رہی۔ وہ جو بہت سنجیدہ تھا اور اسے عجیب نظروں سے تک رہا تھا۔ یہ بات اسے بھی کھٹک رہی تھی لیکن وہ سمجھ نہیں پارہی تھی۔ ٹرے واپس رکھ کر جب وہ آئی تو انیل سگریٹ سلگا رہا تھا۔

"ارے اس کا دھواں مجھے برا لگتا ہے۔" اس نے فوراً منہ پھلا لیا اور ہاں جلدی سے سناؤ کیا بات ہے۔ مسلسل سسپنس Create کررہے ہو۔"

"اویتہ!" پہلی بار اپنا نام اس کے منہ سے سن کہ اسے بڑا عجیب سا احساس ہوا۔

"اویتہ مجھے تم اچھی لگنے لگی ہو' بہت اچھی۔" وہ خاموش رہی اور انیل کسی زبردست رد عمل کا منتظر تھا مگر وہ خاموش تھی۔

"یہ سب کچھ بے حد اچانک ہی ہوگیا۔" وہ دھیمے سے بولا۔

"تمہیں میرے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔" اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے۔ تم جو ہو' جیسی ہو' مجھے پسند ہو۔"

"میں ایک طلاق شدہ لڑکی ہوں۔ بغیر کسی جرم کے قصوروار ہوں' میٹرک کی اسٹوڈنٹ تھی تو میرا نکاح خالہ کے لڑکے سے ہوگیا تھا جو اعلیٰ تعلیم کے لیے فارن جارہا تھا۔ جانے سے پہلے جو زنجیر اس کے پیروں میں ڈال دی گئی وہ میں تھی' جو اس بندھن سے بے حد خوش اور مطمئن تھی۔ جب چار سال گزر گئے اور خالہ کی طرف سے رخصتی کا مطالبہ تک نہ ہوا تو امی نے مجبور ہوکر خود ہی بات شروع کی کیونکہ چھوٹی بہن کی بات بھی چل چکی تھی۔ خالہ کا رویہ ہم لوگوں کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ یہ شادی ان کی پسند پر ہوئی تھی اور اب وہی اتنی خاموش تھیں۔ انہوں نے ہمارے سامنے ہی کال بک کروائی اور صاحبزادے سے خود رخصتی کا شدید اصرار کیا اس کے چند دنوں بعد میرے نام رجسٹرڈ لیٹر آیا۔ طلاق نامہ تھا۔ میرا قصور یہ تھا کہ میں مشرقی لڑکی تھی اور ان کو فارن کی ایک امیر

زادی نے اپنے دام الفت میں گرفتار کر کے مغرب کی محبت بخش دی تھی۔ اب ان کا یہاں رکھا ہی کیا تھا جسے وہ لینے آتے۔ ایک بے تکا بندھن' جوان کی نظروں میں اتنا غیر اہم تھا کہ فوری طور پر چھٹکارا پالیا گیا پھر جو کچھ بچتی وہ مجھ پر بیتی۔ لوگوں کی باتوں نے وہ ذہنی کچوکے دیے کہ میں جیتے جی مرگئی۔ بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا دیا پھر وہ جگہ اور شہر بھی چھوڑ دیا۔ حالات کا مقابلہ کرنے یہاں چلی آئی۔ اس دن سے مجھے مرد کے اس حق پر شدید غصہ ہے۔ وہ جب چاہتا ہے بندھن جوڑ لیتا ہے۔ جب چاہتا ہے توڑ لیتا ہے۔ عورت کوئی کھلونا تو نہیں حالانکہ وہ برے سے برے مرد کے ساتھ بھی گزارا کر لیتی ہے۔ تب سے مجھے مظلومیت سے نفرت ہے اس لیے میں نے اپنا چلن بدل دیا ہے میں کسی کی محتاج نہیں۔ کسی پر بوجھ نہیں۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحے اپنے ہونٹ کاٹتی رہی اور بغیر اس کی طرف دیکھے باہر نکل گئی۔ پھر کئی دن گزر گئے ان دونوں کا آمنا سامنا نہ ہوا۔ وہ نہ جانے کس وقت گھر آتی کمرا بند کیے پڑی رہتی۔ انیل سمجھ گیا کہ حالات اس کے خلاف ہیں۔ اس کی ہمت تو ایک ہفتے ہی میں جواب دے گئی۔ اس سے جدائی کا تصور ہی روح فرسا تھا۔ اماں بھی ان دونوں کی کشمکش سے سمجھ گئی تھیں کہ دونوں کے مابین کوئی مسئلہ ضرور ہے۔ پھر ذہنی رسہ کشی کے سبب انیل کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ کئی دنوں سے اسے بخار آرہا تھا۔ ایک ڈاکٹر آتا' پھر دوسرا' یہ سلسلہ او میتہ کئی روز سے دیکھ رہی تھی لیکن وہ عیادت کو نہیں گئی تھی۔ اماں تو او میتہ کو بہو بنانے پر دل و جان سے تیار تھیں لیکن وہ ان دونوں کے بیچ میں کچھ کہنا نہیں چاہتی تھیں اور انیل سے کسی طرح یہ مسئلہ سلجھ نہیں پا رہا تھا۔ ایک دن ذرا طبیعت سنبھلی تو وہ ایزی چیئر پر دراز کھڑکی سے باہر نظریں جمائے بیٹھا تھا کہ او میتہ جھجکتے جھجکتے اس کے پاس دھیرے سے آ کھڑی ہوئی۔ چند لمحے تاسف سے اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔

"یہ کیا حال بنا رکھا ہے!" وہی ہمدردانہ مانوس آواز سن کر انیل کو اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ سامنے وہ موجود تھی۔ لباس حسب معمول صاف ستھرا تھا لیکن چہرہ اترا اترا اور آنکھیں سوجی سوجی وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"کیا دیکھ رہے ہو میں بہت بری ہوں نا۔ آپ کو دکھ پہنچایا ہے۔" اس کی نظریں جھک گئیں۔

"میں بہت جلد یہاں سے چلی جاؤں گی' نجانے کہاں جانا ہوگا۔"

"منزل پر پہنچ کر منزل کی تلاش کیسی؟"

"میری کوئی منزل نہیں۔ میں نے مرد کو صرف دوست کا روپ دیا تھا۔ اب کوئی اور روپ ہرگز نہیں دے سکتی۔"

"فیصلے کبھی کبھار غلط بھی ثابت ہوسکتے ہیں' دیکھو او میتہ زندگی حادثوں سے عبارت ہے۔ لوگ جینا نہیں چھوڑ سکتے زندہ رہنے کے لیے ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت رہتی ہے۔ ایک شخص کی بے وفائی کی سزا کسی دوسرے کو کیوں دیتی ہو۔ اپنے آپ پر کیوں ظلم کر رہی ہوں؟ پھر تم یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ مجھے تمہارے سہارے کی کتنی ضرورت ہے' کیا مجھے اکیلا چھوڑ جاؤ گی۔" اس نے او میتہ کے شانے دھیمے سے تھام لیے۔ او میتہ کی لرزتی کانپتی پلکیں اوپر اٹھیں اور انیل کی محبت لٹاتی نظروں سے جا ٹکرائیں' وہ جو دامن پھیلائے اس کے سامنے آگیا تھا' اس کی آنکھیں کچھ مانگ رہی تھیں۔

"زخم لگانا کوئی کمال نہیں بلکہ اس پر مرہم رکھنا کمال کی بات ہے اور تم میرے زخموں کا مرہم ہو کیا تم چاہتی ہو کہ میں ساری عمر تڑپتا رہوں۔"

"نہیں۔"

"تم نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا ہے۔ مجھے جینا سکھایا۔ کیا تمہیں میرا ذرا بھی خیال نہیں۔ ہم اتنے عرصے سے ساتھ ہیں۔ پھر بھی تمہارے دل میں میرے لیے کوئی جذبہ نہیں؟ بولو او میتہ! تمہیں میری پروا نہیں ہے؟"

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے! میں کوئی مٹی کی مورت تو نہیں لیکن...."

"لیکن ویکن کچھ نہیں جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ' پیچھے دیکھو گی تو پتھر کی ہو جاؤ گی۔ ماضی کو چھوڑو کل جو کچھ ہوا' وہ گزر چکا ہے۔ صرف آج کا سوچو۔ کیونکہ جو سامنے ہے وہ اپنا ہے اور میرے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو تھام لو بھلا اپنوں کو بھی کوئی ٹھکراتا ہے۔"

"نہیں ہرگز نہیں۔" اس کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں انیل کو بے اختیار کر گئیں۔ آگے بڑھ کر اس نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا' تو پھر وہی مخصوص خوشبو اس کے اردگرد طواف کرنے لگی تھی لیکن آج اس خوشبو کا اپنا الگ احساس تھا۔ اپنا الگ جادو تھا ایک ایسا انوکھا پن تھا کہ اس لمحے اس کی گرفت میں وقت کا ہر لمحہ آ چکا تھا۔ وہ خوشبو کو پا چکا تھا۔ خوشبو اپنی ہو چکی تھی۔ ہمیشہ کے لیے۔

وہ محبت میدانِ خودسری کی تمام منزلیں طے کر گئی تھی اور اسے احساس بھی نہ تھا کہ وہ دھوکا کھا رہی ہے اور جب اسے احساس ہوا تو وہ خود بھی فنا ہو گئی تھی اور...

ایک المناک تحریر: ایک دردناک فسانہ۔

زاہدہ پروین

چنبیلی کی ڈالی

نہر کی پٹری پٹری چمکیلی ریت پر چھوٹے چودھری کی کار پل تک خاصی رفتار سے آئی پل کے نشیب میں گاؤں تک جانے والا راستہ ہموار ضرور تھا' دو رویہ جامن اور کیکر کے اونچے اونچے درخت کھڑے تھے' لیکن تھا کچا راستہ۔ چنانچہ نفاست پسند چھوٹے چودھری نے اسپیڈ کم کر دی اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ نہر کے نشیب میں حدِ نگاہ تک ہریالی کا جال بچھا تھا۔ تناور درختوں' لہلہاتے کھیتوں کے باغ' خودرو بیلوں' پودوں اور سرسبز پگڈنڈیوں کی بہتات پہلی نظر میں ہی انسان کا دل موہ لیتی تھیں۔

چندن پور حقیقتاً کائنات کا ایسا قابلِ رشک گوشہ تھا جہاں مویشیوں کے لیے چارا اور انسانوں کے لیے رزق بافراط پیدا ہوتا تھا۔ سونے پر سہاگا یہ کہ ادھر کی زمین قدرتی طور پر زرخیز تھی مناظر فطرت میں مظہر حسن و رعنائی' وسیع و عریض چراگاہوں' سرسبز و شاداب کھیتوں کھلیانوں' گنگناتی ندیوں' آباد چوپالوں اور ہنستے بستے گھروں پر خدا کی رحمت تھی۔ کار کے کھلے ہوئے شیشے سے آتا سرما کی خنکھری ہوائیں چھوٹے چودھری کے سلیقے سے بنے بال اڑائے لیے جا رہی تھیں مگر اسے یہ ٹھنڈ خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔

ادھر ادھر مناظر کو دیکھتے دیکھتے..... بالکل اچانک ہی اس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی شکار کی بو شکاری تک آ پہنچی تھی مگر ذہن ابھی شکار کی نوعیت سے آگاہ نہ تھا ایک نظر اس نے قریب پڑی ایئر گن پر ڈالی' پھر وہ سامنے متوجہ ہو گیا۔ بس وہ ایک لمحہ قیامت کا لمحہ تھا۔ ونڈ اسکرین کے پار' شاید اس کی گاڑی سے تین گز کے فاصلے پر رہ کر بجلی سی کوند رہی تھی یا شاید نیلے پانی میں جیسے ایک اونچی سی لہر اٹھتی تھی اور لپک کر ساحل کو چھو جاتی تھی یا پھر جیسے پھولوں کے بوجھ سے لدی ہوئی ڈال بار بار کپکپا اٹھتی تھی چھوٹے چودھری کے ہاتھ اسٹیئرنگ سے چپک کر رہ گئے تھے اور آنکھیں تھیں کہ سامنے سے ہٹنے کا نام نہ لے رہی تھیں اسی کیفیت میں اس کے ذہن سے اس حسین رہائی کا ایک خوبصورت عنوان ٹکرایا۔ چنبیلی کی ڈال۔

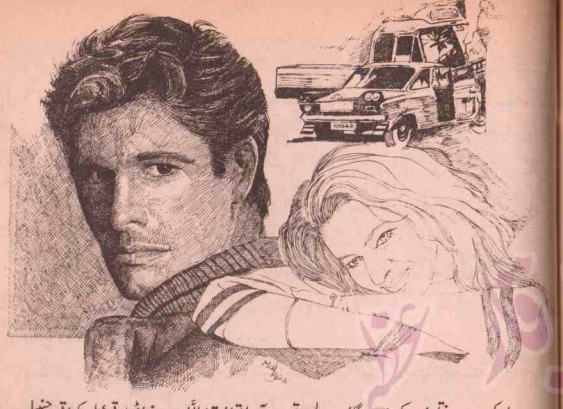

بلا کی سست رفتاری کے باوجود گاؤں ہر لحہ قریب آ رہا تھا احتیاطاً اس نے اٹھلاتی' بل کھاتی چنبیلی سے نظر ہٹا کر دور تک دیکھا۔ کچا راستہ سنسان پڑا تھا۔ اب اس نے ہلکا سا ہارن دیا۔ مقصد یہ تھا کہ اس سمیں بدن کا چور دیکھا جائے۔ مگر وائے نصیب کہ اس نے خلاف توقع گھوم کر دیکھنے کی بجائے راستے سے دو قدم ہٹ کر پل کھانا شروع کر دیے۔ چھوٹے چودھری کا خیال تھا کہ ہارن سن کر پہلے وہ بو کھلا کر پیچھے دیکھے گی' پھر سٹپٹا کر گھڑا ہاتھ سے چھوڑ دے گی' پھر اکراس کی گاڑی میں آ بیٹھے گی۔

اس نے آج تک جتنے بھی عشق کیے تھے عموماً ان کا تیسرا مرحلہ آخری مرحلہ ثابت ہوا کرتا تھا مگر یہاں معاملہ کچھ ٹیڑھا نظر آ رہا تھا مجبوراً اسے اسپیڈ بڑھانی پڑی۔ گاڑی آگے بڑھا کے اس نے کھڑکی سے گردن نکال کے پیچھے دیکھا۔ معاذ اللہ! وہ چرہ تھا کہ دھیرے دھیرے کھلنے والا گلاب کا پھول! چھوٹے چودھری کے پہلو میں دھڑکتا دل کسی نے چٹکی سے پکڑ لیا۔ وہ آہو چشم' مثل ہیر پھولوں بھری ڈال کی طرح لچک لچک کر بل کھا کھا کر تو چل ہی رہی تھی مگر سامنے سے اور بھی قیامت تھی چھوٹی سی ستواں ناک میں پڑی کیل جیسے چمک چمک کر دیکھنے والوں کو دھمکا رہی تھی۔ ابھرے ہوئے ہونٹوں اور آنکھوں میں بے نیازی اور لاپروائی ڈیرے جمائے ہوئے تھی۔

لمحے بھر کو تو وہ مایوس ہی ہو بیٹھا مگر پھر فوراً ہی سنبھالا لیا۔ اس میدان میں پرانا اور منجھا ہوا کھلاڑی تھا جب کہ حقیقت یہ تھی کہ لڑکی پہلی ہی نگاہ میں جی کو بھا گئی تھی اس کے دونوں ہاتھ سر پر رکھے کورے گھڑے کو سنبھالے ہوئے تھے دوپٹا سارا کا سارا سمٹ کر گردن سے جا چپکا تھا چھوٹے چودھری کو وہ تو بہ

شکن اور خطرناک ایماں تو لگ رہی تھی مگر اس "ہینڈ زاپ" سی پوزیشن میں قمل کیے ڈال رہی تھی نیلے رنگ کی پھنسی ہوئی قمیص میں جسم کا ہر حصہ یوں بلکورے لے رہا تھا جیسے لوریاں سنا رہا ہو۔ ہارن تو بے سود ثابت ہوا تھا۔ اب اس نے کھنکار کر اسے متوجہ کرنا چاہا نتیجہ حسب منشاء رہا۔ اس کی آنکھیں براہ راست چھوٹے چودھری کی آنکھوں میں آن اتریں اتنی خشمگیں، اتنی ہوش ربا اور اتنی کٹیلی آنکھیں، اس نے گڑبڑا کے گردن اندر کرلی اور یہی گھڑی، اس کے لیے شہ گھڑی بن گئی اگر وہ مزید ایک منٹ بھی جھیڑ چھاڑ میں مصروف رہتا تو آج پکڑا گیا تھا۔ ونڈ اسکرین پر کماد کا وسیع و عریض کھیت نظر آرہا تھا۔

پندرہ بیس افراد جگہ جگہ کھڑے گنے کی چھلائی کررہے تھے اور کماد سے ہٹ کر ایک اونچی جگہ پر بڑے چودھری آنکھوں پر ہاتھ کا چھجہ بنائے اسے گاڑی سمیت پہچاننے کی کوشش کررہے تھے مجبوراً اس مثل ہیرو کو الوداع کہہ کے اسے گاڑی کی اسپیڈ بڑھانا پڑی۔

"اوئے میرا شیر پتر آپسچا آخر!" بڑے چودھری نے ایک گرجدار قہقہہ لگا کر اسے سینے سے بھینچ لیا۔ پھر اسے اپنے سامنے کھڑا کرکے نیچے سے اوپر تک دیکھ کر بولے۔

"اوئے تیری ماں کو بڑی فکر تھی تیری۔ ہر روز راہ دیکھتی تھی کب کالج بند ہوا پتر تیرا!"

"ابا جی کالج تو ابھی کل ہی بند ہوا ہے۔ رات میں حیدر آباد رک گیا تھا صبح ہوتے ہی ادھر چل پڑا۔"

چھوٹے چودھری نے چوری چوری پیچھے نظریں دوڑائے ہوئے جواب دیا۔ جہاں وہ ہیرا بدن جانے کدھر غائب ہوچکی تھی۔ بڑے چودھری نے نئے سرے سے فلک شگاف قہقہہ لگایا پھر اس کا بازو پکڑ کر چلتے ہوئے بولے۔

"چل..... گھر چل تیری ماں نے میری جان کھا رکھی تھی۔۔۔۔"

گاڑی میں بیٹھے بیٹھے بڑی چودھری نے چھلائی کرنے والوں کو للکارا اور دوبارہ بیٹے کی طرف متوجہ ہوگیا جو کھویا کھویا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

وہ چند دن چھوٹے چودھری کے لیے عذاب جاں بن گئے ایک لچکتی مچلتی چال والی مغرور لڑکی اسے سرراہ چیلنج کرکے پس پردہ چلی گئی تھی اور وہ ہونقوں کی طرح اسے ہر گنڈ بندی، ہر کھیت اور ہر باغ میں ڈھونڈتا پھرتا تھا خبر نہیں کون تھی اور کس گھر میں رہتی تھی! بظاہر ایک عام سی لڑکی تھی مگر اس کے دل میں ایک خاص مقام حاصل کرگئی تھی۔ کیسا ستم تھا کہ وہ کسی سے اس کے بارے میں پوچھ بھی نہ سکتا تھا۔

ہاں! یہ ایک ستم ہی تو تھا کہ وہ گاؤں کے سب سے بڑے چودھری کا اکلوتا بیٹا ہوتے ہوئے بھی اپنے

گاؤں والوں کے لیے تقریباً اجنبی ہی تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ اوپر تلے تین عدد بیٹیوں کا باپ بن جانے کے بعد جب انتہائی مایوسی کے عالم میں چودھری صاحب کو قدرت نے ایک عدد بے حد خوبصورت، صحتمند اور خوبرو بیٹے سے نوازا تو صحیح معنوں میں ان کے دل کی کلی کھل اٹھی خوشی سے ان کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ چنانچہ دوسری شادی کا ارادہ ترک کرکے وہ تن من دھن کے ساتھ اپنے ولی عہد کی طرف متوجہ ہوگئے جو آرزوئیں مدت سے دل ہی دل میں پل رہی اور ٹھٹھر رہی تھیں، رحمت خداوندی کے ایک ہی جھونکے سے لہلہا اٹھیں۔

بیٹے کو پڑھا لکھا کر آفیسر بنانے کا اتنا شدید ارمان تھا کہ انھوں نے بچپن سے ہی اسے بہترین اتالیقوں کے سپرد کردیا۔ کچھ بڑا ہوا تو اپنی محبت اور شفقت پر پہرے بٹھا کر اور بیوی کی منت سماجت کو نظرانداز کرکے شہر بھجوادیا۔

شہر میں وہ شہزادوں کی سی آن بان کے ساتھ رہا۔ دیالو اور شاہ خرچ وہ فطری طور پر تھا ہی لہٰذا اس کی مقبولیت اور دوستوں کی تعداد ان گنت تھی۔ عیاش اور آزاد منش دوستوں کے ساتھ مل کر اس نے دنیا کی ہر عیاشی کر ڈالی تھی۔ جی بھر کے لطف زندگانی اٹھایا تھا۔ بڑے چودھری کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ بیٹا کراچی میں کیا گل کھلاتا ہے اور گھر کیسی معصوم صورت لیے آیا ہے ویسے اگر معلوم بھی ہوجاتا تو وہ کچھ خاص اثر نہ لیتے۔ ان کا خیال تھا بلکہ نظریہ تھا کہ جب تیز ہوا چلتی ہے تو سارے ہی درختوں کے پتے ہلتے ہیں۔ جھومتے ہیں اور جب ہلتے جھومتے ہیں تو ظاہر ہے کہ کلیوں سے ٹکرانا بھی پڑتا ہے۔ انھیں چھونا بھی پڑتا ہے۔ یہ تو قانون قدرت ہے۔ فطرت کے اصول ہیں جن سے انحراف ناممکن ہے۔ وہ جس دن پیدا ہوا تھا تو دادی نے پوپلے منہ سے کہا تھا "اللہ نے ہمارے ویڑے (آنگن) میں بوٹا (پودا) لگایا ہے بس ہم تو اس کا نام "محمد بوٹا" رکھیں گے" پھر بڑے چودھری کی مجال نہ ہوئی کہ ماں کا کہا ٹالتے بس ان کی اس اکلوتی بھول نے "محمد بوٹا کو تختی کا ناچ نچادیا۔

جوں جوں وہ بڑا ہوا توں توں اسے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ جب زمانے کی ہوا لگی تو اس نے خود کو "ایم بی چودھری" کرلیا جب خود بھی ہر آن دوڑتے بھاگتے زمانے کا حصہ بن گیا تو کہیں "چودھری صاحب" اور کہیں "مسٹر چودھری" کہلانے لگا چندن پور کی آبادی اسے "چھوٹے چودھری" کے نام سے جانتی تھی یوں رفتہ رفتہ دادی کا بڑے چاؤ اور عقیدت سے رکھا ہوا نام "محمد بوٹا" خود اسی کی بوڑھی ہڈیوں کی طرح پیوند زمین ہوگیا۔

چھوٹے چودھری کو پریشان اور سرگرداں گھومتے آٹھ سات دن گزرے تھے کہ ایک صبح گوہر مقصود

جھلک دکھلا گیا وہ ناشتے کے بعد ہی گاڑی لے کر نکل آیا تھا۔ دور دور یہ کماد کے کھیتوں کے درمیان سے راستے پر ہلکی اسپیڈ پر جا رہا تھا کچھ آگے جا کر کھیت ختم ہو گئے اور دائیں طرف سرسوں کے نیچے ہرے ہرے کھیت نظر آنے لگے تھے۔ کہیں کہیں سرسوں پھولی ہوئی تھی۔ سرسبز پتوں پر زرد زرد پھولوں کے گچھے کھلے پڑے ہے تھے وہ ٹھٹک کر رہ گیا زرد اور سبز رنگوں پر رہ رہ کر گلابی آنچل لہرا جاتا تھا۔

چھوٹے چودھری کو صبر کرنا دشوار ہو گیا۔ وہ گاڑی سے تیزی سے نکلا اور پانی کی کھائی پھلانگ کر دوسری طرف پہنچ گیا۔ اس نے ٹھیک پہچانا۔ یہ سچ مچ وہی سیمیں بدن تھی اور کھیت کے درمیان جھکی جلدی جلدی سرسوں کا ساگ توڑ توڑ کر جھولی میں ڈالے جا رہی تھی۔ آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور منڈیر پر کھڑے چھوٹے چودھری کو دیکھ کر مبہوت رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں لپکتے لراتے، وار فتگی، شوق اور دلچسپی کے عکس اسے وحشی ہرنی کی طرح چوکنا کر گئے۔ ادھر چھوٹے چودھری نے کھیت کی منڈیر سے نیچے قدم رکھا ادھر وہ زخمی شیرنی کی مانند غرائی

"دیکھ! میرے قریب مت آنا ورنہ میں شور مچا دوں گی۔" اس کے کانوں میں نقرئی گھنگھنیاں سی بج اٹھیں۔ بڑھتے قدم خود بخود ہی تھم گئے۔ اسے نظروں ہی نظروں میں تولتا ہوا عجیب سے لہجے اور متاثر کن انداز میں بولا "کیا میں تجھے اتنا ہی برا لگا ہوں....."

بظاہر ایک سادہ سا جملہ تیر کی طرح سامنے والی کے سینے میں اتر گیا اور ابھی وہ پوری طرح دم بھی نہ لینے پائی تھی کہ چودھری نے انتہائی پتے تلے اور چھٹے چھٹائے مکالمے بولنے شروع کر دیے۔

"اے حسن کی دیوی! مجھے نہیں معلوم کہ تو کون ہے لیکن تو جانتی ہے کہ میں کون ہوں۔ اس کے باوجود میں کہتا ہوں کہ فقہ بھر پور بہاروں کا جوبن اور سہم چلنے والا مست خرام جھونکا ہے۔ بیشک تو چنبیلی کی ڈال ہے اور میں بھول کا کانٹا، میرا تیرا کوئی جوڑ نہیں مجھے معلوم ہے میں تیرے قدموں کی خاک بھی نہیں... لیکن میں نہیں سمجھتا کہ میرے دل کو کیا ہو گیا ہے۔ میری یہ حالت پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ میں تجھے دوش نہیں دیتا کہ تجھے ستم کرنے اور بجلیاں گرانے کا حق ہے لیکن اپنے اس دل کا کیا کروں جو ہر دم تجھے ہی دیکھتے رہنے کی تمنا کرتا رہتا ہے اب تو خفا ہو یا راضی میں اس روز سے تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو گیا..... اس لیے مجھے اپنے دل پر قابو نہ رہا....."

اتنا کہہ کر وہ مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گاڑی میں جا بیٹھا اور جھٹکے سے گاڑی لے اڑا پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ لمحہ بھر پہلے اطمینان اور سکون سے ساگ توڑنے والی لڑکی پر کیا گزری ابھی اس واردات کو گزرے دوسرا دن تھا کہ ان دونوں کا پھر ٹکراؤ ہو گیا اس موقع پر چھوٹے چودھری نے

زبردست ایکشن دیا ایسی بھرپور ایکٹنگ کی کہ وہ چنبیلی کی ڈال بیچاری دل تھام کر رہ گئی گندم کی بوائی کے لیے نئے کھیت تیار ہو رہے تھے محض وقت گزاری کے لیے چھوٹا چودھری ٹریکٹر پر جا بیٹھا اور ڈرائیور کو چلتا کر دیا۔ موسم خوش گوار تھا آسمان پر گہرے گہرے بادل چھائے تھے اور کھیت کی مٹی نم نم ہو رہی تھی وہ سرپر ہیٹ جمائے خاصی توجہ سے ٹریکٹر چلا رہا تھا پیچھے لگی ہوئی ٹرالی ایک تسلسل کے ساتھ مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلے توڑتی جا رہی تھی و فعتاً اسے یوں محسوس ہوا جیسے پوری کائنات نے دھانی رنگ کا آنچل اوڑھ لیا ہو۔ دور کھیت کی آخری منڈیر پر وہی پری چہرا سیمیں بدن لہراتی بل کھاتی نظر آ رہی تھی چھوٹے چودھری نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے ٹریکٹر کا رخ اسی جانب موڑ دیا ٹریکٹر اپنے ساز و سامان اور ٹرالی سمیت بے پناہ شور مچاتا، لہکتا اٹھلاتا عین اس کے سامنے جا کر رک گیا۔ وہ اچھل کر منڈیر پر جا کھڑی ہوئی سر اٹھا کر قہر آلود نظر سے گھورا تو اس نے فوراً ایک عدد سلام جھاڑ دیا، ساتھ ہی ہاتھ بڑھا کر ٹیپ کا بٹن دبا دیا شوکت علی کی آواز ابھری۔

کیوں دور دور رہندے او حضور میرے کولوں
مینوں دس دیو ہویا کی قصور میرے کولوں

اس پاٹ دار آواز کے ساتھ ہی لڑکی کی آنکھوں میں ہزاروں فکریں جاگ پڑیں لاکھوں اندیشوں نے اسے بدحواس کر دیا۔ چھوٹے چودھری کی یہ جسارت تو رسوائی کا دعوت نامہ تھی۔ جب وہ کھیتوں کی اوٹ ہی اوٹ میں گاؤں کی طرف چل رہی تھی تو چھوٹے چودھری کی شرارت دوسرے گیت میں تبدیل ہو گئی تھی۔

میرے شوق دا نئیں متاں رقیبوں
آ ویکھ، میرا انتظار آجا

انتہائی خوف و ہراس کے باوجود لڑکی کے دل کے کسی نرم گوشے میں دھیمی دھیمی شہنائیاں بجنے لگی تھیں۔

چوتھے ٹکراؤ میں چھوٹے چودھری نے عامیانہ پن کی حد ہی کر ڈالی اس کا پیچھا کرتا ہوا گھر تک جا پہنچا تب سے اس نے معمول بنا لیا۔ دن بھر میں ایک مرتبہ ٹریکٹر لے کر ضرور ٹیپ فل اسپیڈ پر آن کیے اس کے گھر کے سامنے سے گزرتا۔ دیکھنے والوں کو گمان بھی نہ گزرتا اور وہ حال دل ڈنکے کی چوٹ پر سناتا چلا جاتا تھا کبھی۔

پہلی واری آج اوناں اکھیاں نے سیکیا

اے ہو جیا کیا کہ ہائے مار سٹیا
عاشقاں تو سوہنا کھڑا چھپان لئی
جہاں نے بوئے آگے چک تان لئی

گھر کی چار دیواری میں اس بے چاری کے کان کھڑے ہو جاتے سادہ لوح' معصوم فطرت لڑکی کب تک اس کے قرب سے بچی رہتی! چھوٹے چودھری کا خیال اور اس کا تصور' یوں دھیرے دھیرے غیر محسوس انداز میں اس کے دل و دماغ پر قابض ہوا کہ وہ خود حیران ہو گئی۔ چھوٹے چودھری کو اپنے چلائے ہوئے تیروں کے جواب کا انتظار تو تھا مگر وہ بے صبری اور جلد بازی میں کام خراب کرنے کا قائل بھی نہیں تھا۔ فطرتاً معاملہ فہم اور دور اندیش تھا اور پھر معاملہ اپنے ہی گاؤں کی مٹیار کا تھا۔ اس لیے دیر آید درست آید کے مصداق مطمئن تھا۔ دوسرے اس کی ابھی بہت سی چھٹیاں باقی تھیں۔

وہ تو بے صبر نہ تھا مگر اس کی خوش بختی کو کیا کیا جائے کہ اسے خود بخود قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا۔ اس بار بھی وہ نہر کی پٹڑی پٹڑی دھیمی رفتار سے جا رہا تھا۔ گاڑی کے آگے آگے بھیڑوں کا ایک ریوڑ تھا ہارن پر بھیڑیں بدحواسی سے ادھر ادھر بھاگ رہی تھیں ڈوبتے ہوئے سورج کی نارنجی کرنیں لبالب بہتی نہر کے پانی میں آخری غوطے کھا رہی تھیں۔ فضا شب بسری کو آشیانوں کی طرف محو پرواز پرندوں کی چہکاروں سے گونج رہی تھی یہ سب تھا لیکن چھوٹے چودھری کی توجہ کنارے کے صرف اس حصے پر مرکوز تھی جہاں اس کی چنبیلی کی ڈال ایک ادائے دلبری سے جھکی کھڑا بھر رہی تھی آج صحیح معنوں میں پھولوں سے بھری شاخ اپنے عکس کی بلائیں لے رہی تھی۔ ادھر ادھر کئی عورتیں پانی بھر رہی تھیں وہ کسی چھیڑ چھاڑ سے بھی مجبور تھا۔ دوسری افتاد گاڑی کا گھیراؤ کرنے والا ریوڑ تھا۔ چودھری نے اسے پل پر جالیا۔ لیکن صرف اشارے کنائے تک محدود رہا۔ بات کرنے کا موقع نہیں تھا لیکن حقیقت یہی ہے کہ خدا جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ ابھی وہ اپنی گونگی کارروائی کا آغاز بھی نہیں کر پایا تھا کہ اس سیمیں بدن مہ جبیں کے یاقوتی لب ہلے اور ایک نغمہ بار آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"کل صبح..... میں وہیں ساگ توڑنے جاؤں گی۔"

یہ بظاہر بے ضرر' مبہم' سادہ اور عام سا جملہ بھلا چھوٹے چودھری جیسا گھاگ نہ سمجھ پاتا اسی منزل تک پہنچنے کے لیے تو اس نے اتنے مرحلے طے کیے تھے۔ محنت کی تھی اور آج اس کی کاوش رنگ لائی تھی پیغام غیر متوقع طور پر ملا تھا۔ شوق آوارگی کی تکمیل حسب آرزو گلے ملنے والی تھی پیغام وصول کر کے فاتحانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے وہ تیزی سے گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔

اگلی صبح چھوٹے چودھری کی مرادوں والی صبح تھی زندگی میں پہلی بار بے ڈھگا سا ناشتہ کر کے وہ پیدل ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا پورے چندن پور میں گاڑی اس کی خاص پہچان تھی لیکن وہ آج کسی طرح کا خطرہ مول لینے کے موڈ میں نہ تھا ہاتھ میں ایئر گن لیے وہ بظاہر بٹیوں اور چڑیوں کا شکار کرتا ہوا وہیں پہنچا تو اصلی شکار بے چینی سے اس کا منتظر تھا پانی کی کھائی عبور کرنے سے قبل چھوٹے چودھری نے شکرے کی طرح چوکنا نظروں سے چاروں طرف کا جائزہ لیا پھر نظر بھر کر اس کو جانچا آج وہ پہلے دن والا نیلا سوٹ پہنے ہوئے تھی ہونٹوں کا دنداسا اور قاتل آنکھوں کا کاجل اسے بلا رہا تھا چند قدم بڑھ کر وہ اس کے پاس جا رکا اور ایئر گن زمین پر ٹکا کر ذرا سا جھکا اور اپنے مخصوص انداز میں ایک ہاتھ سے اس کا چہرہ اٹھا کر اپنی جلتی ہوئی نگاہیں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ وہاں خود سپردگی کے سارے رنگ بکھرے ہوئے تھے مشاق مردانہ ہاتھ ٹھوڑی سے اتر کر بازوؤں پر آئے' وہاں سے مختلف منزلوں کا سفر طے کرتے گوری گوری گدرائی ہوئی کلائیوں پر آٹھہرے چھن چھناتی ہوئی کانچ کی چوڑیاں چلائیں' مگر گوشت پوست کی لڑکی خاموش رہی۔ دامن بھرا ہوا تازہ تازہ ساگ سرسوں کے کھیت میں ہی دوبارہ جاگرا اور چھوٹے چودھری نے اسے کلائی پکڑ کر کماد میں گھسیٹ لیا۔ گنے زور زور سے ہلے' آپس میں ٹکرائے اور کچھ جڑ سے اکھڑ گئے۔ چند لمحوں کے لیے ایک بھونچال سا اٹھا' پھر ہر منظر پر سکون ہو گیا۔"

لمحے بیتے' گھڑیاں گزریں' دن پہ دن گزرتے چلے گئے' وقت کا پنچھی اپنے پنجوں میں لمحوں کی ست رنگی ڈور تھامے اڑتا رہا جانوں اور چھوٹے چودھری کا عشق پروان چڑھتا گیا اور چندن پور میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ چھوٹا چودھری کراچی سے گاؤں کے اتنے پھیرے کیوں کرنے لگا ہے کسی کو پتہ نہ چل سکا کہ جانوں پر مہکتی بہاروں اور چٹکتی کلیوں کا گمان کیوں ہونے لگا ہے! اتنی بھرپور بہار گاؤں کی شاید ہی کسی لڑکی پر آئی ہو گی۔

دھیرے دھیرے کئی مہینے گزر گئے چھوٹے چودھری کا ایک پیر کراچی میں تھا تو دوسرا چندن پور میں۔ وہ جب بھی آتا جانوں کے لیے سرسبزیوں اور مدھوشیوں کا پیامبر بن کر آتا اور وہ بھی شاخ گل کی طرح مچل کر اس کے گلے کا یوں ہار بنتی جیسے صدیوں بعد ملی ہو لمحے امر ہو جاتے چھوٹا چودھری خود اپنی وارفتگی اور جانوں سے اس درجہ دلچسپی پر حیران تھا کراچی میں اس کی دوستی ایک سے ایک طرحدار اور تیز طرار لڑکیوں سے رہ چکی تھی مگر وہ چند دن سے زیادہ کسی کی ہمراہی قبول نہ کر سکا تھا وہ اپنی افتاد طبع سے خوب واقف تھا مگر جانوں سے ملنے کے بعد خود کو عجیب طرح مجبور اور بے بس پاتا کراچی آ کر چند دن ہی گزرتے کہ پھر اسی سیم تن کی یاد ستانے لگتی حقیقت یہ تھی کہ جانوں جیسی تر و تازہ اور بھرپور لڑکی سے اس کا

ٹکراؤ پہلی بار ہوا تھا اب تک وہ اس سے شادی کر لینے کا وعدہ بار بار دہرا چکا تھا۔ وہ جب بھی کراچی کی جانوں کی جھولی نت نئے تحائف سے لبریز ہو جاتی اور وہ ہر دفعہ مچل مچل کر کہتی۔

"تم یہ سب چیزیں میرے لیے کیوں اٹھالاتے ہو چودھری..... ابھی سے یہ سب پہن اوڑھ کر میں کیا کروں گی بھلا؟"

"تو پھر کب کرو گی جاناں! جب میں تمہارے پاس نہ ہوں گا' اس وقت!!" جانوں گھبرا کر اس کے ہونٹ پر اپنا ہاتھ رکھ دیتی اور سہم کر کہتی۔

"ایسی بات مت کہو' میں تو اسی ایک دن کے لیے زندہ ہوں جب تم دھوم دھام سے برات لے کر میرے گھر آؤ گے..... تب....." چھوٹا چودھری مونچھوں کے اندر ہی اندر مسکرا پڑتا اور اس چاہ بھری کے ساتھ بات کا رخ موڑ دیتا کہ سادہ دل جانوں کے فرشتوں کو بھی گمان نہ گزرتا یہ ضرور تھا کہ وہ سادہ لوح جانوں کو شادی کے نام پر چکر پہ چکر دیے جا رہا تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ پوری طرح اس کے سحر میں گرفتار بھی ہو چکا تھا۔ جانوں ہر ملاقات پر پہلے سے بھی زیادہ پرکشش اور نئی ثابت ہوتی۔ وہ بار بار سوچتا اب یہ معاملہ ختم کر دینا چاہیے جانوں ایک اہم ترین ضرورت کی طرح اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی چھوٹے چودھری کی شاعرانہ فطرت اور عاشقانہ مزاج اس سے مل کر ایک نئے لطف سے آشنا ہوا تھا۔ اسے بجائے جانوں کے "جاناں" کہہ کر بلاتا تھا۔

کہتے ہیں اعتدال پسندی' دنیا کے ہر کام میں بہتر ہوتی ہے جذبہ کوئی بھی ہو حد سے بڑھا اور بے راہ رو ہوا۔ آتے جاڑوں' جاتی گرمیوں کا موسم تھا۔ ایک دن اچانک بلا علم و اطلاع چھوٹا چودھری چندن پور آ پہنچا۔ یوں تو جب سے جانوں نے دیار دل پر قبضہ جمایا تھا' آئے دن وہ پھیرے لگایا کرتا تھا مگر اس بار خاصی تاخیر سے آیا تھا اس تاخیر نے شوق آوارگی کو خوب ہوا دی تھی اور وہ جانوں سے ملنے کو بے تاب ہوا جا رہا تھا۔ وہ جو رات چھوٹے چودھری اور جانوں کی ملن رات تھی اسی رات چودھرائن کو بھی بڑے چودھری کی یاد نے آستایا صورتحال یہ تھی کہ چھوٹے چودھری کا کمرا دوسری منزل پر تھا۔ اس کمرے میں ایک زینہ دوسری طرف باہر آنے جانے کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا چودھری صاحب حویلی کی کھلی چھت پر گرمی کی رات گزارتے تھے۔ اس رات بھی وہ وہیں سوئے ہوئے تھے جب کہ چودھرائن نیچے آنگن میں سوتی تھیں چھت پر جانے کے لیے جب وہ دوسری منزل کے برآمدے سے گزر رہی تھیں تو معاً زینہ سے ان کے قدم جکڑ لیے۔ گہرے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انھوں نے چاروں طرف دیکھا دھیمی دھیمی سرگوشیاں واضح طور پر چھوٹے چودھری کے کمرے سے آ رہی تھیں۔ ڈرتے ڈرتے انھوں نے

دروازے کی دراڑوں سے جھانکنے کی کوشش کی مگر گھپ تاریکی میں کچھ بھی دکھائی نہ دیا صرف سمجھ میں نہ آنے والی باتیں اور سرگوشیاں تھیں' جو رات کے بوجھل سناٹے میں ابھر رہی تھیں لیکن تاریکی چہرے دیکھنے نہ دے رہی تھی۔ چھوٹے چودھری کی مردانہ آواز تو وہ ہزاروں میں پہچان سکتی تھیں مگر دوسری زنانہ آواز نے ان کے چھکے چھڑا دیے مگر تھیں دانا اور دور اندیش عورت۔ بجائے کواڑ دھڑدھڑانے کے دبے قدموں سیڑھیاں چڑھتی چھت پر جا پہنچیں۔ جاگتے ذہن اور چوکنے انداز میں سونے کے عادی چودھری صاحب اس کی پہلی ہی پکار پر اٹھ بیٹھے۔ مگر بیوی پر نظر پڑتے ہی ان کا منہ بن گیا تلخ لہجے میں غرائے۔

"کیا لینے آئی ہو تم! میں نے بلایا تھا؟" چودھرائن نے موقع کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے بے قابو سانسوں پر قابو پایا اور نہ صرف پورا واقعہ ان کے گوش گزار کر دیا بلکہ ثبوت کے طور پر نیچے چل کر دیکھنے کو کہا۔

ایک ٹانے کو چودھری صاحب کے ماتھے پر شکنیں پڑیں مگر پھر فوراً ہی انھوں نے بیوی کے شانے پر ہاتھ مارا اور خلاف عادت ننھا سا قہقہہ لگا کر بولے۔

"ارے چھوڑ نیک بخت! کس چکر میں پڑ گئی۔ آخر جوان جہان لڑکا ہے عمر کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں بلا بیٹھا ہو گا کسی کرائے کی عورت کو۔"

چودھرائن نے ایک جھرجھری سی لے کر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ مگر چودھری صاحب نے اسے کچھ کہنے کی مہلت ہی نہ دی تحکمانہ لہجے میں بولے۔

"چلو جاؤ۔ سو جا کر اپنی جگہ۔ آدھی رات کو بھی چین نہیں ہے تم عورتوں کو یونہی کن سوئیاں لینے کی عادت ہوتی ہے۔ نیند نہیں آتی تو دو گولیاں کیوں نہیں کھا لیا کرتیں جو میرے پتر نے کراچی سے لا کر دی تھیں۔" وہ اٹھ کر چلیں تو پیچھے سے پھر وارننگ ملی "دیکھو! شیر پتر کی طرف رخ کرنے کی کوشش مت کرنا!!!"

رات کے ان ظالم و جابر لمحات میں تو چودھرائن نے بھی عقل سے کام لیا۔ بیٹے اور "کرائے کی عورت" کو ڈسٹرب کیے بغیر دبے قدموں نیچے اتر گئی مگر اس رات کی صبح سے اس نے ایک ہی رٹ لگائی۔

"بس اب بوٹے کی شادی ہو جانی چاہیے مجھے ایک عدد بہو چاہیے پہلے پہل تو بڑے چودھری نے کان ہی نہ دھرا اور جب ذرا توجہ دی تو یہ کہہ کر ٹال دیا "ابھی اس کے کھانے گھومنے کے دن ہیں۔ ابھی سے کیوں آزاد پنچھی پر جال ڈالتی ہو۔ شکل کی ہو نہ ڈھنگ کی لیکن بات تو ڈھنگ کی کر لیا کر نیک بخت۔" مگر

نیک بخت بھی پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ چکی تھی۔ وہ زندگی کے اس موڑ پر تھی جہاں پہنچ کر ہر عورت پوتے پوتیوں کو کھلانے کے خواب دیکھنے لگتی ہے اور اب تو اسے ایک دو سرا ہی دھڑکا لگ گیا بیٹا بازاری اور کرائے کی عورتوں سے جی بہلانے لگا تھا دھیرے دھیرے بالکل ہی ہاتھ سے نکل گیا تو پوتے پوتیاں کہاں سے ملتیں کہیں ایسی ہی عورتوں کا عادی ہو کر شادی سے انکار نہ کر بیٹھے!! عورت کرنے پر آجائے تو دنیا میں کیا نہیں کر سکتی! چنانچہ شوہر کے کان میں بھی اس نے یہی فسوں پھونکا یہ نکتہ ان کی سمجھ میں آیا اور سارے کھیل ڈرامے تو چلتے ہی رہتے ہیں' اگر اب وہ اس عمر میں اپنے اس شیر پتر کے پتر نہ دیکھ سکے تو پھر زندگی کا فائدہ ہی کیا تھا یہ ایک بات عقل میں بیٹھنی تھی کہ بڑے چودھری نے تہلکہ مچاؤالا ذہنی رو بھک چکی تھی اور بوڑھے ذہن میں یہی ایک سوال سر جوڑ کر بول رہا تھا کہ وہ اب تک اس نظریے سے سوچ کیوں نہ سکے! شیر پتر کہیں بھی رہے ہو تو گھر میں رہتی تھی! آخر جب بھی وہ کراچی سے گھر آتا ہے تو وہ دوسری عورتیں ہی بلائے گا جب اپنی بیوی نہ ہوگی!! اوئے ربا! اب تک تو میں کتنے ہی پوتوں کا دادا بن چکا ہوتا۔ فٹے منہ میرا بھی۔۔۔

جو خیال بڑے چودھری کو سوجھ جائے بھلا اس پر عمل نہ ہو۔۔۔۔؟

پندرہ دن کے اندر اندر چھوٹے چودھری کے قریبی گاؤں میں نسبت ٹھہر گئی معاملہ چودھری صاحب کے اکلوتے بیٹے کا تھا منگنی خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ پورے چندن پور میں خوشی کی لہر دوڑ گئی منگنی کے فوراً بعد ہی چودھری صاحب نے اپنے فلک شگاف قہقہوں کے شور میں اصرار کر کے لڑکی والوں سے شادی کی تاریخ بھی مانگ لی یوں چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق چھوٹے چودھری کی شادی کا دن مقرر ہو گیا اور وہ خود ایک لفظ بھی منہ سے نہ بول سکا نہ ہی اس نے بولنے کی ضرورت محسوس کی۔ بہرحال وہ معاشرے کے اس طبقے کا فرد تھا جن کے مستقبل کا فیصلہ جائدادوں اور جاگیروں کو بیچ میں رکھ کر کیا جاتا ہے جن کی شادیاں لڑکیوں سے نہیں بلکہ دھن دولت اور زمینوں سے ہوتی ہے' خواہ بے جوڑ ہی کیوں نہ ہوں!

جانوں یہ جو بیت رہی تھی وہ اسے معلوم تھا یا اس کے رب کو اس کا ہر آتا جاتا سانس تیز دھار تلوار بن چکا تھا۔ ایک آری تھی جو مسلسل اس کے حلقوم پر چل رہی تھی۔ چند دنوں کے اندر اندر اس کا رنگ پیلی سرسوں کے مثل ہو گیا تھا اس نے صحیح معنوں میں چھوٹے چودھری کو اپنے تن من کا امین سمجھ لیا تھا آنکھیں بند کر کے اس پر ایمان لائی تھی اور سچی نیت سے اس کا کلمہ پڑھا تھا اپنی نادانی سے اس کی شادی کر لینے کے وعدوں کو سچ جانا تھا اور اب یہ حال تھا کہ وہ کسی کو راز داں بھی نہ بنا سکتی تھی پھر اپنا دکھ کسے

چھوٹے چودھری کا رویہ حیرت انگیز طور پر تبدیل ہو چکا تھا۔ بے شک وہ جانوں کا بری طرح اسیر ہو گیا
ں حد تک کہ شہر کی لڑکیاں بے ڈھب لگنے لگی تھیں لیکن اب معاملہ دوسری شکل اختیار کر گیا تھا۔
ین نازک تھی اور حالات ناگفتہ بہ چنانچہ اس نے سنجیدگی کے ساتھ جانوں سے پیچھا چھڑانے کا
یہ بنالیا۔ شادی تو ظاہر ہے وہ اس سے کسی صورت کر ہی نہیں سکتا تھا مگر اس سکی فطرت سے بھی
ی طرح آگاہ تھا۔ جانتا تھا کہ وہ بہت جذباتی اور کھری قسم کی نیار ہے عین وقت پر اگر کچھ کر بیٹھی تو
ی عزت خاک میں مل جاتی اور معلوم نہیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا چنانچہ اس نے وقتی طور پر جانوں
ہلانے پھسلاتے کا فیصلہ کیا۔

فیصلہ کرنے کو تو چھوٹے چودھری نے کر لیا تھا لیکن جانوں سے سامنا کرتے ہوئے قدرے جھجک غالب
تی تھی کئی روز سوچنے ہی میں بیت گئے برات کو صرف دو دن رہ گئے تھے کہ ٹھیک دوپہر کے وقت نہر کے
رے ایک پیڑ کے نیچے اسے جانوں نظر آگئی صبح جب وہ شہر گیا تھا شاید جانوں اسی وقت سے اس کا
نتظار کر رہی تھی عالبا وہ بھی کوئی اہم فیصلہ کر چکی تھی۔ چپ چاپ گاڑی میں آبیٹھی چھوٹے چودھری نے
ں موقع غنیمت جانا اور بغیر منہ سے ایک لفظ نکالے گاڑی کا رخ شہر کی طرف دوبارہ موڑ دیا۔

شہر کے ایک پارک میں بیٹھ کر اس نے دیر تک جانوں کو اپنی بے گناہی کا یقین دلایا اسے بتایا کہ اس کی
ادی زبردستی کی جا رہی ہے اور زندگی کے اس اہم ترین معاملے میں اس کی مرضی اور رائے کا کوئی دخل
یں۔۔۔۔ ورنہ وہ جانوں کے علاوہ ہرگز ہرگز کسی اور سے شادی نہیں کرتا۔ اب چونکہ وہ بے بس اور
اچار ہو چکا ہے اس لیے بحالت مجبوری یہ شادی تو ضرور ہی کرنی پڑے گی کیونکہ سوائے اس کے کچھ چارا
ی نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے وہ اپنی ہونے والی بیوی کو جاناں سمجھ کر ہی قبول کرے گا۔ شادی بے
ک ہو جائے گی مگر اس کے دل و دماغ میں جانوں کا ہی قبضہ رہے گا۔ ہماری روحوں کو خدا نے ایک
کر دیا۔ شادی کے بعد بھی ملاقات کا سلسلہ برقرار رہے گا۔

ہمیں دنیا کا کوئی قانون علیحدہ نہیں کر سکتا۔ وغیرہ وغیرہ نیز یہ کہ جانوں کی سچی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ
اپنے محبوب کو تہہ دل سے معاف کر دے اور معاوضے میں کچھ نہ مانگے کیونکہ محبت صلہ نہیں چاہتی۔ وہ
نیاوی تقاضوں سے بے نیاز ہوتی ہے۔

جانوں نے گاڑی سے اترنے اور پارک میں بیٹھنے تک اتنے بے شمار آنسو بہا ڈالے تھے کہ اس کے
پٹے تک سوج گئے تھے۔ دنیا اس کی نظروں میں اندھیر ہو رہی تھی لیکن چھوٹے چودھری کی تقریر سنتے
سنتے اچانک ہی اس کے اشک رواں کا سیلاب رک گیا۔ اس کی ساری فریادیں' التجائیں اور دہائیاں دم

سادھ گئیں۔ چھوٹے چودھری کا محتاط رویہ اور چالبازی اس پر کھلنے لگی تھی وہی محبوب جو گزری ملاقاتوں میں اس کے حسن معصوم اور بے ریا اداؤں کی تعریف کرتے نہ تھکتا تھا' آج جب کہ وہ اس کے کرتوتوں سے جل کر خاک ہو چکی تھی اور رنگ توری کا پھول ہو رہا تھا۔ تو اس کی تسلی کو ایک جملہ بھی نہ کہہ رہا تھا سچ ہے قصیدہ گو تو بہت ہوتے ہیں مگر نوحہ وہی کہتا ہے جس کے دل میں سچا درد ہوتا ہے اپنی دانست میں جانوں کو ایک آخری فریب دے کر اور خوب سمجھا بجھا کر وہ دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا جانوں کے ہونٹوں پر چپ کے قفل لگے تھے۔ ایک جامد چپ نے اس کی پوری ذات کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔

گاڑی بھری پری شاہراہوں سے نکل کر چندن پور کی طرف جانے والی سڑک پو پوری اسپیڈ سے چل رہی تھی دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ گزشتہ واقعات جانوں کے ذہن میں فلم کی طرح چل رہے تھے۔ اب اسے چنبیلی کی ڈال کون کے گا کون کہے گا....؟ ایک بڑا سا سوالیہ نشان اس کی سوچوں کو گڑبڑ کرنے لگا دل و دماغ سے دھواں سا اٹھنے لگا حسد اور رقابت کا جذبہ انتقام کے جذبے سے ٹکرایا تو ساری سوچیں دھماکے سے اڑ گئیں اس نے چنگاریاں اڑاتی ہوئی نگاہیں اٹھا کر اگلی سیٹ پر دیکھا چھوٹا چودھری سنجیدگی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ دور سڑک پر جہاں روڈ ایک خوبصورت سی گولائی میں گھوم گئی تھی۔ بھاری بھرکم' گنے سے لدے پھندے ٹرک منوں بوجھ لیے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ سڑک کے اطراف ویرانیاں ڈیرا جمائے تھیں درخت چپ' فضائیں خاموش تھیں۔ ہر سو بکھری دھوپ رخت سفر یا وہ رہی تھی چندن پور ہر آن قریب آتا جا رہا تھا اور گولائی سے گھوم کر آنے والے گنے کے تینوں ٹرک قریب تر۔۔۔ فاصلے سمٹ رہے تھے ابھی کوئی دم جاتا تھا کہ چھوٹے چودھری کی گاڑی زناٹے سے ٹرکوں کے قریب سے گزر جاتی اور پھر اسے نہر کی پڑی پڑی کسی سنسان مقام پر اتار کر وہ ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو جاتا' اور پھر سب کچھ آناً فاناً ہو گیا۔۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا چودھری گیئر ہی بدلتا رہ گیا پھیلی ہوئی پر رہ رہ کر بل کھانے والی "چنبیلی کی ڈال" نے ایک زور کا جھکولا کھایا دو سنولائی ہوئی بانہیں آگے بڑھیں بانہوں کا ہار چھوٹے چودھری کے گرد ڈال کر اس نے اپنی دونوں ہتھیلیاں مضبوطی کے ساتھ اس کی آنکھوں پر رکھ دیں پل کے پل میں وہ حواس باختہ ہو گیا اس نے غیر ارادی طور پر اسٹیئرنگ چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں کھولنی چاہیں۔ بھاری بھرکم ٹرک جو دور سے ہی ہیڈ لائٹس آن کیے آ رہا تھا ایک دھماکے کے ساتھ بے قابو ہوتی ہوئی کار سے ٹکرایا۔

سڑک پر چھوٹے چودھری کی گاڑی کئی فٹ اچھلی۔۔۔۔ پھر تیزی کے ساتھ لڑھکنیاں کھاتی ہوئی نشیب میں گرتی چلی گئی۔

✿✿

بتائیے میں کیا کروں

قارئین

نصرت جہاں۔۔۔ راولپنڈی

جانی! اپنا ایک مسئلہ لکھ رہی ہوں۔ خدا کے واسطے ضرور حل کر دیجیے گا۔ میں اس سلسلے میں بہت پریشان ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں ایک صاحب کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہوں۔ آپ مجھے غلط نہ سمجھیے گا۔ میں بڑی ریزرو قسم کی لڑکی تھی مگر ہوا یوں کہ ہمارے محلے میں ایک نئی فیملی آ کر رہنے لگی۔ ابھی انہیں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ وہ فیملی پورے محلے میں مشہور ہو گئی۔ وجہ یہ تھی کہ رزاق صاحب کی بیگم بہت لڑاکا ہیں۔ ان کا ایک بچہ بھی ہے۔ روز روز جھگڑنے کی وجہ ان کی بیوی کی کوئی کنڑول بھی ہے۔ وہ بے حد شکی اور تیز مزاج ہیں جبکہ ان کے شوہر بڑے سیدھے سادے اور معصوم سے ہیں۔ وہ خاتون ویسے تو محلے بھر سے بہت اچھی طرح ملتی ہیں مگر شوہر کے گھر آتے ہی ہنگامہ! ہو جاتا ہے۔ رزاق صاحب ایک پرائیویٹ فرم میں منیجر ہیں' گھر انہوں نے خریدا ہے اور کار بھی ہے' گھر میں ضرورت کی ہر چیز ہے مگر نہ معلوم پھر بھی ان کی بیوی ان سے کیوں شاکی رہتی ہیں۔ بہرحال ہمارا ان کے گھر آنا جانا ہو گیا تھا ہی۔ اکثر ہم نے بیچ بچاؤ بھی کرایا تھا۔ میں نے ہمیشہ رزاق صاحب کو خاموش اور ان کی بیوی کو بولتے پایا تھا اس لیے مجھے رزاق صاحب سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ یہی ہمدردی دھیرے دھیرے پیار میں بدل گئی اور جب ایک روز رزاق صاحب نے روتے ہوئے بتایا کہ وہ دنیا میں تنہا ہیں اور بیوی اتنی بری ملی ہے کہ لمحہ بھر بھی سکون کا سانس نہیں لے پاتے تو یہی شکوہ پیار کے اظہار کا ذریعہ بن گیا۔ انہوں نے بڑی حسرت سے کہا تھا کہ کاش میں کبھی سکون کا سانس لے سکوں۔ بس یہی جملہ میرے دماغ میں بیٹھ گیا۔ میں خود بھی نہیں جانتی کہ یہ سب کیسے ہو گیا مگر بس ہو گیا۔ اب یہ حالت ہے کہ ایک دن بھی ان کو دیکھے بنا چین نہیں آتا۔ جی چاہتا ہے کہ انہیں دنیا جہان کا سکھ دے دوں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ وہ بچے کی وجہ سے طلاق دینے کو تیار نہیں ہیں اور بیوی اتنی خونخوار ہیں کہ اگر انہیں شبہ بھی ہو گیا تو قیامت آجائے گی۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم چپ کر شادی کر لیتے ہیں مگر میں اپنے گھر والوں سے چھپ کر کچھ نہیں کرنا چاہتی حالانکہ میں جانتی ہوں کہ امی ابو دونوں ہی انہیں پسند کرتے ہیں اور اکثر ان کی بدقسمتی پر افسوس کرتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اگر انہیں بتا دیا جائے تو وہ راضی ہو جائیں گے مگر پھر ان کی بیوی والا معاملہ مسئلہ بن جائے گا کیونکہ امی کبھی بھی نہیں چاہیں گی کہ میں ان کی دوسری بیوی بنوں۔ وہ زور دیتے ہیں کہ میں ان کی بات مان لوں۔ بتائیے میں کیا کروں؟

بی بی نصرت! ہمارے خیال میں تو آپ ان کا خیال دل سے نکال دیں۔ وہ آپ کی قسمت میں نہیں تھے ورنہ آپ ہی ان کی پہلی بیوی ہوتیں۔ دوسری بات یہ کہ آپ نے لکھا ہے ان کی بیوی باقی سب سے اچھی طرح ملتی ہیں یعنی بددماغ نہیں ہیں پھر شوہر ہی سے جھگڑنے کی وجہ کیا ہے۔ آپ نے اس وجہ پر روشنی نہیں ڈالی۔ ہمارے خیال میں آپ جھگڑوں کی وجوہ پر غور کریں۔ ممکن ہے ان کی بیوی حق بجانب ہوں۔ معصوم شکلیں اکثر دھوکا دیتی ہیں۔ بغیر سوچے سمجھے کوئی قدم نہ اٹھائیے گا ورنہ آپ کی زندگی جہنم بن سکتی ہے۔ ان کی بیوی کو آپ طلاق دلوانے کی کوشش نہ کریں اگر وہ آپ کو چاہتے ہوں گے یا بقول ان کے وہ جہنم میں زندگی گزار رہے ہوں گے تو خود ہی کوئی فیصلہ کریں گے۔ ورنہ پچھتاوے زندگی بھر آپ کو پریشان رکھیں گے۔ بیوی کے جھگڑے وقت ان کی خاموشی معنی خیز بھی ہو سکتی ہے۔ مراد کوئی غلط کام نہیں کرتا تو بیوی کی اتنی باتیں بھی نہیں سنتا۔ بہرحال آپ سمجھ دار ہیں ہمارے خیال میں تو دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ آپ اچھی طرح دیکھ بھال کر لیں۔

✿

شاہدہ رضوی۔۔۔ کراچی۔

باجی! میری منگنی بچپن میں میرے خالہ زاد سے ہوگئی تھی۔ یہ بات مجھے کافی پہلے ہی معلوم تھی مگر میں نے کبھی اپنے دل میں ان کے لیے ایسا کوئی جذبہ محسوس نہیں کیا تھا۔ نہ ہی ان کی کسی بات یا رویے سے ایسی کوئی بات محسوس کی تھی کہ وہ مجھے بہت زیادہ چاہتے ہیں یا میری محبت میں گرفتار ہیں۔ ہم ہمیشہ نارمل انداز میں ملتے رہے پھر میری خالہ لاہور شفٹ ہوگئیں۔ برسوں ان سے ملاقات نہ ہوئی۔ میں یونیورسٹی میں پہنچی تو وہاں ایک لڑکے نے میرے دل پر قبضہ جمالیا۔ میں بے اختیار اس کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ اب وہ لڑکا مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ہمارے گھر پیام بھجوا تو امی ابو نے صاف انکار کردیا کہ بیٹی کی منگنی ہو چکی ہے۔ وہ اور میں دونوں ہی پریشان ہوگئے۔ میں نے اس سے چھپ کر اپنے منگیتر کو خط بھی لکھا کہ میں کسی اور سے پیار کرتی ہوں اور شادی کرنا چاہتی ہوں مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ خط اسے ملا تھا اس کی تصدیق میں اپنی خالہ زاد بہن سے کروا چکی ہوں۔ میں نے بار بار اسے خط لکھے مگر اس نے کسی ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ تنگ آکر میں نے امی سے کہہ دیا کہ میں صرف "ر" سے شادی کروں گی ورنہ زندگی بھر شادی نہیں کروں گی مگر امی نے چیخ چلا کر بات ختم کردی اور اب یعنی ان واقعات کے سال بھر بعد میری شادی کی تیاریاں شروع ہوگئی ہیں، میرے دن اور رات کی نیندیں حرام ہو چکی ہیں۔ میں اب بھی اپنے اسی عہد پر قائم ہوں۔ وہ لڑکا اب بھی میرے لیے کنوارا بیٹھا ہے اور یہ لوگ زبردستی میری شادی وہاں کررہے ہیں جہاں میں نہیں چاہتی۔ اب تو مجھے اپنے منگیتر کی خاموشی سے بھی ڈر لگنے لگا ہے کہ جانے وہ اب میرے ساتھ کیا کرے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ امی ابو کو ہر طرح سے سمجھا کر اور دھمکیاں دے کر تھک چکی ہوں۔ خدا کے لیے آپ بتائیے کہ میں کیا کروں۔"

شاہدہ بی بی! افسوس تو ہمیں اس بات کا ہے کہ والدین اس زمانے میں بھی اپنی اولاد کی بات کو اہمیت نہیں دیتے جبکہ ہمارے مذہب میں تو چودہ سو سال پہلے بھی شادی کے معاملے میں اولاد کی مرضی ہی جانی جاتی تھی اور یہ ان کی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔ ہمارے خیال میں تو آپ کے والدین بے جا ضد کررہے ہیں۔ آپ اپنا حق استعمال کرسکتی ہیں۔ انہیں صاف طور پر کہہ دیں کہ آپ اس شادی پر راضی نہیں اور نتائج کی ذمے دار آپ نہیں ہوں گی۔ آپ بالغ ہیں اور آپ کے والدین کو کوئی حق نہیں کہ وہ آپ کی زندگی کا فیصلہ اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے غلط کردیں۔ آپ کے خاموشی پر اسرار ہے، ہمارے خیال میں آپ کو کسی بھی حال میں یہاں شادی نہیں کرنا چاہیے ورنہ زندگی بھر پچھتاتی رہیں گی۔ ہمارا یہ جواب اپنے والدین کو بھی دکھا دیجئے گا اور کہہ دیجئے گا کہ اسلام میں لڑکی اور لڑکے دونوں کی مرضی کو اہمیت حاصل ہے۔ انہیں اپنی بیٹی کے لیے کسی بھی غلط فیصلے کا حق حاصل نہیں۔

*

تصور خانم۔۔۔ لاہور۔

"باجی! میرے تین بچے ہیں۔ بڑا بیٹا ہے اور اس سے چھوٹی دو بیٹیاں ہیں۔ بڑے بیٹے کی عمر اٹھارہ بارہ برس ہے۔ میں اس کی وجہ سے بے حد پریشان ہوں۔ وہ بچپن ہی سے بڑا سہما سہما سا رہتا تھا۔ بات کرتے وقت ہکلا تا تھا۔ کسی کے سامنے آنے سے کتراتا تھا۔ شروع میں تو ہم نے اس بات کو اس کی شرم اور جھجک پر محمول کیا مگر ہوں ہوں کرتے وہ بڑا ہوتا جارہا ہے یہ بات ایک مسئلہ بنتی جارہی ہے۔ ویسے وہ بچہ بالکل ٹھیک ہے۔ اکیلے میں مجھ سے بہت باتیں کرتا ہے۔ اپنی بہنوں سے بھی باتیں کرلیتا ہے مگر اپنے ابو کے دوسرے لوگوں کے سامنے اس کی زبان ہکلانے لگتی ہے۔ اسکول میں بھی بہت پریشان کرتا ہے۔ تمام ٹیچرز شکایت کرتی ہیں۔ رپورٹ بھی بہت خراب آتی ہے۔ اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔ نہ ہی محلے میں کسی سے ملتا ہے نہ گھر سے باہر کھیلنے کے لیے جاتا ہے۔ میں اب اس کی طرف سے بے حد پریشان ہوں۔ میرا یہ مسئلہ حل کردیں میں آپ کو بہت دعائیں دوں گی۔"

تصور خانم صاحبہ! یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس دور میں جب تعلیم عام ہو چکی ہے ہمارے یہاں کی عورتیں اس بنیادی تعلیم کو اہمیت نہیں دیتیں جو انہیں اچھی ماں بھی بنانے میں معاون ہو۔ بی بی! آپ کے بچے میں خود اعتمادی آنا چاہیے تھی وہ نہیں آسکی وجہ اس کی بھی ہو سکتی ہے کہ اسے پہنچے نہیں دیا گیا۔ آپ نے ذکر کیا ہے کہ

اپنے ابو کے سامنے بھی ہکلانے لگتا ہے گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی ذہنی کجی کی وجہ "آپ کے شوہر کا اپنے بچے کے ساتھ رویہ ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ ان کا رویہ کیا رہا مگر ہمارا خیال ہے کہ زیادہ روک ٹوک، لوگوں کے سامنے ڈانٹنا" اسے بات نہ کرنے دینا ہی اس کی وجہ ہے۔ طرح بچے کے جسم کو بڑا ہونے کے لیے زیادہ غذا اور کھیل کود کی ضرورت ہوتی ہے اس طرح اس کے بڑا ہونے کے لیے بھی کچھ باتوں اور رویوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک معمولی مثال دے رہے ہیں کہ کسی بچے کو تنگ جوتا مستقل پہنایا جاتا رہے تو اس کا پاؤں چھوٹا رہ جاتا ہے اسی طرح بات بات پر ٹوکنا، اسے کھل کر بولنے نہ دینا۔ اس کے کسی سوال کے جواب میں توجہ نہ دینا اس کی ذہن کو محدود کردیتا ہے۔ بچہ اچھا اور برا سوال کرسکتا ہے" اسے معلوم نہیں ہو تا کہ ایسا پوچھنا یا کہنا برا ہے یا اچھا۔ یہ جواب دینے والے پر منحصر ہے کہ وہ پیار سے سمجھائے کہ ایسا کرنا برا ہے یا اچھا" نہ کہ ڈانٹ کر سوال کو اسی کے اندر گھونٹ دینا۔ آپ ذرا سی توجہ دیں تو آپ کی سمجھ میں بھی آجائے گا کہ بچے کی اس کمزوری کی وجہ کیا ہے۔ اس عمر میں اس کا اعتماد بحال کرنا بہت ضرور ہے مگر ناممکن نہیں اور یہ کوشش آپ کو اور ان سب کو درمیان بیٹھ کر باتیں نہیں کرتی جبکہ ہم بہن بھائی اور امی ابو سب رات کو بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرتے ہیں۔ لڑکی خاندان کی ہے اس لیے طلاق بھی نہیں دلوانا چاہتے۔ اب تو جانے اس کے گھر والوں سے کیا کہہ دیا ہے کہ وہ لوگ بھی اچھی طرح نہیں ملتے۔ خیر ہمیں اور کسی کی پروا نہیں، ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بھیا خوش رہیں۔ ہمیں کوئی ایسا وظیفہ لکھ دیں جس سے وہ بھیا کا خیال رکھنے لگے اور ہنسی خوشی رہنے لگے۔"

ناظم احمد۔۔۔ فاضوا احمد نوابشاہ

باجی! میرے بھیا سخت پریشان ہیں۔ آپ کے رسالے میں بتایئے میں کیا کروں پڑھا تو قریباً چاہا کہ اپنا مسئلہ آپ کو لکھ کر دیکھوں شاید ہمیں اس پریشانی سے نجات مل جائے۔ بات یہ ہے کہ ہم تین بہنیں ہیں اور ایک بھائی۔ بھائی سب سے بڑے ہیں۔ پڑھے لکھے ہیں اور اپنا چھوٹا موٹا کاروبار کرتے ہیں۔ وہ سب کے لاڈلے ہیں۔ ہم بہنیں ان کے لیے جان دینے کو تیار رہتی ہیں۔ امی ابو انہیں دیکھے بنا جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ ہم نے اپنے بھائی کی شادی بڑے چاؤ سے کی تھی۔ لڑکی خاندان کی ہی ہے اور بھیا کو پسند بھی تھی۔ بے حد خوبصورت اور پیاری ہے مگر ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وہ فطرت کی کیسی ہے۔ یہ اب بھیا کی شادی کے سال بھر بعد کھلا۔ وہ بھیا کا ذرا سا بھی خیال نہیں رکھتی۔ ہم لوگوں سے بہت جلتی ہے۔ جب شام کو بھیا آتے ہیں تو پہلے ہم لوگوں کے پاس آتے ہیں، ہم رہتے تو ایک ہی گھر میں ہیں مگر بھائی کا کمرا دوسری طرف ہے۔ یعنی گھر میں داخل ہوتے ہی پہلے امی ابو کا کمرا آتا ہے پھر ہم بہنوں کا اور آخر میں بھائی کا۔ امی ابو دروازے پر آنکھیں جمائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ہم بہنیں ان کی پسندیدہ چیزیں بنا کر ان کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں مگر بھائی اپنے کمرے میں بند ہوتے ہیں۔ ہم سے مل کر بھیا جب اپنے کمرے میں جاتے ہیں تو بیوی کا موڈ خراب ہوتا ہے۔ انہیں زبردستی کمرے سے باہر لاتے ہیں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ نواب زادی غصے میں ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ بھیا ہم سے بات بھی نہ کریں۔ امی ابو کے پاس بھی نہ جائیں بلکہ گھر میں داخل ہوتے ہی پہلے اسے روبرو حاضری دیں۔ بھیا ہم سب سے بے انتہا پیار کرتے ہیں۔ وہ ایسا کسی حال میں بھی نہیں کرسکتے اور اس بات نے ان کی زندگی اجیرن کردی ہے۔ وہ بھی ان کی کوئی پسندیدہ چیزیں نہیں پکاتیں۔ کبھی خوشی ہو کر نہیں ملتیں۔ کبھی ہم سب کے درمیان بیٹھ کر باتیں نہیں کرتیں جبکہ ہم بہن بھائی اور امی ابو سب رات کو بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرتے ہیں۔ لڑکی خاندان کی ہے اس لیے طلاق بھی نہیں دلوانا چاہتے۔ اب تو جانے اس کے گھر والوں سے کیا کہہ دیا ہے کہ وہ لوگ بھی اچھی طرح نہیں ملتے۔ خیر ہمیں اور کسی کی پروا نہیں، ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بھیا خوش رہیں۔ ہمیں کوئی ایسا وظیفہ لکھ دیں جس سے وہ بھیا کا خیال رکھنے لگے اور ہنسی خوشی رہنے لگے۔"

بی بی کلثوم! آپ ناراض نہ ہو جایئے گا کیوں کہ اس سارے معاملے میں قصور آپ کی بھائی کا نہیں بلکہ آپ سب کا ہے۔ آپ نے جب ان کی شادی کردی تو ان کے کام ان کی بیوی کو کرنے دیں۔ بھیا کی پسندیدہ چیزیں آپ لوگ پکا لیتے ہیں، ان کے گیزوں جو تو کا خیال آپ لوگوں کو رہتا ہے۔ آفس سے واپس آتے ہی آپ انہیں گھیر لیتے ہیں پھر وہ بے چاری کرے کیا۔ اس کا موڈ خراب ہونا فطری سی بات ہے۔ وہ جو شخص سن، ان کا انتظار کررہی ہوتی ہے

اے آپ لوگ رات کو چھوڑتے ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ یہ سب آپ اپنے بھیا کی محبت میں کرتے ہیں مگر جس لڑکی کو ان کی بیوی بنا کر لایا گیا ہے اس کا بھی تو آپ کے بھیا پر حق ہے۔ وہ اگر آپ لوگوں کے رویوں ان سے نہیں ملنا چاہتی تو اس میں برا ماننے کی بات نہیں ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ آپ کے بھیا آپ سے سلام لے کر اور امی ابو کو سلام کر کے سیدھے اپنے کمرے میں جائیں۔ انہیں کچھ دیر آرام کرنا چاہئے اس لئے آپ لوگ کچھ انتظار کریں پھر وہ دونوں میاں بیوی آپ لوگوں کے پاس آئیں اب اگر رات گئے تک باتیں کرتے رہیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ آپ کے بھیا یقیناً آپ لوگوں کی وجہ سے خاموش ہیں۔ ان کے صبر کو اس حد تک نہ لے جائیں جہاں وہ پھٹ پڑیں۔ یاد رکھیے کہ اب ان پر ان کی بیوی کا زیادہ حق ہے۔ بھیا کی پسندیدہ چیزیں آپ نہ پکائیں بلکہ ان کی بیوی کو پکانے دیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ آپ ان کی بیوی کو کچھ موقع تو دیں۔ سبھی کچھ تو آپ لوگ کر لیتے ہیں پھر بھلا وہ کیا خیال رکھیں۔ ابھی شاید یہ باتیں آپ کی سمجھ میں نہ آئیں مگر جب آپ بیاہ کر اپنے سسرال جائیں گی تو آپ کو پتا چلے گا کہ ہم ٹھیک کہتے تھے یا غلط۔ ایک کوشش کر کے دیکھیں امید ہے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

بانو۔۔۔ اسلام آباد۔

باجی! میرا خط ملتے ہی جواب دیجئے گا اس لیے کہ میں بے حد پریشان ہوں۔ میرے بال روز بروز گرتے جا رہے ہیں۔ کنگھا کروں تو پوری پوری لٹیں ہاتھ میں آجاتی ہیں اگر یہی حال رہا تو میں بہت جلدی گنجی ہو جاؤں گی۔ پلیز میرے لئے کچھ کیجئے ورنہ میں تو خوف ہی سے مر جاؤں گی۔

بانو! آپ فوری طور پر بیٹھئے۔ تملہ اور سیکا کائی لے کر رات بھر بھگو دیں۔ صبح تک وہ پھول جائیں گے۔ انہیں اچھی طرح ہاتھ سے مل کر باریک کر لیں۔ اس کے پانی کو بالوں کی جڑوں میں اچھی طرح ملیں۔ تقریباً گھنٹا بھر لگا رہنے دیں پھر سادے پانی سے سر دھو لیں۔ یہ عمل جاری رکھیں شیمپو کا استعمال ترک کر دیں۔ بالوں کو اچھی طرح دھونے کے بعد باقی بھرپانی میں تھوڑا سا سرکہ اور لیموں نچوڑ لیں۔ آخر میں اس پانی سے بالوں کو نہ نچارس۔ کنگھا پلاسٹ کا قطعی نہ استعمال کریں بلکہ لکڑی یا لوہے کی کنگھی یا برش استعمال کریں۔ ہفتے میں ایک مرتبہ کلونجی (پیاز ہوتی) بالوں بھرپانی میں گھول کر بالوں کو نہلائیں۔ یہ عمل آپ کو مشکل مزاجی سے کرنا پڑے گا۔ دو ہفتے میں ہی آپ دیکھیں گی کہ حیرت انگیز نتائج نکلنا شروع ہو جائیں گے۔

فارینہ سعید، کلثوم جہاں، فاخرہ بیگم، سعیدہ فاروق، صدف عتیق، اور حمیرا بانو۔ آپ سب کا ایک ہی مسئلہ ہے۔ آپ کو کسی ماہر امراض نسواں سے رجوع کرنا چاہیے۔ یہ سارے مسئلے باہواری میں بے قاعدگی سے ہوتے ہیں۔ لیڈی ڈاکٹر اس سلسلے میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں گی۔ چہرے پر بال، اگ آنا، چہرے پر دانے کمر کا شدید درد، مٹھنوں اور پنڈلیوں میں درد یہ سب اندرونی خرابی کے سبب ہیں، ان کا مکمل علاج بھی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں تاخیر نقصان دہ ہو سکتی ہے آپ سب پہلی فرصت میں ڈاکٹر سے رجوع کریں۔

*

نورین اقبال۔۔۔ نوشہرہ۔

بی بی! آپ سبزیوں اور پھلوں کا استعمال بڑھا دیں، گوشت یا تیز مسالے دار چیزوں سے پرہیز کریں۔ چہرے اور ہاتھ پیروں کی صفائی کا خاص خیال رکھیں۔ کولڈ کریم جو آپ کی جلد کو موافق ہو استعمال کریں۔ تولیہ اور صابن الگ کر لیں۔ چہرے کو ایک بار دن میں ضرور دھوئیں۔ تھوڑے سے چاولوں کو رات کو دودھ میں ملا کر پیس لیں اور اس کا لیپ کھنچے بھر تک چہرے پر لگا رہنے دیں پھر سادے پانی سے منہ دھو لیں۔ بہت جلد آپ کی جلد نرم و ملائم ہو جائے گی اور داغ دھبے دور ہو جائیں گے۔ ہفتے میں ایک مرتبہ تھوڑا سا خالص سرکہ ہم وزن خالص پانی میں ملا کر روئی کے ذریعے چہرے پر لگائیں کہنیوں اور دانوں کو ہاتھ سے قطعی نہ چھیڑیں اگر ان چیزوں سے فائدہ نہ ہو تو پھر جلد کے کسی ماہر ڈاکٹر سے مشورہ کریں۔

طیبہ خاتون، جہاں افروز بیگم، حمیدہ حنا، انعمہ خاتون، فیصل ہمایوں، سہیل اختر، عزیز احمد، نور بانو، صالحہ خاتون، سلمہ بی بی اور سیدہ خاتون۔ آپ سب مایوسی کی کیا بات ہے اس مسئلہ یہ ہے کہ آپ ایک خط لکھیں۔ وہ خط ملاحظہ فرما کر بتاتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ سب کے مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔ آپ لوگ خط تفصیل سے...

......*...*

تکلف برطرف

قارئین کے مسکراتے سوالوں کے کھلکھلاتے جواب

شہباز مرزا کے قلم کی بیباکیاں

پشاور۔۔۔

دکھ اور پچھتاوے میں کیا فرق ہے؟

دکھ کا علاج ہو سکتا ہے، پچھتاوے کا نہیں۔

ایک خاتون رو رو کر بتا رہے تھے کہ رہی تھی "ہائے ظالم سے شادی کر کے میرا تو نصیب ہی پھوٹ گیا۔ تباہ و برباد ہو گئی میں تو تم سے شادی کر کے۔ کاش! میں اپنی امی کا کہا مان لیتی اور تمہارے ساتھ شادی سے انکار کر دیتی۔" شوہر نے بے یقینی سے پوچھا۔ "کیا واقعی تمہاری ماں نے مجھ سے شادی کرنے کو روکا تھی؟"

"ہاں، مگر میں نے امی کی بات نہ مانی اور اب یہ دن دیکھ رہی ہوں۔"

شوہر نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "افسوس! میں ایک خاتون کو اپنا دشمن سمجھتا رہا کہ وہ اپنی بلا میرے گلے منڈھ گئی ہے۔ اب میں زندگی بھر پچھتاتا رہوں گا کہ وہ خواہ مخواہ اپنا دشمن سمجھتا رہا؟"

انسان اپنی حماقت پر فخر کرتا ہے؟

لڑکے عام طور پر اس وقت جب وہ دوستوں کو یہ بتاتے ہیں کہ فلاں لڑکی نے ان کا نذرانہ دل قبول کر لیا ہے۔۔۔۔ لڑکیاں اس وقت جب سہیلیوں کو بتاتی ہیں۔ "میری اپنے محبوب سے ہونے والی ہے۔۔۔ اور شادی شدہ پہلے بچے کی پیدائش پر جو بن بھائیوں کا "میر خاں" ثابت ہوتا ہے۔"

*

کلیبہ۔۔۔ کراچی

پیار کرنے والوں کو خطرے کا احساس کب ہوتا ہے؟

جب چوری چھپے کی ملاقاتوں کے بعد گلی کھلنے والا ہو۔

وقت انسان کا ساتھ دینے پر کب آمادہ ہوتا ہے؟

جب انسان کو وقت کے ساتھ سمجھوتا کرنا آجائے۔

محبوبہ نے بہت اتراتے ہوئے اپنے محبوب سے کہا۔ "میں اس شرط پر تمہارے ساتھ شادی کرنے کو تیار ہوں کہ شادی کے بعد تم مجھ پر کوئی پابندی عائد نہیں کرو گے؟"

"بالکل بالکل۔" محبوب نے فوراً تائید کی۔ "تم اسی طرح ملازمت جاری رکھنا اور میں اسی طرح ملازمت کی تلاش۔"

*

سید شکیل حیدر بخاری۔۔۔ فیصل آباد

س: شدید محبت کے بعد شدید نفرت نیوٹن کے کس قانون کے تحت ہوتی ہے؟

ج: اس قانون کا نام تو مصطفیٰ چاند کو بھی معلوم نہیں البتہ یہ دو نشانیاں ضرور بتاتی ہیں انھوں نے۔

(۱) جب ایک ہی محبوبہ سیب کی طرح بار بار جھولی میں گرنے لگے۔

(۲) یہ سوال بار بار دہراتی رہے کہ شادی کب کرو گے؟

طارق ظفر۔۔۔ فیصل آباد

س: تقدیر کا لکھا کب سمجھ میں آتا ہے؟

ج: مرد شادی کے موقع پر مگر بعض لوگ پھر بھی نہیں سمجھ پاتے۔ مرد شادی کرنے والے کار کن نے ایک دروازے پر دستک دی تو اندر سے ہر سائز کے آٹھ بچے شور مچاتے ہوئے نکلے اور اسے گھیر لیا کار کن نے بچوں سے پوچھا۔ "گھر میں کوئی بڑا بھی ہے؟"

"ہاں، امی ہیں۔" کئی بچوں نے بہ یک وقت جواب دیا۔

"انھیں بلاؤ۔"

جب بچوں کی ماں دروازے پر آئی تو کار کن نے اپنی آمد کا مقصد بتاتے ہوئے پہلے ان کے شوہر کا نام پوچھا اور پھر سوال کیا۔ "وہ کرتے کیا ہیں؟"

خاتون نے بچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔ "یہ بچے دیکھنے کے بعد بھی آپ پوچھ رہے

ہیں کہ وہ کیا کرتے ہیں؟"

س: کہتے ہیں کہ سانپ کی دو زبانیں ہوتیں ہیں اور عورت کی؟

ج: وہ بیچاری صرف ایک زبان سے اتنا کام لیتی ہے کہ سانپ شرم کے مارے بلوں میں گھسے رہتے ہیں۔

—○—

اسد ظفر——فیصل آباد

س: انسان اور گرگٹ میں بنیادی فرق کیا ہے؟

ج: گرگٹ تو رنگ بدل کر دھوکا دیتا ہے' انسانوں کو رنگ بھی نہیں بدلنا پڑتا۔

س: خوبصورت خواتین احمق کیوں ہوتی ہیں؟

ج: کون کہتا ہے کہ خوبصورت خواتین احمق ہوتی ہیں؟ خوبصورت تو کیا' عام سی شکل وصورت والی خواتین بھی احمق نہیں ہوتیں۔ یہ صفت تو صرف مردوں میں پائی جاتی ہے ورنہ وہ زندگی بھران کے نخرے کیوں برداشت کرتے؟ آئندہ خواتین کے بارے میں ایسا غلط سوال نہ سمجھنے گا اسد صاحب!

شمیم خان——کراچی

س: آپ بھی ہمیشہ عورتوں کے سیدھے سادے سوالوں کے الٹے الٹے جواب دیتے ہیں' اگر آپ نے یہ غلط رویہ ترک نہ کیا تو میں "تکلف برطرف" پڑھنا چھوڑ دوں گی۔

ج: تکلف برطرف! آپ کی دھمکی مجھے اس قسم کی معلوم ہوتی ہے:

اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے بڑے کنجوس مشہور ہیں۔ ایک اسکاچ نے اپنے پسندیدہ رسالے کے ایڈیٹر کو بے رنگ خط بھیجا جس میں اس نے لکھا تھا۔

"اگر آپ نے اپنے رسالے میں اسکاٹ لینڈ کے باشندوں کی کنجوسی کے متعلق لطیفے شائع کرنا بند نہ کیے تو میں اپنے جمائے ہے۔ آپ کا رسالہ مانگ کر پڑھنا چھوڑ دوں گا۔"

عطیہ خاتون——لاہور

س: ایک عام نرس اور ذہنی امراض کے اسپتال کی نرس میں کیا فرق ہوتا ہے؟

ج: عام نرسوں میں سے کچھ اتنی خوبصورت ہوتی ہیں کہ مریضوں کو پاگل بنا دیتی ہیں اور ذہنی مریضوں کے اسپتال کی نرسوں کا حال کچھ یوں ہوتا ہے:

پاگل خانے کے ڈاکٹر نے دیکھا کہ ایک مریض چھت کی کڑیوں سے چمٹا ہوا ہے۔ اس نے نرس سے پوچھا۔ "یہ چھت سے کیوں چپکا ہوا ہے؟"

"یہ اپنے آپ کو ٹیوب لائٹ سمجھ رہا ہے۔" نرس نے بتایا۔

"تا رہا ہے۔" ڈاکٹر نے حکم دیا۔ "مگر پڑا تو اس کی اپنی پسلی چور ہو جائے گی۔"

"مگر اس کے اترنے سے تو کمرے میں اندھیرا ہو جائے گا جناب!" نرس نے جواب دیا۔

—○—

خان زادہ——پشاور

س: بیوی کی بیماری کا ثبوت کب دیتی ہے؟

ج: جب شوہر کو چور سمجھ لے۔

ایک دوست دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ "تم کہتے ہو کہ تمہاری بیوی بہت بزدل ہے مگر میں نے سنا ہے کہ کل اس نے چور کو پکڑ کر اسے خوب مارا۔"

"اسے غلط فہمی ہو گئی تھی یار! وہ یہ سمجھی تھی کہ عادت میں رات کو دیر سے گھر آیا ہوں۔"

سہیل عباسی——کراچی

س: زندگی کا سب سے خوبصورت لمحہ کون سا ہوتا ہے؟

ج: جب بیوی میاں سے کوئی فرمائش نہ کرے اور بالکل خاموش بیٹھی رہے۔

شادی کے کچھ عرصے بعد بیوی نے شوہر سے کہا۔ "تمہیں یاد ہے شادی کی پہلی رات میں نے تم سے آدھے گھنٹے تک بات نہیں کی تھی۔"

"آہ" شوہر نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میں وہ خوش گوار ترین لمحے کیسے بھلا سکتا ہوں۔"

عالیہ فاروقی——سیالکوٹ

س: واپڈا والے رات کو لوڈشیڈنگ کیوں کرتے ہیں؟

س: موم بتیوں کی صنعت کو فروغ دینے کے لیے مگر کچھ لوگ اندھیرے سے "غلط فائدے" بھی اٹھاتے ہیں۔

س: عورت اور جوں میں کیا فرق ہے؟

ج: اس دفعہ تو آپ کے سوال کا جواب دے رہا ہوں مگر آئندہ ایسے سوال نہ بھیجئے گا۔ ورنہ خواتین مجھ سے خفا ہو جائیں گی۔ عورت اور جوں میں ایک فرق تو یہ ہے کہ جوئیں سب کا خون چوستی ہیں مگر عورتیں مردوں کا۔۔۔ اور دوسرا فرق یہ ہے کہ عورتیں جوئیں رکھتی ہیں مگر جوئیں عورتیں نہیں رکھتیں۔ یہ غلطی صرف مرد کرتے ہیں۔

—○—

نسیم اختر——فیصل آباد

س: چونکا دینے والا انکشاف کیا ہوتا ہے؟

ج: وہ جب کوئی اور موقع سے فائدہ اٹھا لے۔

ایک فوجیا بتا جو اماوس مون منانے کے لیے ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ ٹرین اچانک ایک لمبی سرنگ میں داخل ہوئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ سرنگ سے نکلی تو شوہر نے بیوی سے کہا۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ سرنگ اتنی لمبی ہے تو میں اندھیرے سے کچھ فائدہ اٹھا لیتا۔"

یہ سن کر بیوی نے بے ساختہ کہا۔ "ہائیں! تو وہ تم نہیں تھے؟"

شہناز——سکھر

س: انسان کو یہ احساس کب ہوتا ہے کہ اسے کسی سے محبت ہو گئی ہے؟

ج: جب کسی کی حماقتوں پر غصے کی بجائے رحم آنے لگے۔

ایک صاحب اپنی محبوبہ سے پوچھ رہے تھے۔ "آج تو یہ بتاہی دو کہ سب سے پہلے تمہیں یہ احساس کب ہوا تھا کہ تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔"

"اس دن جب پارٹی میں تمہارے دوست تمہیں بے وقوف بنا رہے تھے تو مجھے تم پر رحم آ رہا تھا۔"

فیصل ندیم ندوی——لاہور

س: عورت اپنے آپ کو بوڑھی کب محسوس کرتی ہے؟

ج: کبھی نہیں۔

بالی وڈ کی مشہور اداکارہ مارلین ڈیڑچ اسی (۸۰) برس کی ہو گئی تو ایک اخبار نویس نے اس سے انٹرویو لیتے ہوئے پوچھا۔ "عورت اپنے آپ کو بوڑھی کب سمجھنے لگتی ہے۔" مارلین نے غصے سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "یہ سوال آپ کو کسی بڑھیا سے کرنا چاہیے میں ابھی بڑھاپے سے بہت دور ہوں۔"

ملک محمد خان——راولپنڈی

س: کیا بچے بھی عورتوں کی طرح اپنی عمر چھپاتے ہیں؟

ج: کبھی کبھی والدین کے کہنے پر۔

ایک بچہ اپنے والدین کے ساتھ ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔

غزل

ریاض حسین قمر

رواں کتنے عجب انداز میں ہے زندگی اپنی
نہ گلتے ہیں یہ غم اپنے' نہ گلتی ہے خوشی اپنی
کوئی اے کاش اتنا مہرباں ہم پر بھی ہو جاتا
کسی نے دیکھ لی ہوتی دریدہ دامنی اپنی
انا کے خول سے نکلیں تو کچھ آئے نظر ہم کو
ہمیں کچھ سوچنے دیتی نہیں ہے بے خودی اپنی
رہِ مہر و وفا میں لوگ کتنے دور تک پہنچے
مگر اپنے تو آڑے آ گئی ہے سادگی اپنی
ہمیں ہر موڑ پر دھوکا دیا ہے خمگساروں نے
وفا کے نام پر لٹتی رہی ہے زندگی اپنی
وہ جس پر ناز تھا وہ بھی تو آنکھیں پھیر بیٹھا ہے
کسے محسوس ہو گی انجمن میں اب کمی اپنی
قمر اس بے وفا کی بے رخی نے دل جلایا ہے
ابھی تو دیدنی ہے بے بسی' بے چارگی اپنی

ٹکٹ چیکر کو بچہ تین سال سے بڑا نظر آیا گو والدین کا اصرار تھا کہ وہ تین سال سے کم عمر ہے لہٰذا اس کا ٹکٹ نہیں لیا گیا۔ ٹکٹ چیکر مسکرایا اور بچے سے بولا۔ "نے! جب تم چار سال کے ہو جاؤ گے تو میں بہت اچھا تحفہ دوں گا۔"

بچہ فوراً بول اٹھا۔ "ٹرین سے اترتے ہی ساڑھے چار سال کا ہو جاؤں گا۔"

—○—

گل مینہ زوار خاں ——— کراچی

س۔ آپ کے ہم جنس کسی حسین عورت کو دیکھ کر سیٹیاں کیوں بجاتے ہیں؟

ج۔ انھیں خوش کرنے کے لیے۔ ثبوت کے لیے یہ پرانا لطیفہ حاضر ہے:

ایک ادھیڑ عمر خاتون سائیکل چلاتے ہوئے سگنل کے قریب پہنچیں۔ اس وقت سگنل کی سرخ بتی جل رہی تھی اور ٹریفک رکی ہوئی تھی مگر خاتون سرخ بتی کا لحاظ کیے بغیر آگے بڑھ گئیں تو سپاہی نے سیٹی بجا کر انھیں روکنا چاہا۔ خاتون نے سیٹیاں بھی ان سنی کردیں تو سپاہی نے ان کا تعاقب کیا اور انھیں روکتے ہوئے بولا۔ "خاتون! آپ نے میری سیٹیاں نہیں سنی تھیں؟"

خاتون بولی "سنی تو تھیں مگر اب میں عمر کی اس منزل سے گزر چکی ہوں جب عورتیں سیٹیاں سن کر خوش ہوتی اور پلٹ کر دیکھتی ہیں۔"

آصف انصاری ——— میرپور خاص

س۔ محبت کے بیچ میں جنیت کیسی ہوتی ہے؟

ج۔ محبت کے بیچ میں جنیت بھورت عورت کی ہوتی ہے مرد شوہر بن کر اسے ساری زندگی خراج ادا کرتا رہتا ہے۔

س۔ خوش قسمت اور بد قسمت میں کیا فرق ہوتا ہے؟

ج۔ خوش قسمت وہ ہوتا ہے جس کی شادی نہ ہوئی ہو اور بد قسمت:

ایک صاحب اپنے دوست سے کہہ رہے تھے "میں بہت ہی بد قسمت ہوں یار!"

"وہ کیسے؟" دوست نے پوچھا۔

"میری پہلی بیوی شادی کے فوراً ہی بعد فرار ہو گئی اور دوسری بھاگنے کا نام ہی نہیں لیتی۔"

نسیم ملک ——— حیدر آباد

س۔ آپ ہمیشہ بیویوں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ ایسا کیوں؟

ج۔ بات یہ ہے کہ مجھے کوئی ذاتی تجربہ تو ہے نہیں اور کسی اور سے سنتا ہوں وہی بیان کردیتا ہوں۔

ناصر ادریس ——— جڑانوالا

س۔ لڑکیاں کالے رنگ کے کپڑے تو پسند کرتی ہیں مگر کالے رنگ کے لڑکوں کو کیوں پسند نہیں کرتیں؟

ج۔ کالے کپڑے تو وہ جب چاہیں اتار کر پھینک سکتی ہیں لیکن کالے لڑکے ان کی جان کو آجاتے ہیں اسی لیے وہ ان سے دور بھاگتی ہیں۔

س۔ اچار اور عورت میں کیا فرق ہے جب کہ دونوں کو دیکھ کر منہ میں پانی آجاتا ہے

ج۔ اچار سے دانت کھٹے ہو جاتے ہیں عورتیں دانت توڑ سکتی ہیں۔ یہی فرق ہے دونوں میں۔

☆☆☆—○—☆☆☆

طارق ظفر ——— فیصل آباد

س۔ کس عمر میں انسان محبت کا بھوکا ہوتا ہے؟

ج۔ کس عمر میں انسان محبت کا بھوکا نہیں ہوتا؟

س۔ گرمیوں میں سردیاں کیوں یاد آتی ہیں؟

ج۔ لحاف کی وجہ سے، یہ جواب سمجھ میں نہ آئے تو "لحاف" پڑھ لیجیے۔

☆☆☆—○—☆☆☆

اسد ظفر ——— فیصل آباد

س۔ آدمی اعتبار کب کھوتا ہے

ج۔ جب غلطی سے اس کی "پے سلپ" بیوی کے ہاتھ لگ جائے۔

س۔ دنیا کی ساری لذتیں اور راحتیں ایک طرف، غم اور دکھ دوسری طرف آخر کیوں؟

ج۔ تو کیا کوئی تیسری طرف بھی ہوتی ہے؟

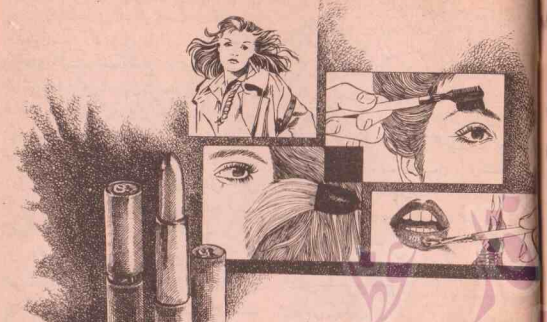

نسرین نظامی

حسن و آرائش

قارئین! ہمارے چہرے پر سب سے اہم چیز ہماری آنکھیں ہیں۔ یہ آنکھیں ہی ہیں جو ہمارے چہرے کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں۔ آپ چاہے خوب میک اپ کریں، آپ کے چہرے کی جلد چمک دار اور صاف ستھری ہو۔ آپ کے ہونٹ لاکھ جاذب نظر اور ٹاک ستواں ہو لیکن اگر آپ کی آنکھیں جھکی ہوئی، بے رونق، پیلاہٹ لیے اور اجڑی اجڑی سی ہوں گی تو یقین کیجیے کہ آپ کی ساری محنت اکارت چلی جائے گی۔ اکثر خواتین بھرپور میک اپ کرتی ہیں مگر آنکھوں پر توجہ نہیں دیتیں جبکہ ہمارا دعویٰ ہے کہ اگر آپ صرف آنکھوں کا میک اپ کریں یا آپ کی آنکھیں پُر رونق، چمک دار اور تازہ دم ہوں گی تو دیکھنے والے پر گہرا اور ایک خوب صورت تاثر چھوڑیں گی۔ ان تمام باتوں سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ کو اپنے پورے چہرے کے ساتھ ہی آنکھوں پر بھی گہری توجہ دینا چاہیے۔

آنکھوں کو پُر رونق اور چمک بنانے کے لیے سب سے اہم چیز نیند ہے۔ ایک بھرپور اور پر سکون نیند آپ کی آنکھوں کی خوبصورتی کی ضمانت ہے۔ سب سے پہلے آپ اپنی نیند پر توجہ دیں۔ دوسری بات یہ کہ جس قدر ہو سکے آنکھوں کی صفائی کا خیال رکھیں۔ گرمیوں میں خاص طور پر آنکھوں کی صفائی کا خیال رکھنا چاہیے اگر آپ کہیں سوس کرتی ہیں تو بھی گھر جانے کے بعد آپ کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ٹریفک کا دھواں، گرد و غبار آپ کی آنکھوں میں گیا ہو گا اگر آپ آنکھیں دھوئے بغیر سو گئیں تو یاد رکھیے

کہ آپ کو آنکھوں کا کوئی مرض بھی لاحق ہو سکتا ہے اسی لیے آنے کے بعد آپ کھلی آنکھوں میں نیم اچھی طرح پانی کے چھپاکے ماریں بلکہ اگر چھوٹے سے گلاس میں صاف پانی لے کر آنکھ کو باری باری اس گلاس میں بھگوئیں تو بہت ہی بہتر ہے۔ ایک آنکھ کم از کم تین چار منٹ تک پانی میں ڈبو کر رکھیں پھر یہ پانی پھینک دیں اور گلاس میں دوسرا پانی لے کر یہی عمل دوسری آنکھ کے ساتھ دہرائیں۔ میک اپ صاف کرنے کے دوران میں اگر آپ لیموں ملے ٹھنڈے پانی میں روئی بھگو کر دونوں آنکھوں پر رکھیں تو آپ کی آنکھوں کی ساری تھکن نکل جائے گی' آپ کی آنکھیں روشن اور چمک دار ہو جائیں گی۔ اس کے علاوہ آلو کے چپس کاٹ کر بھی آپ آنکھوں پر رکھ سکتی ہیں۔ کوئی بھی

کریم' لوشن یا ٹونر آنکھوں سے کچھ فاصلے رکھا کریں ورنہ ان کے کیمیائی اثرات آپ کی آنکھوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ خالص شہد کو سلائی میں لگا کر آنکھوں میں پھیرنے سے بھی آپ کی آنکھیں صاف ستھری اور چمکیلی نظر ہوتی ہیں۔ آج کل سردیاں آنے والی ہیں اور گاجریں تو آ ہی چکی ہیں۔ کچی گاجروں کا استعمال آپ کی بینائی کے ساتھ ہی آنکھوں کو صحت' مند چمک دار اور خوبصورت بنا سکتا ہے۔

میک اپ کرتے ہوئے آپ سب سے زیادہ توجہ آنکھوں پر دیں اگر پہلے سے کاجل یا مسکارا لگا ہوا ہے تو اسے کاسمیٹک آئل سے اچھی طرح صاف کریں۔ آنکھوں کے گرد بھی اچھی طرح صفائی کریں تاکہ کاجل کی سیاہی آنکھوں کے گرد نہ رہ جائے۔ اب آپ آئی فاؤنڈیشن وغیرہ لگانا چاہتی ہیں تو خیال رکھیے کہ آنکھوں کے گرد ملتے ہوئے انگلیوں کا دباؤ نہ پڑے بلکہ بڑے ہلکے انداز میں اسے جلد میں جذب کریں اگر آپ کی آنکھیں چھوٹی ہیں تو براؤن رنگ کی پنسل سے آنکھوں کے اوپری حصے یعنی پلکوں کے بالکل ساتھ ہی لکیر کھینچیں۔ یہ لکیر آنکھوں کے نیچے بھی کھینچ دیں مگر یہ بالکل پلکوں کے ساتھ کھنچی ہوئی بہت باریک لکیر ہو' اب مسکارا لگائیں' اور برش سے پلکوں کو ٹھوکتی جائیں بلکہ اگر آئی شیڈو استعمال کرنا چاہتی ہیں تو پہلے پینسل پر آئی شیڈو استعمال کریں پھر مسکارا لگائیں۔ آپ دیکھیں گی کہ آپ کی آنکھیں بے حد خوبصورت اور بڑی محسوس ہو رہی ہیں۔ کاجل لگانا چاہیں تو بہت مناسب ہے' یاد رکھئے کہ سیاہ اور گہری آنکھیں ایشیا کی خوبصورتی کی نشانی ہیں

بھنوؤں کو بھی ترتیب میں ہونا چاہئے اگر آپ بھنویں بڑی ہیں تو خاص طور پر خیال رکھیں کہ نکل آنے والے چھوٹے بال آپ کی آنکھوں کو برا نہ بناتے ہیں اس لیے انھیں ضرور نکال دیں۔ اب ہائی لائٹ جو بھی آپ استعمال کرتی ہوں بہت ہلکی سی بھنوں کے نیچے لگالیں صرف اتنی ابھرے ہوئے حصے میں کچھ چمک پیدا ہو جائے آپ دیکھیں گی کہ بغیر میک اپ کے بھی آپ جاذب نظر لگ رہی ہیں۔ آنکھوں کی طرح ہونٹوں کا میک اپ بھی چہرے کے لیے بہت اہم ہوتا ہے اور آپ کی ذرا سی بے پروائی یا احتیاطی آپ کے پورے چہرے کی خوبصورتی کو ضائع کر سکتی ہے۔ اکثر خواتین لپ اسٹک اس طرح لگاتی ہیں کہ ہونٹوں کے کناروں سے باہر نکل جاتی ہے' دانتوں پر لگ جاتی ہے یا باچھوں تک پہنچ کر بدنما محسوس ہوتی ہے۔ لپ اسٹک ہمیشہ باریک لپ لائنر لگانا چاہئے۔ لپ لائنر سے ہونٹوں کے گرد آؤٹ لائن بنالیں پھر برش ہی کے ذریعے لپ اسٹک کو ہونٹوں پر لگائیں اس طرح لپ اسٹک پھیلی نہیں۔ باچھوں پر یعنی ہونٹوں کے دونوں کناروں پر پہلے ہی لپ اسٹک ختم کر دیں ورنہ منہ بند کرنے کے بعد آپ کے ہونٹ بدنما انداز میں پھیلے ہوئے محسوس ہوں گے۔ جو رنگ بھی آپ لگانا چاہتی ہوں اس سے کچھ گہرے رنگ کی آؤٹ لائن آپ کے ہونٹوں کو بے حد خوبصورتی دے گی۔ لپ اسٹک لگانے کے بعد ایک ٹشو پیپر کو دونوں ہونٹوں کے درمیان رکھ کر دبالیں اس طرح زائد گی ہوئی لپ اسٹک ٹشو پیپر پر لگ جائے گی اور ہونٹوں پر گلی رہے گی اسٹک دیر تک قائم رہے گی۔ لپ گلوس کا اب فیشن نہیں رہا اس لیے اسے لگانا بے کار ہے لیکن اگر آپ لپ اسٹک استعمال نہیں کرتیں تو لپ گلوس کا استعمال ضرور کریں۔ لپ اسٹک لگانے کے بعد برش آن لگاتے ہوئے خیال رکھیے کہ برش کا رنگ آپ کی لپ اسٹک سے میچ کرتا ہوا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ آپ نے لپ اسٹک تو براؤن رنگ کی لگائی ہو اور برش آن آتشی گلابی ہو دونوں کا رنگ ایک جیسا ہی ہونا چاہئے۔ برش آن کو ٹھوڑی کی جانب سے کانوں کی لو کی جانب لے جائیں' ہاتھ کا دباؤ ایک سا رکھیں اور لگاتے ہوئے یہ نہ سوچیں کہ زیادہ رنگ ہو گیا ہے کہ کم' بعد میں آپ اسے ہلکا یا گہرا کر سکتی ہیں۔ رات کے وقت آپ کو گہرا رنگ لپ کرنا چاہئے اور دن کے وقت ہلکے رنگ استعمال کرنا چاہئے۔

چہرے کے دائرے دھبے دور کرنے کے لیے دودھ میں پسے ہوئے چاولوں کا لیپ آپ کو دھبوں سے مکمل طور پر نجات دلا دے گا۔

قارئین! یہ خط ہمیں نازش بہن نے لکھا ہے لاہور سے۔ بی بی! ہونٹوں پر روز رات کو سونے سے قبل لیمو کا رس اور شہد کا آمیزہ ملیں۔ سستی قسم کی یا کسی اور کی استعمال کی ہوئی لپ اسٹک قطعی استعمال نہ کریں۔ رخساروں پر نظر آنے والی دریدوں کے سلسلے میں کسی ڈاکٹر سے رجوع کریں تو بہتر ہے ویسے ایک احتیاط بتا رہے ہیں کہ کسی بھی وقت بہت گرم پانی چہرے پر قطعی نہ لگائیں بلکہ ہلکا' نیم گرم پانی استعمال کریں۔ کوئی کریم یا لوشن بھی فی الحال استعمال نہ کریں۔

جڑیوں کے لیے آئندہ ماہ ورزش لکھ دیں گے مگر یہ ورزش آپ کو مسلسل کرنا ہوگی۔ آپ کا خط کیونکہ بہت دیر سے ملا اس لیے شمارے میں ورزش لکھنا ممکن نہیں۔ انشاء اللہ اگلے شمارے میں ضرور لکھیں گے۔

یہ دو سرا خط آزاد کشمیر سے بھیا اشفاق زیدی نے بھیجا ہے بھیا جب کم ہونے کی وجہ سے آپ کا خط شائع نہیں کر رہے ہر حال جواب حاضر ہے آپ انڈے کی زردی اور لیمو کا آمیزہ استعمال کر سکتے ہیں۔ خشک جلد کے لیے فیئر اینڈ لولی بہتر نہیں بلکہ یہ آپ کی جلد کو مزید خشک کر دے گی اور کچھ عرصے بعد آپ کے مسام کھل کر بدنمائی پیدا کریں گے۔ یہ کلین جلد کے لیے بہتر ہے۔ انڈے کی زردی اور لیمو کا آمیزہ تازہ ہی لگایا جاتا ہے رکھ دینے سے خراب ہو جاتا ہے زیادہ سے زیادہ آپ صبح بنائے جانے والے آمیزے کو صبح اور پھر رات استعمال کر سکتے ہیں یعنی دو مرتبہ۔ یہ ترکیب میں آپ کے لیے بہتر ہے انشاء اللہ جلد ہی آپ فرق محسوس کریں گے۔ اس کے علاوہ مکئی کے چھلکوں کو پیس کر رکھ لیں۔ بھتے میں ایک مرتبہ ایک چائے کا چمچ پسے ہوئے چھلکے' آدھا چمچ ہلدی' آدھے لیموں کا عرق اور ایک چمچ سرکا آمیزہ بنالیں۔ اگر گاڑھا ہو تو پانی ملالیں۔ آمیزہ چہرے پر لیپ کر لیں آدھا گھنٹہ لگا رہنے دیں پھر سادے پانی سے دھو لیں۔ چہرے کے تمام داغ دھبے دور ہو جائیں گے۔

اجازت دیں آپ کی باجی

تیرِ نیم کش

قارئین

ہر ماہ بہترین اشعار بھیجنے والے تین قارئین کو دوشیزہ کا آئندہ شمارہ بہ طور انعام ارسال کیا جاتا ہے۔ اس بار بھی حسبِ سابق تین قارئین کے اشعار بہترین قرار دیے گئے ہیں۔

پہلا انعام..... بابو سیاسی

دوسرا انعام..... ارم ناہید

تیسرا انعام..... مظہر حسین شاہ

ان قارئین سے درخواست ہے کہ اپنا مکمل پتا بھیجیں تاکہ انھیں انعامی شمارہ ارسال کیا جاسکے۔ (ادارہ)

بابو سیاسی..... کراچی

مجھے ملال نہیں اپنی کم نگاہی کا
جو دیدہ ور ہیں انھیں بھی نظر نہیں آتا

ارم ناہید..... کراچی

اس ستم ظریفی پر ہم قتیل کیا سمجھیں
آدمی ہے کپڑوں میں، زندگی برہنہ ہے

مظہر حسین پشتی..... خانیوال

اہلِ زر آنگن میں گڑیوں کا رچائیں گے بیاہ
مفلسوں کی بن بیاہی بیٹیاں رہ جائیں گی

رحمان ندیم خٹک..... پشاور کینٹ

اس تشنہ لب کی نیند نہ ٹوٹے خدا کرے
جس تشنہ لب کو خواب میں دریا دکھائی دے

آصف سارنی..... سارن چٹھہ

میں وقت آنے پہ خود زہر بھر کے پی لوں گا
تو میری موت کا معیار اتنا پست نہ کر

محمد رضا حسن گوندل..... منڈی بہاؤالدین

غریبِ شہر کا تہ تشنہ تراشنے والو
امیرِ شہر کا بھی شجرۂ نسب دیکھو

اشتیاق حسین شاہ..... فیصل آباد

دل جیتنے کے فن سے اگر دسترس نہ ہو
دکھتی رگوں کو چھیڑنا دانشوری نہیں

بشریٰ نذر حزیں..... لاہور

ضمیر کانپ تو جاتا ہے آپ کچھ بھی کریں
وہ ہو گناہ سے پہلے کہ ہو گناہ کے بعد

ایم عبدالرؤف خان..... میانوالی

سیرت نہ ہو تو عارض و رخسار سب ہلاک
خوشبو اڑی تو پھول فقط رنگ رہ گیا

شازیہ سجاد قریشی..... بیول

خودداریوں کی موت سمجھنا انھیں قلیل
حاصل جو نعمتیں ہوں بڑی التجا کے بعد

سید شکیل حیدر بخاری..... فیصل آباد

روپ تو اس کو ایسا دیتے دنیا دیکھتی، لیکن ہم
بت سازی ہی چھوڑ چکے تھے جب وہ پتھر موم ہوا

ثمینہ قریشی..... ضلع چکوال

راہیں جدا جدا ہوں تو کچھ غم نہ کیجیے
ہم عالمِ خیال میں ہیں آپ ہی کے ساتھ

فرحانہ شیریں گیلانی..... جھنگ صدر

اپنے خیالوں کو مجھے سونپ کے دیکھو
محض امانت میں خیانت نہیں کرتا

نبیلہ بلوچ..... میرپور خاص

اک جھوٹی انا کے واسطے برباد ہو جانا
ہی کے زعم میں انسان کتنے دکھ اٹھاتا ہے

مدیحہ ظفر..... فیصل آباد

اک روز پلٹنے کا کیا تھا تم نے
دیا دل کے اندھیروں میں جلا رکھا ہے

مدیحہ ظفر..... فیصل آباد

رت کو گوارا نہیں تنہائی کسی کی
جس کو دیا ہے اسے غم ساتھ دیا ہے

مسز عجل حسین نوری..... حیدر آباد سندھ

اتنی تو عطا کر مرے فن کو خالق
دشمن مرے مرنے کی خبر کو ترسے

ثمینہ شاہین..... کراچی

دیدۂ امید کا موسم خاک اڑتی ہے آنکھوں میں
کب بھیجو گے درد کا بادل کب برکھا برساؤ گے

عبدالرحمان گل..... ضلع کوہاٹ

وہ تو پھر اللہ ہے پوری کرے گا آرزو
چھوں سے جب مرادیں دل کی پالیتے ہیں لوگ

حافظ علی احمد..... ریتالہ خورد

تھی آرزو پھولوں کی مگر پائے ہیں پتھر
کچھ لوگ مقدر میں لکھا لائے ہیں پتھر

فرید اللہ..... ڈی آئی خان

گل چہ چاہئیں گے لحد پر جن سے یہ امید تھی
وہ بھی پتھر رکھ گئے سینے پہ دفنانے کے بعد

صدف فاروقی..... کراچی

ہم ہیں وہ ساغر کہ بے بھی ڈھل کے پیمانہ بنے
ہم نہیں وہ پی کے جو دو گھونٹ دیوانے ہوئے

بسیرا فاروقی..... کراچی

ایک ہم ہیں کہ تصور کی طرح ساتھ رہے
ایک تو ہے کہ جو خلوت میں بھی تنہا نہ ہوا

سلطوت نظامی..... کراچی

پہلی محبتوں کے زمانے گزر گئے
ساحل پہ ریت چھوڑ کے دریا اتر گئے

امیرا مصطفیٰ..... حیدر آباد

صدیوں میں چند پھول کھلے اور ثمر بنے
لمحوں میں آندھیوں کے تھپیڑوں سے مر گئے

کاظم رضا..... نوابشاہ

اس کے آتے ہی سمٹ آئی نگہ میں تشنگی
اس طرح دیکھا اسے جیسے کبھی دیکھا نہ تھا

عطاء الرحمان بھٹی..... سیالکوٹ

قرب میں ڈھلتی گئیں ساری سمندر دوریاں
تھا بہت پایاب، جو پانی مجھے گہرا لگا

گل مینہ زدار خان..... کوئٹہ

وہاں تو آج بھی کھلتے ہیں دھڑکنوں کے محاذ
جہاں نگاہ نے پہلی شکست مانی تھی

بدن ملاپ کو بیتاب اور روحوں پر
نہ ملنے والے ستاروں کی حکمرانی تھی

مہیرا..... پشاور

سینہ مدفن بن جاتا ہے جیتے جاگتے رازوں کا
جانچنا زخموں کی گہرائی کام نہیں اندازوں کا
ساری چابیاں میرے حوالے کیں اور اس نے اتنا کہا
آنکھوں پر حفاظت کرنا، شہر ہے نورورازوں کا

لذتِ کام و دہن

ایرانی کباب

اشیاء۔ قیمہ ۲/۱ سیر، ٹماٹر ۲/۱، ہری پیاز ایک پاؤ، نمک حسب ذائقہ اور تیل ایک چھٹانک

ترکیب۔ قیمے میں ہری پیاز کاٹ کر نمک ملا دیں اس کو دو گھنٹے تک رہنے دیں۔ تیل فرائی پان میں گرم کر کے ثابت سرخ رس دار ٹماٹر ڈالیں اور ہلکی آنچ پر نرم کریں اور لکڑی کے کفگیر سے دبا کر اس کا ساس بنا لیں، اب گول گول کباب بنا کر ساس میں ڈالیں اور پکائیں جب پک جائے تو ڈش میں کباب ڈال کر اوپر سے ٹماٹر کا رس ڈال کر نوش فرمائیں۔

بیسنی کباب

اشیاء۔ پانچ کچری، نمک مرچ حسب ذائقہ، ادرک دو انچ کا ٹکڑا، قیمہ ایک سیر، پیاز ۴ عدد، تیل ایک پاؤ، بیسن پانچ چمچہ، گرم مسالہ حسب ذائقہ، ہرا مصالحہ کٹا ہوا تھوڑا سا۔

ترکیب۔ کچری نمک مرچ اور ادرک پیس کر قیمہ میں ملا دیں اور ایک گھنٹے تک یونہی رکھیں۔ پھر تیل گرم کر کے اس میں پیاز سرخ کر کے نکال لیں اور جب وہ کرکری ہو جائے تو ہاتھ سے مسل لیں اب تیل میں بیسن ڈالیں اور بھونیں، جب بیسن پتلا ہو جائے تو قیمہ ڈال دیں اور اس کے ساتھ ہی مسلی ہوئی پیاز اور گرم مصالحہ ایک گھنٹے تک ہلکی آنچ پر پکائیں تقریباً ایک گھنٹہ، جب اسے خوب بھون لیں تو ہرا مسالہ ڈال کر مہمان کے سامنے پیش کریں۔

کچری کباب

قیمہ ۲/۱ سیر، کچری چھ عدد، ادرک تھوڑی سی، دہی ۲/۱ پاؤ، نمک مرچ مرضی کے مطابق۔

ترکیب۔ دہی میں نمک، مرچ، کچری، لونگ اور ادرک پیس کر ملا دیں اور پیسنے کے بعد قیمے میں ملا دیں اور دو گھنٹے کے بعد ایک بڑی پیاز آدھ پاؤ گھی یا تیل میں سرخ کر کے قیمے میں بگھار دیں اور ہلکی آنچ پر پکائیں اور پھر دم دے کر اتار لیں، لذیذ کباب تیار ہیں نوش فرمالیں۔

حلیم

اشیاء۔ ایک سیر گوشت (گائے کا) ۲/۱ سیر دلیہ، ہرا مسالہ اور ڈیڑھ سیر کے حساب سے قورمہ کا مسالہ۔

ترکیب۔ ایک سیر گوشت کا قورمہ، پریشر کوکر میں پکائیں بعد میں نمک، مرچ، دھنیا، ہلدی، ادرک، لہسن ڈال کر پریشر کوکر میں پکائیں۔ اب دونوں کو ملا کر دوبارہ پکائیں اور خوب گھوٹیں تاکہ یکجان ہو جائے اب دوبارہ گھی اور پیاز کا بگھار دے کر ڈش میں ڈالیں اور ہرا مسالہ گرم مسالہ باریک کٹی ادرک اور لیموں کے ٹکڑے کے ساتھ پیش کریں۔

کچے قیمے کی ٹکیاں

اشیاء۔ ۲/۱ سیر قیمہ پیاز ۲ بڑے نمک مرچ مرضی کے مطابق، ادرک ایک چمچہ کچا پپیتا ذرا سا اور گرم مسالے، ہری مرچ ۴۔

ترکیب۔ تمام مصالحے پیس کر قیمے میں ملا دیں۔ ہری مرچ کاٹ کر ملا دیں اب قیمے کی چھوٹی چھوٹی گول ٹکیاں بنا کر تلیں اور کھائیں۔ آدھ سیر قیمے کی ۱۸ ٹکیاں بنتی ہیں۔

پیاز اور ٹماٹر کی بھجیا

اشیاء۔ ٹماٹر ۶ بڑے سرخ رس دار، پیاز ۲ بڑے نمک مرچ مرضی کے مطابق ہلدی ذرا سی گرہ، دھنیہ ۴/۱ چمچہ اور ہری مرچ ۴ عدد کٹی ہوئی، گھی تھوڑا سا۔

ترکیب۔ پیاز کاٹ کر تیل یا گھی میں نرم کر کے تمام مسالے اس میں ڈالیں اور ۵ منٹ کے بعد ٹماٹر اور ہلکی آنچ پر پکنے دیں جب پک جائے تو کٹا ہوا ہرا دھنیا اور ہری مرچیں ڈالیں اور کھائیں۔

آلو کے قتلے

اشیاء اور ترکیب۔ تیل گرم کر کے سفید زیرہ ڈال لیں اس کے ساتھ آلو کے قتلے ڈالیں اور ۵ منٹ بھون کر نمک اور مرچ سرخ اور ساتھ ہی ٹماٹر کاٹ کر ڈال لیں۔ (جتنے آلو ہوں اتنے ہی ٹماٹر ہونے ضروری ہیں) تیار ہونے پر ہرا مسالہ ڈالنا نہ بھولیں۔

پبلشر: خاور صدیقی پرنٹر: سلیم الحسن نقوی، احباب پرنٹرز، کراچی مقامِ اشاعت: بی ایس/۵۴/۱ اے ۶۔ بلاک، فیڈرل بی ایریا۔ کراچی